جدید دنیائے اسلام

مصنفہ

ڈاکٹر لوتھراپ اسٹاڈرڈ

(اے۔ ایم۔ پی۔ ایچ۔ ڈی)

مترجمہ

محمد جمیل الدین (بدایونی)

بی اے (علیگ) ڈپٹی کلکٹر

محمد ظہور الحق مقتدری پروپرائٹر

عثمانی پریس بدایوں میں طبع ہوئی

بار اول ۱۰۰۰ جلد

تہدیہ
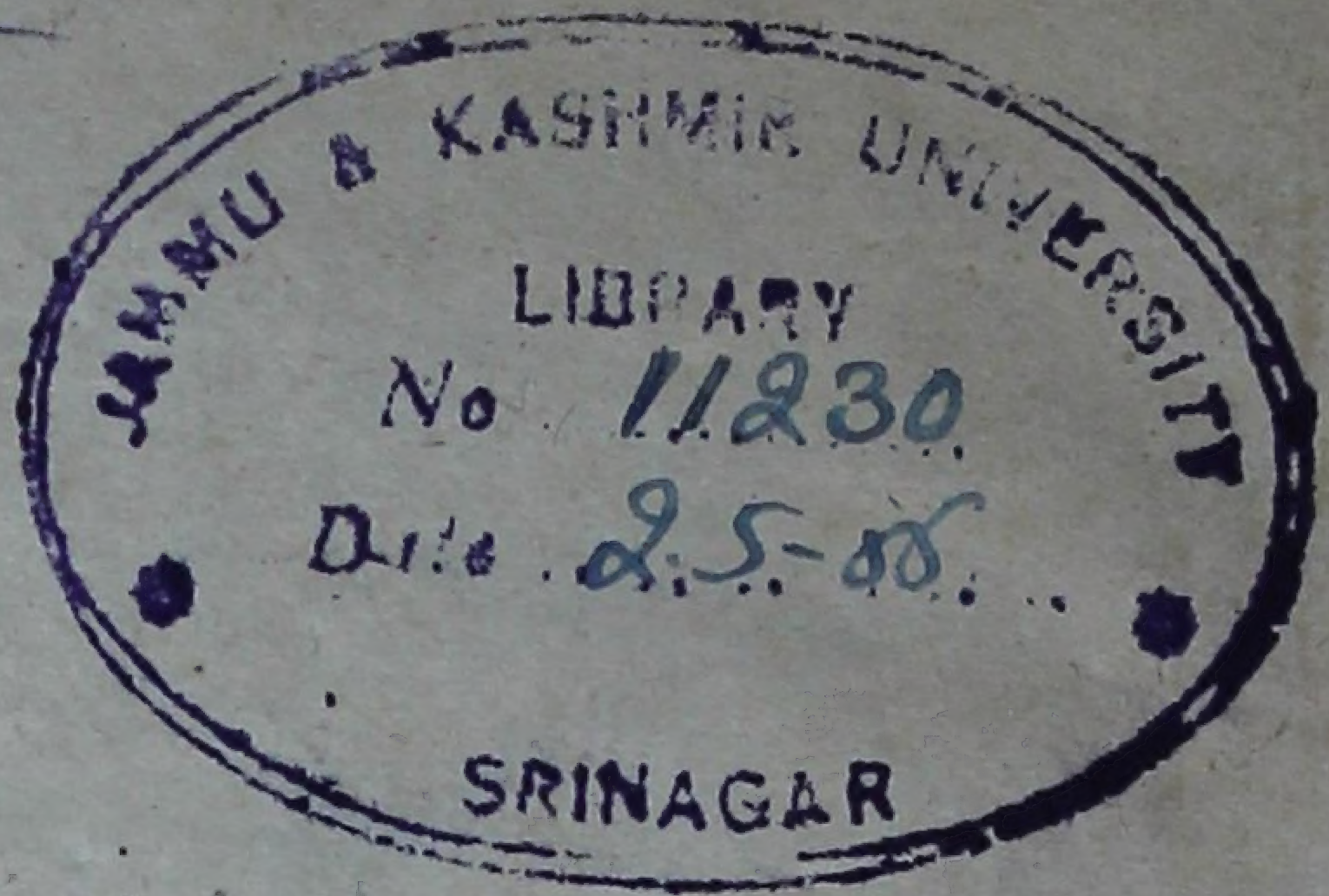
میں اپنی اس ناچیز خدمت کو مخدومی محترمی مولوی سیّد
محفوظ علی صاحب بی۔ اے (علیگ) کے اسم گرامی سے معنون کرتا ہوں
جن کے جذبات اسلامی اور خصوصیات علمی و ادبی اظہر من الشمس ہیں اور
جن کی ترغیب و مشورت اس جسارت کا سبب ہوئی ہے

دل! دگر ہرچہ از ہیچ میرزی خجل است
التفات نگہے۔ گرمیِ بازار دل است

جمیل الدین

۷۸۶

تمہید

مترس از انقلاب فتنہ خیزے ٭ کلید مش زندگی را در کشاید
زمیں را لرزہ از صد جا شگافد ٭ ہزاراں چشمۂ نو بر کشاید

(سر محمد اقبال)

اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر لوتھراپ اسٹاڈرڈ امریکہ کے ماہر سیاسیات ہیں۔ ان کی عمر چالیس سال کی ہے ۱۹۰۸ء میں قانونی ڈگری ہارورڈ یونیورسٹی سے حاصل کی خیال تھا کہ سفر یورپ کے بعد وہ مستقل طور سے وکالت شروع کریں گے لیکن ۱۹۰۹ء میں جب وہ فرانس میں موجود تھے تو یورپ کے سیاسی مطلع کا تکدر دیکھ کر انھیں شوق ہوا کہ سیاسیات میں استعداد پیدا کر کے اپنے وطن اور قوم کی خدمت بجا لائیں۔ چنانچہ امریکہ واپس آکر یونیورسٹی مذکور میں سیاسیات کے مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔ اور ۱۹۱۴ء سے متواتر اپنا کل وقت سیاسی تقریروں اور تحریروں میں صرف کر کے ایک پبلسٹ کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اس وقت تک متعدد کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر موصوف کی تصانیف پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص ایشیا کے سفر کرنے پر بھی ممالک ایشیا کے متعلق ایسی جامع اور بسیط معلومات رکھ سکتا اور قیاسات کا صحیح اندازہ کرنے پر قادر ہو سکتا ہے۔ اسلامی اقوام کا حال محض کتابوں اور رسالوں

نے معلوم کر کے ایسے صحیح نتائج پر پہونچنا اس شخص کی اعلیٰ قابلیت اور خداداد ذہانت
کی دلیل ہی۔ علاوہ ازیں اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہو کہ یورپی اقوام نے علوم میں کس
درجہ ترقی کی ہو اور ان کی تحریرات ہر رطب و یابس اور کلیات و جزئیات پر کسی مبسوط
اور مدلل ہوتی ہیں کہ محض ان کے مطالعہ سے ایک ذی فہم ایسی معلومات حاصل کر سکتا ہو
جس سے ہم صاحب البیت ہونے پر بھی بخوبی واقف نہیں ہیں۔

اِس کتاب میں مصنف نے یہ کوشش کی ہو کہ ارتقائے اسلامی کی
دلچسپ اور عجیب کہانی اوس کے مختلف یعنی معاشرتی، مذہبی، تمدنی، سیاسی اور
اقتصادی پہلوؤں سے بیان کریں" مصنف نے کتاب کو دیباچہ، مقدمہ، نو فصلوں،
اور خاتمہ پر تقسیم کیا ہو۔ دیباچہ میں صرف اسلامی دنیا کے موجودہ ہیجان کا ذکر کر کے اپنے
موضوع کتاب کو مجملاً بیان کیا ہو۔ مقدمہ میں اسلامی قوت کے عروج و زوال پر
بحث کی ہو۔ اور اُس میں یہ دکھایا ہو کہ عربوں نے استحکام قوت کے ساتھ ہی یونانی
و عجمی تمدنی سے پورا نفع اُٹھا کر اپنی عالی ظرفی اور وسیع الخیالی کا ثبوت دیا۔ اور ایک جدید
تمدن یعنی تمدنِ عرب کی تعمیر کی۔ مصنف نے قدیم یونانی اور عجمی روایات کے اعادہ کو زوال
سبب بتایا ہو جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خالص نژاد عرب سلطنت سے جدا ہو کر بادیہ نشینی
کی طرف عود کر گئے اور مولد العرب قدامت پسندی اور مطلق العنانی کی روایات میں مبتلا
ہو گئے اس درماندہ اسلامی دنیا کو انیسویں صدی کی یورپ سے مقابلہ کرنا پڑا نتیجہ یہ ہوا کہ
اسلامی ممالک یکے بعد دیگرے مغربی حملوں کی نذر ہو گئے اور جنگ عظیم میں عمل تسخیر
اپنے اوج کمال پر پہونچ گیا۔ فصل اول میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کا ذکر ہو اور مصنف نے یہ
دکھایا ہو جس کے متعلق میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں تک حق بجانب ہو کہ اس کی ابتدا محمد بن
عبدالوہاب نجدی کے مساعی سے ہوئی۔ اس وہابی تحریک کا مقصد اسلام کو بدعات مابعد سے
پاک و صاف کرنا اور اسلامی سلطنت کو بیدار کرنا تھا یہ تحریک اگرچہ سیاسی طور پر ناکامیاب

رہی اور مذہبی تجدید میں بھی تنگ خیالی کی ملزم ٹھہرائی گئی لیکن اس نے اسلامی اقوام کو بیدار ضرور کر دیا اور مسلمانوں میں بطور خود اصلاحی تحریک شروع ہو گئی جسے مغربی خیالات کی رو سے مزید تقویت پہونچی. فصل دوئم میں اتحاد بین الاسلامی کی ابتدا اور ترقی کا حال لکھا ہے جس کے بانی سید جمال الدین الافغانی ہیں اس تحریک کا منشا و مقصد مسلمانوں کا اقتصادی اور سیاسی اتحاد و استحکام ہے فصل سوئم میں مصنف نے یہ بتایا کہ اسلامی اقوام پر مغربی اثرات کا کیا نتیجہ ہوا اور وہ کس طرح جادہ پیمائے ترقی ہوئیں. فصل چہارم میں سیاسی انقلاب کا ذکر ہے اس سلسلہ میں دکھایا گیا ہے کہ اسلام میں قرون اولےٰ کے بعد جو شخصی اور استبدادی حکومتیں قایم ہوئیں اُس سے اسلامی اقوام قعر ذلت میں گر گئیں۔ اور مغربی حملوں اور اندرونی اصلاحی تحریکات سے بیدار ہو کر اسلامی اقوام اب دستوری نظامات اور اصلاحات کے قیام و بقا کے لیے ساعی ہیں. فصل پنجم میں مختلف اسلامی اقوام میں قوم پرستی کی تحریکات کے نشو و نما کا ذکر ہے. فصل ششم فصل ماسبق کا جزو ہے اور ہندوستان کی تحریک، قوم پرستی سے تعلق رکھتی ہے چونکہ اس تحریک کے بانی اہل ہنود ہیں لہذا مصنف نے اس پر جداگانہ بحث کی ہے. فصل ہفتم و ہشتم میں مصنف نے اقتصادی اور معاشرتی انقلابات پر بحث کی ہے. فصل نہم میں معاشرتی بے چینی کے اسباب اور بالشویک تحریک کا ذکر کیا ہے اس کے بعد خاتمہ ہے جس میں مصنف اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ "بالآخر غیر متحرک مشرق اسلام اور کامل طور پر متحرک ہو گیا... دنیائے اسلام جو ایک ہزار سال تک جمود و سکون کی حالت میں رہی اب پھر ایک مرتبہ سرگرم تگاپو نظر آتی ہے"، لیکن مصنف اس اسلامی جد و جہد کا نتیجہ بتانے کی جرات نہیں کرتا. بلکہ صرف یہ اُمید ظاہر کرتا ہے "کہ موجودہ تکلیف جو عظیم ہونے کے ساتھ ہی ساتھ مبہم بھی ہے اس نوزائیدہ مشرق کا درد زہ ہی ثابت ہو گی جو نئی دنیا میں عنقریب اپنا مقام اور وقار حاصل کرنے والا ہے"۔

مصنف نے اپنے خط میں اس کتاب کی علت غائی یہ تحریر کی ہے کہ وہ

اہالیان یورپ و امریکہ کے سامنے اسلامی دنیا کی تحریکات عظیم کی صحیح اور غیر جانبدارانہ تشریح پیش کریں۔ بلاشبہ مصنف نے اس اظہار حال میں نہایت صاف بیانی اور حق گوئی سے کام لیا ہے۔ چنانچہ لارڈ میسٹن کا جو مضمون سنڈے ٹائمس میں شایع ہوا تھا اُس کا اقتباس ۴ ار نومبر ۱۹۲۲ء کے ہمدم میں شایع ہوا ہے لارڈ موصوف نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اہل برطانیہ کو اس کتاب سے سبق لینا چاہیئے۔ اور اپنی مسلمان رعایا کے خیالات کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

اس کتاب کے دو پہلو ہیں۔ اولاً دول یورپ کو مطلع اور متنبہ کرنا ہے جیسا کہ لارڈ موصوف نے نتیجہ نکالا۔ مجھ کو اس پہلو سے کوئی سروکار نہیں۔ دوسرا پہلو خود ایشیائی اقوام سے تعلق رکھتا ہے مصنف نے مشرقی اقوام کے میدان عمل میں سرگرمیاں اور کامیابیاں دکھا کر نہایت واضح طور پر ترقی کن اصلاحی عمل اور فتنہ انگیزی کے امتیازات کی توضیح کی ہے اور میری تمنا اس ترجمہ کے پیش کرنے سے یہ ہے کہ میرے ابناء وطن اس آئینے میں اپنی صورت ملاحظہ فرمائیں۔ مصنف کے مشورہ پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور جہاں تک ممکن و مناسب ہو اس پر عامل ہوں۔

ہندوستان آج حکومت غیر کے تابع فرمان ہے اور اپنی آزادی کے مساعی میں اس قدر کامیاب ہو گیا ہے کہ حکمران قوم نے خود اس ہندوستانی نصب العین کو تسلیم کر کے ریفارم اسکیم عطا کی ہے۔ میں اس متنازعہ مسئلہ میں نہیں پڑنا چاہتا کہ ان اصلاحات سے ہندوستانیوں کو حکومت میں حقیقی اقتدار کسی حد تک حاصل ہوا یا نہیں۔ لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ان اصلاحات نے انتخاب کنندگان اور نمائندگان دونوں کے لیے جدید ذمہ داریاں پیدا کر دی ہیں اس سے قبل حکومت میں ہمارا ہاتھ نہ تھا اور ہمارے لیڈروں کی مساعی محض طلب حقوق اور سلطنت کو اس کی غلطیوں کے انتباہ پر متضمن تھیں۔

اب حالت جداگانہ ہے۔ ہم پر خود ذمہ داریاں عائد ہو گئیں اور یہ ذمہ داریاں ہماری توجہ کی ایسی طالب ہیں کہ حقوق کے سوال کو پس پشت ڈالنا پڑے گا۔ ہم کو ان ذمہ داریوں کا احساس پیدا کر کے اپنے ابناء وطن کی جہالت کا استیصال کرنا ہے جو ہماری

بدبختی کا سبب اصلی ہے۔ اس سے میری مراد مروجہ تعلیم یعنی صرف و نحو جغرافیہ و حساب و تاریخ و ہندسہ سے ناواقفیت نہیں ہے۔ بلکہ میرا منشا یہ ہے کہ نوجوانان ملک میں خود اعتمادی۔ استقلال فکر۔ وطن پرستی اور آزادی کے جذبات پیدا کیے جائیں۔ سب سے ضروری امر یہ ہے کہ عامۃ الناس کو بیدار کیا جائے اور اُن کے ذہن نشین کیا جائے کہ مذہبی نفاق و نفاق اور فرقہ بندی سے پرہیز کریں کیونکہ دستوریت اور آزادی ملک محض مختلف فرقوں اور مذہبوں کے مناقشات کی وجہ سے معرض التوا میں ہیں۔ ان امور کے حصول کے لیے لازمی ہے کہ جاہلانہ جنسی تعصبات کو دور کر کے کل اقوام ہند مادر وطن کی جامعیت کے پرچم کے زیر سایہ جمع ہو جائیں۔ ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ پر اور ایک فرقہ کو دوسرے فرقہ پر ترجیح دینا ایک ظلم ہے جس کے ہوتے ہوئے ملک میں امن وامان ناممکن ہے۔ اس ظلم کے مٹانے کی یہی صورت ہے کہ کل اقوام وطبقات متحد ہو کر پرستار وطن بنیں۔

اس تعلیم کا شیوع محض روزانہ زندگی کے عمل ہی میں ہو سکتا ہے اور صلاحی اسکیم کی کم از کم یہ برکت مسلمہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ انتخابات کے موقع پر اپنے طرز عمل اور روش سے عام رائے دہندوں کو یہ تعلیم دے سکتا ہے کہ وہ حق انتخاب کی ذمہ داری کو محسوس کریں اور انتخاب میں مقامی، قرابتی، مذہبی، ذاتی تعلقات کو بالائے طاق رکھ کر ایسے نمائندے منتخب کریں جو فی الحقیقت ایمانداری سے حق نمائندگی ادا کریں اور اپنے انتخاب کو حصول اعزاز و ثروت کا ذریعہ نہ بنائیں۔

اس دور میں معاشرتی اور اقتصادی انقلابات کی بدولت ہر طرف اضطراب و سراسیمگی کے آثار رہویدا ہیں۔ اس اضطراب و سراسیمگی میں سیاسی جدوجہد خیالات میں اور خلفشار پیدا کر رہی ہے۔ ہندوستان کی حالت اس بارے میں غیر معمولی طور پر عجیب ہے۔ یہاں چونکہ حکومت غیر ملکی ہے لہذا جذبات حریت کی عام اشاعت اور حصول یت کی جائز کوشش باغیانہ و مفسدانہ خیال کی جاسکتی ہے۔ بعض حالات میں گورنمنٹ ایسا

خیال کرنے میں حق بجانب بھی ہوتی ہو کیونکہ رہنمایان قوم مطالبہ دستوریت کے استدلال میں موجودہ طرز حکومت پر بعض وقت ایسی ایسی نکتہ چینیاں کرتے ہیں جن سے عوام میں حکومت موجودہ سے تنفر پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہو خطرہ ہوتا ہو کہ کہیں انقلاب تک منجر نہ ہو۔ لیکن ملک کی اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی حالت ہنوز کسی انقلاب کی متحمل نہیں ہو۔ ہم کو امن وامان کے ساتھ بہت سی سیاسی تعلیم لینے اور بہت سی معاشرتی اصلاحیں اور اقتصادی ترقیاں کرنی ہیں۔

میں موجودہ حکومت پر کوئی مخالف یا موافق تنقید کر نہیں سکتا اول الذکر اس وجہ سے نہیں کہ یہ امر بحیثیت ملازمت حکومت میری حالت کے موزوں نہیں ثانی الذکر اس لیے نہیں کہ ملک کے مزاج کو دیکھتے ہوئے یہ محض خوشامد و چاپلوسی پر محمول سمجھی جائے گی۔ لیکن میں ایک بات کہنے کی جرات کر سکتا ہوں جس سے شاید کسی کو اختلاف نہ ہوگا وہ یہ کہ موجودہ گورنمنٹ "خواہ ہماری فلاح و بہبودی کا باعث ہوئی" یا "اس کی بدولت ہم غلاموں کی نسل بن گئے" ایک بات میں ضرور کامیاب ہوئی کہ اوس نے ملک میں امن قایم کر دیا۔

یہ وقت نہایت موزوں ہو کہ ہم اپنی حالت درست کر کے اپنی توقعات کو حاصل کریں اور اپنی سیاسی جدوجہد میں ان تمام فتن سے دور رہیں جن سے اس تخویفی دور کا اعادہ ہو جو انقلاب فرانس کے بعد رونما ہوا تھا۔

مجھے افسوس ہو کہ اس ترجمہ کا اعلان نومبر سنہ ۱۹۲۲ء میں کیا گیا تھا اور فی الحقیقت یہ تیار بھی تھا۔ لیکن ۲۰ دسمبر سنہ ۱۹۲۲ء کو جب میں مکمل کتاب پریس میں دینے کے لیے جا رہا تھا۔ رامپور اور بریلی کے درمیان میرے اسباب کے ساتھ کل مسودہ ضایع ہو گیا اور چونکہ میری رخصت ختم ہو چکی تھی لہذا مجھے کار منصبی کی بجا آوری سے کافی فرصت نہ ملی جو اس کام کو از سر نو بعجلت ختم کر سکتا۔ اب کامل ایک سال کی تاخیر و تعویق کے بعد

اس کی اشاعت ہو رہی ہے۔ والامر بیدہ تعالیٰ

میں اس موقع پر برادر معظم مولوی محمد سلیمان صاحب، مولوی محمد یحییٰ صاحب۔ ایم۔ اے۔ وکیل، مولوی فضل علی صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی اور مولوی غلام یوسف صاحب عزیز کا مشکور ہوں جنھوں نے کاپیوں کی صحت اور پروف کے مطالعے میں مجھے پوری مدد دی۔

آخر میں ناظرین کرام سے درخواست ہے کہ اگر اس کتاب میں کوئی ابہام یا فروگذاشت ہو تو اسے میری بے بضاعتی پر محمول کریں۔

"محمد جمیل الدین"

قاضی ٹولہ - بدایوں

۱۱ر نومبر ۱۹۲۳ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

دنیائے اسلام آج سخت ہیجان کے عالم میں ہے۔ مراکش سے لیکر چین اور ترکستان سے لیکر کانگو تک پچیس کروڑ پیروان اسلام جدید خیالات جدید جذبات اور جدید توقعات سے بیدار ہو رہے ہیں۔ ان میں ایک عظیم انقلاب برپا ہے۔ جس کا اثر کل نوع انسان پر پڑ کر رہے گا۔

اس انقلاب کو اگرچہ جنگ گزشتہ سے بہت زیادہ ترقی ہو گئی ہے لیکن اس کی ابتدا بہت پہلے سے ہو گئی تھی۔ ایک صدی سے زیادہ ہوا کہ اس کا بیج بویا گیا۔ اور اُس وقت سے برابر نشو و نما ہوتا رہا۔ ابتداءً اس تحریک کا نمو آہستہ اور پنہاں ہوا۔ اور آج اس عظیم ہنگامہ رستخیز کے بعد یہ تحریک دفعتاً اور تعجب انگیز طور پر اپنے شباب کو پہنچ گئی۔

اس کتاب میں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ میں اس دلچسپ اور عجیب ارتقار کی کہانی اس کے مختلف جوانب یعنی معاشرتی، مذہبی، تمدنی، سیاسی اور اقتصادی پہلوؤں کے لحاظ سے بیان کروں۔ میرا نصب العین یہ ہے کہ ان مناظر کی ابتدا اور نشو و نما کی تصویر کھینچوں تاکہ ان کی نوعیت کے اجزا ترکیبی اور ان کے قوائے عملیہ کا صحیح اندازہ ہو جائے۔ میں نے اس میں مرز بوم کے اختلافات کا پورا لحاظ رکھا ہے اور مختلف تحریکات کے نتائج متقاربہ اور اصول متحدہ کو ہمیشہ مد نظر رکھا ہے۔

اگرچہ اس کتاب کا اصل بحث دنیائے اسلام ہے لیکن اس میں

ہندوستان کے غیر مسلم ہندو عنصر کا ذکر بھی لازمی ہے۔ اس طریقے پر یہ کتاب کُل بلاد مشرقی ادنے و وسطی سے تعلق رکھتی ہے۔ مشرق اقصے پر براہ راست کوی تبصرہ نہیں ہے۔ لیکن وہاں کے بھی متوازی واقعات کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اور یہ امور ہمیشہ پیش نظر رہنے چاہئیں۔

"مصنّف"

مقدمہ

قدیم اسلامی دنیا کا انحطاط اور زوال

تاریخ انسانی کا غالباً سب سے تعجب انگیز واقعہ اسلام کا عروج ہے۔ اس کی ابتدا ایسی سرزمین اور قوم سے ہوئی جو اولاً کسی شمار میں نہ تھی۔ اسلام ایک ہی صدی میں نصف کرۂ زمین پر پھیل گیا۔ اس نے بڑی بڑی سلطنتوں اور مدتوں کے مستقل مذہبوں کو تہ و بالا کر کے نفوس اقوام کو نئی ترکیب دی۔ اور ایک مکمل جدید دنیا یعنی دنیائے اسلام کی تعمیر کی۔

اس ترقی پر جس قدر غور کیا جاتا ہے اُسی قدر زیادہ عجیب معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے بڑے مذاہب کو کامیابی آہستہ آہستہ اور بہت کشمکش کے بعد حاصل ہوئی۔ اور آخر کار کسی زبردست بادشاہ کی امداد سے جو خود اس مذہب کا مقلد ہو گیا ہو ان کا عروج ہوا۔ مسیحی مذہب کے لیے قسطنطین[ف۱]، بودھ کے لیے

ف۱ قسطنطین۔ اس کا نام فلیویس ویلیریس اوریلیس کانسٹنٹینس الملقب بہ قسطنطین اعظم ہے۔ ۲۷ فروری ۲۷۴ء میں بمقام نسا پیدا ہوا۔ اوائل میں یہ مشرق میں ڈیوکلیٹین کے دربار میں رہا۔ جب اس کا باپ قیصر روما منتخب ہوا اور اُس کو مغربی حصہ سلطنت یعنی اسپین و فرانس و برطانیہ دیا گیا تو اس نے قسطنطین کو اپنے پاس بُلا لیا۔ یہ فرانس کے بندرگاہ بولانی پر اپنے باپ سے ملا۔ اور اس کے ساتھ انگلستان گیا۔ ۲۵ جولائی ۳۰۶ء میں جب اس کا باپ مرا تو یہ اُس کا جانشین ہوا۔ اس نے عیسائیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا۔ اور گلیریس کے ظالمانہ احکام کی پروا نہ کی۔ اس زمانے میں رومۃ الکبریٰ کا نظام قیاصرہ دا مخطوس ایسا غلط اور ناقابل

اشوکؔ، اور زرتشتیوں کے لیے کیخسروؔ ایسے سلاطین تھے جنہوں نے اپنے اختیار کردہ عقائد کو اپنی دنیوی عظیم قوت سے امداد دی۔ بخلاف اس کے اسلام نے اس طرح ترقی

(بقیہ نوٹ صفحہ ۳) عمل تھا کہ گلیرلیس کے خلاف بغاوت ہونے پر چھ مختلف دعویداران سلطنت پیدا ہو گئے نتیجہ یہ ہوا کہ طوائف الملوکی اور بدنظمی پھیل گئی۔ اور قسطنطین نے موقعہ سے پورا فائدہ اٹھا کر اپنے رقیبوں کو یکے بعد دیگرے مغلوب کر لیا کہا جاتا ہے کہ انہیں لڑائیوں کے دوران میں اس نے دوپہر کے وقت آسمان میں ایک نورانی صلیب دیکھی جس پر "اس کی مدد سے فتح ہے" لکھا ہوا تھا۔ اسی واقعہ سے اس نے باطل پرستی کو چھوڑ کر دین مسیحی اختیار کیا۔ ۳۲۴ء میں وہ مشرقی و مغربی دونوں رومی سلطنتوں کا تنہا حکمراں ہو گیا۔ مورخین اس مسئلہ پر مختلف الرائے ہیں کہ وہ دراصل اس معجزہ اور خواب دیکھنے کی وجہ سے عیسائی ہوا یا محض سیاسی اغراض کے لیے۔ لیکن اس نے اشاعت دین مسیحی کے لیے جو نمایاں کام کیے وہ قابل ذکر ہیں۔ سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اس نے جلسہ شوریٰ بمقام نیسیا (نیقیا) منعقد کیا۔ اور اس جلسہ کا خود صدر رہا۔ اس مجلس کے بعد اور نیز اس سے قبل اس نے یہ بھی کوشش کی کہ حضرت مسیح کی الوہیت کے منکرین اور راسخ الاعتقاد مسیحیوں کو ایک ہی کلیسا کے متبع کر دیے۔ علاوہ ازیں اس کے ایسے وعظ بھی موجود ہیں جس میں اس نے باطل پرستی کی تردید اور نئے مذہب کا اثبات اور اس پر استدلال کیا ہے۔ اس کے شغف کے بہترین شہادت یورپی مورخین کے حسب ذیل اقتباس سے ملتی ہے:-

"مسیحیت کی بابت تاریخی اہمیت اس میں نہیں ہے کہ وہ بذاتہ خود عیسائی ہو گیا۔ بلکہ اس نے بحیثیت ایک مدبر کے وہ طرز عمل اختیار کیا کہ نئے مذہب کو پہلی مرتبہ ایسا دنیوی اقتدار مل گیا جس کی بدولت یہ سب سے مستحکم معاشرتی اور سیاسی نظام ہو گیا۔ اور اس نے نوع انسان کی قسمتوں پر بڑا اثر ڈالا" مترجم

لہ اشوک۔ اول شہنشاہ ہند چندر گپت کا پوتہ اور بندوسار کا لڑکا ہے۔ یہ اپنے باپ کے وفات کے وقت اوجین کا صوبہ تھا۔ تخت نشینی ہونے پہ اس نے بودھ مذہب اختیار کیا (بقیہ نوٹ بصفحہ آیندہ)

نہیں کی۔ اس کا آغاز ایک ریگستانی ملک میں ہوا جس میں آبادی بہت کم اور اس کے باشندے خانہ بدوش اور گزشتہ تاریخ عالم میں غیر معروف تھے۔ اسلام جب اس عظیم

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴) اور اس کی تبلیغ کے لیے ہر طرح کی کوشش کی۔ اصل ارکان مذہب تمام ملک میں مناروں پر کندہ کرا دیے اور اس امر کے لیے محتسب مقرر کیے کہ عوام ان اصولوں کی پابندی کریں۔ علاوہ بریں اس نے ایشیا افریقہ اور یورپ میں مبلغین روانہ کیے۔ یہ ۲۷۲ ق۔م میں تھا۔ بودھ مذہب کے اصولوں کے منضبط کرنے کے واسطے اس نے ایک مجلس شوریٰ ۲۵۰ ق۔م میں منعقد کی۔ مترجم

۱۲ کیخسرو۔ شاہنامہ اور نیز مرزا فرصت شیرازی کے تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زردشت کا ظہور سلطنت گشتاسپ کے چوتھے سال میں ہوا۔ گشتاسپ کا دوسرا نام ویستسپا ہے اور یونانی میں اس کو ہستاسپ کہتے ہیں۔ ان دونوں مصنفین کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ گشتاسپ اور اس کے لڑکے اسفندیار نے مذہب زردشت کی ترویج میں سعی بلیغ کی۔ مصنف نے جو کیخسرو کو لکھا ہے غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ فردوسی نے جو کیانی بادشاہوں کے نام دئے ہیں ان کی مطابقت ان ناموں سے بمشکل ہوتی ہے جو تاریخ یونان میں ملتے ہیں۔ علاوہ ازیں مرزا صاحب موصوف نے جو کتبات آثارِ قدیمہ سے نقل کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی نے کوئی صحیح سلسلہ نسب نہیں دیا ہے اور نہ سلاطین کی فہرست مکمل ہے۔ ایک کتبہ میں گشتاسپ نے اپنے آپ کو پسر دارا لکھا ہے۔ لیکن شاہنامہ میں گشتاسپ پسر لہراسپ درج ہے۔ اس لہراسپ کا دوسرا نام کامبیز یعنی کیکاوس اور یونانی میں (کمبائسس) ہے۔ غالباً انھیں غلطیوں کی وجہ سے مصنف نے ان حامیان دین زردشت میں سے کسی کو کیخسرو لکھ دیا ہے۔ مرزا فرصت نے چند سلاطین کے ناموں کی مطابقت کی ہے۔ اس کو ناظرین کی معلومات کے لیے لکھا جاتا ہے "کوروش" یعنی کیخسرو (سائرس) "کیکاوس" (کمبائسس) کا لڑکا ہے۔ اور پانسو انسٹھ ۵۵۹ سال قبل مسیح حکمراں تھا۔ تیس سال حکومت کی (کامبیزیہ) کیکاؤس پسر کیخسرو کو لہراسپ بھی کہتے ہیں۔ وہ ۵۲۹ ق۔م حکمراں تھا (بقیہ نوٹ صفحہ آیندہ)

پر روانہ ہوا تو اس کے معاونین کی تعداد بہت قلیل تھی اور بہت بڑی مادی طاقتوں سے مقابلہ تھا۔ لیکن اس نے ایسی آسانی سے فتح پائی جو سراسر اعجاز تھی۔ اور دو ہی نسلوں میں چمکتے ہوئے ہلال نے پیرینیز سے لیکر کوہ ہمالیہ تک اور صحرائے ایشیار متوسط سے لیکر صحرائے افریقہ متوسط تک فتح حاصل کی۔

اس عجیب و غریب فتح کے متعدد وجوہ تھے۔ اور ان میں خاص اسباب عربوں کے خصائل، نبی اکرم (صلے اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم کی نوعیت اور ہمعصر مشرقی دنیا کی عام حالت تھی۔ اگرچہ اس وقت تک عرب بالکل غیر معروف رہے تھے۔ لیکن یہ لوگ اُن غیر معمولی قابلیتوں کے اہل تھے جو اس وقت خودسازی

(بقیہ نوٹ صفحہ ۵) اور سات سال شاہی کی۔ ڈاریوس کا نام دارائے اکبر ہے اور ۵۲۱ ق م۔ میں حکمراں تھا اور ۳۶ سال سلطنت کی۔ زرکزس اسفندیار کا نام ہے اس کے باپ کا نام دارا ہے ۴۸۵ قبل مسیح میں حکمراں تھا اور ۲۰ سال شاہی کی۔ ارتکسر یکزس کا نام اردشیر اور بہمن ہے وہ ۴۶۵ ق۔ م۔ میں تخت نشین ہوا اور ۴۰ سال سلطنت کی۔

ڈاریوس دوم ۴۲۵ قبل مسیح میں تخت نشین ہوا اور ۱۲ سال سلطنت کی۔ اردشیر دوم ۴۰۴ قبل مسیح میں تخت نشین ہوا اور ۴۳ سال سلطنت کی۔

اردشیر سوم ۳۶۱ قبل مسیح میں تخت نشین ہوا وہ پانچ سال سلطنت کی اس کا دوسرا نام بھوکا بھی ہے۔ داریوس سوم جس کو دارا اور بیز کودماں بھی کہتے ہیں ۳۳۶ قبل مسیح میں تخت نشین ہوا اور اس کو اسکندر رومی نے مغلوب کیا۔ مترجم

کے لیے نمایاں طور پر متلاشی تھیں۔ نبی اکرم صلعم[۱] سے قبل کئی پشتوں سے ملک عرب میں ایک نئی روح پیدا ہو گئی تھی قوم عرب اپنی موروثی بُت پرستی سے تجاوز کر کے طبعًا برتر امور کی متمنی ہو چلی تھی۔ اس دماغی اور روحانی ہیجان میں دعوت اسلام نے نفیر صور کا کام کیا۔ نبی اکرم صلعم خالص عرب اور اپنی قومی روح کا مکمل مجسمہ تھے۔ انھوں نے ایک سادہ اور زبردست وحدانیت کی تلقین کی۔ جس میں نہ بت پرستی تھی اور نہ دینیات کے پیچیدہ مسائل۔ انھوں نے سامی قلوب کے اُس سرچشمہ کو کھولدیا جو ہمیشہ سے مذہبی جوش سے لبریز تھا۔ عرب قوم جو اپنے جوش کو اعتکاف خانہ جنگیوں میں صرف کرتی تھی اب اپنی دیرینہ رقابتوں اور خوں ریز جنگ و جدال کو یک قلم بھول گئی۔ اور اپنے نئے مذہب کی روشنی میں متحد ہو گئی۔ اور ریگستانوں سے اپنے حقیقی اور واحد خدا کے واسطے دنیا کے فتح کرنے کو چل کھڑی ہوئی۔

اس طور پر اسلام تُند باد صرصر کی طرح سرزمین عرب سے برآمد ہو کر اُن

---

[۱] مصنف کا یہ فقرہ کہ "محمد صلے اللہ علیہ وسلم سے قبل کئی پشتوں سے ملک عرب میں ایک نئی روح پیدا ہو گئی تھی .... نفیر صور کا کام کیا" محض مسیحی پادریوں کا اتباع ہے۔ اس مسئلہ پر کافی بحث ہو چکی ہے اور مجھکو اُن دلائل کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ مغربی مصنفین خود اس سے واقف ہیں کہ مسیحی پادریوں نے اس قسم کے فقرے محض اس لیے تراش لیے تھے کہ بعثت اعظم کی اہمیت اور مافوق العادت عظمت کو گھٹا دیں۔ چونکہ اس ظہور اعظم کی خوبیوں سے انکار تو دن کو رات اور سفید کو کالا بتانا تھا۔ لہذا اس پر ایسے فقرے چُست کئے جس سے کم از کم عوام میں تذبذب پیدا ہو جائے۔ اور اس دین فطرت کے ملہم اور موید من اللہ ہونے کا عقیدہ کمزور ہو جائے لیکن واقعات اور نیز مسیحی مورخین کو بھی مصنف کی رائے سے اختلاف ہے۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا جلد نمبر ۱۶ مطبوعہ ۱۸۸۳ء صفحہ ۵۴۵ پر تحریر ہے۔ "رسولخدا صلعم کی پیدائش اور جوانی کے زمانہ میں یہ خیال میں (بقیہ نوٹ بصفحہ آئندہ)

اقوام سے دوچار ہوا جو روحانیت سے معرّا تھیں۔ ہمسایہ بزنطینی و عجمی سلطنتیں بظاہر نہایت شاندار و پُرشوکت نظر آتی تھیں لیکن محض پرکاہ ثابت ہوئیں۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۶) بھی نہ آتا تھا کہ کچھ ہی دنوں میں عرب قوم کے کارنامے ایرانیوں اور یونانیوں کے فاتحین کی حیثیت سے تاریخ عالم میں درج ہونگے .... ظہور (خاتم النبیین) سے قبل عربوں کا مذہب فضول اور مُردہ تھا۔ اکثر قصص اور نظموں سے ثابت ہوتا ہے کہ دیوتاؤں سے بے توجہی اور غفلت عام تھی۔ لیکن مُردہ مذہب کی بدل کی تمنا عام تھی۔ بعض ایسے افراد بھی تھے جو صرف انکار سے مطمئن نہ ہوئے بلکہ بہتر اور برتر تعلیم کے متمنی تھے۔ ایسے اشخاص حنیف کہلاتے تھے اور ان کے نام حسب ذیل ہیں :- امیہ بن الصلت طائفی۔ زید بن عمر مکی۔ ابو قیس بن ابی الانس۔ ابو عامر مدنی۔ مگر یہ لوگ اپنے عقائد کی اشاعت کے کوشاں نہ ہوئے۔ بلکہ اپنے تزکیہ اور تصفیہ نفس میں مشغول تھے۔" علاوہ ازیں سر ولیم میور نے جو لکھا ہے حسب ذیل ہے۔ "آنحضرت صلعم کے ایام جوانی میں جزیرہ نما رعب کی حالت کسی تبدیلی اور ترقی کے قبول کرنے کے لایق نہ تھی۔ شاید اس سے پہلے کسی زمانہ میں ان لوگوں کی اصلاح سے اس قدر نا امیدی پیدا نہیں ہوئی جیسی آپ کے وقت میں۔ بعض وقت جب ایک سبب کو ایک نتیجہ پیدا کرنے کے لیے ناکافی سمجھ لیا جاتا ہے تو اس کے لیے اور وجوہ جمع کیے جاتے ہیں۔ مثلاً نبی اکرم صلعم کے متعلق لکھا جاتا ہے کہ ان کا اُٹھنا تھا کہ ساتھ ہی سارے کا سارا عرب ایک نئے اور روحانی ایمان کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ عرب اس وقت بڑی بھاری تبدیلی کے لیے جوش میں تھا۔ اور اس کے قبول کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ ہمارے نزدیک جب ٹھنڈے دل کے ساتھ اسلام سے پہلے کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو تاریخ اس نتیجہ کو جھٹلاتی ہے۔ پانچ صدیوں تک عیسائیوں کی متواتر کوششوں اور مواعظ کا یہ نتیجہ ہوا تھا کہ چند آدمی بعض قبائل سے اس مذہب میں داخل ہو گئے۔ اس طرح عرب کی مذہبی سطح پر عیسائیت کی کمزور سی کوشش کی کبھی کبھی کوئی چھوٹی سی لہر نمودار (بقیہ نوٹ بصفحہ آئندہ)

ان سلطنتوں کی اصلی زندگی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ ان کے مذاہب بالکل مضحکہ خیز و پُر فریب تھے۔ ایران کا موروثی زرتشتی مذہب مسخ ہو کر مجوسیت کی شکل میں نمودار ہو چکا تھا۔ اُس کے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۸) ہوتی تھی۔ بعض وقت زیادہ گہری موجوں میں یہودیت کا اثر نمودار ہوتا تھا۔ مگر اصلی بُت پرستی اور توہم پرستی کی موجیں نہایت بلند تھیں"۔ دوسری جگہ پر مسٹر لیم نے لکھا ہے۔ "آنحضرت صلعم کی بعثت سے پہلے عرب کی حالت مذہبی تبدیلی کے قبول کرنے سے ایسی ہی دور تھی جیسے باہمی اتفاق اور اتحاد پیدا کرنے سے دور تھی۔ عربوں کے مذہب کی بنیاد ایسی سخت بُت پرستی پر تھی جس کی جڑیں نہایت گہری جمی تھیں۔ جس نے صدیوں تک مصر و شام کے عیسائیوں کی تمام کوششوں کا ایسا مقابلہ کیا تھا کہ گویا ان کا اس پر کچھ اثر ہی نہ تھا"۔ مترجم

لہ بزنطینی سلطنت (جس کو بلگرامی نے مشرقی سلطنت اس وجہ سے لکھا کہ وہ رومی مشرقی سلطنت تھی۔ اپنی دار السلطنت بائز نطیم سے موسوم ہے۔ یہ ان سات پہاڑیوں میں سے ایک کا نام ہے جس پر موجودہ قسطنطنیہ واقع ہے۔ فی الحقیقت یہ سلطنت اپنی رعایا تہذیب اور دیگر اثرات کی وجہ سے یونانی کہلانے کی مستحق ہے۔ اس سلطنت کا حقیقی بانی قسطنطین اعظم ہے۔ جس نے بزنطیم کو ۳۲۶ء میں اپنا دار السلطنت قرار دیکر قسطنطنیہ کے نام سے مشہور کیا۔ رومی سلطنت میں جو دو بڑی تبدیلیاں واقع ہوئیں اس کا اظہار اس امر سے ہوا کہ سنہ ۳۴۰ء میں قسطنطنیہ حضرت مریم علیہا السلام کے نام سے معنون ہوا۔ اور زاں بعد اس نے محض مشرقی سلطنت کی حیثیت سے ترقی کی۔ ازمنہ مظلمہ و متوسطہ میں یہ سلطنت تمدن کی ضامن رہی اور اطالوی و یونانی شہروں پر بربرہ کے حملوں کے بعد نشاۃ ثانیہ کا مخرج بنی۔ مشرقی سلطنت کا باضابطہ قیام ۳۹۵ء سے شروع ہوتا ہے جبکہ تھیوڈوسیس اعظم نے سلطنت کو مستقل طور پر اپنے لڑکوں ارکیڈیس اور ہنوریس میں تقسیم کر دیا۔ ایشیائی حصہ مع مصر و تھریس و موزیہ و مقدونیہ اور یونان کے ارکیڈیس کے حصہ میں آیا۔ مشرقی سلطنت نے ٹیوٹنی حملوں کو پسپا کر کے (بقیہ نوٹ بصفحہ آئندہ)

نمائشی موبدوں کا فریب ایسا طاری تھا کہ عوام ان کے شکنجہ ظلم و عذاب میں گرفتار تھے اس لیے عوام موبدوں سے متنفر اور دل میں ان کو ذلیل سمجھتے تھے۔ مشرقی مسیحیت پر

(بقیہ نوٹ صفحہ ۹) حملہ آوروں پر اپنی سطوت و جبروت کا سکہ جما دیا۔ اور یہ سلطنت آخر دم تک ایشیائی حملوں کے خلاف یورپی چوکی کا کام دیتی رہی۔ قسطنطین کے بعد چار سو سال تک وحشی اقوام کے حملوں کا دور رہا۔ اس زمانہ میں صرف شہنشاہ جسٹینین کا زمانہ قابل ذکر ہے۔ اس نے اپنے جنرلوں بلیساریس اور نارسس کی امداد سے کچھ مغربی حصہ بشمول رومۃ الکبریٰ کے فتح کر لیا تھا۔
اسی زمانہ میں قوانین مدون ہوئے۔ اور ایا صوفیہ کا گرجا تعمیر ہوا۔ لیکن اس کے دربار میں اسکندری شان و شوکت اور عیاشی کا دور رہا۔ انہیں اصراف کی وجہ سے ساتویں صدی کا انحطاط شروع ہوا۔ لمبارڈی والوں نے اطالیہ پر قبضہ کر لیا۔ سلافی اور بلغاریوں نے جزیرۂ نما بلقان میں سکونت اختیار کی اور ایرانیوں نے ۶۱۴ء میں شام پر حملہ کر کے بیت المقدس کو غارت کیا۔ اور قسطنطنیہ پر چڑھائی کی ایرانیوں کی شکست کے بعد عربوں نے مصر و شام کو فتح کیا۔ اور ایشیا مائنر کو عاکپ بھی خطرہ میں پڑ گئی۔ ملک کا بڑا حصہ ہاتھ سے نکل گیا۔ اور تمدن روبہ انحطاط ہوا۔ ۷۱۷ء لغایت ۷۴۰ء میں لیو اسوری نے عربوں کو چند شکستیں دیکر کمزور کر دیا۔ اس میں سب سے بڑا حملہ خلیفہ سلیمان اموی کے زمانہ میں ہوا۔ امیر لشکر خلیفہ کا بھائی مسلمہ تھا۔ مدافعت نہایت عمدہ طور پر کی گئی۔ اور حملہ آور فوج سردی کی غیر معمولی شدت سے تباہ ہو گئی۔ ۸۶۷ء لغایت ۱۰۵۶ء مقدونی خاندان حکمراں رہا۔ عربوں میں انحطاط پیدا ہو گیا۔ اور قسطنطنیہ تجارتی مرکز ہو گیا۔ اسی زمانہ میں بلغاریوں نے مذہب مسیحی قبول کر لیا اور روس بھی مسیحی حلیف ہو گیا۔ مقدونی خاندان کے زمانہ سے سلطنت کا تمدن بھی زوال شروع ہوا۔ سلجوقی ترکوں نے بسرکردگی الپ ارسلان جنگ منزیکرٹ ۱۰۷۱ء میں فتح پائی اور رومونس چہارم کو قید کر لیا۔ اور روم میں ترکی سلطنت کی (بقیہ نوٹ صفحہ آئندہ)

بت پرستی کی نمائشات اور پست یونانی دماغ کے تراشیدہ عقائدِ الوہیت کا ایسا اثر ہو چکا تھا کہ وہ مسیحی تعلیم کا قابلِ نفرین خاکہ رہ گئے تھے۔ مجوسیت و رومی نصرانیت دونوں کو اُن ملاحدہ نے جو وحشیانہ مظالم اور شدید نفرت کے بانی تھے پارہ پارہ کر دیا تھا۔ مزید براں رومی اور ایرانی سلطنتیں مطلق العنان سلطنتیں تھیں۔ ان کی رعایا پامال ہو چکی تھی۔ اور ان کے دل سے حُبِّ وطن اور وفاداریٔ سلطنت بالکل محو ہو چکی تھی۔ آخری بات یہ کہ اسی زمانے میں دونوں سلطنتوں میں ایک خونریز جنگ ہو چکی تھی جس سے دونوں تھک گئی تھیں[۱]۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۰) بنیاد ڈالی۔ شاہنشاہ ایلیگزیس کو کامنیس (۱۰۸۱ء لغایت ۱۱۱۸ء) کی درخواست پر اول جنگ صلیبی واقع ہوئی۔ صلیبی نبرد آزماؤں کی حرص اور خود غرضی کی وجہ سے مشرقی سلطنت کا زوال ہو گیا۔ چوتھی جنگ صلیبی کے موقع پر قسطنطنیہ لُوٹ لیا گیا۔ اور سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے۔ ۱۲۶۱ء میں یونانیوں نے برائے نام شاہنشاہ انتخاب کیا۔ عثمانی ترکوں کے حملے سے سلطنت فنا ہو گئی۔ اُنھوں نے ۱۳۹۳ء میں فلیپڈ لفیا جسے اب اعلیٰ شہر کہتے ہیں مسخر کیا اور بلقان پر تاخت کی اور ۱۴۲۲ء میں قسطنطنیہ کا محاصرہ شروع ہوا اور بالآخر ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد خاں ثانی نے فتح کر لیا۔ اور اُس وقت سے لیکر اس وقت تک قسطنطنیہ خدا کے فضل سے ترکانِ آلِ عثمان کے قبضہ میں ہے۔ مترجم

[۱] اسکندرِ اعظم کے فتح ایران کے بعد یہ بدنصیب ملک تقریباً چار سو سال تک طوائف الملوکی میں مبتلا رہا۔ بالآخر ساسانی خاندان نے ایک فرد اردشیر بابکان نے قدیم ایرانی سلطنت کے کھنڈروں پر جدید سلطنت کی بنا ڈالی۔ اس خاندان کے عروج پر ہمسایہ مشرقی سلطنت سے سرحدی نزاعات اور قتال و جدال شروع ہوئے۔ اس خاندان کے دوسرے فرمانروا شاپور اول نے ۲۵۷ء میں شہنشاہ ولیرین کو لڑائی میں گرفتار کیا ایک صدی بعد جولین (بقیہ نوٹ بصفحہ آیندہ)

یہ تھی حالت اُس عالم کی جسے اسلامی سیلاب کا مقابلہ کرنا پڑا - نتیجہ جو کچھ ہوا ناگزیر تھا - ان جوشیلے صحرا نشینوں کے شدید حملے سے ایک مرتبہ جو مشرقی روما کی افواج اور ایرانی زرہ پوشوں کی باقاعدہ صفوف درہم برہم ہو ہیں تو مقابلہ کا خاتمہ ہو گیا - پھر کوئی محب وطن مقابلہ کو نہ اُٹھا - پامال شدہ رعایا نے نئے آقاؤں کو خاموشی سے بلکہ گرم جوشی سے قبول کر لیا - اور بیشمار ملاحدہ نے اپنے آزار دہ ہم مذہبوں کی شکست پر خوشیاں منائیں جو اپنے ہم مذہبوں سے بمقابلہ اجنبی فاتحین کے بہت سخت متنفر تھے - قلیل زمانہ میں اکثر رعایا نے اس نئے مذہب کو جو ان کے پست مذہب کے مقابلہ میں نہایت شگفتہ اور سادہ تھا قبول کر لیا - عرب اپنی حکومت کے مستحکم کرنے کے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۱) ایران کے میدان مصاف میں مارا گیا - شہنشاہ جسٹینین کو بھی بدقسمتی سے سابقہ پڑا - اُس کی ناکامیابی اُس کی ناقابلیت کی وجہ سے نہ تھی بلکہ اُس کا مدمقابل خسرو نوشیرواں غیر معمولی قابلیت کا تھا - بلیساریس کو بھی بست سالہ جنگ میں کوئی کامیابی نہ ہوئی اس قدر فائدہ ضرور ہوا کہ صلح ہو گئی جس کی رو سے یورپی شہنشاہ کو تیس ہزار اشرفی سالانہ کا خراج دینا پڑا - لیکن لڑائیاں پھر شروع ہو گئیں حتیٰ کہ موریس نے جو طبریس دوم کا داماد تھا ایک باعزت صلح منوالی - کیونکہ خسرو ثانی اپنی جلا وطنی کے ایام میں موریس کے دربار میں رہا تھا - یہ بادشاہ تخت نشین ہونے کے بعد بھی رومیوں کا ممنون احسان رہا لیکن جب فوکس نے موریس کو معزول کیا تو خسرو ثانی نے اپنے مربی کا انتقام لینے کے لیے فوج کشی کی - ایشیائی صوبوں کو تاراج کرنے کے بعد ایرانی افواج باسفورس تک پہنچ گئیں بادی النظر میں رومی سلطنت کا خاتمہ معلوم ہوتا تھا لیکن ہرقل نے سلطنت کو اس خطرہ صعب سے بچا لیا - ہرقل سب سے بڑا شہنشاہ ہی نہ تھا بلکہ سب سے بڑا سپہ سالار بھی تھا - اس نے دشمن کو پسپا ہی نہ کیا بلکہ سات مہموں میں نمایاں کامیابی حاصل کر کے ایرانی قوت کا خاتمہ کر دیا - اگرچہ یہ لڑائیاں بدرجہ مجبوری رومیوں نے لڑی تھیں لیکن ان کا اثر خود رومیوں کے لیے بھی تباہ کن ثابت ہوا - انہیں آخری لڑائیوں کی طرف سورۂ الروم میں اشارہ ہے - مترجم

طریقے خوب جانتے تھے۔ یہ کوئی خون کے پیاسے وحشی نہ تھے جو لوٹ مار اور غارتگری کے خواہش مند ہوتے۔ برخلاف اس کے وہ جبلّی طور پر خداداد اوصاف سے متصف اور اُن شائستہ صفات کو جو قدیم تہذیبوں سے حاصل ہوسکتی تھیں سیکھنے کے متمنی تھے۔ یہ فاتحین اور مفتوحین ایک ہی مذہب کے پیرو ہوگئے۔ ایک دوسرے سے مناکحت کرنے لگے۔ لہٰذا سرعت کے ساتھ ایک دوسرے میں ضم ہوگئے۔ اس اختلاط سے ایک جدید تمدن یعنی عربی (سارسنک[1]) تہذیب پیدا ہوئی۔ عرب کی طبعی قوت نے یونانی۔ رومی اور ایرانی تہذیب کو مستحکم کردیا۔ اور عربی ذہانت اور اسلامی روح نے اس پر جلا کرکے اپنی تہذیب میں ملالیا۔ پہلی تین صدیوں (۶۵۰ - ۱۰۰۰ء) میں بلادِ اسلامی دنیا کے سب سے زیادہ مہذب اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ حصے تھے۔ ان میں جابجا بارونق شہر عالیشان مسجدیں اور پُرسکون درسگاہیں تھیں۔ ان درسگاہوں میں دنیائے قدیم کی حکمت کی حفاظت اور قدر کی جاتی تھی۔ نصرانی مغرب سے جو ازمنۂ مظلمہ[2] کی تاریک شب میں چھپا ہوا تھا اسلامی مشرق کا کھلا ہوا تقابل تھا۔

---

[1] سیرسینس اس لفظ کی اصل کی بابت اختلاف ہے بعض کا قول ہے کہ یہ دراصل شرقیین کی تحریف ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ شرقہ سے ہے جس کے معنے حلیف کے ہیں۔ ازمنۂ متوسط میں یوروپ کے نصرانی اپنی متخاصم مسلمانوں کو اس نام سے موسوم کرتے تھے۔ اس سے قبل یونانی اور رومی سراسنی کا اطلاق شام و عرب کے صحاری کے خانہ بدوش عربوں پر اطلاق کرتے تھے جو رومی سلطنت کے سرحدوں پر مصر سے لیکر دریائے فرات تک تاخت تاراج کرتے تھے۔ مترجم

[2] ازمنۂ مظلمہ یورپ کا وہ تاریخی زمانہ ہے جو تقریباً ازمنۂ متوسط سے مطابق ہوتا ہے۔ اس کا آغاز روما کی مغربی سلطنت کے انحطاط سے ۴۷۶ء میں ہوتا ہے۔ اور فتح قسطنطنیہ یعنی ۱۴۵۳ء میں ختم ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ زمانہ پانچ لغایت پندرھویں صدی تک رہا۔ بیٹلیٹہ لکھتا ہے (بقیہ نوٹ بصفحہ آئندہ)

مگر دسویں صدی عیسوی میں عربی تمدن میں تنزل کے آثار پیدا ہو گئے۔ ابتداءً یہ تنزل تدریجی تھا یہاں تک کہ تیرھویں صدی کے ہولناک حادثہ تک اس تمدن میں اقتداری آثار نمایاں تھے۔ اور مغربی نصرانیت پر فوقیت رکھتا تھا۔ تاہم دسویں صدی میں اس کا زریں عہد ختم ہو گیا۔ زوال کے متعدد اسباب تھے۔ اولاً گروہ بندی کا مستقل جذبہ عود کرنے لگا جو ہمیشہ سے قبائل عرب کے لیے تباہ کن تھا۔ مختلف قبائل امارت اسلام کے لیے کوشاں ہوئے۔ اور ان کے تنازعات خونریز خانہ جنگیوں کی شکل میں نمودار ہوئے۔ ان باہمی لڑائیوں میں قرون اولےٰ کا جوش ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اسلام کے اولین علم برداروں یعنی حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ وغیرہ جیسے پاک نفوس کے بجائے دنیوی جاہ طلب اشخاص پیدا ہوئے اور انہوں نے عہدہ خلافت کو اپنی خودمختاری اور سطوت کے اظہار کا ذریعہ خیال کیا۔ دارالسلطنۃ۔ شام میں دمشق اور عراق میں بغداد کو منتقل ہوا۔ اس تبدیلی کی وجہ ظاہر ہے۔ مکہ میں خودمختاری ناممکن تھی۔ تند اور آزاد صحرائے عرب کسی کو آقا نہیں مان سکتے تھے۔ ان کی جبلی جمہوریت کو دربار رسالت سے خلعت قبول ہو چکا تھا۔ کل مومن اخوۃ کا عام اعلان کر دیا گیا تھا۔ مکہ کی خلافت خدائی حکومت جمہوری تھی۔ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کا انتخاب جمہور نے کیا تھا اور وہ اپنے آپ کو باتباع شریعت جس کی تعلیم رسول کریم صلعم نے بذریعہ قرآن کی تھی رائے عامہ کا پابند سمجھتے تھے۔

دمشق میں اور اس سے زیادہ بغداد میں حالات بالکل مختلف تھے۔ خالص

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۳) کہ یہ زمانہ ایسی جہالت کا نہ تھا جیسا کہ بعض مورخین ہم کو یقین دلاتے ہیں۔ اسی زمانہ میں فن معماری میں ترقی ہوئی۔ اور یورپ کے بڑے حصہ نے دین مسیحی قبول کیا۔
مترجم

عرب ان مقامات میں بہت کم تھے زیادہ تر شامی و ایرانی نو مسلم اور مولد العرب مخلوط النسل تھے۔ یہ لوگ شخصی سلطنت کی روایات سے متاثر اور خلفار کی خوشامدانہ اطاعت کو مستعد رہتے تھے۔ خلفار بھی ان خوشامدی اشخاص کی روز بروز طرفداری کرنے لگے۔ اور انھیں میں سے درباری منصب دار اور سپاہی مقرر کیے گئے۔ خوددار عرب ملول و افسردہ ہو کر بتدریج اپنے صحرا کو واپس ہوئے اور حکومت کی گاڑی مشرق کی قدیم خود مختاری کے پامال شدہ راستہ پر پڑ گئی۔ خاندان عباسیہ کے عروج پر یعنی ۷۵۰ء میں جب دار الخلافہ بغداد کو منتقل ہوا تو ایرانی عنصر غالب ہو گیا۔ مشہور خلیفہ ہارون رشید (الف لیلہ کا ہیرو) ایرانی بادشاہ کا مکمل نمونہ اور اسفندیار اور کیخسرو کا سچا جانشین تھا۔ اور حضرت ابو بکرؓ و حضرت عمرؓ سے اتنا ہی مختلف تھا جتنا کہ خیال میں آسکتا ہے۔ دیگر مقامات کی طرح بغداد میں بھی یہ شخصی سلطنت خود صاحب اختیار کے لیے مہلک ثابت ہوئی۔ اس کے تاریک اثر میں خلفار یا تو متوہم ظالم یا حرم کی پست کٹ پتلیاں ہو گئے جن کے کمزور ہاتھ عظیم اسلامی سلطنت کا بالکل ہی انتظام نہ کر سکے۔

سلطنت بتدریج پارہ پارہ ہو گئی۔ خانہ جنگیوں سے اس کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں۔ کوئی باہمت سردار نہ تھا اور خالص صحرائی عربوں کی تقویت بخش آمیزش سے محروم ہو کر سیاسی اتحاد مفقود ہو گیا۔ دبا ہوا قبائلی اور خصوصی میلان ہر جگہ عود کرنے لگا۔ جب اس توسیع کے چشمے خشک ہونے لگے تو اسلام کی سرعت اشاعت اس کے مخالفانہ پڑی۔ اسلام نے مختلف اقوام و قبائل کے لاکھوں آدمیوں کو متبع کر لیا تھا لیکن ان پر ہنوز کامل رنگ نہیں چڑھا تھا۔ نبی اکرم صلعم نے صرف اُن خیالات کی تبلیغ کی تھی جو عربوں میں اندر ہی اندر پیدا ہو رہے تھے اور ان کی جبلت کے موافق تھے۔ اس سبب سے انھوں نے درحقیقت عربوں ہی کو اپنا متبع بنایا تھا۔ لیکن جب دوسری غیر عرب قومیں بھی اسلام لائیں تو انھوں نے طبعاً تعلیم اسلام کو اپنی قومی خصوصیات اور ذہنیت کی

بناء پر تعبیر کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدائی اسلام کو مسخ اور محرف کر ڈالا۔ اس کی انتہائی مثال ایران میں پائی گئی۔ وہاں خالص اسلامی توحید کو پیچیدہ اور بعید از فہم عقائد سے جو تشیع کے نام سے موسوم ہیں تبدیل کر دیا گیا۔ یہی تحریفی میلان (گو کسی قدر کمی کے ساتھ) شمالی افریقہ کے بربروں کی پیر پرستی اور ہندی مسلمانوں کے عقیدے ہمہ اوست میں پایا جاتا ہے۔ یہ دونوں تبدیلیاں ایسی ہیں کہ جن کو رسول اللہ صلعم ضرور رد کرتے۔

ان مذہبی اختلافات کے ساتھ ساتھ سیاسی اتحاد بھی پارہ پارہ ہو گیا۔ پہلا تجزیہ بنو عباس کے خلافت پر متمکن ہونے پر ہوا۔ معزول شدہ خاندان بنو اُمیہ کا ایک شخص بھاگ کر اسپین پہنچا اور وہاں اس نے ایک مقابل کی خلافت قرطبہ[1] میں

---

[1] خلافت بنی امیہ کے دور میں طارق نے اسپین پر حملہ کیا۔ ۷۱۱ء میں راڈرک شاہ اسپین کو شکست دی۔ عربوں نے اسپین کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا۔ ابو مسلم خراسانی اور آل محمد کے خروج کے بعد محمد بن سفاح عباسی خلیفہ ہوا۔ اور خاندان بنی اُمیہ کا قتل و استیصال شروع ہوا اس خاندان کا ایک شخص عبد الرحمٰن بھاگ کر جنگلوں میں پھرتا تھا۔ سفاح کے زمانہ میں تو بنی اُمیّہ کا استیصال اور اس کے بعد ابو مسلم وغیرہ کے جھگڑے رہے۔ لیکن جب سفاح کے مرنے پر منصور جانشین ہوا تو والی افریقہ نے بیعت قبول کر کے کچھ معمولی تحائف بھیجے۔ اس پر منصور نے معاندانہ خط لکھا جس پر عبد الرحمن والی افریقیہ برافروختہ ہو گیا۔ اور اس نے کل مغرب میں خلیفہ منصور کی معزولی کا اعلان کیا۔ اس سے فتنہ بڑھا۔ حتیٰ کہ عہد ہارون میں قیروان میں اغلب کا خاندان قایم ہو گیا۔ اور اسی قیروان کے مناقشہ کے دوران میں اسپین والوں نے اپنا ایک خلیفہ بالاتفاق منتخب کیا۔ یہ عبد الرحمن بن معاویہ بن خلیفہ ہشام کا پوتہ تھا جو اپنے انتخاب کے وقت افریقہ کے ریگستانوں میں مارا مارا پھرتا تھا۔ اس نے اس عہدہ کو خوشی قبول کر کے قرطبہ میں مغربی خلافت بنی اُمیہ کی بناڈالی ۲۵ ستمبر ۷۵۵ء کو عبد الرحمن اندلس میں اترا۔ مترجم

قایم کی۔ اس کو نہ صرف اسپین کے مسلمانوں نے بلکہ شمالی افریقہ کے بربروں نے بھی جائز تسلیم کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد ایک اور خلافت مصر میں قائم ہوئی۔ یہ خلافت فاطمیین[1] مصر کی تھی۔ جو اپنا حق بحیثیت اولاد فاطمہ رضی اللہ عنہا دختر رسول خدا صلعم قایم کرتے تھے۔ عباسی خلفاء کا بتدریج انحطاط ہوتا گیا۔ اور بالآخر وہ نئے عنصر یعنی ترکوں کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن گئے۔

قبل اس کے کہ ہم تاریخ اسلام کے اس اہم واقعہ کو بیان کریں کہ اقتدار حکومت مولد العرب کے ہاتھوں سے منتقل ہو کر ترکوں میں کیونکر پہنچا یہ ضروری ہے کہ ہم اولاً اس تمدنی اور دماغی انحطاط پر غور کریں جو مولد العرب زمانہ کے آخر حصہ میں اتحاد سیاسی

---

[1] فاطمیین مصر۔ خلیفہ مقتدر باللہ عباسی کے عہد میں اس خاندان کی بنیاد قایم ہوئی۔ جس نے اولاً مغرب میں اور ازاں بعد مصر میں تقریباً تین سو سال حکومت کی۔ اس خاندان میں جس شخص نے اولاً دعوئ خلافت کیا وہ عبید اللہ الملقب بہ مہدی تھا۔ اس نے یہ دعوی کیا کہ وہ براہ راست اولاد حضرت خاتون جنت علیہا السلام سے ہے۔ یہ امر تحقیق ہے کہ یہ عبید اللہ بن میمون القداح کی اولاد سے تھا جس نے فرقہ اسمعیلیہ کی بنا ڈالی قرامطہ اسی فرقہ کی ایک شاخ ہیں۔ عبید اللہ فرقہ اسمعیلیہ کا امام تھا۔ خلیفہ مکتفی باللہ کے عہد میں عبید اللہ کے ایک مبلغ ابو عبد اللہ نے صوبہ افریقیا میں بہت سے پیروان بنائے تھے جو اس وقت میں خاندان اغلب کے زیر حکومت تھا۔ اور اس مبلغ کے فتوحات سے مشرقی افریقیا خاندان اغلب سے نکل گیا۔ جب مقتدر تخت نشین ہوا تو عبید اللہ اپنی جدید سلطنت کو روانہ ہوا۔ اور ۳۰۳ھ میں شہر المہدیہ کی بنا ڈالکر اسے اپنا پایہ تخت بنایا۔ اس نے مصر پر بھی قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ناکامیاب رہا۔ یہ سعادت اس کے ایک جانشین المعز لدین اللہ کی قسمت میں تھی۔ اس خاندان نے ۲۹۰ھ لغایت ۵۶۷ھ تک حکومت کی اور شمالی افریقہ کے سواحل کے علاوہ مصر و سقلیہ و کچھ حصہ اطالیہ و فلسطین و شام بھی فتح کیا۔

و مذہبی کے تجزیہ کے ساتھ ساتھ ہوا۔

رسول اللہ صلعم کے زمانہ کے عرب تازہ دم اور خرابیوں سے مبرّا تھے۔ یہ لوگ عنفوان قوت کے جوش سے لبریز اور معارک کے متلاشی تھے اور مقاصد اعلیٰ اپنے پیش نظر رکھتے تھے۔ سامی جوش مذہبی سے انھیں پورا حصہ ملا تھا۔ ان کا یہ جوش تعصب سے بری تھا یعنی وہ تنگ خیال نہیں۔ بلکہ وسیع النظر مگر اپنے عقائد میں راسخ تھے۔ ان کا مذہب بہت ہی سادہ تھا۔ بنی اکرم صلعم کی تعلیم کا لب لباب توحید اور چند عبادات پر مشتمل تھا۔ توحید کا پکا عقیدہ اور اسی قدر رسالت منجانب اللہ[1] ہونے پر ایمان رکھنا اور بعض فرائض مامورہ یعنی طہارت نماز روزہ زکوٰۃ اور حج ادا کرنا۔ یہی مشرقی دنیا کی فاتح عربوں کا اسلام تھا۔

ایسے سادہ احکام مذہب عرب دماغ کو پابزنجیر نہیں کر سکتے تھے۔ عرب دماغ ذی ہوش متفحص اور تعلیم کا شایق اور ان حالات سے تطابق عمل پیدا کرنے کے لیے جو اس کے تفنۂ صحرائی جواری کیفیات سے زیادہ رفیع اور پیچیدہ تھے ہر وقت مستعد تھا۔ اس وقت عربوں نے اپنے مفتوحین کی ترقی یافتہ معاشرت سے نہ صرف مادی منفعت اور عیش و عشرت کا مذاق حاصل کیا بلکہ انھوں نے پرانے تمدن کے

---

[1] رسالت منجانب اللہ اور الوہیت کو خلط مبحث نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ ان دونوں کے امتیاز کو بخوبی پیش نظر رکھنا چاہیے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے صرف یہی نہ کیا کہ الوہیت کا دعویٰ نہ کیا بلکہ ایسے صفات سے بالکل انکار کیا جو خالصۃً اللہ سے منسوب ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ان انبیائے ملہم من اللہ کا خاتم ظاہر فرماتے تھے جن کا سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ علیہم السلام سے ہو کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تک پہنچا تھا۔ اور آخرین و کاملترین رسول اپنے آپ کو بتاتے تھے۔ مصنف

فنون لطیفہ اور علوم وخیالات کی بھی قدر کی ۔ اِن جدید تحریکات کا نتیجہ قابل تعریف تمدنی اور دماغی گلکاری تھا ۔ جس پر عربی تہذیب کو ناز ہے ۔ کچھ عرصہ تک آزاد خیالی کا نسبتاً دور رہا ۔ اور اِس عرصہ میں جدید خیالات اور دلیرانہ تصورات کے خزاین جمع ہو گئے ۔ یہ کام تنہا عربوں کا نہ تھا بلکہ اِس میں نصرانی یہودی اور ایرانی مفتوحین بھی شریک تھے ۔ اِن میں سے اکثر پہلے ملاحدہ میں شمار کئے جاتے تھے اور ظالمانہ بیزنطینی راسخ الاعتقادی اور مجوسیت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے رہ چکے تھے ۔

رفتہ رفتہ یہ روشن خیالی کا زمانہ گزر گیا ۔ مخالف قوتیں پیدا ہو کر مستحکم ہو گئیں ۔ آزاد خیال طبقہ جو عام طور پر معتزلہ کے نام سے پکارا جاتا تھا ابتدائی اسلام کے سادہ عقائد دین کا اتباع کرتے ہوئے اِس کا مدعی تھا کہ ہر چیز کو عقل کے معیار پر جانچنا چاہیئے ۔ بر عکس اِس کے قدامت پسند طبقہ اسناد اور تقلید کو معیار قرار دیتا تھا ۔ اِن میں سے اکثر نومسلموں نے جو بیزنطینی راسخ الاعتقادی کی روایات سے متاثر تھے قرآن شریف کی بڑی بڑی تفاسیر لکھیں اور احادیث نبوی کی جو صحابہ اور تابعین سے منقول تھیں تدوین و تعبیر کی ۔ ان سرگرمیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ کچھ ہی عرصہ میں بتدریج ایسا اسلامی فقہ اور روحی فلسفہ پیدا ہو گیا جو زمانہ وسطےٰ کی مغربی نصرانیت کی طرح شدید و پیچیدہ اور متحکمانہ تھا ۔

معقول ومنقول کا جھگڑا قدرتی طور پر تلخ اور طویل تھا نتیجہ پہلے ہی سے معلوم تھا ۔ معقول پر فتح پانے میں ہر چیز نے منقول کی امداد کی ۔ مشرق کی کل تاریخی روایات جو زیادہ تر قومی اور مقامی میلان سے پیدا ہوئی تھیں قدامت کے موافق تھیں ۔ صحرائی آزادروی کے

سیلاب نے اس روایت کو کچھ عرصہ کے لئے روک دیا تھا۔ لیکن قدیم میلان طبع نے پھر فوراً اپنا سکہ جمانا شروع کیا۔ اور چونکہ خلافت عقدائی جمہوریت سے خود مختار سلطنت میں مبدل ہوئی لہذا اس سیاسی تبدیلی سے اس تباہ کن روایت کا زور بڑھ گیا۔

میدان حکمرانی میں مطلق العنانی نے فتح حاصل کی اس سے دیگر اصناف میں بھی بالآخر کامیابی یقینی ہوگئی۔ جس طرح خود مختار حکومت میں آزادی عمل پسندیدہ نہیں ہے اسی طرح آزادی خیال کی رواداری عرصہ تک نہیں ہوسکتی۔ چونکہ خلفاء بنوامیہ دنیادار تھے آزاد خیالی اُن کے قلوب کو پسندیدہ معلوم ہوتی تھی۔ لہذا خلفاء دمشق نے قلیل عرصہ کے لئے معتزلی عقائد سے دلچسپی ظاہر کی۔ لیکن اُنھیں بہت جلد معلوم ہوگیا کہ ان عقائد میں سیاسی آزادی بھی مضمر ہے۔ فرقہ معتزلہ نے اپنی جد وجہد کو صرف خالص

سلہ ارتقاء انسانی پر بالعموم اور تاریخ مشرق پر بالخصوص جو ماحول اور توریث کا اثر پڑتا ہے وہ بہت اہم ہے لیکن ایسے مختصر رسالہ میں اسپر بحث نہیں کی جاسکتی۔ پروفیسر ایلسورتھ ہنٹنگٹن نے آب وہوا اور جواری کیفیات کے اثرات کے بارے اپنی متعدد تصانیف میں خوب بحث کی ہے۔ مثلاً "ایشیا کی نبض" مطبوعہ بالٹن ۱۹۰۷ء اور "تمدن آب وہوا" مطبوعہ یال یونیورسٹی پریس ۱۹۱۵ء اور "دنیوی قوت اور ارتقاء" مطبوعہ یال یونیورسٹی پریس ۱۹۱۹ء نبر ملاحظہ ہو۔ ارمنس وامبیری کی کتاب "اسلام انیسویں صدی میں یعنی تاریخ تمدن کا مطالعہ" باب سوم مطبوعہ لپنرگ ۱۸۷۵ء۔ مشرقی تاریخ میں قومی اثرات کے اجمالی حالات کے لئے ملاحظہ ہو میڈیسن گرانٹ کی کتاب "نسل عظیم کا انتقال" مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۶ء۔ مصنف

فلسفیانہ تصورات کے دائرہ میں محدود نہیں رکھا - بلکہ انھوں نے زیادہ پرخطر میدان میں قدم بڑھایا - معتزلہ واعظین نے مکہ کی جمہوری خلافت کے زمانے کی یاد دلائی جبکہ امیر المومنین بجائے پشتینی بادشاہ کے جمہور کا انتخاب کردہ اور رائے عامہ کا پابند ہوتا تھا - بعض دلیر طبائع نے خوارج جیسے وسط عرب کے تند و سرگرم فرقوں سے سلسلہ ارتباط قایم کیا - یہہ خوارج قدیم صحرائی آزادی کے حامی تھے - اور شخصی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے تھے - بلکہ جمہوریت کے رفیع اصول کا اعلان کرتے تھے -

نتیجہ یہ ہوا کہ خلفا و آزاد خیال فرقے کے مخالف ہو کر قدامت پسند فقہا کی طرف اسی طرح مائل ہو گئے . . . . جس طرح کہ وہ شاہی پسند مولد العرب کو سرکش پاک نژاد صحرائی عرب پر ترجیح دیتے تھے - بنی عباس کے دور میں سلطنت قدامت پسندی کی علانیہ حامی ہو گئے - قدیم راسخ الاعتقادی کا علم بلند کیا گیا - اور معتزلین کو مقہور اور قتل کیا گیا - یہاں تک کہ بارہویں صدی عیسوی میں عربی حریت کے آخری نقش پا کو مٹا دیا گیا - اسلامی تخیل کے قواعد منضبط کر دئے گئے - تجدید کی سرگرمیاں سرد ہو گئیں معتزلہ فقہا کی یاد بھی جاتی رہی - اسلامی وسعت خیال کا خاتمہ ہو گیا - اور یہ تنگ نظری ہمارے زمانہ تک قایم رہی -

گیارہویں صدی کے اوایل میں عربی تمدن کا انحطاط ایسا واضح ہو گیا تھا کہ انقلاب کا تموج ہوا میں ظاہر تھا - چونکہ جدید عرب اپنی اصلی قوت کو ضائع کر چکے تھے - لہذا انہیں مجبوراً اپنی سیاسی قوت کو دوسرے کے ہاتھوں میں جاتے دیکھنا پڑا - جدید عرب کے سیاسی جانشین ترک ہوئے - یہ ترک ان خانہ بدوش اقوام کے مغربی شعبے تھے جو زمانہ قدیم سے مشرقی و وسطی

ایشیار کے مرغزاروں میں گھومتے رہتے تھے - اور من حیث الجمعیت
ارالو آلتک یا تورانی کہلاتے تھے آغاز فتح ایران سے عربوں کو ترکی
خانہ بدوشوں سے سابقہ پڑا - ترکوں کے متواتر حملے شمالی مغربی گوشہ
فارس پر مسلمان سرداروں کو روکنے پڑے - خلافت کے زریں عہد میں
ترکوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا - بلکہ اصلاً وہ کار آمد ثابت ہوئے - چونکہ
ترک غبی اور تنگ نظر تھے - لہٰذا وہ دو کام نہایت عمدہ کر سکتے تھے یعنی
تعمیل حکم اور جنگ - بالفاظ دیگر وہ نہایت اچھے پیشہ ور سپاہی تھے - خلفاء
اُن سے بہت خوش تھے - اور اپنی افواج اور باڈی گارڈ کے لئے اُنہیں کو
بھرتی کرتے تھے -

جب تک خلافت میں قوت رہی تب تک حالات درست رہے -
لیکن جب اس میں کمزوریاں نمودار ہوئیں حالت بالکل برعکس ہوگئی - ترکی
تنخواہ دار ترقی کرکے ہر عہدہ اقتدار پر پہونچ گئے - اور آقا کا کام کرنے
لگے - مشرقی سرحدوں کے دروازہ کھول دے اور اپنے ہموطنوں کے انبوہ
داخل کرلئے - یہہ انبوہ منفرداً نہیں آئے - بلکہ قبایل میں اپنے موروثی سرداروں
کے ساتھ آئے اور اپنی مرضی کے موافق اودھر اُودھر گھومنے لگے - اِن قبایل کا
جہاں جی چاہتا تھا مقامی اشخاص کو لوٹ مار کر نکال دیتے اور خود بس جاتے
تھے -

ترکوں نے بہت جلد اپنے قدیم مذہب کو چھوڑ کر دین اسلام قبول
کرلیا - لیکن اسلام نے ترکوں کے طبائع میں کوئی تبدیلی نہیں کی - اِن نوآمدہ
اتراک کا اندازہ کرنے کے لئے ہم کو یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ وہ آجکل کے
قسطنطنیہ یا ایشیاء کوچک کے عثمانی ترکوں کے مشابہ تھے - موجودہ عثمانی ترک

یورپ اور مشرق اوسط کی نسلوں سے بہت مخلوط ہوگئے ہیں۔ اور مغربی و عربی تمدن میں ایسے رنگ گئے ہیں کہ وہ اپنے تو آبا و اجداد سے بالکل مختلف ہیں۔ آج بھی عثمانی ترک ان ناپسندیدہ تورانی خصایل کا کافی اظہار کرتے ہیں۔ جو ایشیاء وسطےٰ کے اُن غیر ترتیب یافتہ ترکوں کے خصوصیات ہیں جنھیں ترکمان اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی مغربی اخوان عثمانی ترکوں سے ممیز ہو جائیں۔

سوال یہ ہے کہ ترکوں کے ابتدائی خصائل کیا تھے۔ اول اور سب سے مقدم اُن کی خصلت پیشہ ور سپاہی کی تھی۔ تعمیل حکم اُن کا فرض اولین تھا۔ جدت تخیل سے معرا۔ اور بدرجہ اقل متفحص تھے۔ ترکوں کے غبی دماغ میں خیال بہت کم پیدا ہوتے تھے۔ اور اگر کوئی خیال ذہن نشین ہو جاتا تھا تو وہ اُس کو فوجی احکام کی طرح مانتے۔ بلا کسی چون و چرا کے تعمیل کرتے اور بلا غور و خوض کے اتباع کرتے تھے۔ جب عرب کے مرتعش ہاتھوں سے عنانِ حکومت چھوٹی تو امارت ایسی قوم کے پنجۂ اطبین میں آئی۔

اسلام اور کل دنیا کے لئے اس سے زیادہ اور کوئی مصیبت نہیں ہوسکتی تھی۔ اسلام کے لئے اس اعتبار سے کہ عنان حکومت[1] ایک غبی متعصب کے ہاتھ میں

---

[1] ترکوں کو عام طور پر مغربی اقوام اور مصنفین نے بلا کسی وجہ خاص کے غبی اور متعصب فرض کر لیا ہے۔ میں شق دوم کو پہلے لیتا ہوں۔ میدان مصاف اور اس کے بعد کو واقعات اس خصوصیت کے اطلاق کے لئے ناکافی ہیں۔ ورنہ کوئی قوم بھی اس خصلت ذمیمہ سے پاک نہیں مل سکتی۔ دیکھنا یہ ہے کہ ترکوں نے اپنے محکوم غیر مسلم اقوام سے امن و امان کے زمانہ میں کیا برتاؤ کیا۔ مغرب کی متمدن اقوام نے اپنے مستعمرات میں (بقیہ صفحہ ۲۴)

آئی - جس کے زمانہ میں روشن خیالی کی ترقی ناممکن ہو گئی - بلا شبہ اسلام نے

(بقیہ صفحہ ۲۳) کبھی بھی اقوام غیر کو ایسے حقوق و مراعات و مناصب نہیں دئے جیسا کہ ترکی نے اس مسئلہ میں اپنی عالی حوصلگی کا اظہار کیا ہو - آرمینیا یا دیگر مسیحی اقوام محکومہ کے جو قصص روزانہ اخباروں میں نظر آتے ہیں اس کے ذمہ دار مغربی تہذیب ہی - جسنے مختص قومی تفریق کو بہترین نظام مان رکھا ہی - اگرچہ اسکا نسل سے کوئی تعلق نہیں ہی لیکن یہ اُن کے قلوب میں ایسی راسخ ہو گئی ہی کہ طبیعت ثانیہ بنگئی ہی - مشرقی اقوام جو پستی اور انحطاط میں مبتلا تھیں مغرب کو اپنا رہبر کامل سمجھکر ہر امر میں اِس کا اتباع کرنے لگیں ہیں - چنانچہ ترکی کی عیسائی اقوام بھی بجائے اِس کے کہ وہ اپنے آپ کو سلطنت کا جزو سمجھتیں بالکل متنفر رہیں اور بطور خود اپنی قومیت کے گیت الاپنے لگیں - اِس نوائے بے ہنگام کو دول یوروپ نے اور بلند کر دیا - ورنہ سلطنت کا معمولاً سلوک غیر مسلم اقوام سے قابل ستایش ہی - اور اسی سال کے اوایل میں جو خطوط مسلم ورلڈ میں ایک انگریزی سپاہی کیطرف سے شائع ہوئے ہیں اسپر شاہد ہیں - یوروپی موخین کی رائے حسب ذیل ہی -

ڈریپر اپنی مشہور تصنیف ہسٹری آف دی کانفلکٹ بٹوین ریلیجن اینڈ سائنس میں لکھتا ہی کہ انصاف و عدالت اور مذہبی بے تعصبی میں اپنے عہد کے تمام عیسائی دنیا پر ترکوں کو وہی فوقیت رہی ہی جو چھٹی صدی عیسوی میں عربوں کو تنزل یافتہ بیزنطاین کے مقابلہ میں تمام یورپ پر حاصل تھی - ایڈورڈ کریسی نے تاریخ روم میں ترکونکو تہذیب تمدن اور علمی ایجادات اور اختراعات کے لحاظ سے پندرہویں اور سولہویں صدی کے تمام یوروپ میں سب سے برتر قوم تسلیم کیا ہی وہ کہتا ہی کہ انسائیکلوپیڈیا کی قسم کی کتابیں لکھنے کا یوروپ میں ترکوں ہی کی تقلید سے رواج ہوا - یوروپ کی زبانوں میں سب سے پہلے انسائیکلوپیڈیا دلا میرٹ نے لکھی لیکن ایک ترک مصنف کلبی بے کی قاموس العلوم ہی کے مطالعہ سے اسکو رہنمائی ملی تھی - کمسریٹ رسدرسانی، فوجی شفاخانونکا باقاعدہ انتظام ترکوں ہی سے یوروپ نے سیکھا قلعہ کی تعمیر میں تمام یوروپ ترکونکا شاگرد ہی - فوجی باجا تمام یوروپ نے ترکون ہی سے حاصل کیا چیچک کے دم کے ٹیکہ کا اصلی موجد ایک ترک تھا مترجم

حربی قوت میں بہت رفعت حاصل کی - لیکن یہ جدید قوت بلا پس وپیش ایسے غیر مناسب طور پر استعمال کی گئی کہ اسکا تباہ کن اثر خود اسلام پر پڑا - ان نو وارد ترکی قبایل کا اولین قابل الذکر کارنامہ فتح ایشیاء کوچک[1] و قبضہ بیت المقدس تھا - یہ دونوں واقعات گیارہویں صدی کے اختتام پر رونما ہوئے - اس وقت تک ایشیاء کوچک مسیحی دنیا کا جزو تھی - ساتویں صدی کا اصلی عرب سیلاب فتح شام کے بعد کوہ طارس پر رک گیا - مشرقی سلطنت نے اپنی حالت سنبھال لی تھی اگرچہ سرحد پر اکثر ہنگامہ ہوا کئے - لیکن عربی و مشرقی سرحد بدستور قایم رہی - مگر اب ترکوں نے اس حدّ فاصل کو توڑ کر ایشیاء کوچک کو فتح کر لیا - اور مسیحی مشرقی جائے پناہ یعنی قسطنطنیہ بھی خطرہ میں پڑ گیا - بیت المقدس کو ۶۳۷ء میں بلا شبہہ عربوں نے فتح کر لیا تھا اور وہ مسلمانوں ہی کے قبضہ میں تھا - لیکن خلیفہ دوم حضرت عمرؓ نے عیسائی مقامات مقدسہ کی نہایت احتیاط سے حرمت کی اور اُن کے جانشینوں نے نہ مقامی نصرانیوں کو آزار پہونچایا اور نہ زائرین کے ساتھ کوئی بدسلوکی کی جو مسیحی دنیا کے ہر گوشہ سے دوامًا بیت المقدس میں آتے تھے - ترکوں نے یہ سب کچھ لوٹ دیا - غارتگری کے طامع اور کفار سے متعصبانہ طور پر متنفر ترکوں نے مقامات مقدسہ کو تباہ کر کے نصرانیوں پر ظلم کیا - اور زیارت کرنا ناممکن کر دیا -

یہ دونوں مصایب جو نصرانی دنیا پر ایک ساتھ ٹوٹے سخت ہولناک تھے عیسائی مغرب جو اس وقت اپنے مذہبی جوش کے انتہا پر تھا خوف و غیظ سے

---

[1] ۱۰۷۱ء میں مشرقی سلطنت کی افواج منزیکرٹ کی جنگ عظیم میں تباہ ہونے کے بعد ترکوں نے ایشیاء کوچک پر تاخت کی - اور ۱۰۷۶ء میں بیت المقدس پر قبضہ کر لیا - مصنف ۲ و ۳ کا نوٹ صفحہ ۲۶ پر

کانپنے لگا۔ پیٹر راہب جیسے بے شمار فدائیانِ مذہب نے تمام یورپ کو جنون کے درجہ تک مشتعل کر دیا۔ دیوانگی کا حاصل دیوانگی ہے۔ اِن غیر معمولی جنگوں میں جو جنگ صلیبی کہلاتی ہیں شرکت کرنے کے لئے نصرانی مجاہدین کا سیلاب ممالک مغرب سے اسلامی ارض مشرق میں امنڈ آیا۔ ترکون کے اسلامی فتوحات اور اس کا طوفانی جواب حروب[۱] صلیبی دنیا کے لئے سب سے بڑے مصائب تھے۔ انھوں نے مشرق و مغرب کے روابط کو بالاستقلال درہم و برہم کر ڈالا۔ سنہ ۱۰۰۰ء میں عیسائی اور مسلمانوں کے تعلقات اچھے خاصے تھے اور اِس میں ترقی کے آثار نمایاں تھے۔ اسلام کے اولین سیلاب سے جو نفرت پیدا ہوئی تھی وہ زایل ہو رہی تھی۔ اور نصرانیت کے حدود مستقل ہو چکے تھے۔ کسی فریق کو دوسرے فریق کی آراضی پر مداخلت کی خواہش نہ تھی۔ دراصل جس ملک کے متعلق نزاع تھا وہ اسپین تھا یہاں مسلمان اور عیسائی متواتر دست و گریباں رہتے تھے۔ باایںہمہ اسپین کے واقعات فریقین میں سرحدی تنازعات سے زاید وقعت نہ رکھتے تھے۔ فی الجملہ اسلام اور نصرانیت کے مراسم باہمی اِس زمانے میں دوستانہ روابط کی شکل اختیار کرتے جاتے تھے

اگر روابط دوستانہ اسی روش پر قایم رہتے تو بنی نوع انسان کی ترقی نہایت ہی اہم نتایج پر منتج ہوتی۔ اِس زمانہ میں اگرچہ دنیا، اسلام علم و تمدن میں مغربی

---

[۱] صفحہ ۲۶ حروب صلیبی اُن لڑائیوں کا نام ہے جن کے نبرد آزما تیغوں کی جگہ صلیب کے نشان اپنے سینوں پر لگاتے تھے اور اس مذہبی تمغے کی بدولت اپنے آپ کو ارض مقدس اور روضۂ مسیح کو غیر مذہب والوں سے چھین لینے کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ اس مہم کا خیال دوراندیش پاپاؤں اور پرجوش مسیحیوں کے دل میں عرصہ سے چلا آتا تھا لیکن اس کا عملی اظہار ۱۰۹۵ء میں ہوا۔ یہ سلسلہ نو جنگ پر سنہ ۱۲۹۱ء میں ختم ہوا۔ ان میں سب سے اہم تیسری حرب صلیبی تھی جس میں سلطان صلاح الدین کی شخصیت سب سے نمایاں ہے۔ مترجم

یورپ سے بہت آگے تھی لیکن عربی تہذیب میں جمود آجاتا تھا اور مغربی نصرانیت
باوجود اپنی جہالت ناشایستگی اور بربریت کے شباب زندگی سے معمور اور بظاہر
بہتر امور کی مشتاق تھی۔ اگر مشرق و مغرب کے دوستانہ تعلقات جو گیارہویں
صدی میں پیدا ہو چکے تھے بڑہتے رہتے تو دونوں کو بڑا فائدہ ہوتا۔ مغرب میں
عربی تہذیب کا اثر جس میں یونان و روم کے پُرانے علوم شامل تھے ہماری نشأۃ ثانیہ
کو بہت پہلے بیدار کر دیتا۔ اور مشرق میں ازمنہ متوسط کے مغرب کا اثر جس میں لاانتہا
قوتیں بھری ہوئی تھیں اسلامی تہذیب کو انحطاط کے مرض سے بچا لیتا جو آہستہ
آہستہ بڑھ رہا تھا۔

لیکن تقدیر الٰہی یوں نہ تھی۔ دنیائے اسلام میں مہذب اور سلیم الطبع
عرب کی جگہ متعصب اور بے رحم ترک کو ملی تھی۔ اسلامی حملے پھر شروع ہو گئے۔
لیکن اس بار[۱] کسی نصب العین کے حصول کے لئے نہیں تھے۔ بلکہ محض خونخواری

---

[۱] مشرقی سلطنت پر حملے تو ہمیشہ ہی ہوتے رہے۔ اسلام سے قبل ایرانی بادشاہوں سے مسلسل اور متواتر
لڑائیاں ہوتی رہیں۔ اور جب مسلمانوں نے ایران کو فتح کر لیا تو خلفائے بنی امیّہ اور بنی عباس دونوں سے وقتاً فوقتاً
جنگ و جدال ہوتے رہے۔ جب بنی عباس پر زوال آیا اور زمام اختیار سلجوقیوں کے ہاتھ میں آئی تو بھی پہلے کی ایسی لڑائیاں ہوئیں لیکن
اس زمانے میں مشرقی سلطنت کی کمزوری اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ خود رعایا نے حملہ آوروں کا ساتھ دیا۔ چنانچہ عیسائی مؤرخین
خود لکھتے ہیں کہ سلجوقیوں کو اپنی تاخت و تاراج میں شہنشاہ کی رعیت سے بیحد مدد ملی۔ رعایا کی بے اطمینانی کے اسباب متعدد و حق بجانب
تھے سلطنت اور پیشوایان دین دونوں کے مظالم و انحصال بالجبر نے ہزارہا اشخاص کے قلوب کو پھیر دیا تھا اور زمین کی ملکیت
چند اشخاص میں محدود ہو جانے سے آبادی بہت کم ہو گئی تھی۔ دراصل سلجوقیوں اور مسیحیوں کی جنگ بھی محض
نزاعات سرحدی کی حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن مشرقی سلطنت کے ضعف و مظالم نے انکو آسانی فاتح بنا دیا۔
جس میں نہ غارتگری اور نہ ظلم محرک تھے۔ (مترجم)

غارت گری اور تباہی کے لئے تھے۔ اس وقت سے یورپ کے امکانی تمدن اور بیرحمانہ مایوس کن جہالت میں دست بدست لڑائی شروع ہوگئی۔ مزید براں یہ تقدیر الٰہی تھی کہ یہ جنگ صدیوں تک رہی۔ حروب صلیبی ان حملوں کا جواب تھیں جو عیسائیت پر ترکوں نے چھ سو سال تک کئے اور بالآخر وائنا[1] کی دیواروں کے نیچے ۱۶۸۳ء میں ختم ہوئے لازمی طور پر ان صدیوں کی ظالمانہ لڑائیوں سے تنفر اور تعصب پیدا ہوگیا۔ جس سے آج بھی اسلامی اور نصرانی تعلقات ناخوشگوار ہیں۔ مصطفےٰ کمال کے ترکی قوم پرستوں کے یونانیوں پر اور یونانی افواج کے ایشیائے کوچک میں مظالم جو ہم اپنے صبح کے اخباروں میں پڑھتے ہیں اُن باہمی ظلموں کا تتمہ ہیں جو ترک اور کروسیڈر ایک دوسرے کے ساتھ آٹھ سو سال ہوئے ارض مقدس میں کرتے تھے۔

ہماری اس کتاب کو ترکوں اور نصرانیوں کی ان پرانی لڑائیوں کی تفاصیل سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے ان لڑائیوں کا تذکرہ صرف مشرق و مغرب کے قدیم حجاب کی حیثیت سے کیا جاتا ہو۔ اسلامی مشرق جسمیں عربی تہذیب

---

[1] محاصرہ وائنا کا بانی محض وزیر اعظم قرا مصطفےٰ پاشا تھا جو اسکا متمنی تھا کہ ڈینوب اور راین کے کل ارض کو فتح کرکے ایک ترکی صوبہ قایم کرے اور خود اسکا دراصل شاہ بنجائے۔ غالباً کسی وزیر نے اپنے ملک کو ایسا نقصان نہیں پہونچایا جیسا کہ قرا مصطفےٰ نے جب ترکی افواج جو تقریباً ۲ لاکھ تہیں وائنا کے قریب پہونچیں تو قیصر نے دارالسلطنت کو خالی کردیا لیکن جرمن صوبجات اور پولینڈ سے کمک آئی اور ترکی فوج نے اپنی کیمپ تک کے کوئی حفاظت نہ کی تھی کہ تین طرف سے حملہ ہوا اور سخت ہزیمت واقع ہوئی ترک نہایت پریشانی میں روبفرار ہوئے اور بڑی غنیمت اعدا کو نصیب ہوئی اس شکست سے ترکوں کا اقتدار بالکل متزلزل ہوگیا۔ (مترجم)۔

روبہ انحطاط تھی ترکی بے رحم حکومت کا مطیع ہو گیا۔ اور مزید ہولناک مصائب کا منتظر تھا۔ یہ مصائب بھی اصلاً تورانیوں کے ہاتھوں ہوئے[۱]۔ بارہویں صدی کے اختتام پر تورانی اقوام کے مشرقی شعبے عارضی طور پر چنگیز خاں کی سرکردگی میں متحد ہو گئے۔ اس وحشی نے اپنا منحوس خطاب "ائل" رکھا۔ اور دنیا کو لوٹنے کے لئے چل کھڑا ہوا۔ اس نے پہلے شمالی چین پر تاخت کر کے اُسے بڑی طرح غارت کیا۔ پھر اُس نے اپنا تباہ کن رُخ مغرب کی طرف کیا۔ اس خوفناک مغل نے اسطرح عروج حاصل کیا۔ کہ اس کا نام مہذب دنیا کے دماغ میں آج بھی عفونت پیدا کر دیتا ہی۔ چنگیز خاں اپنے ساتھ ہوشیار چینی دستکار رکھتا اور بارود سے قلعوں کو اڑاتا تھا

---

[۱] پہلا حملہ تورانیوں کا بسرکردگی چنگیز خاں ہوا۔ اولاً اسنے محمد شاہ خوارزم سے صلح کی اور تباد لہ تجارت ہوا۔ لیکن اس کا ایک سفیر مارا گیا اور اُس نے معاوضہ طلب کیا۔ شاہ موصوف نے انکار کیا۔ جسکا نتیجہ خوارزمی شاہی کی تباہی ہوا۔ اور محمد شاہ بحیرہ خزر کے کنارے بے یارو مددگار مرا۔ محمد شاہ کا لڑکا جلال الدین بھی تباہ حال رہا۔ اور بالآخر یکہ و تنہا دریائے سندھ کو عبور کر کے ہندوستان میں پناہ گزیں ہوا۔

دوسرا حملہ منگو خاں کے عہد میں ہوا۔ اسنے ایران میں طوائف الملوکی کا حال سُنکر اپنے بھائی ہلاکو خاں کو نظم و نسق کیلئے بھیجا چونکہ اس بدنظمی کا سبب فرقہ باطنیہ تھا لہٰذا یہ بھی حکم تھا کہ امام فرقہ رکن الدین کا استیصال کیا جائے۔ مغلوں کے خوف سے رکن الدین نے صلح و آشتی کے پیام بھیجے۔ اور عارضی صلح اس شرط پر ہو بھی گئی کہ پچاس قلعہ مسمار کر دیئے جائیں۔ قلعوں کے مسمار ہونیکے بعد مغلوں نے حملہ کر دیا۔ اور مرد و عورت بچے بوڑھے سب کو تہ تیغ کر کے اِس فرقہ کا نام و نشان مٹا دیا۔ اسکے بعد ہلاکو خاں نے بغداد کی طرف رُخ کیا۔ قلعہ کے سامنے پہونچکر اسنے ہتیار و روپے کا مطالبہ کیا۔ انکاری جواب ملنے پر محاصرہ شروع ہوا۔ تو خلیفہ نے اپنے آپکو حوالے کر کے دروازے کھول دیئے۔ ۵ا۔ فروری ۱۲۶۳ء کو فاتح افواج نے داخل شہر ہو کر قتل و غارتگری شروع کر دی۔ سات دن قتل عام کا دور رہا۔ کہا جاتا ہے آٹھ لاکھ نفوس تہ تیغ ہوئے (مترجم)

اوراس کے رسالے ہر جگہ پر اٹل ثابت ہوئے - اِن مغلوں کا شمار دنیا کے خونخوار
ترین وحشیوں میں ہے۔ اِن کی فتوحات کا نہ تو یہ مطلب تھا کہ وہ اپنی مفتوحہ
ممالک میں آباد ہو جائیں - یا صرف لوٹ مار کریں بلکہ اِن کے دل میں زیادہ تر ایک
شیطانی خواہش خونریزی اور غارتگری کی تھی - کل آبادیوں کے ذبح کر ڈالنے شہروں
کے مسمار کرنے اور زراعت کے تباہ کرنے میں اُن کو لطف آتا تھا - اس کے بعد
وہ نئی جگہ پر چلے جاتے تھے چنگیز خاں جب مغرب کی طرف بڑھا اس کے چند سال
بعد وہ مرگیا - لیکن اس کے جانشینوں نے اس کام کو اسی سرگرمی سے جاری
رکھا نصرانیت اور اسلام دونوں دبائے مغلیہ میں مبتلا تھے - کل مشرقی یورپ تباہ
ہو کر غیر مہذب ہو گیا تھا - روسیوں میں مغلیہ نقش پا کا اثر آج بھی نظر آتا ہے - نصرانیت
کے آلام اسلامی مصائب کے مقابلہ میں ہیچ تھے - مغل حملے پولینڈ سے آگے نہ بڑھے -
اور مغربی یورپ جو مغربی تہذیب کا گہوارہ تھا اس سے محفوظ رہا - اسلام کی حالت دگرگوں
تھی - مغلیہ افواج شمالی مغربی گوشہ سے داخل ہوئیں - اور کل اسلامی دنیا پر یعنی
ہندوستان سے لیکر مصر تک طوفان کی طرح پھیل کر لوٹ مار اور قتل و غارتگری
کرتی چلی گئیں - ازمنہ متوسط کا خوشگوار ایرانی تمدن ترکی تکالیف سے چھوٹ کر تازہ
زندگی کے لئے کوشش کر رہا تھا - لیکن مغلوں نے اسے پامال کر دیا - اس کے بعد
مغل اسلامی تمدن کے مرکز یعنی بغداد کی طرف بڑھے بغداد کے دورِ ہارون الرشید
کی شوکت اور لاکھوں کی وضعی آبادی میں انحطاط ہو گیا تھا تاہم یہ ایک بڑا شہر اور
دارالخلافۃ اور عربی تمدن کا مسلمہ مرکز تھا - ۱۲۵۸ء میں مغلوں نے حملہ کر کے اُس پر قبضہ
کرلیا - اس کی کل آبادی کو قتل کر ڈالا - بغداد کو صفحہ زمین سے مٹا دیا - یہ مصیبت
کی انتہا نہ تھی - بغداد جزیرۃ العرب کا دارالسلطنت تھا - یہ دریاؤں کے درمیانی
زمین ابتداءِ تاریخ سے دلدلوں اور ریگستانوں سے نکالی گئی تھی - اور اُن نیم فراموش

شدہ قوموں کے استقلال کا نتیجہ تھی جن کی لاانتہا مساعی سے ایک عجیب سلسلۂ آبپاشی کا تعمیر ہوا تھا جس نے عراق کو سدابہار باغ اور دنیا کے لئے غلّے کی منڈی بنا دیا تھا۔ صدیاں گزر گئیں اور عراق میں مختلف دور ہوئے۔ لیکن اِن سب فاتحین نے اِن آبپاشی کے انتظامات کو نہ صرف قدر کی نظروں سے دیکھا بلکہ اِس کے استقامت میں ہر طرح سے کوشش کی تھی۔ یہی ذرائع آبپاشی ساری شادابی کا مخرج تھے۔ مغلوں نے دیدہ و دانستہ باقاعدہ طور سے انھیں تباہ کر ڈالا۔ آہ! دنیا کا سب سے قدیم تمدن اور اُس کے ساتھ ہی انسانی تہذیب کا گھوارہ بڑے طور پر تباہ ہو گیا۔ آٹھ ہزار سال کے مسلسل انسانی مساعی کلیتاً برباد ہو گئے۔ جزیرۃ العرب کی زمین ایک مضر صحت دلدل بن گئی۔ اور اسی حالت میں آج تک ہے۔ خشک سالی کے زمانے میں یہ زمین تپتی ہے اور دریا کے سیلاب کے اوقات میں ترائی ہو جاتی ہے۔ اِس میں چند مخلوط النسل فلاحین کچے جھونپڑوں میں رہتے اور اُن خانہ بدوش بدویوں سے ڈرتے ہیں جو اپنے اونٹ اُس آراضی پر چراتے ہیں جو سابق میں مزروعہ تھی۔

عربی تہذیب کو خصوصاً مشرق میں زوال بغداد سے سخت صدمہ پہونچا۔ اس تاتاری فتنہ سے قبل اس کو ایک مہلک صدمہ مغرب میں پہنچ چکا تھا اسلام نے قرون اولیٰ میں شمالی افریقہ کے پار اسپین میں انتہائی عروج و استحکام حاصل کیا تھا حتےٰ کہ اسپینی مسلمان تمدن کے اعتبار سے مشرقی مسلمان کے پہلو بہ پہلو تھا۔ اسپین میں اسلامی دارالسلطنۃ قرطبہ تھا اور یہی مغربی دارالخلافۃ بھی تھا۔ یہ ایک بہت بڑا شہر اور غالباً بغداد سے بھی زیادہ حیرت انگیز تھا صدیوں تک ہسپانی اسلام نصرانیوں کو شمال کوہستانی ممالک میں محصور رکھ کر با موں رہا۔ جب سے ہی عربی قوت کا انحطاط ہوا عیسائیوں نے

مسلمانوں کو جنوب کی طرف دبانا شروع کیا۔ ۱۲۱۳ء میں ہسپانی اسلامی طاقت جنگ لاس نواس دی طلوسہ میں شکست کھاکر پارہ پارہ ہوگئی۔ اب فاتح نصرانیوں کو صرف ٹکڑوں کا چن لینا باقی رہا۔ خود قرطبہ بہت جلد نکل گیا۔ اور اسکے ساتھ ہی اسپین کے اسلامی شوکت بھی روانہ ہوگئی۔ ان متعصب ہسپانوی عیسائیوں نے عربی تہذیب کو اُسی طرح بیخ و بُن سے اکھیڑا جیسا کہ اس زمانہ میں لامذہب متعل کر رہے تھے۔ بلاشبہہ اسپین کے باقی ماندہ مسلمان بالکل جنوب میں غرناطہ پر مقاومت کرتے رہے۔ اور یہ مقاومت اس وقت تک قایم رہی کہ کولمبس نے امریکہ کو دریافت کیا۔ لیکن یہ مقاومت صرف آخری سانس تھی ورنہ مغربی عربی تہذیب کا حقیقت میں تو اس سے پہلے ہی خاتمہ ہوچکا تھا۔

اس اثنا میں اسلامی مشرق کا مغلیہ فتنہ سے خوں ہو رہا تھا۔ مغلیہ حملہ آوروں کی لہر پر لہر آرہی تھی۔ آخری قابل الذکر حملہ مشہور "بدنام" تیمورلنگ کا پندرہویں صدی کے آغاز میں تھا۔ اس زمانہ تک مغربی منلوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ لیکن اس سے اُن کے رویہ پر کوئی اثر نہ پڑا تھا۔ اس امر کے اظہار کے لئے کہ تیمورلنگ اپنے جد کا خلف الرشید تھا یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ انسانی سروں کا منارہ بنانا اسکا مشغلہ تھا۔ اور سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ ستر ہزار سروں کا منارہ فارس کے شہر اصفہان کی فتح پر بنایا گیا تھا۔ مغلیہ حملوں کے بند ہونے پر تباہ اور برباد شدہ اسلامی مشرق عثمانی ترکوں کے زیر حکومت آیا۔

عثمانی ترک یا آل عثمان اصلاً ان ترکی قبایل میں سے تھے جو سلجوقی سلطنت کے زوال کے بعد ایشیاے کوچک میں داخل ہوے۔ ان میں چونکہ متواتر قابل سلاطین ہوئے لہذا اُنھوں نے عظمت حاصل کرلی۔ اور بتدریج قرب و جوار کے ترکی اقوام کو ملالیا۔ اور اس مستحکم قوت کو مشرق اور مغرب میں پرحوصلہ فتوحات حاصل کرنے کیلئے

استعمال کیا ۱۴۵۳ء میں ال عثمان نے قسطنطنیہ کو فتح کر کے قدیم مشرقی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔
اور ایک صدی کے اندر اسلامی مشرق کو ایران سے مراکش تک فتح کر لیا۔ اُسی زمانہ میں کل خیرہ نما
بلقان کو فتح کر کے ہنگری میں وائنا کی دیواروں تک بڑھ گئے۔ اپنے مغلیہ بھائیوں کے برخلاف
عثمانی ترکوں نے ایک پائدار سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ یہ سلطنت ایک وحشیانہ قسم کی تھی۔ چونکہ ترک
تہذیب کو بہت کم سمجھتے تھے وہ صرف فوجی ترقیوں کے قدردان تھے جنکی انھوں نے پوری قدردانی کی
اور اچھی طرح زمانہ کے قدم بقدم رہے۔ اپنے عروج کے زمانہ میں ترکوں کے پاس سب سے اچھا توپخانہ
اور ثابت قدم پیدل فوج تھی اور یورپ اُنسے ہر وقت خائف تھا۔

اس عرصہ میں یورپ حقیقی ترقی کر رہا تھا۔ اور جبکہ اسلامی مشرق مغلیہ غارتگری اور سپاہیانہ
ترکی فوجی حکومت کے نیچے پست ہو رہا تھا نصرانی مغرب نشاۃ ثانیہ وامریکہ اور ہندوستان کے بحری
راستہ کے دریافت ہونے سے محظوظ ہو رہا تھا۔ ان معلومات کے اثر میں مبالغہ نہیں ہو سکتا۔ پندرہویں
صدی کے آخر میں جب کولمبس اور واسکوڈی گاما نے یہ قابل یادگار سر کئے تو مغربی تمدن
مغربی اور وسطی یورپ کے محدود احاطہ میں بند تھا۔ اور اپنی حفاظت کے لئے تورانی وحشیوں سے
جنگ کر رہا تھا جسمیں کامیابی کی بڑی امید نہ تھی۔ مغل تاتاریوں نے اسکو پامال کر رکھا تھا۔ اور
ترک اپنی جنگی قوت کے شباب میں بہت کامیابی کے ساتھ جنوب و مشرق سے بڑھتے چلے آتے تھے
اور یورپ کے قلب تک کو خطرہ میں ڈال رکھا تھا۔ یہ تورانی وحشی جنکے قبضہ میں ایشیا، شمالی افریقہ،
اور شرقی یورپ تھا۔ ایسے زبردست تھے کہ مغربی تمدن کو اپنی جگہ پر قایم رہنا دشوار تھا۔ حقیقتاً
مغربی تمدن دیوار سے سہارا لئے لڑائی میں مصروف تھا۔ یہ دیوار غیر محدود سمندر تھا۔ ہم مشکل سے سمجھ
سکتے ہیں کہ ہمارے ازمنہ متوسط کے آباؤ اجداد سمندر کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔ اُنکے لئے سمندر
ہاتھ پیر پھیلا دینوالے اور مجبور کن شئی تھی۔ اُسکو وہ تاریکی اور ہول کا مسکن جانتے تھے۔ چونکہ ازمنہ
متوسط کے یورپ کو حملہ آور ایشیا سے مقابلہ کرنا تھا اور کوئی مدد نہیں تھی اسکا توازن میں
کام کرنا تعجب انگیز نہیں۔ مگر چشم زدن میں یہی دریائی دیوار ایک فراخ شاہراہ بن گئی۔ اور یورپ جسکو

راہ گریز نہ تھی دفعتاً مالک بحر اور اِس اعتبار سے مالک دنیا بن گیا۔ انسانی تاریخ میں قسمتوں کے سبب سے بڑی تبدیلی کی صف آرائی وقوع پذیر ہوگئی۔ بجائے اِس کے کہ وہ یاس کی حالت میں خونخوار ایشیائی اقوام کا مقابلہ کریں اور جن پر براہ راست حملہ کر کے فتح پانا ناممکن تھا یورپ والے اپنی مرضی کے مطابق پہلوؤں پر حملہ کر سکتے تھے۔ مزید براں وسائل کا پلہ یورپ کی طرف بھاری ہوگیا۔ کل جدید دنیا پردہ سے باہر ہوگئی۔ جہاں سے یورپ نے بے انتہا دولت پیدا کر کے اپنی اندرونی معاشرت میں نئی روح پھونکی اور ایسی ترقی کا سنگ بنیاد رکھا جو اسکی قدیم ایشیائی حریف پر بہت جلد تفوق حاصل کرنے میں معین ہوا۔ امریکہ اور انڈیز کے مقابلہ میں جامد اسلامی مشرق کے وسایل ہیچ تھے۔ اِس طریقہ پر مغربی تمدن تیزی اور سرگرمی کے ساتھ جلد جلد ترقی کرنے لگا اِس نے ازمنہ متوسطہ کے زنجیروں کو دور کردیا۔ اور سائینس کا طلسم لے کر موجودہ زمانہ کی روشنی میں چل نکلا۔

اِن سب امور کا اسلام پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اسلامی مشرق نے عربی تہذیب کی گدڑی اُوڑھ لی اور پستی میں گرنے لگا۔ اِس کی جنگی قوت بھی بہت جلد غایب ہوگئی۔ کیونکہ ترک عیش میں پڑ گئے اور فنون حرب کی ترقی مسدود ہوگئی۔ کچھ زمانہ تک مغرب اندرونی نزاعات اور آل عثمان کا کارناموں سے مرعوب ہونیکی وجہہ سے مشرق پر حملہ کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ لیکن ۱۶۸۳ء میں ترکوں نے جو بے سوچے سمجھے وائنا پر حملہ کیا اُسمیں اُنھیں تباہ کن شکست دینکے بعد مغرب کو معلوم ہوگیا کہ ترکی سلطنت کمزوری کے انتہائی درجہ کو پہونچگئی ہے۔ اسوقت سے لیکر ترکی سلطنت جسپر بے رحمانہ مغربی حملے متواتر ہوتے رہتے تھے فنا ہونے سے محض اسلئے بچ گئی کہ مغربی سلطنتیں آپس میں رشک وحسد رکھتی تھیں اور ترکی غنایم پر لڑتی تھیں۔

مگر اسلامی دنیا نے بہئیت مجموعی مغربی حملوں کی ضرب کا احساس اونیسویں صدی کے قبل تک نہیں کیا اٹھارہویں صدی کے دوران میں مغرب نے اسلامی صفوف کے

پھلوؤں ہی پر مشرقی یورپ اور انڈیز میں حملہ کیا اسلام کا بڑا حصہ مراکش سے لے کر ایشیاء متوسط تک محفوظ رہا۔ اس وقفہ سے اسلامی دنیا نے کوئی نفع نہیں اُٹھایا۔ خواب غفلت میں مدہوش یورپ کے کفار کو حقیر جاننے والے اور ہر شکست کو قضاء الٰہی ماننے والے مسلمان پرانی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور مغربی خیالات اور مغربی ترقی سے نہ واقف تھے۔ اور نہ واقف ہونے کی کوشش کرتے تھے۔

یہ تھی پست حال دنیاء اسلام۔ جسے انیسویں صدی کے اس یورپ سے مقابلہ کرنا پڑا۔ وہ یورپ جس کی سرگرمیاں صنعتی انقلاب سے بڑھ گئی تھیں اور ان جدید علوم سے مسلح تھا جس کی مثال سابق میں کبھی نہیں ملتی۔ اور جدید اختراعات نے قدرت کے اسرار کو منکشف کر کے اسکے حملہ آور ہاتھ میں ایسے ہتیار دے دئے تھے۔ جو اس سے پہلے خواب وخیال میں بھی نہ آتے تھے۔ نتیجہ ناگزیر تھا۔ ازکار رفتہ اسلامی سلطنتیں مغربی حملوں کے سامنے یکے بعد دیگرے زیر ہوگئیں۔ اور کل اسلامی دنیا بہت جلد یورپی طاقتوں میں تقسیم ہوگئی۔ انگلستان نے ہندوستان و مصر پایا۔ روس نے کوہ قاف کے پار جا کر ایشیا متوسط پر قبضہ کیا۔ فرانس نے شمالی افریقہ کو فتح کیا۔ اور دیگر اقوام یورپ نے اسلامی وراثت کے چھوٹے چھوٹے حصے پائے اِن فتوحات کا آخری درجہ جنگ عظیم میں ظاہر ہوا۔ اس جنگ کے اختتام پر جو صلح نامہ کے شرائط لکھے گئے اُن سے ترکی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا اور ایک بھی اسلامی سلطنت ایسی نہیں ہے جسے حقیقتاً آزاد کہا جاسکے۔ اسلامی دنیا کی مغلوبیت کم از کم کاغذ پر تو مکمل ہوگئی۔

کم از کم کاغذ پر اس لئے کہ عین ظاہری کامیابی کے وقت مغربی حکومت کو ایسا چیلنج دیا گیا کہ جسکی مثال پہلے نہیں ملتی۔ اس مغربی فتوحات کے ۱۰۰ سالہ زمانہ میں اسلامی دنیا میں اہم اندرونی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ مغربی تعدی کے روز افزوں سیلاب نے آخر کار خوابیدہ مشرق کو بیدار کر دیا۔ اور اسلام بالآخر اپنی کمزوری سے واقف ہوا۔ اس واقفیت کیساتھ

پچیس کروڑ پیروان اسلام میں مراکش سے لیکر چین تک اور ترکستان سے لیکر کانگو تک ایک ایسا ہیجان پیدا ہوگیا کہ جس نے اگرچہ خاص شکل اختیار نہیں کی ہی تاہم اس کی قوت اور شدت میں کلام نہیں ہوسکتا۔ پہلی چنگاری صحرا عرب یعنی مہد اسلام میں بجا طور پر روشن ہوئی یہیں اونیسویں صدی کے آغاز میں اسلام کی اصلاح کے لئے وہابی تحریک شروع ہوئی جس نے فوراً حیات اسلامی کی دبی ہوئی آگ کو بھڑکا دیا۔ اور اسی سے اپنے موقع پر اتحاد بین الاسلامی شروع ہوا۔

مزید براں ان ضروری اندرونی تحریکات کے ساتھ مغرب سے بیرونی تحریکات کا ایک طوفان آیا۔ یعنی دستوری حکومت اور قوم پرستی۔ سائینس کی تعلیم و نظام کارخانہ جات، یہاں تک کہ اشتراکیت[۹۵] و بالشوزم[۹۶] کے جدید خیالات اور احساسات شروع ہوئے۔ ان نئی طاقتوں کے باہمی تاثیر سے برانگیختہ اور یورپ کے تعدی پیہم کے دباؤ سے برافروختہ ہوکر اسلامی دنیا حیات اور عمل کی طرف بیش از بیش کمر بستہ ہوئی۔ جنگ عظیم ایک نہایت پرزور تصادم ثابت ہوئی۔ اور آج اسلام بڑی طاقتوں کے ساتھ ایک جدید اسلامی دنیا کی تعمیر کے لئے بیچین ہی۔ اسلامی مستقبل کی تعمیر میں کون کون سی طاقتیں بر روئے کار ہیں؟ اسی سوال کے حل کرنے اور صحیح اندازہ کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہی۔

"مصنف"

---

[۹۵] اشتراکیت یعنی سوشلزم ایک اقتصادی نظریہ ہی جس کا منشا یہ ہی کہ ذرائع پیداوار پبلک ملکیت ہوجائیں یہ لفظ سب سے پہلے انگلستان میں استعمال ہوا اور رابرٹ اوون (۱۷۷۱ء لغایۃ ۱۸۵۸ء) کے خیالات کا اظہار اس لفظ سے کیا گیا۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ دنیا میں عنقریب ایک

عظیم اخلاقی انقلاب ہونے والا ہے جس کی محرک جبر کی بجائے انسانی قوت ارادی ہوگی
اس تحریک کے ختم کے بعد نصرانی اشتراکیت کی تحریک ظہور میں آئی۔ جس کا منشا یہ تھا۔ کہ
اشتراکیت کے اصول کو صنعت کی تعاون عمل میں بطیب خاطر استعمال کیا جاوے۔
اور یہہ دونوں تحریکیں صنعت و حرفت کی خرابیوں کے خلاف احتجاج تھیں۔ اور چونکہ
انکا منشاء یہ تھا کہ بلا مداخلتِ حکومت خرابیوں کو دور کیا جاوے۔ لہذا یہ سیاسی
نہ تھیں۔ موجودہ مسئلہ اشتراکیت فرڈینیڈ لاسل و کارل مارکس اور فریڈریخ اینجلس
کی بلند پروازیوں کا نتیجہ ہے۔ یہہ علمی اور نیز سیاسی ہے۔ یہہ قدیم روایت کو ترک کر کے
حکومت کے زور سے اپنے مقاصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مارکس نے اشتراکیت
کو علمی مسئلہ بنا دیا۔ لیکن اُس نے حصول مقصد کے لئے جدال و قتال کی بھی ضرورت
ثابت کی جس کی بدولت خود اس تحریک کے ہوئیں بن دو گروہ ہو گئے۔

ایک گروہ کا یہہ ادعا ہے کہ جزوی اصلاحات کو قبول کرنا مارکس کے
تعلیم کے خلاف ہے کیونکہ ایسا کرنے سے سرمایہ داروں کی مغلوبیت
معرض التوا میں آجاتی ہے۔

دوسرا گروہ ہر ایسی اصلاح میں مدد دینے کو تیار ہے جو صحیح ہو۔
بالفاظ دیگر اوّل گروہ اس پر زور دیتا ہے کہ کل نظام عمل متحد رکھا
جاوے اور اس کو طبقہ کی خود شناسی سے حاصل کیا جاوے
گروہ دویم غیر مزدوری پیشہ جماعت سے بھی تعاون عمل
کی اجازت دیتا ہے۔

ان دونوں فریق کو "انقلاب پسند" اور "ترمیم پسند"
یا مارکسٹ" اور "مصلحین" کہتے ہیں۔

۱۹۰۶ء کی انتخابات سے اور نیز دیگر سیاسی تجربوں سے

متعلق صفحہ ۳۶

دیگر اثرات بر سر کار ہوئی - ایک طرف تو سلطنت کی کارروائی کی کمی سے اشتباہات بڑھے اور دوسری طرف اس مطالبہ پر زور دیا گیا کہ مزدوروں کو صنعت و حرفت پر مزید اختیار و اقتدار حاصل ہو -

موجودہ سیاسی نظامات کو خریداروں کا نمایندہ تسلیم کر کے یہہ ضرورت پیدا ہوئی کہ مزدوروں کا نظام نمایندگان قایم کیا جاوے - لہذا گلڈ اشتراکین ملکیت تو سلطنت کی رکھنا چاہتے ہیں لیکن صنعت و حرفت کا انتظام قومی گلڈوں کی سپرد کرنا چاہتے ہیں یعنی ہر قسم کے کارخانوں کا ایک گلڈ ہو جس میں کل کام کرنے والے شامل ہوں اور یہ خارجی اثرات سے مصئون ہوں - یہہ اراکین اپنی منتظمیں منتخب کریں اور اپنی محنت کے ثمرات سے خود ساختہ قواعد کے بموجب بہرہ اندوز ہوں اس سے منشا یہہ ہے کہ صنعت و حرفت کی ایک پارلیمنٹ قایم کی جائے جس کا مرتبہ سیاسی پارلیمنٹ کے مساوی ہو اور نزاعات دونوں پارلیمنٹوں کی مشترکہ کمیٹی طے کرے (مترجم)

متعلق صفحہ ۲ بالشویزم اس طرز حکومت کا نام ہے جو روس میں کرنسکی کی حکومت کے زوال کے بعد بسر کردگی لینن قایم ہوئی بالشوی کی در اصل معنی "کثرت" کے ہیں - لیکن میکسمیلی تعریف کے بموجب اس لفظ سے "انقلاب کلی"

نوٹ متعلق صفحہ ۳۶ ۲/

متصور ہے۔

چونکہ موجودہ حکومت روس کسی معلومہ نظریہ پر عمل پیرا نہیں ہے اس لئے اس کی کوئی "علمی تعریف" کرنا محال ہے۔

لیکن لینن اور اُس کے کارپردازوں کے بیانات کے بموجب یہہ معلوم ہوتا ہے کہ بالشویزم سے وہ طرز حکومت مراد ہے جس کے اراکین سرمایہ داری کے مخالف ہوں۔

ارضی سوال کے متعلق بالشویکی جواب یہ ہے کہ "خود انفصالی اصول پر تصفیہ کیا جاوے" لیکن عمل اس اصول سے بالکل جدا ہے ۱۹۱۸ء میں بالشویکیوں کی تعداد قلیل تھی لیکن چونکہ اسلحہ اور سامان خورش کے تنہا مالک تھے اُنھوں نے اپنے مخالفین کو خوف زدہ کردیا۔ اس کے اصول و عقائد ہنوز مستنبط نہیں ہوئے ہیں لیکن بیشتر زیادہ تر نفی پر مبنی ہیں۔

بالشویکی جب سے برسرِ اقتدار ہوئے اُنہوں نے کل اخبارات حتےکہ اشتراکیین کے اخبارات بھی بند کردے۔

مجالس عام آزادی تقریر اور تعلیم مذہبی ممنوع تھیں اُن کے بجائے اشتراکی نصاب تعلیم قایم کیا

گیا تھا۔

حقوق ملکیت اگرچہ مسدود نہیں کئے گئے لیکن اغراض سلطنت کے بالکل ماتحت رکھے گئے۔ مترجم

فصل اوّل

مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ

اٹھارھویں صدی تک اسلامی دنیا اپنے ضعف کی انتہا کو پہنچ چکی تھی صحیح قوت کے کسی جگہ بھی آثار نہیں پائے جاتے تھے۔ ہر جگہ جمود و تنزل نمایاں تھے۔ آداب و اخلاق قابل نفرت تھے۔ عربی تہذیب کے آخری آثار مفقود ہو کر ایک قلیل تعداد وحشیانہ عشرت میں اور عوام وحشیانہ ذلت میں زندگی بسر کرتے تھے۔ تعلیم مردہ ہو گئی تھی اور چند درسگاہیں جو ہولناک زوال میں باقی تھیں وہ افلاس و غفلت کی وجہ سے دم توڑ رہی تھیں۔ سلطنتیں مطلق العنان تھیں اور اُن میں بدنظمی و خونریزی کا دور تھا۔ جگہ جگہ کوئی بڑا خود مختار جیسے سلطان ترکی یا ہند کے شاہان مغلیہ کچھ شاہی شان قایم کیئے ہوئے تھے۔ اگرچہ صوبجات کے امرا اپنے آقاؤں کی طرح آزاد سلطنتیں جو ظلم اور استحصال بالجبر پر مبنی تھیں قایم کرنے کے ہمیشہ کوشاں تھے۔ اسی طرح اُمراء متواتر سرکش مقامی رئیسوں اور قطاع الطریق کی جماعتوں کے خلاف جو ملک کو ایذا پہنچاتے تھے برسرِ پیکار رہتے۔ اس منحوس طرزِ حکومت میں رعایا لوٹ مار و ظلم و پامالی سے نالاں تھی۔ دیہاتی اور شہریوں میں محنت کے محرکات مفقود ہو گئے تھے۔ لہٰذا تجارت اور زراعت دونوں اس قدر کم ہو گئی تھیں کہ محض سدِ رمق کے حصول کے لیے کی جاتی تھیں۔

مذہب بھی دیگر امور کی طرح پستی میں تھا تصوف کے طفلانہ توہمات کی کثرت نے خالص اسلامی توحید کو ڈھک لیا تھا مسجدیں ویران و سنسان پڑی تھیں۔ عوام جہال اُن سے بھاگتے تھے اور تعویذ گنڈے اور مالائیں پھکڑ گندے فقرا اور دیوانے درویشوں سے اعتقاد رکھتے تھے۔ اور بزرگوں کے مزاروں پر زیارت کو جاتے تھے اور اُن کی پرستش بارگاہ ایزدی کے شفیع اور ولی کے طور پر کی جاتی تھی کیونکہ اُن جہال کا خیال تھا کہ خدا ایسا برتر ہے کہ وہ اُس کی طاعات بلاواسطہ نہیں ادا کر سکتے ہیں قرآن مجید کی اخلاقی تعلیم کو نہ صرف پس پشت ڈال رکھا تھا بلکہ اُس کی خلاف ورزی بھی کی جاتی تھی افیون و شرابخوری عام ہو رہی تھی زناکاری کا زور تھا اور ذلیل ترین اعمال قبیحہ کھلم کھلا بے حیائی کے ساتھ کیے جاتے تھے یہانتک کہ مقامات مقدسہ یعنی مکہ اور مدینہ افعال قبیحہ کے قعر مذلت بن گئے تھے۔ اور حج جس کو رسول اللہ نے فرایض میں تعلیم کیا تھا بدعات کی وجہ سے حقیر ہو گیا تھا۔ فی الجملہ اسلام کی جان نکل چکی تھی اور محض بے روح رسمیات اور مبتذل توہمات کے سوا کچھ نہ رہا تھا اگر محمد صلعم پھر دنیا میں آتے تو وہ اپنے پیروان کے ارتداد اور بت پرستی پر بیزاری کا اظہار فرماتے۔

اس جہالت کے زمانہ میں وسیع عربی ریگستان یعنی مہد اسلام سے مومنین کو صراط مستقیم کی طرف دعوت دینے والی صدا پیدا ہوئی۔ اس مخلص مصلح یعنی عبدالوہاب نے ایسا نور ہدایت روشن کیا جو اسلامی دنیا کے ہر گوشہ میں پھیل گیا اور اسلام کو خواب غفلت سے بیدار کر کے قرون اولیٰ کے جوش کو تازہ کر دیا۔ مسلمانوں کی اہم نشاۃ کا یہیں سے آغاز ہو گیا۔

محمد بن عبدالوہاب تقریباً ۱۷۰۳ء میں صحرائے عرب کے وسطی علاقہ یعنی نواح نجد میں پیدا ہوئے۔ اسلامی دنیا کی پستی میں صرف نجد ہی ایک صاف مقام تھا۔

ہم ۔ دیکھ چکے ہیں کہ جب خلافت کی شکل کو خداداد جمہوریت سے شرقی مطلق العنانی میں تبدیل کیا تو آزادی پسند عرب متنفر ہو کر اپنے صحراؤں کو واپس آئے یہاں انھوں نے اپنی بدوی آزادی کو قایم رکھا۔ خلفا اور سلاطین کو یہ جرات نہ ہوئی کہ اُن بیع و دور دراز پیاس سے دم گھوٹنے والے اور جلتی ہوئی ریگستانی ویرانوں میں بہت زیادہ پیش قدمی کریں۔ جہاں کہ جلد باز حملہ آور نیزوں کے جنگل میں اپنے پیروں ناگہانی موت کے منھ میں جاتا ہے۔ عربوں نے کسی کو آقا تسلیم نہیں کیا۔ اپنے گلوں اور اونٹوں کو لیکر ادھر اُدھر گھوما کرتے یا جا بجا ریگستان کے وسط میں کسی سرسبز نخلستان میں آباد ہو جاتے ہیں ان ریگستانوں میں انھوں نے اپنی ابتدائی مذہبی اور سیاسی خوبیوں کو قایم رکھا خانہ بدوش بدوی اپنے شیخ قبیلہ کی زیر اثر زندگی بسر کرتا تھا۔ اور نخلستان کے مستوطن عرب کسی سربرآوردہ خاندان کے امارت کو تسلیم کر لیتے تھے۔ لیکن ان امرا کو بہت ہی کم اختیارات حاصل تھے۔ رسومات قدیمہ اور وحشی عوام کی رائے سے اُن کے اختیارات محدود تھے اور اُن کی خلاف ورزی خطرناک تھی۔ سب سے تُرکوں نے ساحل بحر قلزم اور بلاد مقدسہ پر برائے نام اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ لیکن نجد یعنی اندرونی وسیع حصہ آزاد تھا۔ مذہب اور سیاسیات میں نجدی عرب اپنے اجداد کے عقائد کے مقلد تھے ضعف اسلام کی خرابیوں کو انھوں نے حقارت سے رد کر دیا۔ اور ابتدائے اسلام کی سادہ دینیات کو جو اُن کی طبائع کے موافق تھے۔ وجہ الاعتصام سمجھا۔

اس دیرینہ تر اور برتر عہد کی فضا میں عبدالوہاب کی صدا پیدا ہوئی ابتدا ہی سے اُن کو مطالعہ کتب اور مذہب کا شوق تھا۔ اور بہت جلد اُن کے علم اور تقدس کی شہرت ہو گئی عنفوان شباب ہی میں وہ حج بیت اللہ کو گئے۔ انھوں نے مدینہ میں بھی تحصیل علم کرنے کے بعد ایران تک سفر کیا۔ اور بالآخر نجد واپس آئے۔ واپسی پر اپنے

مشاہدات کے لحاظ سے اُن کے دل میں غیظ و غضب پیدا ہوا اور اُنھوں نے نئے لئے اصلاح کی تبلیغ کا مصمم ارادہ کر لیا۔ سالہا سال تک وہ اطراف عرب میں گھومتے رہے اور بالآخر اُنھوں نے قبیلہ سعود کے شیخ محمد کو جو نجد میں سب سے بڑے سردار تھے اپنا ہم خیال بنا لیا اس سے عبدالوہاب کو اخلاقی اقتدار اور مادی تقویت حاصل ہو گئی اور اُنھوں نے اس زرین موقع سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ بتدریج صحرائی عربوں میں رسول خدا صلعم کے زمانہ کی طرح سیاسی اور مذہبی اتحاد قایم ہو گیا درحقیقت عبدالوہاب پہلے خلفاء حضرت ابوبکر صدیق و عمر رضہ کے سچے پیرو تھے۔ سنہ ۱۷۸۷ء میں جب وہ مرے تو سعود اُن کے قابل جانشین ہوئے۔ جدید وہابی سلطنت قریب قریب مکہ کی خلافت کا نمونہ تھی۔ اگرچہ سعود کی فوجی طاقت زیادہ تھی لیکن اُنھوں نے اپنے آپ کو رائے عامہ کا پابند سمجھا۔ اور اپنی رعایا کی جائز آزادی میں کبھی مداخلت نہ کی طرز حکومت اگرچہ سخت لیکن عادلانہ اور اچھا تھا۔ وہابی قضاۃ لایق اور ایماندار تھے۔ امن عامہ ایسے کامل طور سے قایم کیا گیا تھا کہ رہزنی کا سد باب ہو گیا تھا تعلیم سرگرمی سے پھیلائی جاتی تھی ہر نخلستان میں مدرسے تھے۔ اور بدوی قبایل میں معلم بھیجے جاتے تھے۔

نجد کو مستحکم کر کے سعود نے دنیائے اسلام کو فتح اور پاک کرنے کے اہم کام کی تیاری کی۔ اوّل منزل مقصود بلاد مقدس تھے۔ اُنیسویں صدی کے شروع میں یہ مقصد حاصل ہو گیا۔ ان وہابی عساکر کے مقابل کوئی چیز نہ ٹھہر سکی کیونکہ یہ وہابی ترکوں کی منافرت سے مشتعل تھے ترکوں سے اُن کی منافرت نے دینی اور امارت اسلامیہ کو غصب کر لینے کی وجہ سے تھی جو عرب خیال کے بموجب صرف عربوں کا حصہ تھی۔ سنہ ۱۸۱۳ء میں جبکہ سعود شام پر فوج کشی کی تیاری کر رہے تھے فوت ہو گئے۔ کچھ عرصہ کے لیئے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہابی کل مشرق کو خس و خاشاک سے صاف کر کے ایک ہی وار میں اسلام کو خرابیوں سے پاک کر دینگے

لیکن تقدیر الٰہی یوں نہ تھی سلطان ترکی جب وہابی سیلاب کو نہ روک سکے تو انھوں نے اپنے مشہور و معروف طاقتور نائب محمد علی سے استمداد کی یہ جانباز البانی اس وقت مصر پر کامل طور پر قابض ہو گیا تھا۔ مغربی فوقیت کو اس نے علانیہ تسلیم کر کے متعدد یورپی افسر اپنی ملازمت میں رکھ لیئے تھے۔ جنھوں نے نہایت سرعت کے ساتھ ایک زبردست فوج کی ترتیب دی جس میں زیادہ تر البانیہ کے پہاڑی جنگجو تھے۔ اور جس کا نظام اور تربیت یورپ کے نمونہ پر مرتب کیا گیا تھا محمد علی نے سلطان ترکی کی طلبی کے حکم کی فوراً تعمیل کی اور یہ بہت جلد واضح ہو گیا کہ وہابی جوش بھی یورپ کی بندوقوں اور توپوں کا جو کارآزمودہ ہاتھوں میں تھیں مقابلہ نہ کر سکتا تھا تھوڑے عرصہ میں مقامات مقدسہ واپس لے لیئے گئے۔ اور وہابی افواج ریگستان میں پسپا کر دی گئیں بڑھنے والی وہابی سلطنت سراب کی طرح غائب ہو گئی۔ وہابیت کا سیاسی دور ختم ہو گیا۔[۵]

لیکن وہابیت کے روحانی دور کا اب آغاز ہوا۔ نجد اصلاحی جوش کا مرکز رہا اور یہاں سے نئی روح کی تنویر اطراف عالم میں پھیل گئی۔ مقامات مقدسہ میں بھی وہابیت نے مذہبی لہجہ کی درستی کر دی اور بے شمار حجاج جو تمام دنیائے اسلام

---

۵ وہابی تحریک کے لیے ملاحظہ ہو موسیو لے شاتلی ایر کی کتاب "انیسویں صدی میں اسلام" مطبوعہ پیرس ۱۸۸۰ء۔ ڈبلیو جی۔ پالگریو کی کتاب "مشرقی مسائل پر مضامین" مطبوعہ لندن ۱۸۷۲ء ڈی بی میکڈونلڈ کی کتاب "اسلامی دینیات" مطبوعہ لندن ۱۹۰۳ء ہے۔ ایل برکہارڈٹ کی کتاب "بدویون اور وہابیوں کے تذکرے" مطبوعہ لندن ۱۸۳۱ء دو جلد۔ اسے شوونہ کا مضمون "وہابیوں کی الہیات" جو جرنال ایشیاٹک نمبر ۴ جلد دوم صفحہ ۱۴۰ پر شائع ہوا۔ (مصنف)

سے سالانہ حج کے لیے آتے تھے پرجوش مصلح بنکر واپس گئے۔ وہابیت کے خمیر نے دور دراز مقامات میں ہلچل ڈالدی مثلاً شمالی ہند میں ایک وہابی جانباز سید احمد[1] نے نے پنجابی مسلمانوں کو ابھارکر حقیقتاً ایک مذہبی سلطنت قایم کرلی مگر اُن کی ناگہانی موت سے شمالی ہند میں وہابی فتوحات کا امکان جاتا رہا۔ اس سلطنت کو سکھوں نے ۱۸۳۱ء میں برباد کردیا لیکن جب انگریزوں نے اس ملک کو فتح کیا تب بھی وہابی عقائد کی سلگتی ہوئی چنگاریوں نے بہت کچھ پریشان کیا یہ خیالات عرصہ تک باقی رہے اور اسباب غدر میں ممد ہوئے۔ اور انھیں عقائد نے افغانستان اور شمالی[2] مغربی سرحد کے وحشی قبایل کو ہمیشہ کے لیئے مذہبی تعصب میں رنگ دیا۔ انھیں سنین میں مشہور سید محمد بن سنوسی اپنے وطن الجزائر سے مکہ آئے اور اُن وہابی اصول کو اخذ کیا جن کی بنا پر اُس عظیم بین الاسلامی اخوت کی بنیاد ڈالی جو اُن کے نام سے موسوم ہے۔ فارس میں بابی[3] تحریک اگرچہ اصولاً وہابیت سے بالکل بیگانہ تھی لیکن بلاشبہ یہ بھی وہابی اقتضا

---

[1] یہ سید احمد خاں علی گڈھ والے سرسید احمد خاں نہیں ہیں جو اُنیسویں صدی کے وسط کے ایک آزاد خیال مسلمان تھے مصنف یہ حضرت سید احمد رائے بریلی کے رہنے والے اور مولانا اسمعیل شہید کے پیر تھے۔ مترجم

[2] شمالی ہند کے مسلمانوں کے اندرونی جوش مذہبی سے جو خوف انگریزوں کو اُنیسویں صدی کے وسط تک رہا اس کو سر ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر نے اپنی کتاب "مسلمانان ہند" مطبوعہ لندن ۱۸۷۲ء میں بیان کیا ہے مصنف سر سید احمد خاں علیہ الرحمۃ نے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب "مسلمانان ہند" کا جواب "اسباب بغاوت ہند" زمانہ قیام لندن میں لکھ کر شایع کیا وہ ملاحظہ طلب ہے ۱۲ مترجم۔

[3] بابی تحریک کے متعلق ملاحظہ ہو موسیو کلیما نتوارت کی کتاب "بابی مذہب" مطبوعہ پیرس ۱۹۰۹ء و کاونٹ ارتھودی گوبنو کی کتاب "تین سال ایران میں" مطبوعہ پیرس ۱۸۵۹ء۔ مسلمانوں کی نشاۃ کی ان سب ابتدائی تحریکات کا اچھا خلاصہ موسیو لی شاتلی ایر کی کتاب مذکور الصدر میں موجود ہے ۱۲ (مصنف)

کا دوسرا پرتو تھی فی الواقع ایک ہی قرن میں خالص وہابی تحریک بڑھ کر ایک عام تحریک یعنی نشاۃ اسلام میں مبدل ہو گئی۔ اس میں بھی بجائے خود مختلف صورتیں پیدا ہو رہی تھیں اور ان میں سے خاص تحریک وہ ہے جو اتحاد بین الاسلامی کہلاتی ہے۔ اس تحریک کا جہاں تک سیاسی تعلق ہے اس کو ہیں دوسری فصل میں ذکر کروں گا فی الحال ہم کو اسلامی بیداری کے دیگر پہلوؤں پر خصوصاً جن کا مذہب اور تمدن سے تعلق ہے غور کرنا چاہیئے۔

وہابی تحریک صحیح معنوں میں خالص اصلاح تھی۔ اُس کا مقصد خرابیوں کی اصلاح ضعیف الاعتقادی کی رسومات کا انسداد اور ابتدائے اسلام کا احیا تھا۔ بعد کی کل افزونیاں مثلاً ازمنہ متوسط کی فقہا کی تحریرات و تاویلات اور رسمی و صوفیانہ بدعات اور پیر پرستی غرضکہ ہر قسم کی تبدیلیاں رد کی گئی تھیں۔ رسول اللہ کے تعلیم کردہ خالص توحید اپنی تمام بے لوث سادگی کے ساتھ تلقین کی جاتی تھی اور قرآن کو نصوص ظاہری کے ساتھ انسانی اعمال کا تنہا رہنما مانا جاتا تھا اس اصولی سادگی کو سخت اخلاقی قوانین سے وابستہ کر دیا تھا نماز روزہ و دیگر احکام شرع جن کی رسول خدا صلعم نے تعلیم فرمائی تھی احتیاط سے ادا کیے جاتے تھے سادہ ترین طرز معاشرت کی پابندی کرائی جاتی تھی ریشمی ملبوس قیمتی غذا و شراب و افیون و تمباکو و قہوہ اور دیگر لذات قطعاً ممنوع تھے۔ مذہبی عمارات میں بھی فن معماری کی ممانعت تھی وہابیوں نے مدینہ میں روضۃ النبیؐ اور مساجد کے مناروں کو بدعات سیئہ سمجھ کر منہدم کر دیا۔ باوجود اپنے اخلاقی خلوص کے وہابی بہت تنگ نظر تھے۔ اور یہ اسلام کی خوش قسمتی تھی کہ اُن کا سیاسی اقتدار جلد جاتا رہا اور زوال کے بعد مجبوراً اُن کو اپنی مساعی اخلاقی تعلیم کے لیے محدود کرنے پڑے۔

اکثر نقادان مذہب اسلام اس وہابی تحریک کو اس امر کے ثبوت میں پیش

کرتے ہیں کہ اسلام اصلاً تنزل کا میلان رکھتا ہو اور جبلی طور پر ارتقای وسعت
کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ مگر یہ تنقیدات غیر مستند معلوم ہوتی ہیں. ہر مذہبی اصلاح
کی پہلی منزل یہ ہو کہ وہ اپنی ابتدائی عقائد کی طرف بلا تمیز کے عود کرے۔ مذہبی
مصلح کے لیے بدعات مابعد سے بلا لحاظ اُن کے اوصاف کے انکار کرنا ہی اصلاح
کا واحد ذریعہ ہو ہماری اپنی پروٹسٹنٹ اصلاح اسی طریقہ پر شروع ہوئی اور
آراسمس جیسے ہمدردنی آدم نے پروٹسٹنٹ کی تنگ نظری سے تنگ اور متعرض
و متنفر ہو کر تحریک کو نئے سو و سمجھا تھا اور اس نے اپنے خیال کا یوں اظہار کیا کہ یہ تحریک
حقیقی تہذیب کے لیئے خطرناک تھی اور پوپ کی قدامت کی بجائے بائبل کی قدامت
کو قایم کرتی تھی۔

امر واقعہ یہ ہو کہ مسلمانوں کی بیداری کی اصلاحانہ مشروعات فوراً زیادہ
تعمیری راہوں پر وسعت پذیر ہوئیں۔ اور ان میں سے بعض حقیقی حریت سے رنگ
گیئں۔ اوایل اُنیسویں صدی کے مسلم مصلحین اپنے مذہبی ماضی کی تھوڑی ہی تحقیق
کر پائے تھے کہ اُنھیں اعتزالی عقائد کا علم ہوا۔ ہم اُس نزاع کا پہلے ذکر کر چکے ہیں
جو اسلام کے شروع ایام میں معقول اور منقول کے مابین بڑی شدومد سے
ہوا تھا اس نزاع میں منقول نے ایسی فتح پائی تھی کہ معتزلین کی یاد بھی جاتی رہی
تھی مگر اب یہ یادیں دوبارہ تازہ ہونے لگیں اور آزاد خیال مصلحین کو یہ معلوم کر کے
بڑی خوشی ہوئی کہ معتزلی علما کی تحریرات اور کلام متقدمین دونوں سے اُن کے خیالات
کی تائید ہوتی تھی۔ اس اصول نے کہ بُرہان عقلی نہ کہ کورانہ نقلی تقلید معیار ہو گی اُن
تمام اور اصلاحات کے لیے جن کی مصلحین سب سے زیادہ خواہشمند تھے دروازے
کھول دیے بر سبیل تمثیل مصلحین کو ذیل کی حدیث کتب احادیث میں ملی۔

إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ أَمْرِ دِينِكُمْ فَخُذُوا بِهِ وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ رَأْيِي فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ (مسلم)

"میں بھی صرف ایک انسان ہوں جب میں کسی مذہبی امر کی بابت حکم دوں تو اس کو قبول کرو اور جب میں امور دنیا کی بابت حکم دوں تو میں ایک انسان سے زیادہ نہیں ہوں"

اور دوسری جگہ پر اس زمانہ کو جس میں انقلاب کامل لازمی ہوگا پیش نظر رکھ کر اس طرح فرماتے ہیں:-

إِنَّكُمْ فِي زَمَانٍ مَنْ تَرَكَ مِنْكُمْ عُشْرَ مَا أُمِرَ بِهِ هَلَكَ ثُمَّ يَأْتِي زَمَانٌ مَنْ عَمِلَ مِنْهُمْ بِعُشْرِ مَا أُمِرَ بِهِ نَجَا (ترمذی)

"تم ایسے زمانہ میں ہو کہ اگر تم اوامر کا دسواں حصہ بھی ترک کر دو تو تم برباد ہو جاؤ گے اس کے بعد ایسا زمانہ آئے گا کہ جو شخص اوامر میں دسویں حصہ کی بھی پابندی کرے گا تو وہ نجات پا جاوے گا"[1]

قبل اس کے کہ ہم زمانہ حال کے اسلامی مصلحین کے خیالات و مساعی پر بحث کریں بہتر ہوگا کہ ہم متعدد مغربی نقادوں کے اُن دعاوی پر غور کریں کہ اسلام فطرتاً اصلاح اور علوم انسانی کی توسیع کی تدریجی متابعت کرنے کے ناقابل ہے[2] عیسائی مخالفین کے علاوہ

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح مصنف

[2] اس علم مناظرہ کی بہترین جدید مثالیں ریورینڈ ایس۔ ایم زویمر کی تصانیف ہیں جو عربوں میں مشہور مبلغ رہا ہو بالخصوص اس کی کتاب "عربستان یعنی مہد اسلام" مطبوعہ اڈنبرا ۱۹۰۰ع اور "اسلام کا الزام" مطبوعہ لندن ۱۹۱۵ع نیز ملاحظہ ہو کتاب موسومہ "موجودہ اسلامی دنیا" جو اُن مکتوبات کا مجموعہ ہو جو بمقام قاہرہ۔ مصر ۱۹۰۶ع میں پروٹسٹنٹ مشنری کانفرنس میں پڑھے گئے تھے ۱۲ مصنف

رینان جیسے منقولیین اور لارڈ کرومر جیسے اسلامی ممالک کے منتظمین بھی جو اعتراض کرتے ہیں وہ اسی قسم کے ہیں لارڈ کرومر اپنے بیان میں اس نازک بحث کا جامع خلاصہ ان الفاظ میں کرتے ہیں "اسلام کی اصلاح ہی نہیں ہو سکتی یعنی اصلاح شدہ اسلام اسلام ہی نہیں رہتا بلکہ دوسری چیز ہو جاتا ہے۔" یہ تنقید چونکہ اصحاب کی ہے جنھوں نے اسلام کا غور سے مطالعہ کیا ہے اور اکثر مسلمانوں کے ذاتی طور پر بڑے دوست رہے ہیں لہذا وقعت کی نگاہ سے دیکھے جانے کے قابل ہے تاہم مذاہب پر مورخانہ نظر ڈالنے سے اور خصوصاً گزشتہ صدی کے اسلامی مصلحین کے خیالات اور ان کے مساعی کے نتایج پر غور کرنے سے ان مایوس کن الزامات کا بطلان ہوتا ہے۔

اوّلاً یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام کی آج وہی حیثیت ہے جو نصرانیت کی پندرھویں صدی میں آغاز اصلاح[2] کے وقت تھی منقول کو معقول پر وہی فوقیت

---

[1] کرومر کی کتاب "عہد حاضرہ کا مصر" جلد دویم صفحہ ۲۲۹ مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۰۸ء۔ موسیو رینان کی خیالات کے لیے ملاحظہ ہو اس کی کتاب "اسلام اور سائنس" مطبوعہ پیرس سنہ ۱۸۸۳ء۔ مصنف

[2] اصلاح سے وہ مسیحی کلیسا کا انقلاب مراد ہے جو سولھویں صدی میں ہوا اور جس کی بدولت اکثر سلاطین یورپ نے رومی کلیسا سے قطع تعلق کر کے پراٹسٹنٹ عقائد اور نظام کا اتباع کیا۔ سب سے پہلے اس پر عمل جرمنی میں کیا گیا اور اس کی آغاز لوتھر کے اعتراضات سے ہوئی اور دو سال میں لوتھر اور مقلدین یورپ کے نزاعات پر کل مغربی یورپ متوجہ ہو گیا اسی زمانہ میں ایک تحریک زونگلی اور دوسری کالوین نے شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سولھویں صدی کے وسط میں پروٹسٹنٹ کے دو نظامات کلیسا جاری ہو گئے یہ اثرات کل مسیحی دنیا میں پھیل گئے۔ ڈنمارک و سویڈن و انگلستان کا شاہی مذہب پروٹسٹنٹ ہو گیا۔ شمالی یورپ کے ٹیوٹنی اقوام زیادہ تر اس جدید فرقہ کا اتباع کرنے لگیں لیکن اس کا اثر دیگر ممالک پر بھی پڑا۔

مترجم

قدامت اور اسناد کی وہی کورانہ تقلید اور آزاد خیالی اور علوم سائنس سے وہی بدگمانی اور مخالفت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کی مقدس کتابیں بالخصوص شریعت کی کتب پڑھنے سے اور نیز گزشتہ ایک ہزار سال کی مسلم تاریخ پر نظر ڈالنے سے ایسی حالت نظر آتی ہے جو فی الجملہ موجودہ ترقی اور تہذیب کے بالکل منافی ہے۔ لیکن کیا پندرھویں صدی کے شروع میں یہ سب امور نصرانیت پر صادق نہیں آتے تھے۔ اسلامی شریعت کا مسیحی قوانین مذہب سے مقابلہ کرو

۱؎ جس اسلامی دور کا مورخ ذکر کرتا ہے وہ زیادہ تر انحطاط کا زمانہ ہے۔ اس میں کوئی سوال نہیں ہو سکتا کہ اسلام نے عالمگیر ترقی کی اور قرون اولیٰ اسلامی روایت و درایت کا بہترین زمانہ تھے۔ اگر فی الحقیقت اسلامی شریعت ترقی کی سد راہ ہوتی تو قرون اولیٰ کے مسلمان جن کا مدعائے زندگی اپنی مذہب کی محبت و تقلید تھا کبھی ترقی نہ کر سکتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی ممالک میں تنزل محض اسلامی احکام کی پابندی نہ کرنے سے پیدا ہوا۔ موجودہ ترقی سے علوم و فنون بالخصوص سائنس کی ترقی مراد ہے یورپ نے ان علوم کو مسلمانوں ہی سے سیکھا اور وہی موجودہ تہذیب کے موجد ہیں۔ یورپ کو تو صرف اس میں ترقی کرنے کا فخر حاصل ہے۔ علم کیمیا محض عربوں کی ایجاد ہے (مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو دیباچہ فغان ایران) رہی تہذیب مغربی تہذیب و تمدن کی نمایاں صورت اس کی صنعتی و حرفتی ترقی ہے اس میں بھی مسلمانوں کی ترقیاں نہایت نمایاں ہیں۔ اسلام میں جو تجارت کی فضلیت بیان کی گئی ہے وہ قابل لحاظ ہے اسی کے واسطے کلام پاک میں فضل خدا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے شریعت اسلام صنعت و حرفت و تجارت کی موید اور حامی ہے۔ ہاں وہ موجودہ انڈسٹریلزم کی عیوب کی مخالف ہے نہ وہ محض مادیت کا والہ و شیدا بننے دیتی ہے اور نہ اُن مظالم کو روا رکھتی ہے جسے خود یورپ روزانہ برا کہتی ہیں ۱۲

مترجم

دونوں میں ایک ہی روح ہے۔ برسبیل تمثیل روپیہ کو سود پر قرض دینے کی بابت شرعی ممانعت کو دیکھو اس ممانعت پر اگر عمل کیا جاوے تو موجودہ اصول کے بموجب کاروبار اور صنعت ناممکن ہو جاتی ہے۔ یہ ہے وہ مثال جو اکثر اس ثبوت میں پیش کی جاتی ہے کہ اسلام جبلی طور پر موجودہ تہذیب کے منافی ہے[1] لیکن نصرانی قانون مذہب نے بھی سود کی ایسی ہی ممانعت کی ہے اور یہ ممانعت اس سختی سے نافذ تھی کہ صدیوں تک یہودی کل یورپ کی تجارت کے اجارہ دار ہو گئے تھے اور پہلے عیسائی جنھوں نے روپیہ قرض دیا یعنی لومبارڈی کے رہنے والے وہ تقریباً مرتد سمجھے جاتے تھے۔ ہر شخص اُن سے متنفر تھا اور اکثر اُن کو آزار پہنچایا جایا جاتا تھا اب آزادیِ خیال اور علمی تحقیقات کے متعلق مسلمانوں کی مخالفت کے مسئلہ پر غور کرو کیا اسلام اُس سے زیادہ بھی نفرت انگیز منظر دکھا سکتا ہے جو کم از تین سو سال ہوئے نصرانیت کی تاریخ میں واقع ہوا جبکہ گلیلو اکبر پوپ کے محکمہ احتساب کے سامنے طلب کیا گیا

---

[1] مسئلہ سود میں فی نفسہ جو احکام شرعی ہیں وہ نہایت صحیح ہیں۔ جہانتک ربوا کا تعلق اُس قرضہ سے ہے جو ضروریات زندگی وغیرہ کے لیے لیا جاوے اُس کا حرام اور مضر ہونا بدیہی ہے چنانچہ مصنف نے خود فصل اقتصادی انقلاب کے فقرہ کے آخر میں ذکر کیا ہے۔ ہاں تجارت یا بینک میں روپیہ لگانا اور اُس پر سود لینا اُس کے متعلق خود مسلمان علماء میں اختلاف ہے۔ علماء مصر و عراق اور بعض علماء ہند اس کے جواز کا فتویٰ دے چکے ہیں۔ ایسے مسئلہ کو جس پر خود مسلمانوں میں اختلاف ہو پیش کرنا بعید از عقل ہے۔ چونکہ اسلامی دنیا میں صرف خانگی مصارف پر سود لیا جاتا تھا اور اوس کی سختی سے ممانعت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب تجارتی اغراض کا سود رائج ہوا تو قدیم عقیدہ کے بموجب مسلمانوں میں شک و شبہ پیدا ہوا لیکن یہ کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس سے اسلام کو موجودہ ترقی کا منافی قرار دیا جائے۔

مترجم

اور شکنجہ کشی کی دھمکی دیکر اُس کو مجبور کیا گیا کہ وہ اس قابل نفریں اُلحاد سے توبہ کرے کہ زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہی

امر واقعہ یہ ہی کہ محمد صلعم، علم کی وقعت کرتے تھے آپ کے خود الفاظ اس کی بہترین شہادت ہیں۔ بعض احادیث حسب ذیل ہیں:-

(۱) علم کو اگر ضرورت پڑے تو سر حد چین تک تلاش کرو۔ اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ كَانَ بِالصِّين

(۲) مہد سے لحد تک علم کی تلاش کرو۔ اطلبوا العلم من المهد الى اللحد

(۳) علم کا ایک لفظ سو نمازوں سے قیمتی ہی۔ كلمة يسمعها الرجل خير له من عبادة سنة

(۴) علما کی روشنائی شہدا کے خون پر فضیلت رکھتی ہی۔ ان مداد العلماء افضل من دم الشهداء

(۵) علم دین کا ایک لفظ سیکھ کر ایک مسلمان بھائی کو سکھانا صد سالہ عبادت سے افضل ہی ——

(۶) نبی کے وارث علما ہیں۔ العلماء ورثة الانبياء

(۷) خدا نے عقل سے برتر کوئی چیز نہیں پیدا کی۔

(۸) بلاشبہ ایک شخص نے نماز ادا کی روزہ رکھے زکوۃ دی حج کیا اور دیگر کارہائے خیر کیئے تاہم اُس کو جزا اوسی قدر ملے گی جتنی عقل اُس نے صرف کی۔

ان احادیث اور اسی قسم کی دیگر احادیث سے ثابت ہوتا ہی کہ موجودہ اسلامی مصلحین کو اپنی آزاد روی میں کتب ہائے مقدسہ سے کافی معاونت ملتی ہی۔ بلاشبہ میرا یہ منشا نہیں ہی کہ چونکہ اسلام آزاد اور ترقی پذیر ہی اس لیے اسلام کی اصلاحی تحریک کی کامیابی خود بخود یقینی ہی۔ صفحات تاریخ میں اس کے خلاف بہت سے اندوہناک مثالیں ملتی ہیں درحقیقت ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ اسلام میں خود اوائل ایام کی اُمید افزا آزادانہ تحریک بالکل نیست و نابود ہو گئی۔ مگر تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہی کہ جب زمانہ ترقی کی موافقت کرتا ہی تو مذاہب اصلاح پاکر اور وسعت خیالی پیدا کرکے ترقی کی صلاحیت

پیدا کر لیتے ہیں کوئی انسانی جماعت جب وہ اچھی طرح شاہراہِ ترقی پر چلنے لگتی ہو تو صرف عقائد کی بنا پر رجعت قہقری نہیں کرتی۔ یہ ممکن ہو کہ وہ رُک جائے لیکن اگر ارتقائے قوت زور لگاتی رہتی ہو تو فقہی موانعات یا تو رفع کر دیئے جاتے ہیں یا ان سے پہلو تہی کی جاتی ہو یا بالکل مٹ جاتے ہیں یہ ممکن نہیں ہو کہ اب اسلامی دنیا پر ارتقائی اثرات کی کمی ہو جائے اب[1] اسلام مغربی تہذیب سے خوب اتصال پا چکا ہو اور مغربی خیالات کا نفوذ روز بروز اُس میں روز بروز بڑھ رہا ہو اسلام اب اگر چاہے بھی تو نہ وہ ترک تعلقات کر سکتا ہو اور نہ اپنے آپ کو جدا کر سکتا ہو لہٰذا ہر شئی سے اُس کی اصلاح کامل کی فال ملتی ہو۔ لیکن لارڈ کروم جیسے ناقدین یہ اعتراض یقیناً کرتے ہیں کہ اصلاح شدہ اسلام اسلام ہی نہ ہوگا۔ مگر یہ کیوں؟ اگر لوگ اپنے آپ کو مسلمان ہی کہتے رہیں اور تبلیغ محمدی سے قوت روحانی اخذ کرتے رہیں تو اُن کو نام سے کیوں محروم کیا جائے موجودہ نصرانیت ازمنہ متوسطہ کی نصرانیت سے بہت مختلف ہو اور متعدد نصرانی فرقوں میں بہت بڑا اصولی اختلاف ہو تاہم وہ سب لوگ جو اپنے آپ کو عیسائی سمجھتے ہیں اُن کو سب لوگ بھی سوائے اُن متعصبین کے جو رفتار زمانہ سے جدا ہیں عیسائی ہی سمجھتے ہیں۔

آؤ اب ہم اسلامی مصلحین کی تنقید کریں یہ تنقید اُن کی کتب مقدسہ اور تواریخ کے اندازہ پر نہ ہوگی بلکہ اُن کے اقوال و اعمال سے کیونکہ اُن میں سے ایک الجزائری نے نہایت معقول طور پر کہا ہو کہ آدمیوں کا اندازہ اُن کے کتابوں کے حروف سے نہ کرنا چاہیئے بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے

---

[1] اسلام کو مغربی تہذیب یا اصلاً مغربی ہوع الارض سے یہ نفع تو ضرور ہوا کہ مسلمان اپنی خواب غفلت سے بیدار ہو رہے ہیں۔ اور مغربی سیاسیات کا اتفاق سے بعض اوقات معراہونا اُن کو اپنے مذہب کی عظمت کا یقین کامل دلاتا ہو مذہب اسلام کو خود کسی امداد یا فیض کی ضرورت نہیں ہو۔ ہاں مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار ہو کر اسلام کی متابعت کی ضرورت ہو اور فضا میں اس تموج کے آثار پائے جاتے ہیں۔ مترجم۔

کہ دراصل اُن کا عمل کیا ہے[۱]"

موجودہ زمانہ کی اسلامی حُرّیت کی پہلی ہمت افزائی جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اس پرانے معتزلہ ادبیات کی دریافت سے ہوئی جو ہزار سال پہلے کا تھا یقینی امر ہے کہ اسلام کسی زمانہ میں بھی آزاد خیال اشخاص سے خالی نہیں رہا۔ اس کے تاریک ترین دور میں بھی مروجہ ظلمت کے خلاف چند آوازیں بلند ہوئی تھیں۔ مثلاً سولھویں صدی میں مشہور الغرانی نے لکھا تھا کہ "یہ ذرا بھی ناممکن نہیں ہے کہ وہ ادراک جو خدائے تعالےٰ نے ازمنہ ماضیہ کے لوگوں کو عطا نہ فرمائے ہوں آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ رکھے ہوں۔ مبداء فیاض ہر قرن کے عقلا کے قلوب پر اپنے انعام اور تجلیات کی تراوش کو کبھی بند نہیں کرتا[۲]" اسلام کے عہد تاریک کی ان متفرق صداؤں نے زمانہ حال کے مصلحین کی ہمت بڑھائی اور اُنیسویں صدی کے وسط تک ہر اسلامی ارض میں دور اندیش لوگوں کی جماعتیں پیدا ہو گئیں۔ بلاشبہ اُن کی تعداد شروع میں ناقابل التفات تھی اور متعصب ملاؤں[۳] نے اُن کی تکفیر کی اور عام جہال اُن سے نفرت کرنے لگے۔ پہلا ملک جس میں کہ مصلحین کا اثر نمایاں طور پر محسوس ہوا ہندوستان تھا یہاں ایک جماعت نے بسر کردگی

---

[۱] اسمٰعیل حامد کی کتاب شمالی افریقہ کے فرانسیسی مسلمان" مطبوعہ پیرس ۱۹۰۶ء: مصنف

[۲] منقول از کتاب الاسلام مصنفہ پیروں مطبوعہ پیرس ۱۸۹۸ء مصنف

[۳] مسلمانوں کے مذہبی علماء کو ملا کہتے ہیں اگرچہ یہ پوری طور پر نصرانی پیشوایان دین کے مطابق نہیں ہیں آنحضرت صلعم پوجاریوں کے عہدہ کے خلاف تھے لہذا اسلامی شریعت میں ایسا کوئی مختص پیشوایان دین کا طبقہ یا فرقہ معین نہیں ہے جیسا کہ نصرانیت۔ یہودیت۔ مذہب براہمہ یا دیگر مذاہب میں ہے۔ ہر مسلمان ہر مذہبی کام کو اصولاً سرانجام دے سکتا ہے لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ ایسے اشخاص کا فرقہ پیدا ہو گیا جو اسلامی دینیات اور شریعت کے ماہر تھے۔ بالآخر یہ اشخاص عملاً پیشوایان دین ہو گئے اگرچہ اصولاً ان کو دینیات کے قانون دانوں میں شمار کرنا چاہیے۔ درویشوں کے بھی مذہبی فرقے پیدا ہو گئے بلکہ ابتدائی اسلام ان سے بالکل نابلد تھا۔ مصنف

سرسید احمد خاں علیہ الرحمہ[1] قابل لحاظ تحریک آزادی کا آغاز کیا جماعتیں قایم کیں کتابیں اور اخبارات شایع کیے۔ اور علی گڑھ میں مشہور کالج کی بنیاد ڈالی۔ ابتدائی آزاد مصلحین کا اچھا نمونہ سرسید احمد ہیں۔ طبعًا قدامت پسند اور دینیات میں بالکل راسخ الاعتقاد ہونے کے بلوجود انھوں نے حقیقی وہابی جوش سے اسلام کی موجودہ پستی کی ملامت کی وہ مغربی خیالات کے علانیہ قدردان تھے۔ اور مغربی اوصاف کے اخذ کے خواہشمند تھے۔ چنانچہ ۱۸۶۶ء میں لکھتے ہیں "ہم کو یورپی سائینس کی تصانیف پڑھنا چاہیے اگرچہ یہ مسلمانوں کی لکھی ہوئی نہیں ہیں اور خواہ ہم کو اُن میں ایسے امور ملیں جو قرآنی تعلیم کے خلاف ہیں ہم کو زمانہ سابق کے عربوں کا اتباع کرنا چاہیے۔ جن کو فیثاغورث کی تصانیف پڑھکر یہ خوف نہیں ہوتا تھا کہ اُن کے عقائد میں تزلزل پیدا ہو جائے گا۔"

ہندوستانی آزاد خیال مسلمانوں کا گروہ روز بروز بڑھتا گیا۔ اور اُنھوں نے مولوی چراغ علی اور سید امیر علی[2] جیسے لیڈر پیدا کیے۔ جنھوں نے عجیب انگریزی میں عالمانہ کتابیں لکھیں جو تمام دنیا میں معروف ہیں یہ لوگ اپنے آپ کو جدید معتزلین کہتے ہیں اور انھوں نے ایسی اصلاحات جیسے کہ شریعت کی مکمل جانچ و پڑتال۔ اور اسلام کی زمانہ کے موافق تجدید کی۔ دلیرانہ تبلیغ کی۔ ایک دوسرے سربرآوردہ شخص یعنی صلاح الدین خدا بخش نے اس نقطۂ خیال کو خوب ادا کیا ہے وہ لکھتا ہے "رسول خدا (صلعم) کا کبھی بھی یہ خیال نہ تھا کہ وہ اپنی اُمت کے خیالات کو پابزنجیر کر دیں یا اُن کے واسطے ایسے مقررہ غیر قابل تبدیل و تغیر قوانین بنادیں۔ قرآن شریف مومنین کے لیے ایک کتاب ہدایت ہے اور وہ اُن کے معاشرتی و اخلاقی و

---

[1] اقتباس از مضمون نوشتہ موسیو لیوں کاہون جولا دیرا اور رام بو کی عام تاریخ جلد ۱۲ صفحہ ۴۹۸ پر درج ہوا ہے۔ اس میں اُنیسویں صدی کی اسلامی دنیا کی ذہنی ترقی پر نہایت عمدہ عام تبصرہ ہے ۱۲ مصنف

[2] بالخصوص ان کی نہایت مشہور کتاب "اسپرٹ آف اسلام" مطبوعہ لندن ۱۸۹۱ء مصنف

قانونی و ذہنی ترقی کا سدراہ نہیں ہے" وہ اسلام کی موجودہ پستی پر اظہار رنج کرتے ہوئے کہتا ہے "موجودہ اسلام اپنے مذہبی پیشواؤں کے انتظام اور سخت تعصب و مہلک جہالت اور متوہمانہ رسوم کے باعث درحقیقت نبی آخر الزماں کے تعلیم کردہ اسلام پر ایک اتہام ہے" وہ اپنے الفاظ کو حسب ذیل آزادانہ اقرار ایمانی کے ساتھ ختم کرتا ہے "کیا اسلام ترقی کے مخالف ہے؟ میں اس کا جواب نہایت زور کے ساتھ نفی میں دونگا۔ اسلام بعد اخراج فقہ نہایت سادہ مذہب ہے اس کے اصلی ارکان خدائے واحد کا اقرار اور رسالت محمد صلعم پر ایمان رکھنا ہے باقی محض بدعات اور غیر ضروری امور ہیں"[اھ]

اسی عرصہ میں آزاد خیال اشخاص بلاد اسلامی کے دیگر حصص میں اپنا اثر پیدا کر رہے تھے۔ جنگ کریمیا کے بعد سے عبدالحمید[۵۲] کی خود مختاری کے زمانہ تک آزاد خیال ترک فی الواقعی حکومت کے سرگروہ تھے۔ رشید پاشا و مدحت پاشا جیسے ترکی آزاد خیال وزرا نے سلطنت عثمانی کی آزادی اور تجدید کی سچی مگر ناکامیاب کوششیں کیں۔ لیکن سلطان عبدالحمید کے مہلک مظالم بھی ترکی حریت کو فنا نہ کر سکے۔ احرار یا تو چھپ رہے یا ممالک غیر کو چلے گئے اور ۱۹۰۸ء میں انقلاب پیدا کر کے ظالم (عبدالحمید) کو معزول کیا اور نوجوان ترکوں کا اقتدار قائم کر دیا۔ مصر میں حریت کی بنیاد مستحکم ہوگئی اور اس کے نمائندہ ایسے ملک بر آور وہ اشخاص ہوئے جیسے شیخ محمد عبدہ رکن جامع الازہر جو لارڈ کرومر کے واجب الاحترام دوست تھے۔ اور افتادہ اسلامی ٹکڑے جیسے روسی تاتار بھی نئی روح سے بیدار ہوئے اور ان میں روشن خیال[۵۳]

[اھ] صلاح الدین خدا بخش کے "مضامین در بارہ ہندوستان و اسلام"، صفحات ۲۰۰ و ۲۳۴ و ۲۸۸ مطبوعہ لندن ۱۹۱۲ء مصنف

[۵۲] ۱۸۵۶ء لغایتہ ۱۸۷۶ء مصنف

[۵۳] روسی تاتاریوں میں آزاد خیالی کی تحریکات کی بابت ملاحظہ ہو ابہنیس وامبیری کی کتاب "بلاد مشرق میں مغربی تمدن"، مطبوعہ لندن ۱۹۰۶ء مصنف

خواہان ترقی پیدا ہوئے۔

آزاد خیال مصلحین جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہی بلاشبہ اسلامی تدریجی ترقی کے جذبہ میں یہ قدامت پسند بہترین معنی میں ہیں اور صحت بخش تبدیلی کے قبول کرنیوالے ہیں تاہم وہ اپنے موروثی توازن کو قایم رکھنا چاہتے ہیں یہ سچے مذہبی لوگ ہیں اور ان کا ایمان ہی کہ اسلام زندہ اخلاقی قوت ہی۔ اور اسی سے اپنی غذائے روحانی اخذ کرتے ہیں۔

مگر اسلامی دنیا میں اور جماعتیں بھی ہیں جو مغربیت کی ایسی شکار ہو گئی ہیں کہ اُن کو اپنی روحانی اور تمدنی ماضی سے کم وبیش کوئی ربط نہیں رہا۔ اسلامی دنیا کے زیادہ مہذب حصص میں خصوصاً ہند، والجزائر ومصر جیسے ممالک میں جو یورپی تسلط میں عرصہ سے ہیں ایسے مغربی تعلیم یافتہ یا مغربی طرز کے ٹھاٹھ بنائے مسلمان ہیں جن کا مذہبی رویہ بے التفاتی سے لیکر الحاد تک کے مختلف درجہ کا ہی۔ ان کے قلوب سے سابق اسلامی جوش بالکل غصبت ہو گیا۔ اسمعیل حامد الجزائری اپنے ابنائے وطن کے اس فرقہ کی روش کو خوب بیان کرتا ہی "یورپین الحاد کا اثر الجزائر کے مسلمانوں پر بھی پڑا ہی۔ اگرچہ یہ اپنے مذہب کی ظاہری رسومات سے ارتباط رکھتی ہیں لیکن عموماً غیر نافع مذہبی خیال کی نیا دیوں سے تجاہل برتتے ہیں اگرچہ یہ خود اپنے مذہب کو خود ترک نہیں کرتے ہیں لیکن اُن کے خواب وخیال میں بھی غیر مسلم کو مسلم بنانا نہیں آتا اگرچہ یہ چاہتے ہیں کہ اپنی اولاد تک اس کو پہنچا دیں لیکن دیگر انسانوں کی نجات کے لیے ذرا بھی پروا نہیں کرتے یہ نہ تو ایمان ہی اور نہ آزاد خیالی بلکہ سرد مہری ہی۔"[۱]

ان لاابالی آزاد منشوں سے بڑھ کر ایک دوسرا طبقہ ہی جو بالکل ہی مختلف روش پر ہی ان میں نہایت ہی متضاد جذبات کا اجتماع ہی۔ یہ وہ نوجوان ہیں جن کے دماغوں میں انتہائی مغربی خیال مثلاً الحاد۔ اشتراکیت۔ بالشویزم وغیرہ وغیرہ بھرے ہوئے ہیں۔ طرفہ یہ ہی کہ یہ پُرجوش انقلاب پسند مغرب کی مشترکہ منافرت کے لیئے اسلام کے متعصب قدامت پسندوں

---

[۱] اسمعیل حامد کی کتاب موسومہ شمالی افریقہ میں فرانسیسی مسلمان صفحہ ۲۶۸ جو ۱۹۰۶ء میں بمقام پیرس طبع ہوئی

سے متحد ہیں اور اپنے آپ کو جاہل عوام کا پیدائشی لیڈر اور متمتع سمجھتے ہیں۔ یہ انقلاب پسند سیاسی اقتدار کے بھوکے ہیں اور اس مغربی اقتدار سے جو اُن کے بلند دعوے کا سدراہ ہو ناراض ہیں لہٰذا ان میں سے اکثر انتہائی قوم پرست ہیں اور اتحاد بین الاسلامی کے انقلابی منصوبات میں غرق ہیں درحقیقت اکثر ہم کو ایک عجیب منظر نظر آتا ہو کہ ایک ملحد اپنے آپ کو ایک مسلم جانباز کی حیثیت سے پیش کرکے سچی درویشانہ سرگرمی کا اظہار کرتا ہو مسٹر بخش اس قسم کے لوگوں کا نہایت اچھا خاکہ ان الفاظ میں کھینچتا ہو "میں ایک جنٹلمین سے واقف ہوں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو اُن کی زندگی کی کامیابی اُن کے مذہب کی بدولت ہو۔ اگرچہ ظاہر میں وہ کل تعلیم اسلام کا اتباع کرتے ہیں اور وقتاً فوقتاً عام جلسوں میں بھی اپنے ہم مذہبوں کے ترجمان اور نمایندہ کا کام کرتے ہیں لیکن یہ معلوم کرکے مجھے بڑا غصہ آیا کہ اپنے مذہب اور اُس کے بانی کے متعلق اُن کی ایسی رائے تھی جس کو والٹیر غصہ سے اور گبن حقارت سے رد کرتا۔"[۱]

ہم تحریک بین الاسلامی اور قوم پرستی کے باب میں ان رنگوں کی اچھی طرح سے تنقید کرینگے جس چیز پر میں یہاں زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہو کہ اصل اسلامی اصلاحات جن کو مذکورۂ بالا سچے "مصلحین" مکمل کر رہے ہیں ان پر اس کا کیسا خراب اثر پڑے گا؟ جاہل عوام کے مذہبی تعصبات کو مشتعل کرنے کے لیئے ان کی بداندیشانہ خواہشات اور ہر مغربی شے سے سوائے جنگی ترقیات کے منافرت کلی کا اظہار ہوتا ہو جیسا کہ ایک سربرآوردہ نوجوان ترک کے قلم سے نکلا ہو وہ لکھتا ہو "ہاں مسلمانوں کا مذہب تمھاری ترقی کی دنیا کا علانیہ مخالف ہو! اے یورپ کے ناظرین تم کو معلوم ہو کہ ایک عیسائی اس کی کچھ ہی منزلت کیوں نہ ہو صرف نصرانی ہونے کی وجہ سے ہماری نظروں میں ایسی ہستی ہو جو تمام انسانی مراتب سے محروم ہو۔ ہمارا استدلال سادہ اور قطعی ہو ہم کہتے ہیں کہ جس شخص کی قوت تمیز اس قدر درماندہ ہو کہ خدائے

---

[۱] صلاح الدین خدابخش کی تصنیف مندرجہ بالا صفحہ ۲۴۱ مصنف

واحد کی شہادت سے انکار کرے اور مختلف الانواع معبود پیدا کرے تو وہ انسانی حماقت کا بدترین مظہر ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اُس سے بات کرنا ہی ہماری عقل کی حقارت اور ربّ العالمین کی عظمت کے خلاف ایک گناہ ہی جھوٹے معبودوں کا پرستار ناسپاسی کا عفریت ہی وہ کونین میں ملعون ہی اُس سے لڑ کر اُسے مسلمان کرنا یا اُس کو مٹا دینا مسلمان کا سب سے مقدس فرض ہی ہمارے خدائے واحد کے یہ ازلی احکام ہیں اس دنیا میں ہمارے لیئے مسلم یا غیر مسلم صرف دو فرقے ہیں محبت و خیرات و اخوت مسلموں کے لیئے ہی ذلت منافرت اور جنگ غیر مسلم کے لیئے غیر مسلموں میں سب سے زیادہ گناہگار اور مغضوب وہ ہیں جو خدا کو پہچان کر دنیوی والدین سے اُس کی پیدائش بتاتے ہیں۔ اور اُس کے لڑکا اور مال ثابت کرتے ہیں یہ ہولناک ضلالت ہماری نظروں میں ہر قسم کے فسق سے بڑھی ہوئی ہی ایسے مردودوں کی موجودگی ہماری ہستی کے لیئے عذاب ہی۔ اُن کے اصول ہماری مذہبی پاکیزگی کی سخت توہین ہیں اُن کے ارتباط سے ہمارے جسم ناپاک ہو جاتے ہیں اُن سے کسی قسم کا تعلق رکھنا سوہان روح ہی۔

"تم کو نفرت کرتے ہوئے ہم نے تمہاری سیاسی مجالس اور فوجی نظام کو سیکھا۔ علاوہ بریں قدرت نے تمہارے ذریعہ سے ہم تک نئے اسلحہ پہنچا دیئے تم نے خود ہمارے بہادر شہدا کے غیر فانی عقیدہ کو پھر مشتعل کر دیا۔ ہمارے نوجوان ترک۔ ہمارا بابی فرقہ۔ ہماری نئی اخوتیں یہ سب مختلف الاشکال فرقے ہیں، ان کا منشاء اور غرض ایک ہی ہی ان کا کیا مقصد ہی آیا عیسائی تہذیب کا اتباع ہرگز نہیں"[1]

---

[1] یہ مضمون شیخ عبدالحق نے شریف پاشا کے اخبار مشروطیت میں ماہ اگست ۱۹۱۲ء میں لکھا تھا لیکن میں نے اس کو ای سروی ابرکی کتاب "اسلامی حمایت قومی" مطبوعہ قسطنطین ملک البحرایر ۱۹۱۳ء سے نقل کیا ہی ۱۲ (مصنف)

بدقسمتی سے عام مسلمانوں میں ایسے لکچروں کا جلد اثر ہوتا ہے اگرچہ آزاد خیال مصلحین اسلام میں روز افزوں اقتدار حاصل کر رہے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ ابھی قلیل التعداد منتخب جماعت ہیں جن کے پیچھے جاہل عوام ہیں جو دیرینہ جہالت کی تاریکی میں مبتلا ہیں اور اپنی ہی دنیا کے مدح سرا ہیں اور اسی کو انسانی ہستی کا بہترین نمونہ اور تعصب سے ہر بیرونی چیز کو خراب و قابل نفرت اور فریب دہ سمجھتے ہیں ان کو اگر مغرب کی برتری کا اعتراف بھی مجبوراً کرنا پڑتا ہے تو اُن کی نفرت کسی طرح سے کم نہیں ہوتی۔ اس تبدیلی کی روح سے جو اُن کو پرانے راستوں سے نکال رہی ہے اندھا دھند سرکشی کرتے ہیں۔ اس عالمگیر مغربی اقتدار سے جو اُن کو چاروں طرف سے دبا رہا ہے اُن کا غصہ اور بھی بڑھ جاتا ہے ایسے لوگ اتحاد بین الاسلامی اور تحریک قوم پرستی کے رہنماؤں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ہیں۔ جو اُن کو اپنے ناجائز اغراض کے لیے حسب دل خواہ ڈھال لیتے ہیں۔

درحقیقت اسلام آج آزادانہ اصلاحی اور مبالغہ آمیز وطن پرستی کی انقلابی قوتوں میں منقسم ہے ارتقائی اصلاح کی تنہا امید صرف لبرل سے وابستہ نہیں ہے بلکہ رفتار زمانہ بھی اُن کے موافق ہے۔ کیونکہ اسلامی دنیا میں مسلسل طور پر مغربی ترقی سرایت کر رہی ہے اور یہ عمل اسی طرح سے جاری رہے گا سوائے اس کے کہ مغربی تہذیب خود برباد وتباہ ہو جائے۔

اگرچہ آزاد خیالوں کی کامیابی اغلب معلوم ہوتی ہے لیکن یہ غالی وطن پرست اور انقلاب پسند معلوم کیا کیا تاخیرات یا جنگی اور متعصبانہ رکاوٹیں پیدا کر دیں گے۔ اسلامی اصلاحات اور مشرق و مغرب کے تعلقات خطروں سے خالی نہیں۔ ان نامبارک امکانات پر ہم بعد میں بحث کرینگے۔

فی الحال یہ امید لگی ہی کہ کُل بلاد اسلام ہیں متعدد اور صاحب اقتدار قلیل التعداد جماعتیں ہیں جن میں صرف مغربی تعلیم یافتہ اشخاص بلکہ راسخ الاعتقاد قدامت پسند بھی ہیں جو اسلام کے انحطاط سے واقف ہیں اور آزاد اور ارتقائی طریقوں پر مکمل اصلاح کو عملاً ضروری اور مقدس فرض سمجھتے ہیں یہ ابتک طے نہیں ہوا ہی کہ اصلاح کس طرح ہو گی ہو ذرائع اصلاحات کی مفصل بحث ہمارے پیش نظر امور کے لیئے ضروری نہیں[1] ہی۔ تاریخ ہم کو بتاتی ہی کہ جب اصلاح کرنے کی سچی خواہش موجود ہوتی ہی تو کسی نہ کسی طریقہ سے اصلاح پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی ہی۔

یہ یقینی امر ہی کہ اصلاحی روح نے اپنے مختلف مکاشفات سے کل اسلام میں ایک گہری تبدیلی پیدا کر دی ہی موجودہ اسلامی دنیا سو سال پیشتر کی اسلامی دنیا سے بالکل مختلف ہی وہابی انقلاب نے خرابیوں کو مٹا کر ایک خالص تر مذہبی نور ایمان کو پھر روشن کر دیا ہی اس کے متعصبانہ جوش کا بھی معاوضہ اخلاق سے ہو گیا آزاد خیالوں کے اصول اور مغربی ترقی کی اشاعت سرعت سے ہو رہی ہی مستقبل کے لیئے اگر بہت سے مخاطرہ ہیں تو بہت سی امیدیں بھی ہیں۔

---

[1] ان جائز تدابیر کی بحث کے لیئے ملاحظہ ہو ڈبلیو۔ ایس بلنٹ کی کتاب مستقبل اسلام مطبوعہ لندن ۱۸۸۲ء ای۔ بی۔ رشاتلی ایر کی کتاب "انیسویں صدی کا اسلام" مطبوعہ پیرس ۱۸۹۸ء۔ ڈاکٹر پیروں کی کتاب اسلام مطبوعہ پیرس ۱۸۹۸ء۔ ایچ این بریلسفورڈ کا مضمون "اسلام میں عہد حاضرہ کا نفاذ" جو ستمبر ۱۹۱۹ء میں فورٹنائٹلی ریویو میں شایع ہوا۔ سر تھیوڈور ماریسن کا مضمون "کیا اسلام میں اصلاح ہو سکتی ہی" جو اکتوبر ۱۹۱۹ء میں نائنٹینتھ سنچوری اینڈ آفٹر میں شایع ہوا۔ موسیو پکتال کا مضمون اسلامی اخلاق جو جولائی ۱۹۱۹ء میں ریویو پولیٹک انٹرنیشنل میں شایع ہوا۔ ۔۔ کا مضمون اسلام بعد از جنگ جو پندرہ جنوری ۱۹۱۶ء کو ریویو دی پیرس میں شایع ہوا۔ مصنف

فصل دوم

اتحاد بین الاسلامی

تمام بڑی تحریکات کی طرح نشأۃ اسلامی بھی پیچ در پیچ ہے۔ اس کی ابتدا سادہ اور خالص وہابی احتجاج سے ہوئی اُس نے . . . نہایت مختلف اور بعض اوقات تقریباً متضاد صورتیں اختیار کیں فصل ماسبق میں ہم اسلام کے اصلاح ارتقائی اور اصلاح کے اُس پہلو کا ذکر کر چکے ہیں جس کا رجحان مغربی تہذیب کی ترقی کن روح اور رسوم ظاہری کے اتباع کی طرف ہے اس کے ساتھ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ یہ آزاد مصلحین ابھی تک جماعت اقل یعنی منتخب اشخاص ہیں درانحالیکہ عام مسلمان جو ابھی تک جہالت میں غرق ہیں اور دیرینہ خواب غفلت سے ہنوز اچھی طرح بیدار نہیں ہوئے ہیں دوسرے لیڈروں کے زیر اثر ہیں جو مصلحین سے یکسر مختلف الخیال ہیں اور پُرامن طریقوں کے مقابلہ میں فتنہ کی طرف اور مغربی تعلیم کے قبول کرنے کی بجائے اُس کی مخالفت پر مائل ہیں یہ فتنہ انگیز قوتیں بھی بجائے خود پیچیدہ ہیں اور اُن کی تقسیم عام ادراک کے تحت میں اتحاد بین الاسلامی اور قوم پرستی کی تحریکات میں ہو سکتی ہے ان دو خیالات میں سے پہلے یعنی اتحاد بین الاسلامی کی بحث اس فصل میں کی جاوے گی۔

اتحاد بین الاسلامی اپنے بسیط معنی میں سچے مسلمانوں کے باہمی اتحاد کا ولولہ ہے اور یہ رسول خدا صلعم کے زمانہ سے ہے جبکہ آنحضرت صلعم اور اُن کے چند متبعین اپنے ہموطن بُت پرستوں کے مقابلہ میں جو اُن کے درپے تخریب تھے مذہبی رشتہ سے متحد ہو گئے

تھے۔ آنحضرت صلعم مسلمانوں کے لیئے باہمی برادرانہ اتحاد کے اصول کو نہایت اہم سمجھتے تھے
اور آنحضرت نے اُس کو مسلمانوں کے قلوب میں ایسا راسخ کردیا کہ تیرہ صدیوں کے
دوران میں اس میں کوئی کمزوری نہیں پیدا ہوئی۔ آج ایک مسلمان کا دوسرے
مسلمان سے رشتہ اُس رشتہ سے بہت زیادہ مضبوط ہی جو ایک عیسائی کا دوسرے
عیسائی سے ہی۔ بلاشبہ مسلمان آپس میں بُری طرح لڑتے ہیں لیکن ان جھگڑوں میں
خانہ جنگی کی صورت ہمیشہ باقی رہتی ہو اور مشرکین کی تعدی کے وقت یہ جھگڑے معرض
التوا میں آجاتے ہیں۔ اسلام کے عظیم اتحادی احساس سے غالبًا سب سے بڑا پتہ اس امر کا
ملتا ہی کہ اسلام کا اپنے پیروان پر ایسا زبردست اثر کیوں ہی۔ کسی دوسرے مذہب کا
اپنے پیروان پر ایسا اثر نہیں ہی۔ اسلام نے نصرانیوں اور ہندوؤں[1] کے وسیع ممالک
فتح کیئے اور مجوسیوں[2] کو روئے زمین سے نکال دیا لیکن ایسی ایک بھی مثال نہیں ملتی
کہ جو قوم ایک مرتبہ مسلمان ہوگئی، اُس نے کبھی بھی ترک مذہب کیا ہو۔ یہ ممکن ہی کہ
وہ بالکل مٹ گئے ہوں مثلاً اسپین میں۔ مگر مٹ جانا ارتداد نہیں ہی۔

اسلامی اتحاد کو اُس کے دو اصلی ارکان یعنی حج اور خلافت سے بدل دیتا ہو
مغربی عام رائے کے خلاف حج بہ نسبت خلافت کے متواتر اتحادی اثرات پیدا کرنے کا
بڑا باعث ہی آنحضرت نے حج کو مذہب کا بڑا رکن بنایا اور ہر سال پورے ایک لاکھ حاجی
حج میں جمع ہوتے ہیں جو دنیائے اسلام کے ہر گوشہ سے آتے ہیں۔ یہاں مقدس کعبہ کے

---

[1] اسلام نے صرف مذہب براہمہ کی وطن ہندوستان ہی میں قدم نہ جمایا بلکہ جزیرہ ہائے جاوا و سماترا کی تقریبًا
کل آبادی کو مسلمان بنا لیا جہاں پر مذہب براہمہ کا پہلے بہت زور تھا۔ (مصنف)

[2] ہندوستان کی قلیل پارسی جماعت جن کا مرکز بمبئی ہی مذہب زرتشت کے باقی ماندہ ہیں۔ ساتویں صدی میں
جب مسلمانوں نے ایران کو فتح کرلیا تو وہ دشتی پناہ گزینوں کی طرح یہاں آکر اقامت ڈالی۔

سامنے ہر نسل۔ ہر زبان۔ ہر تمدّن کے مسلمان مشترکہ عبادت کے وجد میں ایک دوسرے سے ملاقی ہوتے ہیں اور حاجی کا قابل فخر خطاب لیکر واپس جاتے ہیں یہ ایسا خطاب ہے کہ جس کی وجہ سے ان کے مسلمان بھائی پایان عمر تک اُن کا احترام کرتے ہیں۔ حج سے جو سیاسی منافع متصور ہیں وہ ظاہر ہیں حقیقتاً یہ سالانہ بین الاسلامی کانگریس ہے جہاں بلاد اسلامی کے ہر حصہ کے نمائندے مذہبی مفاد پر بحث کرتے ہیں اور اسلام کے تحفظ اشاعت کی تدابیر سوچتے ہیں یہاں پر تقریباً اسلامی بیداری کے تمام جنگجو رہناؤں مثلاً عبدالوہاب و محمد بن سنوسی و جمال الدین الافغانی اور بہت سے اشخاص نے اپنے فرائض کے ادا کرنے کی اہمیت کو محسوس کیا۔[1]

اب رہی دوسری شق یعنی خلافت تو اُس نے اپنے ابتدائی زمانہ میں ایک بڑا تاریخی کام کیا ہے اور ہم اس کے مختلف ادوار کا ذکر کر چکے ہیں تاتاری فتنہ میں بغداد تباہ ہو گیا اور اُس کے بعد خلافت کی ہستی محض موہوم رہ گئی لیکن ترکی سلاطین نے اس کو پھر زندہ کیا انھوں نے اس خطاب کو اختیار کیا اور راسخ الاعتقاد اسلامی دنیا نے اُن کو خلیفہ تسلیم کیا۔[2]

---

[1] اگرچہ غیر مسلم کو مکہ جانے کی ممانعت ہے لیکن چند یورپیوں نے بھیس بدل کر حج کیا ہے اور انھوں نے اپنے معاینات کو لکھا ہے اُن میں سے اسنوک ہرگرونج کی کتاب مکہ جو دو جلد میں بمقام ہیگ ۱۸۸۸ء میں طبع ہوئی اور "حج مکہ" جو ۱۹۰۸ء میں بمقام لندن طبع ہوئی بہترین تازہ تصانیف ہیں۔ نیز ملاحظہ ہو تصانیف برٹن و بورکہارٹ ایک آزاد خیال مسلمان غضنفر علی خان نامی نے حال میں ایک گرانقدر کتاب حجاج کے ساتھ مکہ کو ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹۰۱ء کا حج اکبر لکھی ہے جس کا دیباچہ ارمنیس وامبری نے لکھا ہے یہ کتاب لندن میں ۱۹۰۵ء میں طبع ہوئی۔ (مصنف)

[2] ایران کے شیعہ کسی سنی یا راسخ الاعتقاد کی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے اور میدا پنہ شریف سلطان کو مذہبی پیشوا مانتے ہیں۔ مصنف

مگر یہ استانبولی[۱] سلطان خلفا روہ مذہبی اقتدار نہ حاصل کر سکے جو ان کے پیشرو مکہ اور بغداد والوں کو حاصل تھا۔ عرب کی آنکھوں میں بالخصوص ترکی خلیفہ گردش ایام کی یادو تھے۔ اور حقیقتاً وہ اس سے کبھی بھی راضی نہ ہوئے سلطان عبد الحمید نے بلاشبہ خلافت کی سابقہ عظمت کی تجدید کی کوشش کی۔ لیکن جو کچھ کامیابی اُن کو حاصل ہوئی وہ زیادہ تر عام اتحاد بین الاسلامی کے خیالات کی رو کی وجہ سے تھی صرف خلیفہ کے نام کے اقتدار کی بدولت نہ تھی موجودہ اتحاد بین الاسلامی کے اصلی لیڈروں نے یا تو محض عبد الحمید کی مشروط اطاعت کی۔ یا سنوسی کی طرح بالکل مخالفت کی۔ یورپ نے اس کو محسوس نہ کیا اور عبد الحمید کو مسلمانوں کا پوپ سمجھ کر اس سے خائف ہو گئے۔ آج بھی بہت سے مغربی ناظرین کا خیال ہے کہ اتحاد بین الاسلامی کا مرکز خلافت ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کے اخبار نویس نہایت امیدوں کے ساتھ یہ بحث کرتے ہیں کہ آیا غیر معتمد ترکی سلاطین میں خلافت رہنے یا شریف مکہ کی طرف انتقال ہونے یا بالکل معدوم ہونے سے اتحاد بین الاسلامی کے پرکٹ جائینگے۔ مگر یہ خیال بین طور پر کوتاہ اندیشی پر مبنی ہے۔ بلاشبہ اسلام میں آج بھی عہدہ خلافت کی بڑی توقیر ہے لیکن موجودہ اتحاد بین الاسلامی تحریک کے دوراندیش لیڈر عرصہ سے ایک وسیع تر بنا پر کام کر رہے ہیں وہ محسوس کرتے ہیں کہ اتحاد بین الاسلامی تحریک کی اصلی قوت محرکہ خلافت نہیں ہے بلکہ حج اور سنوسیہ جیسے بڑے بین الاسلامی اخوتوں کے نظامات ہیں جس کا ذکر عنقریب کیا جائے گا۔[۲]

---

[۱] قسطنطنیہ کا ترکی نام ہے مصنف۔ یہ لفظ دراصل استانہ بول ہے چونکہ بابعالی یا آستانہ یہاں واقع ہے لہذا یورپی حصہ قسطنطنیہ کا استانبول کہلاتا ہے ایشیائی حصہ اسلامبول مشہور ہے" مترجم

[۲] مسئلہ خلافت پر ملاحظہ ہو سر ولیم میور کی کتاب "خلافت اس کا عروج انحطاط۔ اور ہبوط"، مطبوعہ لندن ۱۹۱۵ء سر مارک سائیکس کی کتاب "خلیفہ کی آخر میراث"، مطبوعہ لندن ۱۹۱۵ء اور "× × کا مضمون" اسلام بعد جنگ" جو ۲۵ جنوری ۱۹۱۶ء کو ریویو ڈی پیرس میں شائع ہوا۔ اور "ہندوستانی وفد خلافت" جو جولائی ۱۹۲۰ء کی فاین فیرس کی خاص تمہ میں شائع ہوا۔ مصنف

اب ہم کو موجودہ اتحاد بین الاسلامی کی کامیابی کی تحقیق کرنی چاہیے۔ بلاشبہ اس کی پہلی منزل وہابی تحریک تھی عبدالوہاب نے نجد میں جو وہابی سلطنت قائم کی تھی وہ مکہ کے خلفا کی الٰہی جمہوریت کے نمونہ پر تھی اور جب عبدالوہاب کے شاہی مرید یعنی سعود نے اپنے جوشیلے عساکر کو بلاد مقدسہ پر چھوڑا تو وہ اُس کو خلوص کی فتوحات اور جمیع دنیائے اسلام کے استحکام کا پہلا قدم خیال کرتا تھا اگرچہ وہابیت کو اس عظیم مقصد میں شکست ہوئی تاہم اُس نے شمالی ہندوستان اور افغانستان جیسے دور دراز ممالک میں [illegible] سیاسی ہنگامے برپا کیے۔ مگر یہ سب وہابیت کے اجزائے ترکیبی تھے۔ اور حقیقتاً اسلامی سلطنتوں کے سیاسی زوال اور اسلامی حکمرانوں کی پستی اخلاق کے خلاف احتجاج تھے یہ ہنگامے مغرب سے خوف یا نفرت کی بدولت برپا نہ ہوئے تھے۔ کیونکہ یورپ ابھی تک [illegible] دور افتادہ مقامات مثل یوروپی ترکی اور ہندوستان کے حقیقتاً اسلام پر [illegible] ہوا تھا۔ اور اسی وجہ سے آئندہ خطرہ کا احساس کامل نہ ہوا تھا۔

مگر انیسویں صدی کے وسط میں حالت بالکل بدل گئی الجزائر کی فرانسیسی فتح اور [illegible] قفقاز پر روسی قبضہ اور کل ہندوستان پر انگریزی تسلط نے دور اندیش مسلمانوں کو ہر جگہ پر یقین دلا دیا کہ اسلام کو مغربی اقتدار کے تحت میں آنے کا ہولناک خطرہ ہے اس [illegible] اتحاد بین الاسلامی کی تحریک نے مغربی مخالفت کی اصل صورت اختیار کی اور اس وقت سے برابر اسی شکل سے قائم ہے۔ مغربی مداخلت کی مقاومت ابتداً منتشر اور غیر متحد تھی کہیں کہیں پر بہادر اشخاص جیسے عبدالقادر الجزائری[1] اور

---

[1] عبدالقادر کے والد ایک مرابط تھے جن کے کچھ مرید بھی تھے۔ جبکہ فرانسیسی حملہ الجزائر پر جاری تھے اور اہل ملک فرانسیسی مظالم اور دستبرد سے نہایت برافروختہ تھے عبدالقادر کے والد نے شہر اوران پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ شہر والوں نے عبدالقادر کو اپنا سردار منتخب کیا یہ ۱۸۰۸ء کے قریب پیدا ہوئے اور

شمیل کوہ قاف میں یورپین حملہ آوروں کے خلاف بہادری سے لڑے اگرچہ ان غادیان

(بقیہ صفحہ ۴۴) اپنے ہم وطنوں میں اپنے علم و زہد کے لیے مشہور تھے فنون حرب و شہسواری میں بھی ان کو اچھی مہارت تھی۔ انھوں نے دو مرتبہ حج کیا۔ ایک مرتبہ کمسنی میں اپنے والد کی معیت میں اور دوبارہ ۱۸۲۶ء میں۔ اس زمانہ میں وہ عزلت نشین تھے اور اپنے تقوے و زہد اور پابندی شریعت کے لیے مشہور تھے انھوں نے دس ہزار فوج جمع کر کے اپنے والد کے ساتھ وہران پر حملہ کیا جو فرانسیسی قبضہ میں تھا۔ مئی ۱۸۳۲ء میں موقع پر پہونچکر تین دن تک حملہ جاری رکھا لیکن ناکامیاب رہے۔ اس کے بعد فریقین میں سخت جنگ و جدال جاری رہی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ مارچ ۱۸۳۳ء میں ڈیوک رووِیگو خرابی صحت کی وجہ سے واپس گئے اور جنرل درال مقرر ہوئے۔ اس عرصہ میں عبدالقادر نے اپنا اثر بڑھا لیا۔ اور بالآخر صلح ہو گئی جس سے اہل فرانس غیر مطمئن رہے۔ کچھ عرصہ تک امن و امان قایم نہ ہوا لیکن فرانسیسیوں کو امیر عبدالقادر کے اقتدار پر حسد ہوا اور اس بنا سے کہ امیر ان کی حدود میں مداخلت کر رہا ہے لڑائی چھیڑ دی ۲۸ جون ۱۸۳۵ء کو فرانسیسیوں کو شکست فاش ہوئی اور بڑے نقصان اٹھانے پڑے۔ امیر کو ذلیل کرنے کے لیے اس کے پایہ تخت پر حملہ کیا گیا۔ لیکن شہر خالی پڑا تھا اسے جلا کر فرانسیسی بے نیل مرام واپس آئے ۔ ۱۸۳۶ء میں مارشل کلوزل نے طلمسین پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد امیر نے تین ہزار فرانسیسیوں کو ہزیمت دی ۔ جولائی ۱۸۳۶ء کو عبدالقادر کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔ بالآخر فرانسیسیوں نے صلح کی درخواست کی اور ۳۰ مئی ۱۸۳۷ء کو صلح طے ہو گئی۔ چونکہ امیر سے سرحدی نزاعات ہوتے تھے جنگ کا دوبارہ اعلان فریقین میں ہو گیا ۱۸۳۹ء میں فرانسیسیوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا ۱۸۴۱ء میں فرانس سے بڑی کمک آئی اور عبدالقادر کو ہر جگہ پسپا ہونا پڑا اکثر قبایل نے امیر کا ساتھ چھوڑ دیا قلعہ تکدمت اور دارالسلطنت معسکر امیر کے قبضہ سے نکل گیا۔ اب ہر طرف سے قبایل نے ہتھیار ڈالنے شروع کر دیے اور کوئی فرانس کے قبضہ میں آگیا۔ بالآخر امیر نے اپنے آپ کو فرانسیسیوں کے حوالہ کر دیا اور اس کو خلاف معاہدہ ۲۹ ر جنوری ۱۸۴۸ء کو فرانس لے گئے اور مقید کر دیا ۱۸۵۲ء میں اس کو آزادی ملی اور بروصہ میں رہنے لگا۔ ۱۸۵۵ء میں وہ قسطنطنیہ چلا گیا اور وہاں سے بعد دمشق ہجرت کی۔ الحاق گرجستان کے بعد روس کو بڑی فکر رہی

اسلام کی مسلمانوں نے عام طور سے ہمدردی کی لیکن ان کو کوئی قابل قدر مدد نہ ملی - اور بلا مدد کے وہ مغلوب ہوگئے۔

مگر مغرب سے خوف اور نفرت کا زور بتدریج بڑھنے لگا- اور ۱۸۷۰ء کے قریب یہ نظر آیا کہ تمام اسلامی دنیا میں ایک کنارے سے دوسرے کنارہ تک جنگجویانہ تعصب کی لہر دوڑ گئی - ۱۸۷۱ء میں الجزائر کے قبائل نے بغاوت شروع کی اور تمام شمالی افریقہ میں جوشیلے اولیا اُٹھ کھڑے ہوئے جنھوں نے جہاد کی تلقین کی سب سے بڑی بغاوت مصری سوڈان میں مہدویوں کی تھی اور باوجود انگلستان کی بہترین کوشش کے یہ شورش

بقیہ صفحہ ۴۰ | کہ درمیانی حصہ یعنی کوہ قاف پر قبضہ کرے ۱۸۲۹ء میں صلحنامہ ادرنہ سے ترکوں نے یہ علاقہ روسیوں کو تفویض کردیا ۱۸۲۹ء لغایتہ ۱۸۵۹ء میں اس کوہستان کی قبایل برابر روسیوں سے جنگ کرتی رہیں جب چرکسی نزاعات بند ہوئیں تو بحر خزر کے کنارہ جابجا دشمن روس پیدا ہوگیا- یہ شمائیل تھا- جو بہادر ملا اقاسی کا فرمان بردار مرید تھا اس نے اپنے سردار کی وفات کے بعد قبیلہ لسغی کی سرداری اختیار کی اس نے مختلف قبایل کو متحد کرکے متعدد فتوحات حاصل کیں- اجولکو کے قلعہ سے اس کا نکل آنا اس کے متبعین اور دشمن دونوں کی نظر میں کرامت معلوم ہوتا تھا- روسیوں نے جو کچھ مساعی کیں اُن کو شمائیل نے بیکار کردیا ۱۸۴۲ء میں جنرل گربیٹ نے چڑھائی کی تو یہ اقوام نہایت پریشان تھیں لیکن شمائیل نے اشکری کے جنگل میں روسیوں کو شکست فاش دی- متعدد روسی جنرل مامور ہوئے لیکن کوئی مستقل نتیجہ نہ پیدا کرسکا ۱۸۵۶ء میں پھر روسیوں نے جدوجہد شروع کی شمائیل کی انتہائی کوششیں کوئی نتیجہ حاصل نہ کرسکیں- اور روسی بتدریج بڑھنے لگے اور ۱۸۵۸-۵۹ء میں شمائیل کے خاص قلعہ ویڈن پر قبضہ کرلیا- اکثر قبائل نے روسی اطاعت قبول کرلی اور ۶ ستمبر ۱۸۵۹ء کو شمائیل قید ہوگیا۔

مترجم

اُس وقت تک قایم رہی جب تک کہ صدی کے آخر میں کچنر نے خرطوم پر قبضہ کیا
افغانستان میں بھی مذہبی جوشش کا دور تھا جس کی ہندوستانی مسلمانوں نے بھی
ہمدردانہ ہم آہنگی کی۔ ان دونوں نے حکومت برطانیہ کو بڑی مشکلات میں ڈالا۔ وسطی
ایشیا میں بھی مذہبی جوش کا اظہار ہوا اور اس کا مرکز باقتدار نقشبندیہ[1] فرقہ تھا۔ یہاں سے یہ مشرق
کی طرف چینی ممالک میں پھیل گیا۔ اور چینی مسلمانوں نے چینی ترکستان اور یون[2] نن دونوں
جگہ بغاوتیں کیں۔ ڈچ ایسٹ انڈیز میں بھی بغاوتوں کا کامل سلسلہ تھا۔ اور ان میں سب سے

---

[1] نقشبندیہ خاندان صوفیوں کے ایک مشہور خاندان کا نام ہے جس کا سلسلہ حضرت بہاء الدین
نقشبند سے چلا ہے جو ساتویں صدی ہجری کے قریب شہر بخارا میں تھے۔ چونکہ آپ کے
ہاں نقاشی و گلکاری کا کام ہوتا تھا یعنی مشجر اور چکن وغیرہ تیار ہوتی تھی اس وجہ سے
یہ لقب پڑ گیا۔ بعض لوگوں کا بیان ہے چونکہ اس خاندان میں دل کی شکل پر تصور جما کر شغل کیا جاتا
ہے اس سبب سے نقشبندیہ خاندان کہلاتا ہے۔ ۱۲ مترجم

[2] مانچو کے اجنبی خاندان کے زوال کے لیئے جو شورش الموسوم بہ "تپائی" شروع ہوئی اُس کی
فرو ہونے پر بھی افواج شاہی کو یون نن میں سلیمان نے قابض نہ ہونے دیا۔ اس جماعت کے خلاف
سلطنت نے کوئی سرگرمی نہ دکھائی لیکن ۱۸۷۲ء میں جب سلیمان کے متبنیٰ شاہزادے حسن نے انگلستان کو
سفارت اس غرض سے بھیجی کہ سلطنت برطانیہ اُس کے باپ کی سلطنت کو تسلیم کرے تو شاہی
سلطنت کو ناگوار ہوا اور فوراً ایک فوج قاہرہ اس صوبہ کو روانہ کی گئی۔ حملہ میں ایسی جد و جہد کی گئی
کہ ایک سال ہی میں مسلمانوں کا پایہ تخت تالیفو فتح ہو گیا۔ اور سلیمان کے طرفداران
خاص نہ اما السلطنت اور کل صوبہ بھر کہ بالکل ہی نیست و نابود کر دیے گئے۔

مترجم۔

زیادہ خطرناک جنگ آچین[1] تھی جو غیر محدود زمانہ تک جاری رہی اور آج بھی بالکل فرد نہیں ہوئی۔

اس زمانہ کی جنگی شورشوں کی نمایاں خصوصیت یہ ہو کہ ان میں اتحاد مفقود تھا یہ تمام خروج مقامی آبادی کے فوری جوش کا نتیجہ تھے۔ بلاشبہ یہ خوف اور نفرت کی ایک ہی روح سے زندہ اور ایک ہی مذہبی جوش کے توقعات سے مشتعل تھیں لیکن کسی ایسی مرکزی قوت کی موجودگی کی شہادت نہیں ملتی ہو کہ جس نے باضابطہ تدابیر بتائی ہوں اور کسی مقررہ پروگرام کے موافق عمل کیا ہو۔ یہ بغاوتیں زیادہ تر صوفیانہ مسئلہ مہدویت سے پیدا ہوئیں۔ مہدویت ابتدائے اسلام میں غیر معروف تھی اور قرآن شریف سے اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا ہو۔ لیکن احادیث میں جو رسول خدا کے اقوال ہیں یہ پایا جاتا ہو کہ رسول خداؐ نے ایک شخص کے ظہور کی پیشین گوئی کی ہو جس کا لقب "المہدی" ہوگا اور جو دنیا کو مساوات اور انصاف سے معمور کر دے گا اس سے ایک عام صوفیانہ امید پیدا ہوئی کہ ایک مؤید من اللہ کا ظہور ہوگا جو تمام دنیا میں اسلام کے جھنڈے گاڑ کر باطل پرستی کو مٹا دے گا۔ اور مسلمانوں کی کامرانی ہمیشہ کے لیئے قایم کر دے گا۔ اس مسئلہ نے اسلامی تاریخ پر بڑا اثر ڈالا مختلف اوقات میں جوشیلے سر برآوردہ اشخاص نے خروج کیا۔ اور مہدویت یا صاحب الزماں ہونے کا دعوے کیا اور مسلم عوام نے

---

[1] آچن یا اچین یا اتجہ۔ شمالی سماترا کا ایک ضلع ہو۔ خاص شہر کوٹا راجہ ہو۔ آبادی زیادہ تر مسلمان ہو لیکن توہم پرستی بہت زیادہ ہو عرصہ دراز تک خود مختار رہا سترھویں صدی میں پرتگالیوں کا مقابلہ کامیابی سے کیا۔ ۱۸۷۳ء میں ہالینڈ والوں نے فتح کیا۔ لیکن بغاوت جاری رہی حتیٰ کہ ۱۹۱۰ء میں فرد ہوئی۔ اندرونی حصہ کوہستانی ہو اور ساٹھ لاکھ کی آبادی ہے۔ مترجم

مجنونانہ طور پر اُن کا اتباع کیا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ بعض مسیحوں نے یہودیوں میں جوش پیدا کر دیا تھا[1]۔ یہ قدرتی بات تھی کہ مغربی تعدی سے روز افزوں ہراس اور ناتوانی کے غصہ میں عام مسلمان ان مصائب سے نجات دلانے والے مہدی کا انتظار کریں۔ تاہم مہدویت فطرتاً کوئی عملی یا مستقل نتیجہ نہ پیدا کر سکی۔ یہ صرف گھاس کی آگ تھی جو جابجا بہت زور سے شعلہ زن ہوئی اور پھر بجھ گئی۔ اور عوام اس طلسم کے باطل ہونے سے پہلے سے بھی زیادہ پست ہمت اور مردہ دل ہو گئے۔

اتحاد بین الاسلامی کے معاونین نے ان سب کو محسوس کیا یورپ کے باقاعدہ

---

[1] مسیحا کا ظہور مسیحا جس کو یونانی میں کرستو کہتے ہیں اس سے ایسی ذات مراد ہے جس کے بنی اسرائیل اپنی خلاصی اور کامیابی کے لئے منتظر ہیں اس قومی توقع نے مختلف صورتیں اختیار کیں مثلاً "ایک ایسا نبی جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ داؤد علیہ السلام کے خاندان کا بادشاہ" "متحمل خادم" اور "بنی آدم سے مشابہ ذات"۔ بنی اسرائیل کی حکمرانی ختم ہونے پر اس خیال سے موجودہ سیاسیات کی تعبیر کی حیثیت تو کھوئی اور محض اس کا یہ منشا رہ گیا اسرائیلی دینیات میں ارثاً بعد ارث منتقل ہونے لگا۔ لہٰذا بنی اسرائیل ایسے موعود من اللہ بادشاہ کے منتظر رہنے لگے جس پر کتاب مقدس کے الفاظ کا ایسا کامل اطلاق ہو کہ پہلے کسی پر نہ ہوا ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جن مقامات پر یہ الفاظ واقع ہوئے ہیں اُن کو پیشن گوئیاں مان لیا اسی بنیاد پر وقتاً فوقتاً متعدد مسیح کاذب نمودار ہوئے چنانچہ ۲۰ء میں یونس شامی پیدا ہوا۔ خلافت بنی امیہ کے زوال پر بھی ظہور مسیح کی بڑی امید تھی۔ ابو عیسیٰ اصفہانی نے اپنے آپ کو مقدمۃ الجیش مسیح ظاہر کیا۔ بارھویں صدی کے وسط میں آذربائجان کے یہودیوں میں داؤد الروی نے دعویٰ کیا۔ ابراہیم ابو لفیا سرغوسی نے دعوی پر بنا روایات کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابر بنیل نے ظہور مسیح کا وقت ۱۵۰۳ء مقرر کیا۔ سولھویں صدی میں متعدد مسیح پیدا ہوئے۔ مترجم

قوت کے مقابلہ میں مقامی جوش کے تند ترین سیلاب کی ناتوانی نے صاحب فکر مسلمانوں کو باور کرا دیا کہ اگر اسلام یورپ کے جوئے کو اُتارنا چاہتا ہے تو اُس کو مدتوں تک تیاری اور متحدہ مکمل سعی کرنا ضروری ہے ان لوگوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ہم کو مغربی طرز سیکھنا چاہئیں اور قوت کا استعمال مغربی طریقے پر کرنا چاہیے مزید براں اُنھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ قبل اس کے کہ اسلام کو مغربی سیاسی اقتدار سے خلاصی ملے کامل روحانی بیداری ہونی چاہیے تاکہ وہ اخلاقی قوے پیدا ہو جائیں جو حریت کی جنگ میں اور اس کے بعد دوبارہ تعمیر کی کامیابی کے لیے ازبس ضروری ہیں۔ اتحاد بین الاسلامی اور احرار کے نقطۂ خیال کا اتصال اسی مقام پر ہوتا ہے دونوں اسلام کی موجودہ پستی کو تسلیم کرتے ہیں اور دونوں روحانیت کی پیدایش نو کے متمنی ہیں یہ دونوں گروہ اس امر پر مخالف ہیں کہ یہ نشاۃ کس قسم کی ہو آزاد خیال طبقہ کا یہ عقیدہ ہے کہ اسلام میں مغربی خیالات پورے طور سے سرایت کر جائیں برخلاف اس کے اتحاد بین الاسلامی کے یہ مویدین یقین کرتے ہیں کہ ابتدائے اسلام میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں جو نئی زندگی کے لیے درکار ہیں اور اُن کی رائے ہے کہ دنیائے اسلام کو صرف مغربی اسلوب اور مادی ترقیات ہی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ایسے اتحاد بین الاسلامی کی تحریک جس کے حامیوں کو اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہو گیا باقاعدہ طور پر اُنیسویں صدی کے وسط میں شروع ہوئی یہ تحریک دو مرکزوں پر قایم ہوتی ہے یعنی نئی قسم کی مذہبی اخوتیں جیسے سنوسیہ یا اُن اصحاب غور و فکر کی تبلیغی جماعتیں جن کے سرگروہ جمال الدین تھے اولاً ہم اخوتوں پر غور کریں گے۔

اسلام میں صدیوں سے مذہبی اخوتیں پائی جاتی ہیں ان سب میں ایک ہی قسم کا عام نظام ہے یعنی یہ کہ وہ زاویوں میں منقسم ہیں جن کے سرگروہ مقدم کہلاتے ہیں جو تھوڑا بہت اختیار اخوان پر رکھتے ہیں سنوسی جیسے اخوتوں سے قبل جو نئے نظام پر بنائے گئے ہیں پرانی اخوتوں کا دنیوی معاملات پر بہت کم اثر ہوتا تھا۔ ان کے اغراض تقریباً مذہبی

اور صوفیانہ عبادات کی نوعیت کے تھے۔ ان کی خصوصیت سخت نفس کشی اور ایسے مذہبی شغف تھے جن پر حال وقال والے درویش عمل کرتے ہیں اگر کوئی سیاسی اثر یہ ڈالا کرتے تھے تو وہ عارضی اور مقامی ہوتا تھا ان کے باہمی رقابتوں اور حسد کی وجہ سے اتحاد عمل ناممکن تھا اس قسم کے پرانے طرز کی اخوتیں آج بھی بہت سی موجود ہیں لیکن بجز اس کے کہ جدید قسم کی اخوتوں کا ان پر کچھ رنگ چڑھا ہے یہ سیاسی اہمیت نہیں رکھتے ہیں۔

جدید قسم کے نظامات کی ابتدا انیسویں صدی کے وسط سے ہوتی ہے ہر لحاظ سے ان میں سب سے زیادہ اہم فرقہ سنوسیہ ہے اس کے بانی سید محمد بن سنوسی الجزائر میں مضافات مستغنم میں سنہ ۱۸۰۰ء کے قریب پیدا ہوئے جیساکہ ان کے لقب سید سے ظاہر ہے وہ اولاد رسول اللہ صلعم سے تھے اور اس لیئے عزت و منزلت کی حالت میں پیدا ہوئے اوائل میں اس نے علم و تقوی کی طرف بڑا میلان ظاہر کیا فاس کے جامعہ مراکشی میں اس نے علم دین حاصل کیا۔ اور بعد میں مروجہ مذہبی خرابیوں کی اصلاح کے تلقین کرنے کو شمالی افریقہ میں دور دور سفر کیا۔ اس کے بعد وہ حج کرنے کے لئے مکہ آیا اور وہاں پر وہابی معلمین نے اس کے اصلاحی جوش کو اور زائد مشتعل کر دیا۔ اسی زمانہ میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے عظیم خالص سلسلہ کا نظام مستقل طور پر قایم کیا اور سنہ ۱۸۴۳ء میں وہ شمالی افریقہ کو واپس آیا اور طرابلس میں بود و باش اختیار کر کے کوہستان میں اپنا پہلا زاویہ بیضا درنہ کے قریب بنایا اس کی شخصیت ایسی بااثر اور اس کی نظامی قابلیت ایسی عظیم تھی کہ تمام شمالی افریقہ سے مریدین اس کے پاس جمع ہونے لگے بیشک طرابلس میں ترکی حکام اس کی طاقت سے ہراساں ہوئے اور تعلقات اتنے کشیدہ ہو گئے کہ سید محمد نے فوراً اپنے صدر مقام کو جنوب کی جانب ریگستان لیبا میں جربوب کے نخلستان میں منتقل کر لیا۔ سنہ ۱۸۵۹ء میں اُن کا انتقال ہوا تو ان کا سلسلہ شمالی افریقہ کے بڑے حصہ میں پھیل گیا تھا۔

سید محمد کے بعد اُن کے بیٹے سنوسی المہدی نے اس کام کو برابر جاری رکھا اس

لڑکے کو جس طریقے سے جانشینی ملی اس سے سنوسی جذبات کا سچّا اندازہ ہوتا ہے سیّدمحمد کے دو لڑکے تھے جن میں المہدی چھوٹا تھا ابھی وہ دونوں بچے ہی تھے کہ ان کے باپ نے ان کے امتحان لینے اور یہ معلوم کرنے کا ارادہ کیا کہ ان دونوں میں کون زیادہ راسخ الاعتقاد ہے۔ کل زاویہ کی موجودگی میں اُنھوں نے دونوں لڑکوں کو ایک اونچے درخت خُرما پر چڑھنے کا حکم دیا۔ اور تب اُنھوں نے اللہ اور رسولؐ کا نام لیکر پیڑ پر سے کود پڑنے کو کہا چھوٹا لڑکا فوراً کود پڑا اور زمین پر بلا کسی ضرر کے پہنچ گیا بڑے نے کودنے سے انکار کیا۔ حق حکمرانی المہدی کو مل گیا جس نے اپنے آپ کو مشیت ایزدی پر چھوڑنے میں پس و پیش نہیں کیا تھا۔ عمر بھر سنوسی المہدی نے اپنے باپ کے انتخاب کو صحیح ثابت کیا اور بڑے اعلیٰ درجہ کی دانشمندی اور تقوے کے ساتھ زندگی بسر کی اس نے اُخوت کی طاقت کو اور وسیع کیا اپنی حکومت کے آخر عہد میں اُس نے صدر مقام کو لیبیا کے ریگستان میں بعید ترین نخلستان جوف کو منتقل کیا وہ ۱۹۰۲ء میں مر گیا اور اُس کا بھتیجہ احمدؒ شریف اُس کا جانشین ہوا۔ اور آج کل اس فرقہ کا سردار ہے اور نمایاں قابلیت کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔

اسّی سال کی کامیاب کارگزاری کے بعد سنوسی فرقہ اسلام میں آج ایک اہم جُز ہے اس کے پیرو اسلامی دنیا کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں عربستان میں اس کے پیرو بکثرت ہیں اور بلاد مقدسہ مکہ اور مدینہ میں روحانی زندگی پر اس فرقہ کا گہرا اثر ہے مگر آج بھی سنوسیوں کا شعاعی مرکز شمالی افریقہ ہی ہے کل شمالی افریقہ میں مراکش سے لیکر سمالی لینڈ تک مختلف مقامات میں اس کے زاویہ بنے ہوئے ہیں جو بڑے زاویہ کے بسر کردگی شیخ سنوسی ماتحت ہیں۔ سنوسیوں کا حصن حصین جوف صحرائے لیبیا کے وسط میں واقع ہے اس مخفی جگہ کو اس وقت تک ایک یورپی کی آنکھ (ڈاکٹر ناٹنگل) نے دیکھا ہے چونکہ اس کے ہر چہار طرف بالکل ریگستان ہے اور کوئیں کوسوں دور ہیں اور راستہ صرف

سنوسی تجربہ کار رہنماؤں کو معلوم ہیں جن میں سے ہر ایک بجائے اس کے کہ شیخ کے مسکن کا پتا بتانے کا ملزم ہو ہزار مرتبہ موت کو ترجیح دے گا۔ لہذا سنوسی شیخ خاموشی کے ساتھ علحدہ بیٹھا ہوا کل شمالی افریقہ میں اپنے احکامات جاری کر رہا ہے۔

فرقہ سنوسیہ کا اثر بہت گہرا ہے مقامی زوایا محض خانقاہ سے زائد حیثیت رکھتے ہیں مقدم کے علاوہ وہاں وکیل یا سول گورنر (ملکی عامل) بھی رہتا ہے اور یہ افسران نہ صرف اپنے زاویہ کے ممبران پر بلکہ کل جماعت پر امتیازی اختیارات رکھتے ہیں کم از کم شمالی افریقہ میں سنوسیوں سے اس قدر لوگ ڈرتے ہیں کہ وکیل یا مقدم کی ہر بات کو مانتے ہیں اور اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ لہذا مختلف یورپی مستعمرات کے عہدہ داروں یعنی برطانوی یا فرانسیسی یا اطالوی حکام کے اقتدار کے علاوہ ایک باطنی حکومت بھی ہے جس کے تصادم سے نوآبادیات کے عمال احتراز کرتے ہیں۔

سنوسی بھی اپنی طرف سے اس کا بڑا لحاظ رکھتے ہیں کہ دول یورپ سے کوئی علانیہ نزاع نہ ہونے پاوے۔ اُن کا محتاط اور دانشمندانہ رویہ حیرت انگیز ہے نصف صدی سے زائد ہوا کہ یہ فرقہ بڑے اقتدار پر ہے لیکن اس وقت تک بڑے معرکہ کے خطرہ میں نہیں پڑا افریقہ کے مختلف حصص میں جو مذہبی بغاوتیں ہوئیں اس میں مقامی سنوسیوں نے بلاشبہ حصہ لیا اور طرابلس میں اطالوی حملہ اور جنگ گزشتہ کے موقع پر بھی یہ صادق آتا ہے لیکن یہ فرقہ باضابطہ طور پر میدان میں نہیں آیا۔

درحقیقت یہ رویہ جس میں دانشمندانہ خودداری اور متکبرانہ علحدگی ملی ہوئی ہیں نہ صرف عیسائیوں سے برتا جاتا ہے بلکہ دیگر سلاطین اسلام سے بھی یہی روش اختیار کی جاتی ہے سنوسیوں نے اپنی کل آزادی عمل کو ہمیشہ قایم رکھا ہے ترکوں سے ان کے تعلقات کبھی بھی مخلصانہ نہ تھے۔ عبدالحمید بھی جو کہ وہ اتحاد بین الاسلامی تحریک کے حامی ہونے کی وجہ سے بڑے صاحب اقتدار تھے سنوسی سے اپنی تحریک کے اظہار استحسان میں

چند بار دو مختصر جملوں سے زیادہ نہ حاصل کر سکے سنوسی المہدی کے پسندیدہ اقوال میں
سے ایک یہ ہے "ترک اور عیسائی، میں ان دونوں کو ایک ہی ضرب میں توڑ ڈالونگا" مصری
سوڈان کی مہدوی شورش کے سر گروہ محمد احمد کے متعلق بھی شیخ سنوسی کا طرز عمل بالکل
اُن کے مخصوص انداز کے مطابق تھا جب محمد احمد نے کامیابی سے سرشار ہو کر اپنے سفیر کو سنوسی
کی خدمت میں استمداد کے لیئے بھیجا تو شیخ سنوسی نے مدد دینے سے انکار کیا اور فخریہ لہجہ
میں کہا کہ مجھے ڈنگولہ کے اس فقیر سے کیا مطلب ہی کیا میں خود مہدی نہیں ہوں اگر میں
چاہوں۔

اس کج دار و مریز کا منشا یہ نہیں ہے کہ سنوسی بیکار بیٹھے ہیں۔ معاذ اللہ۔ بلکہ وہ متواتر
تعلیم و تربیت اور تبلیغ کے روحانی اسلحہ سے برابر مصروف کار ہیں۔ سنوسیوں کا پروگرام
یہ ہے کہ سب سے پہلے وہ اسلامی افریقہ کو متحد کرلیں اور بعدہ اسلام کے قرون اولی کی
تجدید شدہ امامت میں کل اسلامی دنیا کو متحد کر کے ایک الٰہی سلطنت میں تمام مسلمانوں
کو شامل کرلیں جو بالفاظ دیگر بین الاسلامی تحریک ہے لیکن ان کا عقیدہ ہے کہ قبل اس کے کہ
اسلام نصرانی اقتدار سے اپنی سیاسی رہائی حاصل کرے یہ ضروری ہے کہ اپنی روحانی
زندگی کو استوار کرے اس غرض کے لیئے وہ متواتر اپنے زیر اثر آبادیات کے اخلاق و آداب
کی درستی کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی نخلستان میں بہتر کاشت کی حوصلہ
افزائی اور قافلوں کے راستوں پر کنوں اور آرام گاہوں کی تعمیر کرا کے اور تجارت کی
ترقی و توسیع سے مادی حالات کی بہتری کے بھی کوشاں ہیں۔ سوڈانی مہدویوں کے قتل
و غارت نے سنوسیوں کو متنفر کر دیا۔ اور اُن کے شیخ کی زبان سے ملامت و سرزنش
کے سخت الفاظ کہلوائے۔

یہ سب امور اس فرقہ کے نیک مثال ضبط و تحمل کا پتہ دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ سال
بسال قرن بہ قرن سنوسی آہستہ آہستہ خاموشی اور ہوشیاری سے ترقی کر رہے ہیں وہ

عظیم باطنی قوت حاصل کر رہے ہیں اور اس سے محترز ہیں کہ قبل از وقت توسیع کے فریب نہ آجائیں۔ اسی عرصہ میں وہ شمالی افریقہ میں اپنے زاویوں اور مدرسوں کا سلسلہ پھیلا کر لوگوں کو اپنے مقدموں اور وکلاء کی آواز کا مطیع بنا رہے ہیں اور جنوب کی طرف وہ لاکھوں باطل پرست حبشیوں کو داخل اسلام کر رہے ہیں[۱]۔

---

[۱] ان اسلامی فرقوں کے لیئے بالعموم اور فرقہ سنوسیہ کے لیئے بالخصوص ملاحظہ ہو ڈبلیو ایس بلنٹ کی کتاب "مستقبل اسلام" مطبوعہ لندن سنہ ۱۸۸۲ء۔ او۔ ڈیپونت اور ایکس۔ کوپولانی کی کتاب "مسلمانوں کی مذہبی اخوتیں" مطبوعہ پیرس سنہ ۱۸۹۷ء۔ ایچ ددویری ایر کی کتاب "سیدی محمد بن علی السنوسی کی اخوت اسلامی" مطبوعہ پیرس سنہ ۱۸۸۴ء۔ ای۔ ایی شاتلی ایر کی کتاب "مسلمانان حجانہ کی اخوت" مطبوعہ پیرس سنہ ۱۸۸۷ء ایل رین کی کتاب "مرابطہ واخوان" مطبوعہ الجزائر سنہ ۱۸۸۴ء ای سروی ایر کی کتاب "مسلمانوں کی قوم پرستی" مطبوعہ قسطنطین الجزائر سنہ ۱۹۱۳ء بیمیاں کی کتاب "الجزائر میں اسلامی اخوتیں" مطبوعہ الجزائر سنہ ۱۹۱۰ء۔ احمد عبداللہ کا جو خود بھی سنوسی ہی مضمون "السنوسیہ" جو مئی سنہ ۱۹۱۴ء میں فورم میں شایع ہوا۔ اے آر۔ کولکہون کا مضمون "اتحاد بین الاسلام" جو جون سنہ ۱۹۰۶ء میں نارتھ امریکن ریویو میں شایع ہوا۔ ٹی۔ آر۔ تھریلفال کا مضمون "سنوسی اور اس کی جہاد کی دھمکی" جو مارچ سنہ ۱۹۰۰ء میں رسالہ نائنٹینتھ سنچوری میں شایع ہوا۔ کپتان ایچ۔ اے۔ ولسن کا مضمون "مسلمانوں کا خطرہ" جو ستمبر سنہ ۱۹۰۷ء میں "نائن ٹینتھ سنچوری اینڈ آفٹر" میں شایع ہوا۔ اور "اسلام کی قوت اور اس کی مذہبی اخوتیں" جو ۲۵ نومبر اور ۱۰ دسمبر سنہ ۱۹۰۹ء کو لی کورسپانداں میں شایع ہوا۔ کوالصدر اراء بالخصوص سنوسیوں کے متعلق نہایت مختلف ہیں۔ بعض تو نہایت خوف افزا ہیں اور بعض اس تحریک کی اہمیت کو بالکل گھٹا دیتے ہیں۔ اس کل بحث پر سب سے عمدہ توازن کمیدان بینٹر کے مضمون "اسلامی خطرہ" میں پایا جاتا ہے جو سنہ ۱۹۰۲ء میں فرانسیسی افریقہ کی کمیٹی کی کارروائی میں شایع ہوا۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی سنوسی سے ملاقات کا حال سیدی محمد الحشائشی کے مضمون "سنوسیوں اور تواریخ کی درمیان" جو رسالہ "اسپیکٹیشن آف دی فرنچ کالونیز"

موجودہ اسلامی حیات کی تیز گامی کا بہترین اظہار یہ ہے کہ پچھلے سو سال میں اس کا تبلیغی جوش از سر نو زندہ ہو گیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے مسلمان بنانے کی پرزور قوت کا ہمیشہ اظہار کیا ہے قرون اولیٰ میں اس کی تبلیغی کامیابیاں غیر معمولی تھیں اور زمانہ انحطاط میں بھی اس کی اشاعتی قوت کبھی مفقود نہیں ہوئی ازمنہ متوسط میں اسلام ہندوستان اور چین میں برابر پھیلتا رہا اور ترکوں نے اس کو بالاستقلال بلقان میں نصب کر دیا چودھویں اور سولھویں صدی کے درمیان میں اسلامی مبلغین نے مغربی افریقہ ڈچ انڈیز اور فلپائن جیسے دور دراز ممالک میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں مگر کل اسلامی دنیا پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی جوش یقیناً کم ہو گیا۔ اور اٹھارویں صدی میں اس کا جزر انتہا کو پہنچ گیا۔

اسلامی بیداری کے پہلے جھونکے نے اشاعت دین کی سلگتی ہوئی چنگاریوں کو نئے جوش سے شعلہ زن کر دیا اور یورپ کے سوا ہر جگہ اسلام نے اپنی دور دراز سرحدوں پر توسیعی ترقی شروع کی۔ ایک حد تک ہر مسلمان فطرتاً مبلغ ہے اور طبعاً اپنے مذہب کو غیر مسلم ہمسایوں میں شایع کرتا ہے۔ لہذا یہ کام صرف مذہبی ماہرین ہی نے نہیں کیا بلکہ بے شمار سیاح تجار اور غریب تارکان وطن مزدوروں[۱] نے بھی سر انجام دیا۔ بلاشبہ بہت سے فدائیان ملت

بقیہ نوٹ صفحہ ۶۸ | میں ۱۹۰۸ء میں شایع ہوا۔ محمد ابن عثمان کی کتاب "ممالک سنوسیہ کی سیاحت" براہ طرابلس" جس کا ترجمہ عربی سے ہوا اور پیرس میں ۱۹۰۳ء میں شایع ہوا ۱۲

۱۔ اسلام کی عام تبلیغی سرگرمیوں کے لئے ملاحظہ ہو جانسین کی کتاب "اشاعت اسلام" مطبوعہ برلن ۱۸۹۰ء۔ ہوسیٹو اونسینڈ کی کتاب "ایشیا اور یورپ" صفحات ۴۶ لغایت ۴۹ و ۶۰ و ۶۱ و ۸۱۔ اے۔ بی۔ شاتلی ایر کی کتاب "انیسویں صدی کا اسلام" مطبوعہ پیرس ۱۸۸۸ء تھامسن ورلڈ ٹوڈے کے مختلف مضامین مطبوعہ لندن ۱۹۰۶ء ۱۲

نے اپنی زندگی اس کام کے لیئے وقف کر دی۔ مذہبی جماعتوں پر یہ بالخصوص صادق آتا ہے سنوسیوں نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں میں خاص امتیاز حاصل کیا۔ اوزان قدرتی خانقاہوں یعنی نخلستان صحارئی سے ہزارہا مربوط (زاہد) جنکی آنکھیں نور اسلام سے منور اور سینے جوش سے معمور تھے اسلام کی عجیب وغریب تعلیم کی نشر و اشاعت کے لیئے چل کھڑے ہوئے یہ لوگ ازمنۂ متوسط کے نصرانی گداگر راہبوں کی طرح جوش مذہبی سے مشتعل تھے۔ گزشتہ یا پچھلی صدی میں مغربی اور وسطی افریقہ کے حبشیوں میں اسلامی تبلیغ کی کامیابی غیر معمولی تھیں۔ ہر صاف دل یورپی ناظر ایک ہی قصہ بیان کرتا ہے۔ بیس سال ہوئے ایک انگریز نے بہت ٹھیک لکھا کہ "اسلام وسط افریقہ میں حیرت انگیز ترقی اور باطل پرستی کا استیصال کر رہا ہے۔ اس کے مقابلہ میں عیسائی تبلیغ ایک خرافات ہے"[۱] ایک فرانسیسی پروٹسٹنٹ مبلغ بھی اسی طور سے لکھتا ہے "ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام قلب افریقہ کی طرف ایسی رفتار سے ترقی کر رہا ہے جو بعض وقت کم تو ہو جاتی ہے مگر رکتی کبھی نہیں۔ تمام موانعات حائلہ کے باوجود وہ بے تکلف اپنی منزل مقصود کی طرف گامزن ہے اور اس کو کوئی ہراس نہیں ہے اسلام کو اپنی کامیابی پر اس قدر وثوق ہے کہ وہ اپنے سب سے اہم رقیب یعنی نصرانیت سے بالکل بے پروا ہے عیسائی تو فتح افریقہ کے خواب ہی دیکھتے رہے مگر مسلمان اس کی تعبیر پوری کر رہے ہیں"[۲]

۱؎ ٹی۔ آرتھر بلفال کا مضمون "سنوسی اور اُن کا آنے والا جہاد" جو رسالہ اُنیسویں صدی میں مارچ سنہ ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا۔

۲؎ ڈی۔ اے۔ فورزیٹ کی کتاب "وسطی افریقہ میں اسلام اور مسیحیت" صفحہ ۶۵ مطبوعہ پیرس سنہ ۱۹۰۰ء افریقہ میں مسلمانوں کی دیگر تبلیغی جد و جہد کے حالات کے لیئے ملاحظہ ہو جی۔ بونیٹ موری کی کتاب "افریقہ میں دین اسلام اور مسیح" مطبوعہ پیرس سنہ ۱۹۰۶ء اور ای۔ ڈبلیو۔ بلائڈن کی کتاب "نصرانیت و اسلام اور حبشی نسل" مطبوعہ لندن سنہ ۱۸۸۷ء

اسلام جنوب میں جس طرح بڑھ رہا ہے اُس کا ثبوت حال کے ایک واقعہ سے اچھی طرح ہوتا ہے۔ چند سال ہوئے کہ افسران برطانیہ کو دفعتاً معلوم ہوا کہ اسلام نیاسا لینڈ پر تسلط کر رہا ہے تحقیقات سے یہ معلوم ہوا کہ یہ زنجباری عربوں کی کارگزاری ہے۔ انھوں نے اپنی تبلیغ سنہ ۱۹۰۰ء میں شروع کی۔ دس سال بعد جنوبی نیاسا لینڈ کے ہر ضلع میں ایک اسلامی معلم اور خس پوش مسجد موجود تھی اگرچہ یہ تحریک علانیہ یورپینوں کے خلاف نہ تھی لیکن برطانوی حکام کو دوسری جگہ کے فسادات کے ڈر سے اُس کو دبانے کی جرأت نہ ہوئی۔ بہت سے یورپی ناظرین کو اندیشہ ہے کہ کوئی دن جاتا ہے کہ اسلام دریائے زمبیسی کے پار جاکر جنوبی افریقہ میں داخل ہو جائے گا۔

یہ کامیابیاں محض باطل پرستی ہی کے مقابلہ میں نہیں حاصل ہوئی ہیں بلکہ افریقی مسیحیت کو زک دیکر بھی حاصل کی جاتی ہیں مغربی افریقہ میں یورپی مشنوں کے نئے عیسائی مسلمان ہوتے جاتے ہیں اور براعظم کے دوسرے کنارہ پر یعنی مشرقی افریقہ میں قدیم حبشی کلیسا جو عرصہ دراز سے اسلام کے خلاف ایک سرحدی حصن کا کام دیتا تھا اب اسلامی سیلاب کی رو میں اُس کے غرق ہونے کا اندیشہ ہے۔ حبشی جنگجویانہ حملوں سے نہیں بلکہ پرامن مداخلت سے مسلمان ہو رہے ہیں۔ پچاس یا ساٹھ سال ہوئے جن قبائل میں مشکل سے ایک بھی مسلمان تھا آج جزواً یا کلیتاً شریعت اسلام کے پیرو ہیں[1]۔

اسلامی تبلیغی کامیابیوں میں غالباً سب سے زیادہ قابل ذکر افریقی فتوحات ہیں، ان کامیابیوں کی داستان صرف یہاں ختم نہیں ہوتی جیسا کہ اسلامی دنیا کے دیگر حصص

---

[1] اے گوئیجہ نیو کا مضمون "اسلام اور حبش"، جو ریویو دو موند مسلمان میں سنہ ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ نیز ملاحظہ ہو پروٹسٹنٹ مشنری کے بیڈر کولیسٹ کا مضمون "حبش میں اسلام اور نصرانیت"، جو اپریل سنہ ۱۹۲۱ء میں دی مسلم ورلڈ میں شائع ہوا۔

کی مزید تمائیل سے ظاہر ہوگا فصل ماسبق میں ہم نے روسی تاتاریوں میں آزاد تحریک کا ذکر کیا ہے مگر وہ اس ملک میں مسلمانوں کی بیداری کا صرف ایک ہی رخ تھا اس کا دوسرا رخ مسلمان بنانے کے جوش کا نمایاں احیا ہے۔ یہ تاتاری عرصہ سے روسی حکومت کے زیر فرمان ہیں اور راسخ الاعتقاد کلیسا نے انھیں عیسائی بنانے کی مسلسل اور متواتر کوششیں کیں۔ اور بعض حالات میں انھیں ظاہرا کامیابی بھی ہوئی لیکن اوایل انیسویں صدی میں اسلامی بیداری کی لہر تاتاریوں میں پہونچی تو انھوں نے فوراً اپنے عیسائی شدہ بھائیوں میں کام کرنا شروع کیا اور تھوڑے عرصہ میں ان میں سے اکثر باوجود راسخ الاعتقاد کلیسا کی عظیم مساعی اور روسی عمال حکومت کی تعزیری کارروائیوں کے دائرہ اسلام میں دوبارہ شامل ہو گئے۔ اپنے روسی حکمرانوں کے موانعات کے علی الرغم تاتاری مبلغین نے بالٹ پت شمالی ترکی فنی قبایل کو دائرہ مذہب میں داخل کرنا شروع کر دیا۔[1]

انیسویں صدی میں چین میں بھی اسلامی قوت کا غیر معمولی اظہار ہوا اسلام شروع ہی زمانہ میں عرب تجار اور عرب تنخواہ دار سپاہیوں کی جماعتوں کے ذریعہ سے چین پہنچ گیا تھا چینی عورتوں سے صدیوں کی مناکحت کے باوجود ان کے اخلاف عام چینی آبادی سے نمایاں طور پر ممیز ہیں اور اپنے آپ کو جدا اور باامتیاز سمجھتے ہیں۔ ان چینی مسلمانوں کا اصل مرکز یونن کے جنوبی صوبہ اور اس کے ماورا وسطی صوبجات میں ہے ان چینیوں کے علاوہ جو من حیث القوم مسلمان ہیں اسلامی آبادی کا دوسرا مرکز مشرقی یا چینی ترکستان ہے جس میں ترکی نسل کے لوگ آباد ہیں جنھیں چینیوں نے اٹھارھویں صدی ہی میں فتح کیا تھا۔ کچھ عرصہ قبل تک چینی مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ ان کے

---

[1] ایس بروبوفنی کوف کا مضمون ''روس میں مسلمان'' جو جنوری ۱۹۱۱ء میں دی مسلم ورلڈ میں شایع ہوا۔

متکبرانہ طرز عمل نے حکومت چین کو خوف زدہ کر دیا اور اُس نے کُل مراعات واپس لیکر اُن پر ظلم و تعدی شروع کر دی۔ اوایل اُنیسویں صدی میں اسلامی بیداری کی لہر دیگر بلاد اسلامیہ کی طرح چین میں پہنچی اور چینی مسلمانوں نے جوش مذہبی کے تلاطم سے مشتعل ہو کر بغاوتوں کا سلسلہ شروع کر دیا جس کی انتہائی صورت ۱۸۶۱ء کی بغاوت عظیم یونن اور مشرقی ترکستان میں نمودار ہوئی حسب معمول اُن پُرجوش مسلمانوں نے ایک خوفناک جنگی قوت کا اظہار کیا ترکستان کے باغیوں کو ایک قابل سردار یعقوب بیگ مل گیا۔ اور چند سال کے لیئے ترکستان اور یونن حقیقی طور پر آزاد ہو گئے اکثر یورپی ناظرین کا یہ خیال تھا کہ باغی متحد ہو کر ایک مستقل اسلامی سلطنت مغربی چین میں قایم کر لینگے۔ اور کُل سلطنت پر تاخت کریں گے۔ یعقوب بیگ کی شہرت بلاد اسلام میں پھیل گئی اور سلطان ترکی نے امیر المومنین کے ممتاز خطاب سے اُسے سرفراز کیا۔ سالہا سال کے سخت جدال کے بعد جس میں ہیبت ناک قتل عام بھی ہوئے حکومت چین نے بغاوت کو فرو کیا۔ چینی مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہو گئی اور اس وقت تک اپنی پہلی قوت کو نہیں پہونچے ہیں لیکن اُن کا جوش آج بھی غیر مغلوب ہے اور اُن کی تعداد ایک کروڑ نفوس ہے۔ اس طریقہ پر چینی اسلام باوجود اپنی رجعت قہقری کے آئندہ کے لیئے ایسا عنصر ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مذکورہ بالا تماثیل میں گزشتہ صدی میں اسلامی جد و جہد کی فہرست ختم نہیں ہو جاتی مثلاً ہندوستان میں اسلام سرعت کے ساتھ استقامت پذیر ہو رہا ہے اور ڈچ انڈیز

۱؎ برومہال کی کتاب "چین میں اسلام"، مطبوعہ لندن ۱۹۱۰ء۔ نگارندہ کا مضمون "چینی مسلمانوں کا تبصرہ"، جو جنوری ۱۹۱۰ء میں ریویو دو ماند مسلمان میں شایع ہوا "چین میں اسلام"، پر مضمون جو تھا۔ مڈن ورلڈ ٹوڈے" میں بمقام لندن ۱۹۰۶ء میں طبع ہوا ۱۲

کا بھی وہی حال ہے[1]۔ یورپی اقتدار اشاعت اسلام کا بجائے مانع ہونے کے ممد ہے کیونکہ مغربی ترقیات مثلاً ریل، ڈاکخانہ جات، اور مطابع مسلمانوں کو اسلامی تبلیغ کے لیئے کار آمد معاون مل جاتے ہیں۔

اب ہم کو موجودہ تحریک اتحاد بین الاسلامی کے دوسرے مرکزی سرچشمہ پر غور کرنا چاہیئے۔ خصوصاً اس تحریک پر جس سے جمال الدین کی شخصیت وابستہ ہے۔ سید جمال الدین الافغانی اُنیسویں صدی کے اوائل میں ایران کے شہر اسدآباد مضافات ہمدان میں پیدا ہوئے۔ درحقیقت وہ ایرانی النسل نہ تھے بلکہ افغانی النسل تھے جیسا کہ اُن کے نام سے ظاہر ہے اور سید کے خطاب سے جس کے معنی اولادِ رسولؐ ہیں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی رگوں میں عربی خون ہے۔ جمال الدین اعلیٰ ذہانت سے مُتّصف، عظیم الشان ذاتی مقناطیسی اثر سے معمور اور قوائے عملیہ سے لبریز تھے۔ اُن کی عمر پرشور اور گوناگوں معاملات میں گزری۔ یہ بڑے سیّاح اور بلادِ اسلامی کے سوا مغربی یورپ سے بھی خوب واقف تھے ان سیاحتوں اور وسیع مطالعہ سے اُنھوں نے معلومات کا ذخیرۂ کثیر جمع کر لیا تھا جس کو وہ اپنی مختلف سرگرمیوں میں موثر طور پر استعمال کرتے تھے۔ جمال الدین پیدائشی مبلغ تھے اس لیئے دور دور کے لوگ اُن کی طرف متوجہ ہوئے اور بلادِ اسلامیہ میں جہاں بھی وہ گئے اُن کی زبردست شخصیت نے ایک دماغی ہیجان پیدا کر دیا۔ شیخ سنوسی کے برعکس اُنھوں نے دینیات سے بہت کم تعلق رکھا اور کل وقت سیاسیات میں صرف کیا۔ جمال الدین ہی پہلے مسلمان تھے جنھوں نے مغربی تسلط کے آنے والے خطرہ کو پورے طور پر محسوس کیا

---

[1] ملاحظہ ہو محمڈن ورلڈ ٹوڈے مطبوعہ لنڈن ۱۹۰۶ء میں "جاوا اور سماترا میں اسلام پر مضمون" ملاحظہ ہو۔ اے کباٹون کی کتاب "جاوا، سماترا، اور مشرقی ڈچ انڈیز (جس کا ترجمہ ڈچ سے ہوا) مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۶ء"

اور اپنی کل عمر اس خطرہ سے بلاد اسلامی کو متنبہ کرنے اور مدافعانہ تدابیر کی سعی میں صرف
کی۔ یورپی نوآبادیات کے عمال نے اُنھیں بہت جلد خطرناک شورش پسند سمجھ لیا۔ انگریز
خصوصیت سے جلد خائف ہوگئے اور اُن کے درپئے تکلیف دہی ہو کر نشانہ مظالم بنایا۔ یہ
کچھ زمانہ تک ہندوستان میں قید رہ کر تقریباً ۱۸۸۰ء میں مصر گئے اور عربی پاشا کی
یورپی مخالفت کی تحریک میں ان کا بھی حصہ تھا۔ ۱۸۸۲ء میں جب انگریزوں نے مصر
پر قبضہ کیا تو جمال الدین کے اخراج کا حکم دیدیا۔ اور وہ سیر و سیاحت کرتے ہوئے بالآخر
قسطنطنیہ پہنچے۔ یہاں سلطان عبدالحمید کی ذات اُن کے لیے ایک فیاض مربی ثابت
ہوئی۔ سلطان چونکہ اس وقت بین الاسلامی تحریک کو ترتیب دے رہے تھے لہذا
سلطان قدرتی طور پر جمال الدین کی شخصیت سے مسحور ہوگئے اور انھوں نے فوراً اپنے اتحاد
بین الاسلامی کے دفتر تبلیغ کا اُنھیں سردار بنا دیا۔ درحقیقت یہ اغلب ہے کہ سلطانی بین الاسلامی
تدابیر کی کامیابی زیادہ تر جمال الدین کی قابلیت اور سرگرمی سے ہوئی۔ جمال الدین ۱۸۹۶ء میں
کبر سنی میں فوت ہوئے۔ اور آخر وقت تک اپنے مشاغل میں مصروف رہے۔

جمال الدین کی تعلیم کا حسب ذیل خلاصہ ہے: مسیحی دنیا باوجود اپنی قومی اور نسلی اندرونی
اختلافات کے مشرق کے خلاف اور بالخصوص مسلمانوں کی مخالفت میں اسلامی سلطنتوں
کے تباہ کرنے کے لئے بالکل متحد ہے۔ پیٹر راہب کی متعصب روح اور حروب صلیبیہ آج
بھی موجود ہیں۔ مسیحیت آج بھی دلمیں اسلام کو مجنونانہ نفرت اور حقارت سے دیکھتی ہے۔ اسکا
چند طریقوں سے اثبات ہوتا ہے مثلاً بین الاقوامی قانون جس میں اسلامی قومیں مسیحی قوموں
کے مساوی نہیں سمجھی جاتیں۔ مسیحی حکومتیں اسلامی سلطنتوں پر حملہ یا اُن کی تذلیل اور
تحقیر کرنے کا عذر تو یہ پیش کرتی ہیں کہ یہ سلطنتیں پست و بربری حالت میں ہیں۔ تاہم یہی حکومتیں
بلاد اسلامی میں ہر ایک اصلاح و احیاء کی ہر کوشش کا ہزار ہا ترکیبوں حتیٰ کہ جنگ و
جدال سے دم گھونٹ دیتی ہیں۔ اسلام سے نفرت بعض ہی میں نہیں بلکہ کل عیسائی

اقوام میں بالاشتراک ہے۔ اور اس روح کا یہ اثر ہے کہ تباہی اسلام کی سخت پے در پے کوشش کیجاتی ہے ہر اسلامی جذبہ اور ہر خواہش کی مسیحیت کی طرف سے توہین و تعجین کی جاتی ہے۔ یورپ والے جس چیز کو اپنے ملکوں میں قوم پرستی اور وطن پرستی کہتے ہیں اوسی کو مشرق میں جنون سے موسوم کرتے ہیں جس چیز کو مغرب میں خودداری اور فخر اور قومی عزت کہتے ہیں مشرق میں اُسے جنگی جوش سے موسوم کرتے ہیں جس چیز کا مغرب میں قومی جذبہ جانکر احترام کرتے ہیں مشرق میں اُسے جنون جدت پسندی خیال کرتے ہیں[1]۔ ان تمام امور سے یہ عیاں ہے کہ تمام اسلامی دنیا کو تباہی سے بچنے کے لیئے ایک مدافعانہ اتحاد میں منسلک ہو جانا چاہیئے اس عمل کے لیئے مغربی ترقی کے علوم کو حاصل کرنا اور مغربی قوت کے راز کو سیکھنا از بس ضروری ہے۔

جمال الدین کی تعلیمات کا لب لباب یہ ہے جس کی تبلیغ فصاحت اور وثوق کے ساتھ برسوں کی گئی۔ مغربی مداخلت سے، جو خوف اور نفرت کی حالت تمام بلادِ اسلامی میں پھیل رہی تھی اُسے پیش نظر رکھ کے یہ معلوم کرنا بہت آسان ہے کہ جمال الدین کا کتنا بڑا اثر تھا بلاشبہ جمال الدین اپنی موعظت میں تنہا نہ تھا دیگر باثر مسلم بھی انھیں طریقوں پر وسط اُنیسویں صدی سے شورش پیدا کر رہے تھے ان پیشرو‌وں میں سے مشہور ترک عالی پاشا تھا جس نے یہ کہا تھا "ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ مذہبی جنون

---

[1] منقول از مضمون "اتحاد بین الاسلامی و بین الترکی"، نوشتہ × جو ریویو دو موند مسلمان میں مارچ ۱۹۱۳ء کو شائع ہوا۔ ایڈیٹر کہتا ہے کہ یہ مستند مضمون ایک عالی مرتبت مسلمان یعنی "ایک مسلمان افسر اعلیٰ"، کا لکھا ہوا ہے۔ جمال الدین کی دیگر سرگرمیوں کے لیئے ملاحظہ ہو اے سروہی ایر کی کتاب "مسلمانوں کی قوم پرستی"، صفحات ۱۰ لغایتہ ۱۳۔ مصنف

کی زیادتی ہو نہ کہ کمی[۵۱]۔" آرمینس وامبیری مشہور ہنگریا کا مستشرق بیان کرتا ہے کہ جنگ کریمیا کے بعد وہ ایک اتحاد بین الاسلامی کی جنگجویانہ مجلس میں موجود تھا جو عالی[۵۲] پاشا کے محل میں منعقد ہوئی تھی۔ اور اسلامی دنیا کے دور دراز حصص کے وکلا اس میں موجود تھے۔

سلطان عبدالحمید نے جن بنیادوں پر اپنی عالی حوصلہ بین الاسلامی تحریک کی تعمیر کی وہ اس قسم کی تھیں۔ سلطان عبدالحمید موجودہ زمانہ کے عجیب ترین شخصیتوں میں تھے وہ غیر معمولی ذہانت کے آدمی تھے لیکن اُن کے دماغ میں کچھ ایسا عجیب قسم کا خلل تھا جو جنوں کی حد تک پہنچا تھا انہوں نے عالی حوصلہ اور عظیم تجاویز قایم کر کے اُنھیں خفیہ اور پیچیدہ طریقوں سے نافذ کرنے کی کوشش کی یہ طریقے اگرچہ بسا اوقات زیرکانہ سیاسی چالوں کا پہلو لیئے ہوئے تھے لیکن بعض وقت فضول اور طفلانہ ہوتے تھے۔ چونکہ وہ طبعاً خودمختار تھے لہٰذا وہ اس کے کوشاں رہتے تھے کہ چھوٹے سے چھوٹا فیصلہ بھی اُن کی مطلق العنان مرضی کے تحت میں رہے اگرچہ اُن کی رہنمائی بڑے ہوشیار خوشامدی کرتے تھے جو اُن کے توہمات اور اُفتادِ طبیعت سے پورا نفع اُٹھانا جانتے تھے۔

سلطان عبدالحمید ۱۸۷۶ء میں بڑے سخت مصائب و نوائب کے زمانہ میں تخت نشین ہوئے۔ ایک تباہ کن روسی جنگ ملک کے سر پر آگئی تھی اور حکومت اُن مدبرین کے ہاتھوں میں تھی جو ٹرکی کو جدید سلطنت میں تبدیل کرنے کی کوشش

---

۵۱ منقول از کتاب "مشرقی مسایل پر مضامین"، مصنفہ ڈبلیو۔ جی۔ پالگریو صفحہ ۱۱۱ مطبوعہ لندن ۱۸۷۲ء۔ مصنف

۵۲ اے وامبیری کی کتاب "بلادِ مشرق میں مغربی تمدن"، صفحہ ۳۵۱ مطبوعہ لندن ۱۹۰۶ء۔ مصنف

کر رہے تھے اور جنھوں نے ہر قسم کی مغربی سیاسی اختراعات حتیٰ کہ پارلیمنٹ بھی جاری کر دی تھے سلطان عبدالحمید نے اس کو بہت جلد بدل دیا۔ روسی جنگ کے اختتام پر جو پریشانی پیدا ہوئی اُس سے نفع اُٹھا کر انہوں نے پارلیمنٹ کو منسوخ کر دیا۔ اور اپنے پیشرووں کی طرح بالکل خودمختار مطلق العنان بن بیٹھے۔ اپنی خودمختارانہ قوت کو مصئون کرنے کے بعد عبدالحمید نے اپنی خاص حکمت عملی کو ترقی دینا شروع کی جس میں شروع سے نمایاں بین الاسلامی میلان تھا۔ اپنے متقدمین کے برخلاف عبدالحمید نے ارادہ کیا کہ اپنے عہدۂ خلافت کو دوررس سیاسی اغراض کے لئے استعمال کریں۔ اسلامی دنیا میں اپنی روحانی سیادت پر بمقابلہ ترکی سلطنت کی سیاسی سیادت کے زیادہ زور دیکر انھوں نے یہ کوشش کی کہ تمام مسلمانوں کی عملی امداد حاصل کریں اور اس امداد سے ان یورپی طاقتوں کو خایف کریں جو سلطنت عثمانیہ کے خلاف تعدی کرنے کی تدبیریں کر رہی تھیں۔ تھوڑے ہی عرصہ میں عبدالحمید نے اتحاد بین الاسلامی تبلیغ کا نہایت اچھا نظام قایم کر لیا جو خفیہ اور پر پیچ طور سے کام کرنے لگا۔ قسطنطنیہ جمال الدین کے قماش کے پرجوش اور مغرب کے مخالف شورش انگیزوں کا مرکز بن گیا۔ اور وہیں سے منتخب جاسوسوں کے انبوہ روانہ ہوئے اور اسلام کے دوردراز ممالک میں خلیفہ کا پیام امید اور کافروں کی حکومت کے خطرہ سے آئندہ نجات کا مژدہ لیگئے

تقریباً تیس سال تک عبدالحمید کی تبلیغ اتحاد بین الاسلامی بلا روک ٹوک کے

---

[۱] عبدالحمید کی اتحاد بین الاسلامی تجاویز کو سب سے پہلے فرانسیسی ماہر سیاسیات ژبرئیل شارمس نے ۱۸۸۱ء میں بالمشافہ مشاہدہ کیا اور اس کی تنبیہات اُس کی کتاب "مستقبل ترکی اور اتحاد بین الاسلامی" مطبوعہ پیرس ۱۸۸۳ء میں شایع ہوئیں ۱۲ مصنف

جاری رہی اس امر کا صحیح اندازہ کرنا دشوار ہے کہ یہ تبلیغ کس حد تک کامیاب ہو سکی۔ اوّلاً
نوجوان ترکوں کے انقلاب نے جو ۱۹۰۸ء میں واقع ہوا اور جس میں عبدالحمید معزول
ہو گئے اس تبلیغ کا خاتمہ کر دیا۔ اور ایک حد تک اُس کے اثر کو زائل کر دیا۔ ترکی اور
کسی یورپی اوّل درجہ کی طاقت کے درمیان کوئی لڑائی نہ ہوئی جس میں اس کا صحیح
امتحان ہو سکتا۔ ان وجوہ سے کوئی نظری اندازہ کرنا لے سود ہے اکثر اسلامی حکمرانوں اور
مشاہیر نے عبدالحمید کی روحانی سیادت کو نہایت احترام سے قبول کر لیا۔ اور
اس میں شک نہیں کہ عامتہ المسلمین اُن کی مذہبی عزت کرنے لگے بعید ترین مقامات
میں طاقتور اسلامبول کے صاحب سطوت خلیفہ کو حامی دین متین اور اُن کی سلطنت
کو اسلام کا حصن حصین سمجھنے لگے۔ لیکن مذہبی سرگرمی اور عملی کارروائی میں بڑا فرق ہے۔
مزید براں عبدالحمید کو سنوسی جیسے طاقتور اتحاد بین الاسلامی کے سردار کی حمایت حاصل کرنے
میں کامیابی نہ ہوئی سنوسی اُن کے مقاصد سے بدگمان اور اُن کی رائے پر معترض
تھے۔ مسلمان آزاد خیال اُن کی مطلق العنانی و انقلابات شورش اور حکومت کی کمزوری
کی وجہ سے انھیں ناپسند کرتے تھے۔ لہٰذا امر متنازعہ فیہ یہ ہے کہ اگر عبدالحمید کسی جہاد
میں اسلامی دنیا سے مسلح امداد کے خواستگار ہوتے تو اُن کو عام طور سے مدد ملتی یا نہیں
تاہم عبدالحمید نے خیالات اتحاد بین الاسلامی کی اشاعت کو تمام بلاد اسلامی میں ترقی
دی اس بڑے مقصد میں اُن کو کامیابی ہوئی اور یہ کامیابی بہ حیثیت خلیفہ کے نہیں ہوئی
بلکہ اُس نے مغرب کے روز افزوں خوف اور نفرت کو منتقل کر دیا تھا۔ اس طریقہ
پر ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ عبدالحمید کی بین الاسلامی تبلیغ نے ایک عمیق اور دیرپا اثر
پیدا کیا جو کمال توجہ کے ساتھ پیش نظر رہنے کے قابل ہے۔

۱۹۰۸ء میں نوجوان ترکوں کے انقلاب نے حالت زیادہ نازک کر دی
اس کے بعد ہی ایران میں انقلاب ہوا اور مشرق کے دیگر حصص میں اسی قسم کی علامتیں

نمودار ہوئیں ان واقعات سے جدید قوتیں دفعتہً نمودار ہوگئیں مثلاً دستوریت۔ قومیتی اور نیز معاشرتی بے چینی جو اسلام میں لامعلوم طور پر پیدا ہو رہی تھیں اور جن کا پہلے لحاظ نہیں کیا جاتا تھا ہم ان جدید طاقتوں پر بتفصیل بعد میں بحث کریں گے۔ جو امر یہاں پہ قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ ان امور سے تحریک اتحاد بین الاسلامی میں کیسی پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں بلاشبہ تحریک اتحاد بین الاسلامی کا راستہ بدل گیا اور تلاطم اور ذہنی پس و پیش کا دور شروع ہوا۔

لیکن یہ دور بہت مختصر تھا۔ ۱۹۱۲ء میں تحریک اتحاد بین الاسلامی نے اپنا توازن قائم کرکے پھر ترقی شروع کی اس کی وجہ مغربی صعوبات کی تجدید تھی ۱۹۱۱ء میں اطالیہ نے ترکی کے افریقی ملک محروسہ یعنی طرابلس پر نہایت بے شرمی سے حملہ کیا ۱۹۱۲ء میں مسیحی ریاستہائے بلقان نے جنگ بلقان کا آغاز کرکے ترکی پر حملہ کیا۔ اور ترکی کا یورپی صوبہ قسطنطنیہ کی دیواروں تک ہضم کر لیا جس سے ترکی سلطنت نیم دست و پا اور نیم اقتدار رہ گئی علاوہ بریں اس پُر آشوب زمانہ میں روس اور انگلستان نے ایرانی انقلاب کا گلا گھونٹ دیا۔ اور فرانس نے اغادیر کے معرکہ کے بعد مراکش پر پورا قبضہ کر لیا۔ اس طریقہ پر دو سال کی قلیل مدت میں اسلامی دنیا کو دول یورپ کے ہاتھوں ایسے حملے برداشت کرنے پڑے جو نہ صرف اپنی شدت و تعدی میں عدیم المثال بلکہ مسلمانوں کی رائے میں بلا سبب اشتعال تھے۔

اس کا اسلام پر زبردست اثر پڑا۔ اسلامی دنیا کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک یاس اور غصہ کا طوفان برپا ہو گیا اور اس میں بلاشبہ تحریک اتحاد بین اسلامی کا تعلق عیاں تھا اور یہی وہ نتیجہ تھا جس کے لیے بین الاسلامی شورش انگیز پچاس برس سے سعی و تبلیغ کر رہے تھے۔ یعنی یہ احساس پیدا کرنا کہ مغرب نے اسلام کی تباہی کے لیے حرب صلیبی کا آغاز کیا ہے۔ اس سے بہتر جمال الدین کے انتباہ کی تصدیق اور کیا

ہو سکتی تھی۔

نتیجہ بہت جلد ظہور میں آیا طرابلس میں جہاں ترک اور عرب ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے دونوں قومیں بین الاسلامی جوش میں دفعتاً متحد ہوگئیں۔ اور اطالوی حملہ آوروں کو اس غضب کے جوش و غصہ سے مقابلہ کرنا پڑا۔ جس سے اسلام نہایت شادماں ہوا اور مغربی مبصرین میں سخت اضطراب پھیل گیا۔ گیبریل ہانوتو سابق فرانسیسی وزیر خارجہ نے خود ہی یہ سوال کیا "غیر محفوظ طرابلس اطالویوں کے لیے لانہ زنبور کیسے بن گیا" اور خود ہی جواب دیا ہے "اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے معاملہ کو صرف ترکی ہی سے تعلق نہیں ہے بلکہ اسلام سے ہے۔ اٹلی نے حرکت پیدا کردی ہے جس کا نتیجہ خود اس کے لیے اور ہم سب کے لیے بہت برا ہے[۱]"۔ انگریز اور روسیوں نے مملکہ اہل ایران کی قسمت کا جو فیصلہ کیا اس پر کل بلاد اسلام نے نہایت غضبناک[۲] نکتہ چینی کی اور فرانسیسیوں کے ہاتھوں جو مراکش کی آزادی کا خاتمہ ہوا اس پر نہایت غم و غصہ کا اظہار کیا گیا۔

جنگ بلقان کے آغاز سے مسلمانوں کے غصہ کی کوئی حد نہ رہی۔ چین سے لیکر کانگو تک دیندار مسلمان دور دراز بلقان میں صفوف جنگ کی نقل و حرکت پر دم بخود ہو کر نظر جمائے ہوئے تھے اور جب ترکی مصائب کی خبریں آئیں تو اسلامی غم و غصہ کی صدا انتہائی شدت کے ساتھ بلند ہوتی۔ ایک سربرآوردہ

---

[۱] جبرئیل ہانوتو کا مضمون "بحیرہ روم کی پیچیدگیاں اور اسلام"، جو ۱۳ راپریل سنہ ۱۹۱۲ء کو ریویو ہیبدو مدیر میں شایع ہوا۔ مصنف

[۲] ملاحظہ ہو مضمون "فارس کی سیاسی حالت"، نوشتہ × جو جون سنہ ۱۹۱۲ء کو ریویو دو مونڈ مسلمان میں شایع ہوا۔ اور بی ٹیمپل کا مضمون "سیاسیات عالم میں ایران کی جگہ"، جو ۲۴ مئی سنہ ۱۹۱۱ء کو سنٹرل ایشیا سوسایٹی کی کارروائی میں شایع ہوا۔ ڈبلیو ایم شوسٹر کی کتاب "اختناق ایران"، مطبوعہ نیویارک سنہ ۱۹۱۲ء مصنف

ہندوستانی مسلمان نے اپنے ہر جگہ کے ہم مذہبوں کے خیالات کی بہترین ترجمانی اس تحریر میں کی "شاہ یونان جدید حرب صلیبی کا حکم دیتا ہے لندن کے ایوان حکومت سے مسیحی جوش تعصب کو صلائے عام دی جاتی ہے اور سینٹ پٹرس برگ میں صلیب کو مسجد ایا صوفیہ کے گنبد پر نصب کرنے کی گفتگو ہوتی ہے آج اغیار کی گفتگو یہیں تک ہے کل بیت المقدس اور مسجد عمرؓ کے لیے بھی یہی مشورے ہونگے۔ بھائیو وقت ہے کہ سب متحد الخیال ہو جاؤ اور ہر سچے مسلمان کا فرض ہے کہ خلیفہ کے جھنڈے کی طرف دوڑے اور ناموس اسلام کے تحفظ کے لیے اپنی جان کو قربان کرے[1]"۔ ایک دوسرے مسلمان لیڈر نے برطانوی حکام کو حسب ذیل الفاظ میں مخاطب کیا "میں موجودہ حکومت سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ ترکی کے ساتھ اپنا مخالفانہ رویہ بدل دے قبل اس کے کہ اس کے کڑوروں مسلمان رعایا کا غصہ بھڑک کر آگ لگا دے اور مصائب برپا کرے[2]"۔

سب سے زائد معنی خیز وہ اپیل تھی جو اس زمانہ میں مسلمانوں نے غیر مسلم ایشیائیوں سے حصول ہمدردی اور مبغوض مغرب کے خلاف استحکام کے لیے کی۔ یہ صورت جس قدر عدیم المثال تھی اسی قدر حیرت انگیز بھی تھی۔ آنحضرت صلعم چونکہ عہد ناجات جدید و قدیم کا احترام اور حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام انبیا مرسل من اللہ کا اپنے آپ کو جانشین تصور فرماتے تھے انھوں نے اپنے تابعین کو حکم دیا تھا کہ وہ نصاریٰ اور یہود یعنی اہل کتاب کا بمقابلہ دیگر غیر مسلموں کے جو مشرکین کہلاتے تھے زیادہ احترام

---

[1] اقتباس از مضمون "ترکی سانحہ اور دنیائے اسلامی"، نوشتہ اے وامبیری جو جرمن ریویو میں جولائی ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا۔

[2] شاہ محمد نعمت اللہ کا مضمون "جدید ترکی و افغانستان اور ہندی مسلمان"، جو اکتوبر ۱۹۱۳ء میں ایشیاٹک ریویو میں شائع ہوا۔

کریں۔ ہمیشہ ان اوامر رسول خدا صلعم کی پابندی کی جاتی تھی اور ہمارے زمانے تک مسلمانوں کو عیسائیوں سے جو نفرت تھی وہ کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو لیکن اس تحقیر اور نفرت کے مقابلہ میں ہیچ تھی جو مشرکین یعنی براہمہ مذہب کے ہنود یا مشرق اقصٰے کے بدھ مذہب والوں اور کنفیوشیو[1] سے تھی۔

طرز عمل میں تبدیلی کے پہلے آثار ۱۹۰۴ء کی جنگ روس و جاپان کے دوران میں نمودار ہوئے اس وقت تک اسلام کو نصرانی مغرب سے خوف اور تنفر اتنا بڑھ گیا تھا کہ بہت سے مسلمانوں نے ایک ایشیائی قوم کی یورپیوں پر فتح یابی کی نہایت جوش سے خوشی منائی باوجودیکہ فاتحین مشرک تھے۔ بہت سے متقی مسلمان ان بہادروں کو دائرہ اسلام میں لانے کا خیال پیدا ہونا یہ اتحاد بین الاسلامی کے مستحکم تبلیغی میلان کے بالکل

---

[1] کنفیوشیس۔ اس کا اصلی نام کنگفو تسزی ہے۔ جس کو رومیوں نے کنفیوشینس کر لیا ہے ۵۵۱ھ قبل مسیح میں پیدا ہوا اور ۴۷۹ء میں مرا۔ یہ صوبہ شانتونگ میں مضافات شہر شیہو میں پیدا ہوا۔ اپنی والدہ کی وفات کے بعد وہ شاہی دربار میں بمقام حنان حاضر ہوا۔ یہاں اس نے لاؤتسز کے مواعیظ سنے اور ان کو فضول پایا۔ لہذا وہ اس مسئلہ پر بطور خود سوچتا رہا کہ ایک خلیق شریف کی طرح وہ کیونکر زندگی بسر کرے ۵۰۰ھ۔ ق۔ م میں شہر چنگتو کا مجسٹریٹ بنا دیا گیا اس کی حیرت انگیز خوبیوں اور قابلیتوں نے بڑا اثر پیدا کر لیا لیکن دشمنوں کی چالبازیوں کا شکار ہوا اور چنگتو چھوڑنا پڑا۔ اس نے سیاسی نظریات کو ترک کر کے یہ کوشش کی کہ وہ بادشاہوں کو بہترین حکمران بننے کی ترغیب دے۔ اس میں بھی وہ ناکامیاب رہا اور کل ملک چین میں گھومتا رہا۔ اس کی فلسفیانہ تصانیف مفقود ہیں۔ لیکن اس کے مریدین اور اولاد نے اس کے مقولات کو جمع کیا ہے۔ جو نصاب تعلیم میں داخل ہیں یہ چینی فلسفہ کا بانی ہے۔ اس نے چینی ادبیات اور تاریخ کی تفسیر و تدوین کی۔ شہر کیوفو کے متصل کُنگ کے قبرستان میں مدفون ہے اس کی اولاد کی تعداد تقریباً پچاس ہزار بتائی جاتی ہے۔

(مترجم)

مطابق تھا۔ جاپان سے ارتباط پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تبلیغی اخبارات جاری کیے گئے مبلغین منتخب کیے گئے۔ اور سلطان نے ایک جنگی جہاز معہ ایک اتحاد بین الاسلامی وفد کے جاپان کو روانہ کیا۔ کل دنیائے اسلام میں جاپان کی مجوزہ تبدیلی مذہب پر خوب بحث کی گئی۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں ایک مصری اخبار نے لکھا "انگلستان اپنی چھ کروڑ مسلم رعایا کی وجہ سے اس تبدیلی مذہب سے خائف ہے۔ اگر جاپان مسلمان ہو جائے تو مسلمانوں کی حکمت عملی بالکل بدل جائے گی"[1] اسلامی دنیا کے دوسرے گوشہ سے ایک چینی مسلمان شیخ نے لکھا "اگر جاپان کسی دن بڑی قوت ہونے کا اور ایشیا کو دیگر براعظموں پر بزی اقتدار بنانے کا خیال رکھتا ہے تو یہ صرف مقدس مذہب اسلام اختیار کرنے سے پورا ہوگا"[2]

بلاشبہ ان سرگرم حامیوں کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اگرچہ جاپان نے وکلاء اسلام کا شگفتہ اخلاق سے خیر مقدم کیا لیکن اُسے مسلمان ہونے کا وہم وگمان بھی نہ تھا۔ تاہم غیر مسلم ایشیا سے محبانہ ارتباط کا آغاز ہو گیا اور جنگ بلقان نے مسلمانوں کو اس طرف اور بھی بڑھا دیا۔ مسلمانوں کے خیالات میں تبدیلی کا اندازہ ان متعدد اپیلوں سے ہو سکتا ہے جو اس زمانہ میں ہندوستانی مسلمانوں نے ہندوؤں سے کیے۔ ذیل کے نمونہ سے جو بامعنی طور پر "پیام مشرق" کہلاتا ہے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ معروف تحریر حسب ذیل ہے: "مشرق کی روح اٹھ اور مغربی تعدی کے طوفان خیز سیلاب کو روک دے فرزندان ہند اپنی دانائی اور شائستگی و ثروت سے ہماری مدد کرو۔ اپنی قوت جو ہنود کا پیدائشی حق اور ورثہ ہے ہم کو عاریت دو۔ اے ہمالیہ کی سرجبین چوٹیوں کی مخفی روحانی قوتوں اُٹھو لڑائیوں کے دیوتاؤں سے دعا مانگو کہ جبر پر حق کو فتح ہو اور اپنے بے شمار دیوتاؤں سے افواج

مصنف

[1] منقول از مضمون نوشتہ الیف۔ فارنیل "جاپان اور اسلام" جو نومبر سنہ ۱۹۰۶ء کے ریویو و موئد مسلمان میں شائع ہوا۔

[2] ماخذ بالا۔ مضمون مندرجہ بالا۔ مصنف

عدو کے استیصال کے لئے استمداد کرو۔[۱]

ہر اوس شخص کے لیے جو اس سے واقف ہو کہ مسلمانوں کا مشرکوں سے قدیم طرز عمل کیا تھا یہ الفاظ نہایت حیرت انگیز ہیں۔ صاحبان بصیرت ان میں حقیقی انقلاب کی جھلک دیکھتے ہیں اور یہ خیالات ہندی مسلمانوں ہی تک محدود نہ تھے بلکہ چینی مسلمانوں میں بھی مساوی طور پر نمایاں تھے۔ چینی ترکستان کے ایک اسلامی اخبار نے مغربی تباہی کے خلاف کل چینیوں میں اتحاد اخوت کی تبلیغ کرتے ہوئے لکھا "یورپ بہت دلیر ہو گیا وہ ہمیں ہمیں آزادی سے محروم کریگا۔ اگر ہم فوراً راہ رمقاومت کے لیے تیار نہوں تو وہ ہمیں بالکل نیست و نابود کردے گا"[۲] چینی انقلاب کی پر آشوب ابتدائی منازل میں مسلمانوں نے اپنی متکبرانہ علحدگی کو چھوڑکر اپنے بودھ اور کنفیشی ہمدرد ابنا روطن سے ایسا کامل تعاون عمل کیا کہ جمہوریت کے سردار ڈاکٹر سن یات سین[۳] نے بطور شکریہ کے یہ اعلان کیا

---

[۱] منقول از کتاب وامبیری مذکور الصدر۔ مصنف

[۲] وامبیری کا مضمون "مسلمانوں اور بودھوں کے درمیان مفاہمت" جو اپریل ۱۹۱۲ء کے رسالہ نائنٹینتھ سنچوری اینڈ آفٹر میں شایع ہوا۔ مصنف

[۳] سن یات سین یا سنوین ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ یہ چینی مدبر ہیں۔ کچھ عرصہ تک مطب کرنے کے بعد نوجوان چینی جماعت کے ممبر اور سرگرم انقلابی ہوگئے۔ ۱۹۱۱ء کے انقلاب میں نمایاں حصہ لیا اور جمہوریت کی عارضی صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں یوان شیہ کائی کے حق میں استعفےٰ دیا اور بعد میں اُن کے خلاف بغاوت کی۔ ۱۹۱۳ء میں جاپان کو فرار ہو گئے۔ ۱۹۱۷ء کے مصائب میں برخاست شدہ پارلیمنٹ کے انتہا پسند فرقہ نے کنٹون میں ایک فوجی حکومت بسرکردگی ڈاکٹر سنیاتسین قایم کرکے شمالی وجنوبی حصص چین کے مابین حالت جنگ کا اعلان کیا۔ نومبر ۱۹۱۸ء تک یہ جنگی کارروائیاں وقتاً فوقتاً جاری رہیں حتیٰ کہ نسو شیہ چانگ پریزیڈنٹ منتخب ہوئے۔ تب ممالک غیر کی دوستانہ صلاح پر مفاہمت ہو گئی لیکن شورش ہنوز جاری ہو (مترجم)

امن اور حریت کے مفاد میں جو امداد مسلمان ابناء وطن نے دی ہے اس کو چینی کبھی نہ بھولینگے"[1]

اس طور پر جنگ عظیم شروع ہوئی تو اسلام ہر جگہ یورپی تعدی کے خلاف کلی طور برانگیختہ تھا۔ اور اپنے استحکام سے بخوبی واقف اور یورپی اقتدار کے خلاف موزونہ جنگ میں ایشیائی اتحادیوں کے لیے کھلم کھلا بہت ترقی کر چکا تھا۔

ان حالات میں بہ نظر اوّل یہ عجیب معلوم ہو گا کہ ۱۹۱۴ء کے اختتام پر جب جب ترک میدان میں آئے اور سلطان خلیفہ نے جہاد کے لیے باضابطہ دعوت دی تو اسلامی دنیا میں کوئی عام تلاطم نظر نہ آیا۔ بلاشبہ یہ دعوت اُس قدر ناکامیاب نہ تھی جس قدر کہ اتحادیوں کے خبر رسانوں نے یورپ کو اُس وقت اس کی ناکامیابی کا یقین دلایا۔ واقعہ یہ ہے کہ عملاً ہر اسلامی ملک میں جو اتحادیوں کے تسلط میں تھے سخت مشکلات پیدا ہوئیں۔ بہت سے واقعات میں سے چند کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے مصر میں فتنہ اُٹھا جو محض کثیر التعداد برطانوی فوج کی بدولت دبا۔ طرابلس میں ایسی آتش بغاوت بھڑکی جس نے اطالیوں کو بالکل ساحل تک ڈھکیل دیا۔ ایران ترکی کا شریک کار ہونے سے روس و برطانیہ کی فوری مداخلت ہی کی وجہ سے باز رہا۔ اور ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد پر ایسی لڑائی ہوئی کہ وہاں ڈھائی لاکھ انگریزی اور ہندوستانی افواج رکھنی پڑیں۔ گورنمنٹ برطانیہ نے سرکاری طور پر اس کا اعتراف کیا ہے کہ ۱۹۱۵ء میں اتحادیوں کے ایشیائی و افریقی مقبوضات طوفان خیز بغاوت سے صرف ہاتھ بھر کے فاصلہ پر تھے۔

عام بغاوت یقیناً ہو جاتی اگر اسلام کے اصحاب حل و عقد ہر جگہ اس مہتم بالشان لفظ کو اپنی زبان سے نکال دیتے جس سے ہزارہا تقدیریں وابستہ تھیں لیکن وہ لفظ مُنہ

---

[1] دیکھو میری کتاب مضمون "مسلمانوں اور بودھوں کے درمیان مفاہمت" مذکورہ بالا۔ مصنف

سے نہ نکلا۔ بجائے اس کے ترکی کے باہر بااثر مسلمانوں نے عام طور سے ترکوں کے فعل پر اظہار ناراضی اور حتی الوسع متعصب عوام کے جذبات کو روکنے کی کوشش کی۔

ان سربرآوردہ مسلمانوں کا طرزِ عمل اُن کی وسعت نگاہ کی وقعت ظاہر کرتا ہے وہ جان گئے کہ مغرب سے فیصلہ کن جنگ کے لیے نہ تو یہ موزوں وقت تھا نہ مناسب موقع۔ وہ اس وقت اس کے لیے مادی طور پر تیار نہ تھے۔ اور انھوں نے نہ تو خود آپس میں اور اپنے متوقع غیر مسلم اتحادیوں سے کوئی سمجھوتا کیا تھا۔ سب پر طرہ یہ تھا کہ اخلاقی اقتضاء بھی مفقود تھا۔ انھیں علم تھا کہ خلیفہ کے فرمان پر "مصنوعہ جرمنی" ثبت تھا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ اس ہیجان کے محرک کون تھے یعنی "نوجوان ترک"، پارٹی متفرنج لامذہبوں کی جماعت تھی جن میں اکثر برائے نام بھی مسلمان نہ تھے۔ بلکہ یہودی ملاحدہ تھے۔ دور اندیش مسلمانوں کو ذرا بھی پرواہ نہ ہوئی کہ جرمنی کا آلہ کار براری بننے کے لئے اپنے آپ کو گرفتار بلا کریں۔ اور نہ دنیا پر روشیا کے اقتدار حاصل کرنے کی تدابیر کی حمایت کرنا چاہتے تھے کیونکہ یہ ان کے لیے محض آقاؤں کا تبادلہ ہوتا۔ یہ بدرجہا بہتر تھا کہ مغرب کو اس کی مایوسانہ لڑائیاں لڑنے دیا جائے تاکہ وہ کمزور ہوکر اپنے آئندہ کے منصوبات کو ظاہر کر دے۔ اس اثنا میں اسلام وقت گزاری کرکے مزید قوت حاصل کرے اور منتظر فردا رہے۔

ورسیلیز کی صلح کانفرنس میں یورپی ارادوں کا بالکل وہی انکشاف ہوا جس کا کہ بین الاسلامی تحریک کے سرگروہ اپنے نظام عمل کی تکمیل اور اپنے متبعین کے اخلاقی استحکام کے لیے انتظار کر رہے تھے۔ ورسیلیز میں دول یورپ نے غیر مبہم طور پر جتا دیا کہ وہ اپنا تسلط مشرق ادنیٰ اور وسطیٰ سے کسی نوع کم کرنا نہیں چاہتے ہیں۔ ان خفیہ عہدناموں کی بناء پر جو دوران جنگ میں ہوئے تھے فاتح اتحادیوں نے فی الواقع عثمانی سلطنت کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ اور یہی خفیہ عہدنامجات تصفیہ ورسیلیز کی سنگ بنیاد قائم کیے گئے۔ مزید براں آغاز جنگ ہی میں مصر پر برطانوی صیانت کا اعلان کیا گیا تھا۔ اور ورسیلیز کانفرنس ابھی

ختم نہ ہوئی تھی کہ انگلستان نے ایران سے ایک معاہدہ کا اعلان کیا جس کی رو سے یہ ملک بھی فی الواقع دوسرا برطانوی ملک محروسہ ہو گیا اگرچہ یوں موسوم نہ ہوا۔ جیسا ہم بیان کر چکے ہیں نتیجہ یہ ہوا کہ مشرق ادنیٰ اور وسطے بیش از پیش یورپی سیاسی اقتدار کے ماتحت ہو گئے۔

لیکن تصویر کا دوسرا رُخ بھی تھا۔ دوران جنگ میں اتحادی مدبرین بہانگ دہل اس امر کا بارہا اعلان کر چکے تھے کہ یہ جنگ ایک عالمگیر نظام جدید کے قیام کے لیے لڑی جا رہی تھی جس کی بنیاد ایسے اصولوں پر ہے جیسے چھوٹی اقوام کے حقوق اور کل اقوام کی آزادی۔ ان اعلانات کو کل مشرق نے اپنے حافظہ میں محفوظ کر لیا تھا لہذا جب مشرق نے ایسے تصفیہ صلح کو دیکھا جو اِن جلیل القدر دعاوی کے بجائے شہنشاہیت کے خفیہ عہدناموں پر مبنی تھا تو وہ اخلاقی غیظ و غضب اور نیز انصاف کی توہین کے احساس سے اس قدر برافروختہ ہوا کہ اتنا کبھی ہوا ہی نہ تھا۔ خشم الود قصد کا سیلاب اُٹھنے لگا جس نے کل مشرق کو پہلے ہی سے پرشور ہیجان میں ڈال دیا تھا۔ اور جو عظیم تر طوفان کا پیش خیمہ معلوم ہوتا تھا بشگون ایسے بد تھے کہ ورسیلیز کی کانفرنس کے اختتام سے قبل ہی معاملات مشرق کے اکثر واقف کاروں نے نہایت خطرہ کا اظہار کیا۔ مثال کے طور پر یہاں وہ رائے پیش کی جاتی ہے جو لیونی کٹیانی ڈیوک آف سرمونٹیا اطالوی ماہر مسایل اسلامیہ نے ۱۹۱۹ء کے بہار میں ”مشرق پر جنگ کے اثر“ پر بحث کرتے ہوئے ظاہر کی۔ اس نے کہا ”اس ہنگامے نے اسلامی اور مشرقی تہذیب کی بنیادیں متزلزل کر دی ہیں کل اسلامی دنیا چین سے لیکر بحرہ روم تک ہیجان میں ہے۔ ہر جگہ یورپیوں کے خلاف نفرت کی مخفی آگ روشن ہے۔ مراکش کے بلوے، الجزائر کے فتنے، طرابلس کی شورشیں، مصر و عربستان اور لیبیا میں نام نہاد قوم پرستوں کے مساعی سب ایک ہی عمیق احساس کے مختلف مظاہر ہیں۔ ان کی علتِ غائی یہ ہے کہ یورپی تمدن کے خلاف مشرقی

دنیا بغاوت کرے گی۔"[1]

یہ الفاظ اِن واقعات کی صحیح پیشنگوئی ہیں جو اس وقت سے دنیائے اسلام میں ظاہر ہو رہے ہیں چونکہ جدید واقعات غالباً بمقابلہ خالص اتحاد بین الاسلامی کے زیادہ تر اسلامی اقوام کی قوم پرستی کے توقعات سے وابستہ ہیں میں اُن پر تفصیلی بحث کو قوم پرستی کے باب کے لیے ملتوی کرتا ہوں۔ مگر ہم کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مسلمانوں کی تحریکات قوم پرستی اتحاد بین الاسلامی چاہے ان کے اختلافات کچھ ہی کیوں نہ ہوں یورپی اقتدار کے بیرونی تعدی کے خلاف متحد ہونے کی طرف مایل ہیں اور دونوں مساوی طور پر یورپی سیاسی تسلط سے اسلام کی نجات کے آرزومند ہیں۔ ان واقعات کو ذہن نشین رکھ کر آؤ اب ہم اتحاد بین الاسلامی کی موجودہ حالت پر ایک نظر ڈالیں۔

مغربی تعدی بالخصوص گزشتہ جنگ اور موجودہ تصفیہ جات صلح اتحاد بین الاسلامی کی قوی محرک ہیں۔ مگر اتحاد بین الاسلامی کو بیرونی تعدی کے خلاف محض حفاظتی سیاسی ردعمل نہ سمجھنا چاہیئے۔ اس کی ابتدا اُس عمیق جذبہ اتحاد سے ہوتی ہے جو ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے مربوط و منسلک کرتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ مسلمانوں کا یہ باہمی ربط و انسلاک ان تعلقات سے زیادہ قوی ہے جو مسیحی دنیا کے افراد میں قایم ہیں۔ یہ ربط و انسلاک اصطلاحی اعتبار سے محض مذہبی ہی نہیں بلکہ معاشرتی اور تمدنی بھی ہے۔ کل اسلامی دنیا میں مقامی رسومات اور ضوابط کے عظیم اختلافات کے باوجود خاندانی اور معاشرتی عمل کے اصولی قوانین ہر جگہ ایک ہی ہیں۔ درحقیقت یہی نہیں کہ اسلام مجموعہ اعتقادات ہے بلکہ وہ معاشرت کا مکمل نظام ہے۔ وہ ایک ایسی تہذیب ہے جو خود اپنا

---

[1] نیو یارک ٹائمس کو خاص تار جو وہاں سے ۲۸ رمئی ۱۹۱۹ء کو دیا گیا۔ مصنف

فلسفہ، تمدن و فنون رکھتا ہے۔ اپنے رقیب نصرانی تہذیب کے خلاف طویل جد و جہد کی وجہ سے یہ ایک منظم ہستی ہو گیا ہے۔ جو اپنی شخصیت سے باخبر ہے[۱]"

اس اسلامی تہذیب سے کل مسلمان گہری طور پہ وابستہ ہیں۔ اس وسیع معنی میں اتحاد بین الاسلامی عام ہے۔ حتیٰ کہ سب سے زیادہ آزاد مشرب مسلمان بھی خواہ وہ مغربی خیالات کے کتنے ہی دلدادہ ہوں اور سیاسی اتحاد بین الاسلامی کے متعصبانہ اور جارحانہ پہلو سے کتنی ہی نفرت کیوں نہ کرتے ہوں اسلام کے حقیقی اتحاد کے دل سے معتقد ہیں۔ چنانچہ ایک سر بر آوردہ آزاد خیال ہندی مسلمان ہز ہائی نس آغا خاں لکھتے ہیں "ایک سچا اور جائز اتحاد بین الاسلامی بھی ہے جس سے ہر صادق اور مومن مسلمان وابستہ ہے جو جناب رسالت مآب کی افراد امت کی اخوت روحانی اور اتحاد کا مسئلہ ہے۔ اسلام کا حقیقی روحانی و تمدنی اتحاد ہمیشہ ضرور بڑھتا رہے گا کیونکہ امت نبی کے لیے یہ حیات اور روح کی بنیاد ہے[۲]"

جب یہ خیالات ان آزاد خیال مسلمانوں کے ہیں جو مغربی تہذیب سے واقف ہیں۔ اور جن میں مغربی ترقی کی قبولیت کی استعداد ہے تو ان عوام مسلمانوں کے جو جاہل اور شورش پسند اور متعصب ہیں، کیا خیالات ہونگے۔ اس قابل فہم خوف و نفرت کے علاوہ جو مغربی تعدی کی بدولت ہے تمام مسلمانوں میں ایک مذہبی جنون بھی ہے جو یورپی سیاسی تسلط کی بدولت نہیں ہے بلکہ مذہبی تعصب اور مغربی تہذیب سے کورانہ نفرت کی بدولت پیدا ہوا ہے[۳]۔ لیکن مذہبی جنون بلا شبہ گزشتہ قرن کے سیاسی واقعات سے

---

[۱] سر تھیوڈور ماریسن کا مضمون "انگلستان اور اسلام" جو جولائی سنہ ۱۹۱۹ء کے رسالہ نائن ٹینتھ سنچری اینڈ آفٹر میں شائع ہوا۔ مصنف

[۲] ہز ہائی نس دی آغا خاں کی کتاب "ہندوستان تبدیلی کی حالت میں" صفحہ ۱۵۰ مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۸ء۔ مصنف

[۳] مغربی تمدن سے اس نفرت کا حال فصل مابعد میں بیان کیا جائے گا۔ مصنف

بہت مشتعل ہو گیا ہے حتیٰ کہ آج مغرب سے مذہبی، تمدنی و سیاسی نفرت نے وہ دماغی حالت پیدا کر دی ہے جو بالیقین امن دنیا کے لیے فال بد ہے۔ ہم کو موجودہ حالت کے امکانی خطرات کو خفیف سمجھ کر خود فریبی نہ کرنا چاہیے محض اس وجہ سے کہ ۱۴ ۱۹ء میں جرمنی کے اغوا سے نوجوان ترکوں نے جس نمایشی "جہاد" کا اعلان کیا تھا وہ کامیاب نہ ہوا یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ حقیقی جہاد بھی ناممکن ہے۔ چنانچہ ایک جرمن فوجی افسر نے جو جنگ گزشتہ میں ترکی ملازمت میں تھا نہایت آزادی سے کہا ہے "جہاد محض نمائشی تھا کیونکہ یہ جہاد ہی نہ تھا"، میں بیان کر چکا ہوں کہ کس طرح اکثر مسلمان چال کو سمجھ گئے اور انھوں نے جنبش تک نہ کی۔

مگر یورپی تعدیات کا طویل سلسلہ جو موجودہ تصفیہ) صلح پر منتہی ہوا اور جس نے درہ اصل کل اسلامی دنیا کو یورپ کے زیر اقتدار کر دیا، مسلمانوں کے دلوں میں بتدریج ایسے مایوسانہ غصہ کی روح پیدا کرتا رہا ہے جس کے نتائج نہایت مصیبت ناک ہوں گے۔ بلاشبہ جہاد کے لیے مدتوں سے مواد جمع ہو رہا ہے۔ بیس سال سے زیادہ عرصہ ہوا کہ وامبیری نے جو اسلامی دنیا سے ایسا واقف تھا کہ بہت کم یورپی واقف ہیں، اُن خطرات سے متنبہ کیا جو شہنشاہیت کی غیر دانشمندانہ حکمت عملی سے پیدا ہو رہے ہیں۔ ۱۹۰۶ء میں اس نے لکھا "امتداد زمانہ کے ساتھ عام لڑائی کا خطرہ بڑھتا جاتا ہے ہم کو یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ زمانہ نے مخالف کی قوت مقاومت کو بہت زیادہ کر دیا ہے۔ اس سے میری مراد وہ استحکام کا جذبہ ہے جو اس زمانہ میں اقوام اسلامی میں نشوونما پا رہا ہے اور جو ہمارے اس عہد میں جب کہ ذرائع آمد و رفت بہت سریع ہیں ایسا ناقابل التفات نہیں ہے جیسا کہ دس یا بیس سال پیشتر تھا۔

---

[۱] ارنسٹ پراکوئن جو عثمانی جنرل اسٹاف کا سابق افسر اور لفٹنٹ کرنیل ہے اُس کا مضمون ۲۸ جنوری ۱۹۲۰ء کے برلنر تیج بلاٹ میں شایع ہوا۔

ہماری اُنیسویں صدی کی صلیبی نبرد آزماؤں کی توجہ اس اسلامی پریس کی طرف مبذول کرنا بے کار نہ ہوگا جس کی شاخیں کل ایشیاء اور افریقہ میں پھیلی ہوئی ہیں اور جس کے مواعیظ بمقابلہ ہمارے اُس کے قارئین کے دل میں بہت گہرا اثر پیدا کرتے ہیں۔ ترکی، ہندوستان، ایران، ایشیاء متوسط، جاوا، مصر و الجزائر میں دیسی پرچے اور روزنامے، میعادی اخبارات بڑا اثر ڈال رہے ہیں۔ ہر وہ بات جو یورپ اسلام کے خلاف سوچتا یا طے یا اس پر عمل کرتا ہے ان ممالک میں بڑی سرعت سے پھیل جاتی ہے قافلے خبروں کو وسط چین میں خط استوا تک لے جاتے ہیں۔ اور وہاں پر ان خبروں کی نہایت عمدہ طریقے سے تنقید ہوتی ہے۔ بعض چنگاریاں جو ہمارے جلسوں یا دعوتوں میں پیدا ہوتی ہیں رفتہ رفتہ خوفناک شعلے پیدا کر دیتی ہیں۔ لہذا یہ ناقابل عفو غفلت ہوگی اگر ہم اپنی آنکھیں اِن خطرات سے بند کرلیں جو ظاہری سکون کی تہ میں مخفی ہیں۔ جو کچھ کر لیا کا ترجمان بین السطور کہتا ہے اس کو قسطنطنیہ کا اقدام دُہراتا ہوا اور کلکتہ کا مسلم کرانیکل اس پر تنقید کرکے اور مبالغہ کرتا ہے "بلاشبہ اس وقت اتحاد بین الاسلامی کی یہی کمزور اور منتشر ریشوں پر مشتمل ہے لیکن مغربی تعدی اِن ریشوں کو بآسانی قوی اور متحد کر سکتی ہے جس کا نتیجہ ایک[۱] عام لڑائی ہو۔"

وامبیری کی اس تحریر کے بعد جو زمانہ گزرا اس میں حالت بہت زیادہ نازک ہو گئی ہے۔ مغربی اقتدار پر مسلمانوں کا غصہ بڑھ گیا ہے اور اس کو قوم پرستی کی توقعات سے تقویت ہو گئی ہے جن کا گزشتہ صدی میں پتہ بھی نہ تھا اور جس کے قبضہ میں نہایت کامیاب تبلیغی ذرائع ہیں۔ مثلاً بین الاسلامی پریس جس کا وامبیری نے ذکر کیا ہے حقیقتاً غیر معمولی ترقی کر گیا ہے۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں کل اسلامی دنیا میں دو سو سے زیادہ تبلیغی اخبارات نہ نکلے بحث سنہ ۱۹۰۶ء میں ان کی تعداد پانچ سو تھی اور سنہ ۱۹۱۴ء میں ایک ہزار سے زیادہ[۲] ہو گئی

---

[۱] اے وامبیری کی کتاب "موجودہ اور پالیس سال قبل کی سلطنت ترکی" صفحہ ۱۷۰ و ۲۰۷ مطبوعہ پیرس سنہ ۱۸۹۸ء

[۲] اے مرودی ابر کی کتاب "مسلمانوں کی قوم پرستی" صفحہ ۱۸۲

مسلمان، ڈاکخانوں، ریلوں اور تبادلۂ خیالات کے دیگر جدید سریع ذرائع کی قدر کرتے ہیں" ہر اسلامی ملک کل دیگر اسلامی ممالک سے ربط رکھتا ہے براہ راست تو خاص قاصدوں حاجیوں، سیاحوں، اور تاجروں اور مراسلت کے ذریعہ سے اور بالواسطہ اسلامی اخبارات وکتب ورسایل وپرچہ جات موت الیشوع اخبارات کے ذریعہ سے ہیں نے قاہرہ کے اخبار بغداد وطہران وپشاور ہیں اور قسطنطنیہ کے اخبار بصرہ اور بمبئی ہیں اور کلکتہ کے اخبار مہمرہ وکربلا وپورٹ سعید ہیں دیکھتے ہیں؀۱" رہے اتحاد بین الاسلامی کے پیشہ ور مبلغین، بالخصوص وہ جو مذہبی جماعتوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ہر جگہ جمع ہوکر لوگوں کے مذہبی جنون کو برانگیختہ کرتے ہیں۔ یہ مبلغین، ہزارہا بھیسوں میں یعنی تاجر، واعظ طالبعلم، حکیم، مزدور، گداگر، فقیر، عطائی، مسخرے، مجذوب بنکر سفر کرتے ہیں جن کا خیر مقدم مسلمین ہر جگہ کرتے ہیں۔ اور یورپی مستعمرات کے عمال کی اشتباہی تحقیقات سے پناہ دیتے ہیں۔"

مزید براں آج دنیائے اسلام میں کثیر الاشاعت عقیدہ یہ ہے جس کو آزاد خیال اور فتنہ انگیز دونوں مانتے ہیں (اگرچہ اس عقیدہ رکھنے کے وجوہ نہایت مختلف ہیں) کہ اسلام نشاۃ ثانیہ اور جدید عظمت کے دور میں داخل ہورہا ہے۔ سر تھیوڈور ماریسن لکھتے ہیں "کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں کہ اسلامی تہذیب مردہ یا مزید ترقی کے ناقابل ہے۔ وہ اس کے معترف ہیں کہ اس کے برے دن آگئے ہیں۔ اور اس کو ماضی کے بیجا احترام کرنے اور حمایات وبے جا تعصب اور علمی تنگ خیالی سے جو

؀۱ بی ٹیمپل کا مضمون "سیاسیات عالم میں ایران کی جگہ" جو مئی سنہ ۱۹۱۰ء کی سنٹرل ایشین سوسائٹی کی کارروائی میں شائع ہوا۔

؀۲ ایل۔ رین کی کتاب "مرابطہ واخوان" صفحہ ۴

اسی قسم کی ہی جیسے کہ ازمنہ مظلمہ میں یورپی خیالات میں طاری تھی، نقصان پہونچا ہی۔ لیکن اُن کو یقین ہی کہ اسلام کی بھی نشاۃ ثانیہ ہوگی اور یہ کہ اسلام مغربی علوم سے وہ نفوذ پا رہا ہی جو اس کی جدید سرگرمیوں میں سرعت پیدا کر دے گی اور یہ کہ اس جدید زندگی کے شواہد ہر جگہ ظاہر ہیں۔[1]

سر تھیوڈور ماریسن مسلمان آزاد خیالوں کے طرز عمل کو بیان کرتے ہیں۔ مغرب کے مخالفانہ خیال رکھنے والے حامیان اتحاد بین الاسلامی کا کیا خیال ہی؟ اس کو ایک مصری یحییٰ صدیق نے اپنی کتاب موسومہ چودھویں صدی ہجری میں اسلامی اقوام کی بیداری[2]" میں خوب بیان کیا ہی۔ یہ کتاب دو نوع سے دلچسپ ہی۔ کیونکہ اس کا مصنف کامل طور پر مغربی تعلیم یافتہ اور فرانس کی طونور کی یونیورسٹی قانونی سندیافتہ ہی۔ اور مصری عدالت کا جج ہی۔ اگرچہ یحییٰ صدیق نے یہ کتاب اس ہنگامہ سے ایک قرن پہلے لکھی لیکن اس نے یورپی جنگ کے وقوع کو پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ وہ لکھتا ہی "دیکھو یہ دول عظمیٰ اپنے آپ کو خوفناک اسلحہ کے ذخائر سے تباہ کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو دھمکا رہے ہیں۔ ایسے اتحادوں کا معاہدہ کر لیتے ہیں جو برابر ٹوٹتے ہیں اور جوان مصیبت ناک تصادم کی خبر دیتی ہیں جو دنیا کو درہم برہم کر کے تباہی و انتشار کی و خونریزی کا منظر بنا دے گا۔ مستقبل کا علم خدا کو ہی اور اس کی مشیت کے سوا ہر شئی فانی ہی۔"

یحییٰ صدیق مغربی دنیا کو پست سمجھتا ہی۔ وہ سوال کرتا ہی "کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ یورپ ہمارا روشن خیال رہنما، اپنی ارتقائی انتہا کو پہونچ گیا؟ کیا اس نے دو یا تین

---

[1] سر ٹی۔ ماریسن کی کتاب "انگلستان اور اسلام"، مذکور الصدر

[2] یحییٰ صدیق کی کتاب "چودھویں صدی ہجری میں اسلامی اقوام کی بیداری" مطبوعہ قاہرہ ۱۹۰۷ء۔ یہ کتاب عربی میں بھی شایع ہوئی

صدیوں کی غیر معمولی سرگرمیوں میں اپنی قوت حیات کو ختم کر دیا؟ بالفاظ دیگر کیا وہ کہولت میں مبتلا ہو گیا؟ اور کیا اس کو یہ دیکھنا پڑے گا کہ وہ اپنا اشاعتِ تہذیب کا کام دیگر اقوام کو جو کم پست و کم مریض ہیں یعنی جو اس سے کم عمر زیادہ قوی اور تندرست ان کو تفویض کرے۔ میری رائے میں موجودہ زمانہ یورپ کے اوج کمال کا پتہ دیتا ہے اور اس کی نوآبادیات کے فضول توسیع سے طاقت کا نہیں بلکہ کمزوری کا اظہار ہوتا ہے۔ اس قدر عظمت و جبروت و شوکت کے اظہار کے باوجود یورپ ہمیشہ سے زیادہ غیر متحد اور کمزور ہے۔ اور وہ اپنے مرض و تکالیف و کرب کو بمشکل چھپا سکتا ہے۔ لازمی طور پر اس کی سرنوشت عمل پذیر ہے"۔ مشرق پر یورپ کے اتصال نے ہمارے لیے بہت سی خوبیاں اور بہت سی خرابیاں پیدا کر دی ہیں۔ خوبیاں تو مادی اور دماغی لحاظ سے اور خرابیاں اخلاقی اور سیاسی نقطۂ نظر سے۔ جنگ ہائے دراز سے عاجز آکر اور ایک درخشاں تہذیب سے کمزور ہو کر مسلم اقوام مجبوراً مرض میں مبتلا ہیں۔ لیکن وہ نہ پامال ہیں نہ مردہ۔ ان اقوام نے جو توپ کے زور سے مفتوح ہوئیں اُن مظالمانہ حکومتوں کے تحت میں بھی جن کا یورپیوں نے ان کو عرصہ سے زیر فرمان بنا رکھا ہے اپنے اتحاد کو ذرا بھی نہیں کھویا"۔ میں نے کہا ہے کہ یورپی اتصال ہمارے لیے مادی اور ذہنی دونوں نقطہ ہائے خیال سے نفع بخش ہوا ہے۔ جو کچھ مصلح مسلمان حکمران اپنی مسلمان رعایا میں زبردستی رائج کرنا چاہتے تھے آج اس کا صدگونہ احساس ہو رہا ہے گزشتہ پچیس سال میں ہمارے علوم و ادبیات و فنون میں ایسی ترقی ہوئی ہے کہ ہم کو پوری امید ہوتی ہے کہ نصف صدی سے کم عرصہ میں ہم ان سب چیزوں میں یورپ کے برابر ہو جائیں گے۔

چودھویں صدی ہجری سے ہمارے لیے نیا دور شروع ہوتا ہے اور یہ مبارک صدی ہمارے نشأۃ ثانیہ اور عظیم مستقبل کا نشان ہو گی۔ ایک جدید نفس سب نسلوں کی مسلمان اقوام کو زندہ کر رہا ہے اور کل مسلمانوں میں احتیاج عمل اور تعلیم

سرایت کر گئی ہے۔ ہم سب سیاحت وکاروبار و حصول ثروت اور مقاومت خطرات کے آرزومند ہیں۔ مشرق میں مسلمانوں میں ایک حیرت انگیز سرگرمی اور حیات ہے۔ جو ۲۵ سال قبل معدوم تھی،، آج کل مشرق میں ایک حقیقی رائے عامہ ہے۔

مصنف خاتمہ پر کہتا ہے ”ہم کو استقلال سے کام لینا چاہیئے۔ ہر فردِ کُل کے لیئے! اُمید لگائے رہو۔ اُمید! اُمید!! ہم اچھی طور پر جادۂ ترقی پر گامزن ہیں۔ اور ہم کو اس سے نفع اُٹھانا چاہیے۔ یہ یورپ کا ظلم ہی ہے جس نے ہماری قلب ماہیت کر دی ہے! یہ ہمارا یورپ سے مسلسل اتصال ہے جو ہمارے ارتقا کا حامی ہے اور ہمارے نشاۂ کو مجبوراً سریع کر رہا ہے۔ یہ صرف تاریخ کا اعادہ ہے۔ باوجود تمام مخالفت اور مقاومت کے مشیت ایزدی پوری ہو رہی ہے...... ایشیائیوں پر یورپ کی اتالیقی روز بروز کم ہو رہی ہے۔ اور یورپیوں کے خلاف ایشیا کے دروازے بند ہو رہے ہیں۔ بالیقین ہم اپنے پیش نظر ایسے انقلاب کی جھلک دیکھ رہے ہیں جو تاریخ دنیا میں عدیم المثال ہے ایک جدید دور آنے والا ہے“

اگر اس طور پر اتحاد بین الاسلامی کے حامی آغاز صدی میں خیال کر رہے تھے تو یہ ظاہر ہے کہ ان کی رائے جنگ عظیم سے صحیح اور پختہ ہو گئی ہو گی۔ اس سے مغرب کی مادی طاقت بہت گھٹ گئی اور اس کا رعب داب بھی مساوی طور پر تصفیہ صلح کی نوعیت اور اُن نزاعات کی وجہ سے جو فاتحین میں پیدا ہو گئی، جاتا رہا۔ انگلستان وفرانس و اطالیہ اور ان کے مشرقی تابعین کی باہمی رقابتوں اور حسدوں کی وجہ سے مسلمانوں کو اُمیدافزا منصوبہ جات باندھنے کا اچھا موقع ملا۔ اور اس قدر یورپی خیالات میں الجھن

ﻪ ایشیائی اور افریقی اقوام پر جنگ عظیم کے اثر کی کامل بحث کے لیے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب ”گوروں کی عالمگیر اقتدار کے مقابلہ رنگ کا اُٹھنے والا طوفان،، مطبوعہ لندن و نیویارک سنہ ۱۹۲۰ء

پیدا ہوئی۔ ایک فرانسیسی ماہر سیاسیات نے حال میں اپنے رفیق یورپیوں کو نصیحت کی کہ "اسلام ہمارے مستعمرات کی سرحدوں کو تسلیم نہیں کرتا" اور اس نے تنبیہ کے لیے یہ بھی اضافہ کیا "دور اسلامی اتحاد کی بڑی تحریک جس کا آغاز جمال الافغانی نے کیا تھا جاری ہے"[۱]

اسلام کی مخوف روش کا اظہار اس غضب ناک شورش سے ہوتا ہے جو تجزیہ سلطنت عثمانیہ کے خلاف تین سال سے ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں میں جاری ہے۔ یہ شورش صرف ہندوستان تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ کل ممالک اسلامی میں عام ہے۔ اور سر تھیوڈور ماریسن ذیل کے بیان میں قطعی مبالغہ سے کام نہیں لیتے "وقت آ گیا ہے کہ برطانوی پبلک جو کچھ مشرق میں ہو رہا ہے اس کی اہمیت کو محسوس کرنے۔ تجزیہ ترکی پر دنیا کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک سب مسلمان غصہ سے برافروختہ ہیں۔ کابل اور قاہرہ جیسے دور دراز مرکزوں میں فتنوں کا برپا ہونا محض اس عام ناراضگی کی علامت ہے۔ میں تقریباً تیس ۳۰ سال سے مسلمانان ہند سے ارتباط رکھتا ہوں اور میں اس کو اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ برطانوی پبلک کو اس خشم آلود ناراضگی سے مطلع کر دوں جو مسلمانوں کو مجوزہ تجزیہ ترکی پر ہے۔ ورسیلز کے مدبرین نے یہ تصور کیا ہے کہ ترکی اوطان کے باہر کسی کو ترکی سے ہمدردی نہیں ہے۔ یہ سخت غلطی ہے اگر تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ ان کو غصہ کس شدت سے آ رہا ہے تو تم صرف ان مسلمانوں سے جو اس وقت لندن میں ہیں ملاقات کر لو۔ خود ہندوستان میں کل مسلمان جماعت پشاور سے لیکر ارکاٹ تک اس مسئلہ پر غصہ سے کف بدہاں ہیں۔ زنانوں میں مستورات اس پر آنسو بہا رہی ہیں

---

[۱] ال مزینیاں کا مضمون "اسلام اور اتحادیوں کی سیاسیات"، جو جون ۱۹۲۰ء کے ریویو دی سائنس پولیٹیک میں شایع ہوا۔

سوداگران جو عموماً پبلک معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے ہیں اپنی دکانیں اور حساب خانہ چھوڑ کر درخواستوں اور شکایتوں کا انتظام کر رہے ہیں۔ دیوبند اور ندوۃ العلماء کے ازمنہ متوسط کے فقہاء بھی جن کی موجودہ دنیا سے بے تعلقی ضرب المثل ہے تباہی اسلام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے اپنی خانقاہوں سے نکل آئے ہیں۔[1]"

غالباً اس حالت کی سب سے زیادہ نازک صورت یہ ہے کہ آزاد خیال مسلمان بھی مجبوراً سیاسی اتحاد بین الاسلامی کے فتنہ انگیز اور انقلابی سیلان کے مخالف ہیں۔ لیکن یورپ کی سیاسی غلط کاریاں ان کو اتحاد بین الاسلامی اور قوم پرست جماعتوں سے کم از کم عارضی اتحاد پیدا کرنے پر مجبور کر رہی ہیں۔ باوجود اس کے کہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ کوئی ایسا فعل جیسا اعلان جہاد ہے مشرق اور مغرب کے درمیان عمیق خندق کھود دے گا، مغربی قوت محرکہ کی رو کو بند کر دے گا، فتنہ انگیز مذہبی جنون کی حمایت کرے گا اور غالباً اسلام کے حسب حال اصلاح کو پشتہا پشت کے لیے معرض التوا میں ڈالدیگا۔

غالباً یہ اسلام کے مزید سوء مزاج کی علامت ہے کہ گزشتہ چند سال میں دو جدید خالص اور پرجوش تحریکات یعنی اخوان اور سلفیہ کی سریع اشاعت عالم شہود میں آئی تحریکات اخوان دس سال ہوئے وسط عربستان یعنی نجد میں مجہول طور سے شروع ہوئی یہ براہ راست وہابیت کی شاخ ہے جس سے یہ کسی اصول میں مختلف نہیں ہے تحریک اخوان کی ترقی ایسی سرعت سے ہوئی کہ آج وہ کل نجد پر حاوی ہے اور اس کا سرگروہ صحرائے عرب کا سب سے زبردست شیخ بن سعود ہے۔ جو ابن سعود کی اولاد میں ہے جو سو سال ہوئے وہابی تحریک کا سرگروہ تھا۔ اخوان کا مذہبی جوش غیر معمولی بتایا جاتا ہے۔ اور

---

[1] مسٹر ہارلیسن کی کتاب "انگلستان اور اسلام" مذکور الصدر

اس کا مکمل نظام عمل وہی قدیم وہابی خواب یعنی کل دنیا کے مسلمانوں کو خالص مذہب اسلام میں لانا ہی۔ سلفی تحریک کی بابت یہ ہی کہ وہ ہندوستان میں اس سے بھی زیادہ مجہول طور پر پیدا ہوئی جیسے اخوان عربستان میں، لیکن گزشتہ چند سال میں بہ عام پر دنیائے اسلام میں شایع ہو گئی ہی۔ تحریک اخوان کی طرح اس کے عوض بھی خالص اور مذہبی جوش سے لبریز ہیں اور اس کے پیروان بالخصوص درویشوں کے سلسلوں میں پائے جاتے ہیں[۵۲]۔ جب دیگر امور کے ساتھ صورت پر غور کیا جاتا ہی تو اس مشرق کے لیے شگون اچھے نہیں پائے جاتے۔

اتنا تو اسلامی تحریک کے مذہبی اور سیاسی پہلو کی بابت ہی۔ اب ہم کو اس کے تجارتی اور صنعتی پہلو پر نظر ڈالنا چاہیے جس کو اقتصادی اتحاد بین الاسلامی کہا جاسکتا ہی۔

اقتصادی اتحاد بین الاسلامی براہ راست مغربی خیالات کے سرایت کرنے کا نتیجہ ہی۔ نصف صدی قبل اقتصادی حیثیت سے دنیائے اسلام اندھیرے متوسط کی ظلمت میں گھری ہوئی تھی۔ احکام شریعت یا اسلامی قانون مذہب کے ایسے نواہی جیسے حرمت ربوا نے موجودہ طرز کی اقتصادی زندگی کو ناممکن کر دیا تھا۔ جو کچھ تھوڑی تجارت تھی وہ زیادہ تر مقامی یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاتھ میں تھی۔ مزید برآں

---

[۵۱] تحریک اخوان کے لیے ملاحظہ ہو پی۔ ڈبلیو۔ ہیرسن کا مضمون "عرب کی حالت" جو دسمبر سنہ ۱۹۲۰ء کے اٹلانٹک منتھلی میں شایع ہوا۔ ایس مالمریا کا مضمون "عرب میں سیاسی اور مذہبی حالت" جو جولائی سنہ ۱۹۱۷ء کے دی مسلم ورلڈ میں شایع ہوا۔

[۵۲] سلفی تحریک کے لیے ملاحظہ ہو مضمون "ڈ ہابیت۔ اوس کا معاشرتی مستقبل اور تحریک سلفی" جو سنہ ۱۹۱۹ء کے ریویو دی موند مسلمان میں شایع ہوا۔

کل مشرق کی اقتصادی زندگی مغرب کے جارحانہ مقابلہ کے وجہ سے ابتر ہو گئی تھی۔ یورپ نے اسلامی دنیا کی سیاسی فتوحات کے ساتھ ساتھ اقتصادی فتوحات بھی حاصل کیں جو زیادہ مکمل تھیں مشین سے بنی ہوئی ارزاں اور بکثرت مصنوعات یورپ کا سیلاب ہر گوشہ تک پہونچ گیا۔ اور اس کے پیچھے ہی پیچھے یورپی سرمایہ نہایت دل فریبی سے اپنے آپ کو ان قرضہ جات اور مراعات کے معاوضہ میں پیش کرنے لگا جو ایک بار مل جانے پر یورپی اقتدار کے لیے میدان صاف کر دیتے ہیں۔

لیکن سیاسیات کی طرح اقتصادیات میں بھی یورپی فتح کی تکمیل نے مقاومت کو برانگیختہ کیا۔ مغربی جلبِ منفعت سے ناراض اور خوف زدہ ہو کر اسلام نے صاف طور سے اپنی اقتصادی کمی کو پہچان لیا۔ اور اس سے بچنے کی کوشش کی دور اندیش مسلمانوں نے موجودہ زندگی کے مطابق طرز معاشرت کی ایسی ترمیم شروع کی جس سے اسلام اقتصادی طور پر زمانہ کے ساتھ ساتھ چل سکے۔ مغربی طریقوں کو سیکھ کر نقل کیا۔ شرعی موانع سے یا تو احتراز کیا یا خاموشی سے تجاہل برتا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی اقتصادی معیار کی طرف نمایاں تدریجی ترقی ہوئی۔ بلاشبہ یہ ارتقاء ہنوز اپنی ابتدائی منازل میں ہے اور ان ممالک میں زیادہ واضح ہے جہاں مغربی اثرات کے زیادہ موقعہ ہیں۔ جیسے ہندوستان و مصر و الجزائر۔ لیکن کل دنیائے اسلام میں رجحان یکساں ہے۔ اس اقتصادی تبدیلی کی تفصیلی حالت پر بحث اس فصل میں کی جائے گی جو اقتصادی انقلاب کے متعلق ہے۔ یہاں پر ہم کو جس امر سے مطلب ہے وہ اس کا اتحاد بین الاسلامی پہلو ہے۔ اور یہ پہلو بہت مضبوط ہے کسی جگہ پر بھی اسلام کے خلقی استحکام کا اظہار اقتصادی میدان سے بہتر نہیں ہوتا ان مذہبی و تربیتی و رسمی روابط کے وجہ سے جو ایک مسلمان کو دوسرے سے وابستہ کرتے ہیں مسلمان اسلامی دنیا کے ہر حصے میں کم و بیش آسایش سے رہ سکتے ہیں

اور مغربی آمد ورفت اور نقل وحرکت کے ذرائع کی بدولت مسلمان سفر کرکے بیش از بیش ایک دوسرے سے باخبر رہ سکتے ہیں۔ نئی قسم کے مسلمان یعنی تھوک فروش سوداگر و دخانی جہازوں کے مالک اور کاروباری وہاجن حتےٰ کہ کارخانوں کے صنعت کے مالک اور دلال سرعت سے پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ اس نمونہ کے لوگ ہیں جن کا وجود ایک صدی یا نصف صدی قبل خیال میں بھی نہ آتا تھا۔

اور یہ نئے اشخاص ایک دوسرے کو خوب سمجھتے ہیں اخوتِ اسلامی کا رشتہ اور مغربی مقابلہ کے دباؤ دونوں سے وابستہ ہوکر اونھوں نے اپنے مساعی میں اون سے زیادہ آسانی سے اتحادِ عمل پیدا کرلیا ہی جو سیاسات میں سرگرم ہیں۔ یہاں آزاد خیال مؤیدین اتحاد بین الاسلامی اور قوم پرست مشترکہ اصول پر متحد ہوسکتے ہیں۔ یہاں کوئی سوال سیاسی سازشوں اور بغاوتوں یا جہادوں کا نہیں ہی۔ جن میں یورپ کی مسلح قوت کو مقابلہ کی دعوت دے کر خونخوار جبر یا کورانہ ردعمل کا ڈر ہو۔ برخلاف اس کے یہاں پر ہر مذہب مسلمان صرف اقتصادی اغراض کے لیے اُن کاروباری طریقوں پر مل کر کام کرتے ہیں جن کو مغرب نہ ناجائز کہ سکتا اور نہ روکنے کی جرأت کرسکتا ہی۔

اب سوال یہ ہی کہ اقتصادی اتحاد بین الاسلامی کا خاص نظام عمل کیا ہی؟ یہ نظام عمل آسانی سے بیان کیا جا سکتا ہی۔ یعنی اسلام کی دولت مسلمانوں کے لیے۔ عیسائیوں کے بجائے تجارت اور صنعت کا نفع مسلمان اُٹھائیں۔ اور مسلمانوں کے سرمایہ سے مغربی سرمایہ کو خارج کیا جائے سب سے بڑی بات یہ ہی کہ آراضی و معدنوں و جنگلات و ریلوں و محصولات کے

ان مراعات کو ختم کر کے جن کی بدولت آج بلاد اسلامی کی دولت سواحل غیر کو کھنچی جا رہی ہے اسلام کے قدرتی ذرائع کو یورپ کی گرفت سے رہائی دلائی جائے۔

یہ ہیں تمنائیں بین الاسلامی اقتصادیات کی یہ بالکل جدید ادراکات ہیں اور ان مغربی خیالات کا نتیجہ ہیں جن کے اسلامی دنیا پر اثرات کی اب میں بحث کروں گا۔[۵]

---

[۵] اقتصادی اتحاد بین الاسلامی کے عام مضمون کے لیے ملاحظہ ہو اے۔ لی شاتلی ایر کا مضمون "اسلام کی بیداری اور اوس کی اقتصادی حالت" جو جولائی ۱۹۱۰ء کی ریویو ایکونومیک انٹرنیشنل میں شایع ہوا۔ نیز ملاحظہ ہو اوس کا دوسرا مضمون "مسلمانوں کی سیاسیات" جو ستمبر ۱۹۱۰ء کے ریویو دی موند مسلمان میں شایع ہوا۔ موسیو پکتال کا مضمون "اسلامی اخلاق" جو جولائی ۱۹۱۶ء کے ریویو پولیٹیک انٹرنیشنل میں شایع ہوا۔ صلاح الدین خدابخش کی کتاب "مضامین۔ اسلامی اور ہندی" مطبوعہ لندن ۱۹۱۲ء

باب سوئم

(مغرب کا اثر)

مشرق کی موجودہ تبدیلی کا سب سے بڑا محرک مغرب کا اثر ہے۔ مغربیت کا ہمہ گیر اثر نہ صرف اسلامی دنیا میں بلکہ ایشیا و افریقہ کی کل غیر مسلم اقوام میں بھی تبدیلی پیدا کر رہا ہے۔ اور صفحات مابعد میں ہم مغربی اثرات کے ان نتائج کی جانچ کریں گے جو ہندوستان کے غیر مسلم عنصر میں پیدا ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام کے موجودہ ارتقاء کا باعث کلیتاً مغرب کا اثر ہی نہیں ہے ہم دیکھ چکے ہیں کہ گزشتہ سو سال سے اسلام خود ایسی قوتیں پیدا کر رہا ہے جو چاہے بیرونی مغربی تحریک سے کتنی ہی سریع الاثر کیوں نہ ہو گئی ہوں پھر بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل اندرونی ہیں اور جو خود بخود پیدا ہو کر بیّن اور اصلی اغراض کی طرف کھینچے لئے جا رہی ہیں۔ اسلامی دنیا میں آج جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ محض مغرب کی نقل نہیں ہے۔ بلکہ ایک نئی ترکیب و ترتیب کی سعی یعنی مغربی اسالیب اور مشرقی اغراض میں توافق اور تعلق پیدا کرنا ہے ہمکو ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ ایشیائی اقوام جو پیروان اسلام کا عنصر غالب ہیں افریقہ کے حبشیوں یا اسٹریلیا کے اصلی باشندوں کی طرح ابتدائی عہد کے وحشی نہیں ہیں۔ بلکہ زیادہ تر وہ اقوام ہیں جنہوں نے اپنا اصلی تمدن زمانہ بعید سے خود اپنی مساعی سے قایم کیا ہے۔ ان کے تاریخی کمالات کو

۱؎ وسیع صورت کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "گوروں کے عالمگیر اقتدار کے خلاف بگڑا ہوا اٹھنے والا طوفان" مطبوعہ لندن و نیویارک سنہ ۱۹۲۰ء

پیش نظر رکھکر یہ نتیجہ نکالنا ٹھیک معلوم ہوتا ہی کہ اس ہیجان میں جو آج اسلامی دنیا کو مشتعل کر رہا ہی ہم ایک سچی نشاۃ ثانیہ کا مشاہدہ کر رہے ہیں اور جسکی حقیقت کا بہترین ثبوت یہ ہی کہ ازمنہ ماضیہ میں بھی اس قسم کی تحریکات ہو چکی ہیں۔

زمانہ حال میں مغرب جو اثر مشرق پر ڈال رہا ہی وہ شدت اور وسعت ہر دو کے لحاظ سے بالکل عدیم المثال ہی یونان اور روما کے اثرات کو جو زیادہ تر مقامی اور جزوی ہی اس سے کوئی نسبت نہیں ہی۔ دوسرا امر قابل لحاظ یہ ہی کہ مشرق پر مغرب کا موجودہ اثر بالکل ہی حد پر ہی۔ مشرق پر بحالت مجموعی مغربیت کا کامل اثر انیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوا مگر اسوقت سے اس اثر میں یوماً فیوماً ترقی ہی۔ سڑکیں، ریلیں، ڈاکخانے، تار گھر، کتابیں، اخبارات، نئے طریقے اور خیالات مشرق کے گوشہ گوشہ میں پہونچ گئے۔ یا پہونچ رہے ہیں۔ دُخانی جہاز بعید ترین سمندروں میں جاتے ہیں۔ تجارت مغربی صنعت کی بے شمار پیداوار کو بعید ترین اقوام میں لے جاکر پھیلا رہی ہی۔ وہ اقوام جو نصف صدی قبل تیس صدی قبل کی زندگی بسر کرتی تھیں آج اخبارات پڑھتی اور بجلی کی ٹریمکاروں میں سوار ہوکر کاروبار کو جاتی ہیں۔ مشرقیوں کے عادات اور خیالات دونوں میں انقلابات ہو رہے ہیں۔ اس کتاب کے باقی حصہ میں اسلامی دنیا پر مغرب کے اثر کی بابت بحث ہوگی موجودہ فصل میں تو ہم تمہیدی طور پر اس اثر کی عام حالت بیان کرتے ہیں اور فصول مابعد میں خاص اجزا کی توضیح کیجائیگی۔

مغربیت کا نفوذ بداہتاً بلاد اسلامی کے اُن حصص میں سب سے زیادہ ہی جو سب سے زیادہ مدت سے مغرب کے سیاسی تسلط میں ہیں ہندوستان کے

بعید ترین جنگلوں میں برطانوی حکومت کا داخل ہونا ایک غیر معمولی حقیقت ہے۔
یہ نظام حکومت اسکولوں، ڈاکخانوں، ریلوں، عدالت گستری، پنچایت
تعلیم، امداد قحط اور ہزارہا طریقوں سے کل ہندوستان میں ساری و واری ہے
لیکن ان ممالک میں جہاں یورپی تسلط برائے نام ہے مغربیت کے بیج پہلے
ہی پہونچ گئے ہیں۔ عوام کے رسوم و عادات میں نمایاں ترمیم ہو گئی ہے مغربی
مادی ترقیاں اور آسائشیں مثلاً مٹی کے تیل کے لیمپ اور سینے کی مشین
آج لوگوں کی روزانہ زندگی کا جزو بن گئی ہیں۔ جدید اقتصادی ضروریات پیدا
ہو گئی ہیں معیار زندگی بلند اور مذاق تبدیل ہو گیا ہے۔[1]

اسی طور پر ذہنی اور روحانی میدانوں میں بھی مغربی خمیر صاف
طور پر نمایاں ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مسلمان آزاد خیال مصلحین پر مغربی
ترقی کی روح کا کیسا گہرا اثر پڑا ہے بلا شبہہ مغربیت نے ان میدانوں میں
بہت سستی سے ترقی کی ہے۔ اور مادی میدان کے مقابلہ میں اسنے بہت
سخت مخالفت پیدا کر دی ہے۔ مادی اختراعات بالخصوص صنعتی ترقیاں اور
سامان معیشت بمقابلہ جدید رسوم اور خیالات کے بہت جلد پھیل جاتے ہیں۔
جنسے مسلمہ عقاید اور قدیمی حمایات کو عموماً صدمہ پہونچتا ہے۔ ہر مزر بوم کے

---

[1] ان امور کے لئے ملاحظہ ہو ارنیس وامبری کی کتاب "مشرقی ممالک میں مغربی تمدن" مطبوعہ لندن ۱۹۰۶ء نیز "موجودہ اور چالیس سال قبل کی ترکی" مطبوعہ پیرس ۱۸۹۸ء سی۔ ایس۔ کوپر کی کتاب "مشرق کی تجدید" مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۴ء صلاح الدین خدا بخش کے "مضامین متعلقہ ہندوستان اور اسلام" مطبوعہ لندن ۱۹۱۲ء اے۔ جے۔ براون کا مضمون "ایشیا میں اقتصادی انقلابات" جو مارچ ۱۹۰۲ء کے رسالہ وی سنچوری میں شائع ہوا۔

اشخاص نے (تمباکو) استعمال بہت جلد اختیار کر لیا اور تیل کے لیمپ نصف صدی میں ایشیا، متوسط اور چین کے گوشوں میں پہونچ گئے - لیکن رسومات مثلاً انگریزی ملبوس اور خیالات مثلاً مغربی تعلیم ان کو بہت سی دقتوں کا مقابلہ ہوا - اور بعض وقت اتنی ترمیمات کے بعد اختیار کئے گئے کہ اُن کی اصلی روح منقلب اور منعکس ہو گئی - مغرب کی قوت اور صنعت کے تفوق کا آجکل مشرق میں ہر جگہ عام طور پر اعتراف کیا جاتا ہے - لیکن اکثر جگہ مغربی ترقی کی پہلی مقبولیت اور مغربی خیالات کی سرگرمی سرد ہو گئی یا اس کے بجائے اصلاً مغربی تہذیب کے روح سے مخالفانہ نفرت پیدا ہو گئی ہے[۱]

مغرب کے اثرات سب سے زیادہ اعلےٰ اور اوسط طبقوں بالخصوص اُس مغربی تعلیم یافتہ روشن خیال گروہ میں نمایاں ہیں جو آج ہر مشرقی ملک میں پایا جاتا ہے - اس منتخب گروہ کے اشخاص تعداد اور اقتدار میں بہت مختلف ہیں - لیکن ان سب کو مغربی خیالات پر کم و بیش دستگاہ حاصل ہے - یہ افراد مغربی تہذیب کے قبول اثر میں ایک دوسرے سے بالکل متفاوت ہیں - بعض اپنے موروثی فلسفہ حیات کے اصول کو قایم رکھکر مغربی نصب العین کے ساری وطاری ہونے نے اپنی الحقیقت کوشش کرتے ہیں اور مشرقیت کے امتزاج کو پیش نظر رکھتے ہیں بعض

---

[۱] مغرب کے ذہنی اور روحانی اثرات کی بابت ملاحظہ ہو ابیری کی تصنیف مذکور الصدر مسٹر ویلنٹائن چرول کی کتاب "ہندوستانی شورش" مطبوعہ لندن ۱۹۱۰ء - جے - این فارکوہر کی کتاب "ہندوستان میں موجودہ مذہبی تحریکات" مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۵ء - ریورینڈ جے - موریسن کی کتاب "ہندوستان میں خیالات جدید یعنی معاشرتی و اقتصادی و مذہبی ترقیوں کا مطالعہ" مطبوعہ ایڈنبرا ۱۹۰۶ء - ارل آف کرومر کی کتاب "موجودہ مصر" بالخصوص جلد دوم صفحات ۲۲۸ لغایتہ ۲۳۴ مطبوعہ لندن ۱۹۰۸ء مصنف

اپنے قدیمی ماضی سے الگ ہو کر مغربیت میں غرق ہوجاتے اور فی الحقیقت کم و بیش مغربی رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جو اپنی مغربی ملمع کاری کی تہ میں نفرت اور بطلان فریب کو مخفی رکھتے ہیں۔[1]

بلاشبہ مغربی تہذیب کا رواج زیادہ تر امور ظاہری ہی میں نمایاں ہے وہ ہندوستانی یا ترکی "روشن خیال"، جو مغربی درسگاہوں کے سند یافتہ اور متعدد یورپی زبانوں میں روانی کے ساتھ تقریر کرنے پر قادر ہیں۔ اور نیز وہ متمول موٹر کاروں، اور گھوڑ دوڑ کے گھوڑوں کے مالک والیان ریاست و پاشا جو یورپ کے معدنی چشموں کے غسلگاہوں میں سالانہ علاج کو جاتے ہیں بادی النظر میں سب سے زیادہ مغربی رنگ میں ڈوبے معلوم ہوتے ہیں ایسے اشخاص یورپی ملبوس پہنے اور یورپی غذا کھاتے اور ان مکانات میں رہتے ہیں۔ جو جزواً یا کلیتاً مغربی طرز پر آراستہ ہیں۔ اس روکار کے پیچھے اندرونی زندگی کی ہر قسم کی صورتیں بتفاوت مدارج یعنی مغربی نصب العین کی دلی سرگرمی سے لیکر شدید نفرت تک موجود ہیں۔

مغربیت کے متعلق ایسے طرز عمل کسی خاص جماعت یا مقام کے لیئے مختص نہیں ہیں بلکہ مشرق کے ہر ملک و ہر طبقہ کے افراد میں بیک وقت موجود ہیں واقعہ یہ ہے کہ کل مشرق میں ایک عظیم الشان تبدیلی ہو رہی ہے جو ایسی فوری اور

---

[1] ان مغربی تعلیم یافتہ متخمین کی بابت ملاحظہ ہو۔ ایل۔ برتراند کی کتاب "مشرقی سراب" مطبوعہ پیرس سنہ ۱۹۱۰ء۔ کرومر مذکور الصدر۔ اسے میتین کی کتاب "موجودہ ہندوستان یعنی معاشرت کا مطالعہ"، مطبوعہ پیرس سنہ ۱۹۱۰ء اے۔ بی سٹانلی ایر کا مضمون "اسلامی سیاسیات" جو ستمبر سنہ ۱۹۱۰ء کے ریویو دو موند مسلمان میں شایع ہوا۔ (مصنف)

شدید ہے کہ مغرب کے احاطہ علم میں آ ہی نہیں سکتی۔ ہماری تہذیب زیادہ تر خود بخود ارتقائی طور سے ہوئی ہے۔ یعنی اس کا قدرتی نشو و نما معمولی و منطقی اور مقابلتاً تدریجی منازل سے ہوا ہے۔ برخلاف اس کے مشرق میں اجتماعی عمل تطبیق جاری ہے۔ جو ہم کو صدیوں میں حاصل ہوا۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ سیاسی و اقتصادی و معاشرتی و ذہنی و مذہبی اور بہت سے دیگر امور میں اتنا ارتقاء نہیں ہے جتنا کہ انقلاب ہے۔ اس کا ماحصل ابتری و تذبذب و بے ہنگامی اور تناقض ہے۔ ایک ہی نسل کے افراد میں ناقابل عبور دماغی و روحانی فصل ہے۔ والدین بیٹوں کو نہیں سمجھتے۔ اور بیٹے اپنے والدین کو حقیر سمجھتے ہیں ہر جگہ "قدیم" اور "جدید" کی سخت کشمکش ہے اور یہ کشمکش بسا اوقات ایک ہی فرد کے دل و دماغ میں ہے اس کشمکش کی لامتناہی پیچیدگیوں کا جو اظہار ہندوستان میں ہوا ہے ان کی طرف سر ویلینٹا چرول نے جو مختصر اشارات کیے ہیں وہ انھیں کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں:-

اُمواج اور متقابل امواج اُس منتشر تحریک کے،
جو ہندوستانی زندگی کے ساکن سرچشموں کو
متحرک کر رہے ہیں۔ متواتر اثر خیالات غیر کا ایک
فرسودہ و قدیم تہذیب پر۔ کم و بیش نامکمل اشاعت
ان خیالات سے خوف و ہراس اُن لوگوں کا جن کی
قدیم عظمت معرض خطر میں ہے۔ غیر محتاط تر و یج ایک
مصنوعی نصاب تعلیم جو کمزوری کے ساتھ روشن
خیالی پر مبنی ہے اور ہر قسم کے اخلاقی و مذہبی
اجازت سے معرا ہے۔ شکست و ریخت عقائد
قدیمہ کی اور اس کے بعد ان کی جارحانہ تجدید

'استعمال مغربی نظریات حکومت و معدلت '
'کا ایسے نظام معاشرتی پر جس میں شدت '
'سے جمود و تحجر آ گیا ہو۔ اور موجودہ زمانہ کی اقتصادی '
'قوتوں کا عمل صنعت و تجارت ابتدائی '
'حالات پر۔ متواتر اور نامعلوم لیکن لازمی '
'نزاعات مابین اقوام محکوم اور ان کے اجنبی '
'حکمرانوں کے۔ مقامات بعیدہ کی لڑائیوں اور '
'نسلی نزاعات کا اثر۔ مشرق اقصےٰ میں ایک '
'مشرقی اقوام کا عروج'[1]

یہ سطور اگرچہ ہندوستان کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔ لیکن آج مشرق ادنیٰ اور وسطےٰ کے دیگر حصص پر بالکل صادق آتی ہیں۔ چنانچہ ایک فرانسیسی مصنف خاص طور پر لیوانٹ[2] کے متعلق لکھتا ہے "حقیقت یہ ہے کہ مشرق اور نیز مسلمانوں کے احساسات ذہنی بھی انقلابی حالت میں ہیں (گو غالباً ہماری خواہشات کے مطابق نہیں) یہ ایسے نازک دور سے گزر رہے ہیں جس میں ہر جگہ ماضی حال کے خلاف معرکہ آرا ہے۔ اور رسومات قدیم جدید اختراعات سے کمزور ہو کر ایک مخلوط اور مختل منظر پیش کرتی ہیں"[3]

---

[1] پیرول مذکور الصدر صفحات ۳۲۱ و ۳۲۲۔

[2] لیوانٹ کے معنی طلوع یا مشرق کے ہیں۔ بحیرہ۔ روم کے مشرقی کنارے اور ساحل کو کہتے ہیں۔ لیوانٹی حلقہ کے اردگرد یونان۔ ایشیاء کوچک۔ شام اور مصر واقع ہیں (مترجم)

[3] برتراند مذکور الصدر صفحہ ۹۳ ملاحظہ ہو بخش مذکور الصدر فارکوہر مذکور الصدر موریسن مذکور الصدر۔ مکرجی کی کتاب "ہندوستانی اقتصادیات کی بنیادیں" مطبوعہ لندن ۱۹۱۶ء۔ ڈی۔ ایچ۔ ووڈ ڈیل کا مضمون "ہندوستان میں اقتصادی تبدیلی" جو دسمبر ۱۹۱۶ء کی اکونامک جرنل میں شائع ہوا۔ (مصنف)

اسی کی بدولت زیادہ تر وہ غیر مانوس خصوصیات ہیں جو اکثر نام نہاد مشرقیوں سے ظاہر ہوتی ہیں یعنی ہندوستانی بابو کی نمایشی تہذیب[۱]، اور ترکی "آفندی" کی "بازاری شائستگی"، یہ لوگ تہذیب یافتہ ہونے کے بجائے متعدی امراض میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ہر عمیق تبدیلی میں ناکارہ ماحصل لازمی ہے۔ اور آج کل مشرق میں مغربی تہذیب کی اشاعت میں اچھائی اور بُرائی دونوں کا پہلو ہے۔ اصلاح کا عمل خواہ وہ کتنا ہی ضروری اور لازمی کیوں نہ ہو قدیم خرابیوں کو جدید قوت پہونچاتا ہے اور جدید خرابیاں جو پہلے نا معلوم تھیں ان کو داخل کرتا ہے۔ چنانچہ لارڈ کرومر کہتے ہیں۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ ان پست مشرقی جماعتوں میں مغربی تہذیب پھیلانے کی جو قیمت دی جاتی ہے اس کی مقدار کا اندازہ اُسی قدر ہوتا ہے جیسا کہ ہونا چاہیے مغربی تہذیب کے مادی نفع بلاشبہ بڑے ہیں۔ اور پبلک اور خانگی اخلاق پر جو اثر پڑتا ہے اس کی بابت مستقبل بالکل غیر متیقن ہے[۲]،،

مغربی تہذیب کے اثر کی بُرائیاں اور خوبیاں زیادہ تر تعلیم یافتہ منتخبین کے طبقہ میں صاف طور پر نمایاں ہیں ان میں سے بعض تو مغربی روح کا بہترین اثر ظاہر کرتی ہیں۔ لیکن ایک کثیر تعداد قدیم اور جدید کے درمیانی غار میں گر کر ذلت کے ساتھ تباہ ہو جاتی ہے۔ لارڈ کرومر نے اکثر "یورپی تعلیم یافتہ،، مصریوں کو یوں مختص کیا ہے "کہ وہ ایک ہی وقت میں خارج از اسلام مسلم اور خالی از ہمت یورپی ہیں[۳]،، ایک دوسرا یورپی مصنف ہندوستان میں مروجہ انگریزیت کو یوں

---

[۱] ڈبلیو۔ ایس۔ للی کی کتاب "ہندوستان اور اس کے مسایل" صفحہ ۲۴۳ مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۰۲ء (مصنف)

[۲] کرومر کی تصنیف مذکورۃ الصدر جلد دوم صفحہ ۲۳۱ (مصنف)

[۳] مذکور الصدر صفحہ ۲۲۸ (مصنف)

مایوسانہ طور پر بیان کرتا ہے "ہمنے ہندوستانی دماغ کی تزئین و آرایش جیسی کی ہے اس کی مثال یہ ہے کہ خوبصورت مغلیہ محلات کو ٹاٹنہم کورٹ روڈ کے شکستہ سامان سے آراستہ کیا ہے۔ ہم نے اس کو صرف یہی سبق نہ دیا کہ وہ اپنی تہذیب کو ذلیل سمجھکر ترک کردے بلکہ ہم نے یہہ بھی بتا دیا کہ خالی جگہہ کو ایسے سامان سے پُر کرے جو آب و ہوا کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ہندوستان کی نیم یورپی اور نیم ایشیائی دماغی حالت ہولناک ہے۔ میں اب ایسے دماغوں کو آوارہ گرد کہتا ہوں۔ اُن کو کسی تہذیب کسی ملک اور کسی تاریخ سے تعلق نہیں ہے۔ یہ ایسی خواہشات جو پوری نہیں ہو سکتیں اور ایسے نصب العین جو بالکل خیالی ہیں پیدا کرتے ہیں۔ یہ زندگی کا بطلان کرتے ہیں۔ یہ اشخاص کو ان کے تربیتی ماضی کی غذا سے محروم کر دیتے ہیں۔ اور بدل جو دیتے ہیں وہ بیکار ہے........ ہمنے مشرقی دماغ کو مغربی طمانیت اور ماحول دینے کی کوشش کی لیکن ہمکو پوری کامیابی اس میں ہوئی کہ دونوں میں ذہنی اور اخلاقی بدنظمی قائم کر دی تھی"

---

۵ جی ریمزے میکڈانلڈ کی کتاب "حکومت ہند" صفحات ۱۷۱ لغایتہ ۲۷۱ مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۲۰ء۔ مغربی تمدن کی ترویج کی خرابیوں کی بابتہ ملاحظہ ہوں بخش و کرومر و ڈاڈ ویل و مکرجی کی مذکورالصدر تصانیف۔ سر ڈبلیو۔ ایم۔ ریمزے کا مضمون "اناطولیہ کے ترکی کاشتکار" جو جنوری سنہ ۱۹۱۸ء کے کوارٹرلی ریویو میں شایع ہوا۔ ایچ۔ ایم۔ ہائنڈمین کی کتاب "ایشیا کی بیداری" مطبوعہ نیویارک سنہ ۱۹۱۹ء ٹی۔ روتھسٹائن کی کتاب "بربادی مصر" مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۰ء۔ کپتان سی پی ازاں کی کتاب "الجزائر کے ولیسی مسئلہ کا ایک حل کی تلاش" مطبوعہ پیرس سنہ [illegible]ء۔

مغربی تہذیب کی اشاعت کی یہ نمایاں خرابیاں اس شدید نفرت کا باعث اوّل ہیں جو اکثر مشرقیوں کو بشمول بعض واقف کاران مغرب ہر اُس چیز سے ہے جس پر مغربی ہونے کا اطلاق ہوتا ہے۔ ایسے اشخاص جاہل انقلاب پسندوں اور مغربی سیاسی اقتدار کے خلاف بغاوت کرنے والوں کے کارآمد معاونین ہیں۔

بلاشبہہ مشرق پر مغربی اثرات کے مسئلہ میں مشرق پر مغرب کا سیاسی اقتدار نمایاں عنصر ہے ہم یورپ کی گزشتہ صدی کی فتوحات مشرق اور اس کے واسطے پر تبصرہ کر چکے ہیں۔ اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ اسلامی دنیا سیاسی اور اقتصادی تسخیر کے دوگونہ سیلاب کے مقابلہ میں کیسی ناچار و پست و شکستہ پا تھی۔ فی الواقع یوروپی کی سرعت اور تکمیل میں اقتصادی پہلو نے غالباً اہم حصہ لیا۔ بلاشبہہ بعض بلاد مشرق کھلم کھلا فوجی طاقت کی ایک ضرب سے مسخر ہو گئے مثلاً الجزائر میں فرانسیسی مہم اور ایشیا کے وسطے میں روسی فتوحات اور طرابلس میں اطالوی حملہ لیکن زیادہ تر ملک گیری کا آغاز اصلاً اقتصادی عمل سے ہوا۔ جس کو پر امن مداخلت کہتے ہیں۔ یعنی مغربی سرمایہ سے قرضہ جات اور مراعات کی صورت میں ایسے مشرقی ممالک پر جو اس وقت آزاد تھے مالی قابو حاصل کیا گیا۔ حتےٰ کہ مغربی سیاسی تسلط کا حصول ایک بے ضابطہ امر واقعہ کو باضابطہ بنانا رہ گیا۔ یہ ہی قصہ مصر و مراکش و ایران کی تسخیر کا۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ انگلستان کی سلطنت ہند کی ابتدا خالص تجارتی مہم یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی سے ہوئی۔ اکثر ”پرامن مداخلت“ کی غضب کی قوت کا پورا احساس نہیں ہوتا۔ صرف ایک مد یعنی ریلوں کی مراعات کو لو ڈاکٹر ٹولن سیاسات دنیا کا ذہین ہوشمند ماہر لکھتا ہے۔

”آئندہ مسلط ہونے والی حکومتوں کو ریل کی آہنی سڑکیں وہی کام

دیتی ہیں جو کھنکھجوروں کو اون کی مونچھیں پہلے تو بڑے اخلاص سے انہیں پھیلایا جاتا ہے لیکن جب لوہا ایک مرتبہ کمزور اقوام کے دل میں تیر جاتا ہے تو۔ وہی کمزور بال ایک مضبوط آہنی بازو بن جاتا ہے اور اس کی بطش شدید ان اقوام کا فشار کر دیتی ہے"

میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ مغرب نے جو مشرق کو مسخر کیا وہ جائز تھا یا ناجائز اس پر کامل بحث موافق اور مخالف ہو چکی ہے اور ان صفحات کے ناظرین دونوں طرف کی اصل دلیلوں کے ذخائر سے واقف ہوں گے۔ ایک امر یقینی یہ ہے کہ یہ تسخیر کا عمل فی الجملہ لازمی تھا دو دنیاؤں کو ایسی مختلف سطح پر فرض کرو جیسے کہ مشرق اور مغرب اونیسویں صدی کے آغاز پر تھے۔ یعنی مغرب حیات سے لبریز اور انسانی ترقی کا مقدمتہ الجیش بنا ہوا تھا اور مشرق غفلت اور پستی میں غرق تھا۔ لہذا نتیجہ کھلا ہوا تھا کہ اول الذکر آخر الذکر کو مغلوب کر کے چھوڑے گا۔

ہماری موجودہ بحث سے جو امر متعلق ہے وہ مشرقی ممالک میں مغربی تمدن کی اشاعت عام عمل پر یورپی سیاسی تسلط کا اثر ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی تہذیب کی اشاعت کو اس سیاسی تسلط سے بہت زیادہ توسیع اور ترقی ہوئی۔ جب کسی مشرقی ملک پر یورپی حکمران ایک مرتبہ مسلط ہو گئے تو ان کو متعدد وجوہ سے اس ملک میں مغربی تہذیب کی اشاعت کی حمایت کرنا پڑی۔ محض ذاتی مفاد نے ان کو مجبور کیا کہ ملک کو پُر امن اور خوش حال بنائیں۔ تاکہ نفع اوٹھائیں اور رعایا اپنی حکومت سے خوش گزین۔ اس کے یہ معنی تھے کہ ناقابل اور خون ریز دیسی مطلق العنانی کی بجائے جو مانع ترقی اور باعث بدنظمی تھی پائدار حکومت منتظمات اور امن قایم کریں۔ اور

دستکاری کی ہمت افزائی کرکے کارآمد نئی باتیں مثلاً ریلیں ڈاکخانہ جات وحفظان صحت اور اُن کے علاوہ بہت سی دوسری باتیں جاری کریں۔ اِن مادی جدتوں کے علاوہ کل مغربی سلطنتوں نے عملی طور پر اپنے زیر فرمان اقوام کی معاشرتی و ذہنی وروحانی حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ وہ اہل یورپ جنہوں نے اونیسویں صدی میں نوآبادیات کی سلطنتیں قایم کیں وہ ایک ایسی روح سے زندہ تھے جو اُس اگلے زمانہ کی سلطنتوں سے بہت زیادہ روشن خیال تھے۔ جبکہ اسپین و پرتگال وہالینڈ و انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی ابتدائی نوآبادیات کی سلطنتیں محض جلب منفعت کے لئے وحشیانہ اور تنگ خیال اصول پر چل رہی تھیں۔ اونیسویں صدی میں کل مغربی حکومتیں جو مشرق میں قایم تھیں کم وبیش "گورے آدمی کی ذمہ داری" کے نصب العین سے متاثر تھیں اونیسویں صدی کے کل بڑے سلطنت ساز چونکہ محض ذاتی مفاد اور ذاتی حب وطن ہی کی بنا پر کام نہیں کر رہے تھے بلکہ وہ اپنا اہم فرض سمجھتے تھے کہ اپنی زیر تسلط اقوام کی حالت کو سنبھال دیں۔ لہذا وہ اپنے آپ کو مغربی تہذیب کا علمبردار سمجھکر اس کے کل فوائد کو رائج کرنے کی کوشش کرتے تھے وہ ایمان داری سے یہ یقین رکھتے تھے کہ پست حال حصص عالم کو عہد حاضرہ کے مطابق بنانے کا بہترین و سریع ترین اور غالباً واحد ذریعہ مغربی سیاسی تسلط کی توسیع ہی تھا۔

اس نقطۂ خیال کو ایک برطانوی آزاد خیال حامی شہنشاہیت یعنی پروفیسر میور نے نہایت قابلیت سے بیان کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ یہ مسلمہ امر ہے کہ یورپی اقوام کی شہنشاہیت ہی وہ ذریعہ تھی جس کی بدولت یورپی تہذیب کل دنیا میں ایک حد تک پھیل گئی ہے۔ حتی کہ آجکل دنیا ایک

واحد اقتضا وہی ہستی ہے۔ اور اُس کے کل اراکین ایک واحد سیاسی سلسلہ کے جزو ہیں۔ اور اِس امر کے حاصل ہو جانے سے ہم کو دنیا بھر کے لئے ایسا واحد نظام نظر آنے لگتا ہے جس کی امید ماضی میں خواب و خیال میں بھی نہوئی ہوگی۔ یورپی اقوام کی شاہنشاہیت کے بغیر شمالی و جنوبی امریکہ و اسٹریلیا و جنوبی افریقہ ویران رہتے۔ جس میں منتشر وحشی اقوام آباد ہو۔ بایں ہمہ اپنے مشاہدہ کی بنا پر یہہ کہہ سکتے ہیں کہ بغیر اِس کے ہندوستان اور نیز دیگر ممالک کے گروہ جن میں پرانی تہذیب موجود تھی بظاہر لا انتہا ہی سلسلۂ جنگ اور مطلق العنان شخصی حکومت میں گرفتار رہتے جیسا کہ ان کی صدیوں کی تاریخ میں یہ متواتر طور پر ہوتا رہا تھا۔ اور ان حالات میں ہماری ادراک کے بموجب نہ تو عقلی یا مساوی قانون نہ سیاسی آزادی قابل عمل متصور ہوتی ہے۔ بغیر اس کے دنیا کی پست حال اقوام ایک غیر مبدل ابتدائی رسومات کے قیود میں جامد ہی رہتیں۔ جیسا کہ ان کی حالت کل تاریخی زمانہ میں رہی ہے اگر آج مغرب سب سے زیادہ بار آور سیاسی خیالات یعنی قومیت اور حکومت خود اختیاری کے خیالات جو محض مذہبی تہذیب سے پیدا ہوئے ہیں غیر یورپی دنیا کے بہت سے حصوں میں صحیح ہیجان پیدا کرنے لگے ہیں۔ تو یہ یورپی شہنشاہیت کا ہی نتیجہ ہیں[۱]۔

موجودہ شہنشاہیت کے اخلاقی اصول کہیں کبھی اس سے بہتر منضبط نہیں ہیں جیسا کہ لارڈ کرومر کی مضمون میں ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔ "شہنشاہی حکمت عملی بلا شبہہ

---

[۱] بیمزی میور کا مضمون "یورپ اور غیر یورپی دنیا"، جو ۲۸ جون ۱۹۱۷ء کو دی نیو یورپ میں شائع ہوا۔

عاقلانہ دوراندیشی سے نافذ ہونا چاہیئے - اقوام محکوم سے ہمارے تعلقات جن اصول حکومت کی بنا پر قایم ہوتے ہیں وہ سیاسی اور اقتصادی طور پر صحیح اور اخلاقی طور پر قابل استدلال ہونا چاہئیں - فی الحقیقت یہہ شہنشاہی محراب کی درمیانی اینٹ ہے - شہنشاہیت کا اصل جواز ان کاموں سے ثابت ہوتا ہے جن میں شہنشاہی قوت صرف کی گئی ہے اگر ہم اپنے اختیارات کا اچھا استعمال کریں تو ہم مستقبل کا مقابلہ بلا اس خوف کے کر سکتے ہیں کہ ہم اس قہر الٰہی میں گرفتار ہوں گے جو سلطنت روما کی بدنظمی پر نازل ہوا تھا - اگر معاملات اسکے برخلاف ہیں تو برطانوی سلطنت کا زوال واجب ہے اور بالیقین آخر کار اس کو زوال ہوگا۔"[۱]

یہ ہیں مغربی شہنشاہیت کے بنیادی اصول جو انیسویں صدی میں منکشف ہوئے۔ چاہے اس کے قسمت میں ثبات و قیام ہو یا نہ ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس یورپی سیاسی تسلط کی عظیم الشان وسعت نے ہر قسم کی مغربی اثرات کی ترویج میں بڑی حمایت کی - بلاشبہہ یہ استدلال صحیح ہوگا کہ اگر کسی قسم کا مغربی دباؤ نہ پڑتا تو بھی مشرق از خود مغربی دستور اور خیالات کو اختیار کر لیتا - لیکن اس میں بہت زمانہ لگتا - اور یہہ وقت کے اہم عنصر کے ایسے استدلالات محض علمی مباحثہ رہجاتے ہیں - جوش حیات سے لبریز اور خواہش توسیع سے معمور - انیسویں کے یورپ سے یہ توقع تاریخ عالم اور فطرت انسانی کے خلاف تھی کہ وہ بالارادہ اپنے عزایم کو ضبط و احتراز کے سلسلوں سے دست و پا بستہ کرکے خاموش دیکھتا رہتا - جبکہ پست حال مشرق مغربیت کے رد و قبول کے تجربوں میں پئے در پئے

---

[۱] دی ارل آف کرومر کی کتاب "سیاسی اور ادبی مضامین" صفحہ ۵ مطبوعہ لندن ۱۹۱۳ء

غلطیاں کر رہا تھا تاجروں سے سامان خریدتا اور اس کی قیمت دینے سے انکار کرتا تھا۔ قرضوں کا معاہدہ کرنے کے بعد روپیہ کو لے دے کر رد کی سے اڑاتا اور معاہدوں کو منسوخ کرتا تھا۔ یورپی اقوام کو پہلے اپنے یہاں دعوت دیکر پھر ان کا اخراج یا قتل عام کرتا تھا۔

جب صورت حال یہ تھی تو واقعہ یہ ہے کہ مغربی دباؤ پڑا جیسا کہ بے پڑے بچ ہی نہ سکتا تھا۔ اور اس متواتر اور ہمہ گیر اور بے درد دباؤ نے مشرقی قدامت پسندی اور کاہلی کے فصیل کو ایسا منہدم کیا کہ کسی دوسرے چیز سے ایسا ممکن نہ تھا۔ مشرق کو مجبور کیا کہ اپنے پرانی ڈگر کو چھوڑ کر خواب و خیال کے بجائے حقیقت اشیاء کے اثبات کا محاسبہ ایسا ہی کرے جس طور پر اس واقعاتی دنیا میں موجود ہیں۔ فصول مابعد میں ہم اس عمل کے متعدد نتائج پر غور کرینگے جس نے گزشتہ سو سال میں مشرق میں عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ فی الحال مشرق پر مغربی تسلط کے جابرانہ ترین صور اور اس سے مشرق کے ردِّ عمل پر غور کرینگے عام تبصرہ کو جاری رکھینگے۔

میری رائے میں مشرقی بلاد پر مغربی تسلط کے بابتہ جو نکتہ چینی کیجاتی ہے۔ اس میں خاص غلطی یہ ہوتی ہے کہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کی شہنشاہیت کے درمیان فرق نہیں کیا جاتا انیسویں صدی کی شہنشاہیت بلاشبہہ لازمی اور ظاہراً فی الجملہ نفع بخش تھی۔ بیسویں صدی کی شہنشاہیت کے بابتہ ایسی اچھی رائے قایم نہیں کی جاسکتی سنہ ۱۹۰۰ء میں مشرقی اقوام مجموعہً ایسی متعصب اور علم و تہذیب کے مخالف نہ رہی تھیں جو اپنے جاہلانہ اور زوال پذیر تہذیب کے دائرہ کے باہر کسی چیز کو جانتے نہوں یا جاننے کی پرواہ کرتے

ہوں۔ مشرق مدرسہ جانے لگا تھا۔ اور جو کچھ اس کو یورپ نے تعلیم دی تھی اس پر عمل شروع کرنا چاہتا تھا۔ یہ ظاہر تھا کہ ان اقوام سے، جن کی گزشتہ تاریخ ان کو اکتساب کے قابل ثابت کرتی تھی۔ اور جو اب ظاہر طور پر نئی ترقی کے لئے صحیح خواہش کا اظہار کر رہی تھیں، پہلے سے مختلف برتاؤ ہونا چاہئے یا یوں کہنا چاہئے کہ مغرب کے لئے یہ مناسب تھا کہ وہ مشرق سے زیادہ آزاد خیالی کو برتتا۔

مگر ایسی تبدیلی کوئی بھی نہ ہوئی برخلاف اس کے خود مغرب میں انیسویں صدی کی مروجہ آزاد خیالی کے نصب العین کی بجائے سیاسی اور اقتصادی رقابت کی وہ خونخوار روح پیدا ہو رہی تھی جس کا انجام جنگ عظیم کی صورت میں ظاہر ہوا[۵۱]۔ یورپ مستعمرات و "حلقہ جات اثر" و مراعات اور مرجحانہ بازاروں کا ایسا حریص یعنی بدترین معنی میں مختصراً "ایسا شہنشاہیت کا حامی" کبھی نہ ہوا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی مشرق پر مغربی دباؤ کم ہونے کی بجائے دوچند ہو گیا۔ اور مشرق کی بیداری سے ہمدردی کا تو کیا ذکر گزشتہ دو سو سال سے بھی زیادہ بے رحمانہ سلوک کیا گیا۔ جس طریقہ پر ایران و ترکی جیسے مشرقی ممالک سے جو اپنی اصلاح اور تحفظ آزادی کی کوشش کر رہے تھے، یورپ کے جدید سیاسیات حاضرہ نے سلوک کیا ہے۔ اس سے ایک نسل قبل کے آزاد خیال حامیان شہنشاہیت ضرور بیزار ہوتے۔ عہد حاضرہ کے آزاد خیالوں کو بھی اس سے ناراضگی ضرور ہوئی۔ چنانچہ ایک مشہور برطانوی ماہر سیاسیات۔ سڈنی لو نے سطور ذیل جو ۱۹۱۲ء میں

---

[۵۱] مغربی خیالات میں ان انقلابات پر مکمل بحث کیلئے، ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "گورونگی عالمگیر اقتدار کے خلاف رنگ کا اٹھتا ہوا طوفان" بالخصوص فصول ششم و ہفتم۔ مصنف

لکھی تھیں، اسپر شاہد ہیں "گزشتہ چند سال میں نہایت دینداز مسیحی دول کا طرز عمل ان قزاقوں کے گروہ کے مشابہ رہا ہے جو ایک غیر مسلح اور بے کس کسانوں کی آبادی پر حملہ کرتے ہیں۔ دیگر اقوام کے حقوق کی پاسداری تو درکنار انہوں نے ان اقوام سے نہایت مکمل اور خود غرضانہ بے پروائی کا اظہار کیا ہے۔ فی الحقیقت انہوں نے اِس مقولہ کا ادعا کیا ہے کہ جس کی لاٹھی اُسکی بھینس"، اور مسلح قوت کے مقابلہ میں اخلاقی ملحوظات کی لاچاری کا ایسا کھلم کھلا ثبوت دیا ہے کہ مشرقی فوجی فاتحیں میں سے شاید ہی کوئی ان سے سبقت لے جاسکے۔

گزشتہ ربع صدی کے تاریخ کا مہتم بالشان واقعہ ایشا کی خواب غفلت سے بیداری ہے۔ مشرق میں دفعتاً حیات پیدا ہوئی اور اس نے مغربی ترقی کی منجدہار میں اپنے آپ کو زور شور سے ڈالا۔ جاپان نے اس مہم کو شروع کیا۔ اور اسکی خوش قسمتی تھی کہ وہ اِس راہ پر اس وقت گامزن ہوا جب کہ یورپ کے جدید حکمت عملی کی پورے طور پر تکمیل نہ ہوئی تھی۔ اور حقوق اقوام اور عہد ناموں کی حرمت کی بابت بعض متروک نصب العین ہنوز باقی تھے۔ اونیسوی صدی کے بڑے جاپانی مدبرین نے جب جدید عہد کو شروع کیا تو یورپ نے مداخلت کرنا اپنا فرض سمجھا۔ ہمنے جاپانی نشاۃ ثانیہ کو دلچسپی اور معرفانہ نگاہوں سے دیکھا اور جاپان والوں کی اپنے مشکلات نجات کے حل کرنے میں کوئی مزاحمت نہ کی۔ اگر یہ انقلاب تیس سال بعد پیش آتا تو یہاں واقعہ کی شکل دوسری ہوتی۔ اور جدید جاپان اپنے عالم درد و کرب میں یہ دیکھتا کہ دول عظمیٰ اس کے بستر مرض ہر طرف مسلح کھڑے اپنے آستین چڑھائے قابل حصول اشیاء کے چھیننے کے لئے بڑھ رہے ہیں۔ دوسرے مشرقی ممالک کو جنہوں نے موجودہ صدی میں اتباع جاپان کی کوشش کی واژونی بخت سے سابقہ پڑا۔

گزشتہ دس سال سے یورپ کے دفاتر امور خارجیہ پر سخت مادیت اور بین الاقوامی اخلاق کی قطعی تحقیر کی لہر دوڑ گئی ہے۔ یہ لہر اُن مساعی کا مصیبت ناک ردِّ عمل کر رہی ہے۔ جو وہ نظام دستوری۔ کی اصلاح کیلئے سر بکف ہو کر کر رہے ہیں۔ اِن اقوام کے یہ مساعی انہیں مشوروں پر مبنی تھیں جو مسیحی دنیا کے اگلے خیر اندیش مشیر انہیں پشت ہا پشت سے دیتے چلے آئے ہیں۔

"اب جو یہ مشورے اِن کے دلنشین ہوئے اور انہوں نے بے شمار موانع کے مقابلہ میں اصلاحی راستہ پر پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی کوشش کی تو یہ خیال ہوتا تھا کہ مغرب کی حکومتیں ان مساعی کو ہمدردانہ نظروں سے دیکھینگی اور یہ کہ اگر انہوں نے کوئی امداد براہ راست نہ کی تو کم از کم انہیں مناسب آزمایش کا موقع دینگے۔" لیکن برخلاف اِس کے "دول عظمےٰ نے یکے بعد دیگرے مشرقی ممالک کے اندرونی مشکلات کے مواقع سے نفع اٹھا کر الحاقی دور شروع کر دیا"[۱]

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ یہ الحاقی دور کس قدر تیز تھا اور بقیہ مسلمان سلطنتوں کی آزادی کا خاتمہ جنگ عظیم کے ختم پر ہو گیا۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ اِس سے مسلمانوں کا خوف اور تنفر کس قدر بڑھ گیا اور مغرب سے پہلے ہی سے خوف و تنفر متعدد وجوہ سے تھا۔ فصل ما سبق میں ہم نے اتحاد بین الاسلامی کی ترقی کا ذکر کیا ہے۔ اور فصول ما بعد میں ہم مشرقی قوم پرستی کی ترقی کو بیان کریں گے مگر اِن سیاسی اور مذہبی تحریکات سے مغربی تہذیب کے خلاف مشرقی ردِ عمل کی فہرست مکمل نہیں ہوتی۔ اِن کے علاوہ اور بھی اقتصادی، معاشرتی اور نسلی قسم کے ہیں۔ مغربی تہذیب کے

---

[۱] سڈنی لو کا مضمون "اخلاقِ مسیحی کی سب سے زیادہ پابند سلطنتیں" جو مارچ ۱۹۱۲ء کے فورٹ نائٹلی ریویو میں شائع ہوا۔ مصنف

خلاف مشرق کے ردعمل کی پیچیدہ فطرت کے لحاظ سے آؤ ہم اس مسئلہ کے مختلف ترکیبی اجزا کی تشریح کریں۔

گزشتہ سو سال میں مغربی تمالف کے خیالات بعض مقامات میں کم ہو رہے ہیں اور دیگر مقامات میں بڑھ رہے ہیں طبعًا مستبدین اور متعصبین نے مغربی امور سے ہمیشہ نفرت کی لیکن ان سیاسی غلط کاروں کی جماعت اقل کو چھوڑ کر دیگر مشرقی جماعتوں کا طرز عمل وقت اور موقع کے لحاظ سے بہت مختلف رہا ہے۔ آزاد خیال اشخاص نے مغربی اثرات کا خیر مقدم دل و جان سے کیا۔ تمہیدی فصل میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ آزاد خیال مصلحین نے ترقی کے مغربی تصور کا کیسا خیر مقدم کیا اور انہوں نے اس کو اپنے مجوزہ مذہبی اصلاح کے اصولوں میں سے ایک اصول قرار دیا۔ دنیوی معاملات میں بھی آزاد خیال حضرات نے اسی روش کا اظہار کیا۔ انیسویں صدی کے تیسرے ربع میں جو آزاد خیال مدبرین ترکی سلطنت میں برسر اقتدار تھے انہوں نے سلطنت عثمانی کے اصلاح کی دل سے کوشش کی اور یہی حالت دنیائے اسلام کے دیگر حصص کی تھی۔ جنرل خیرالدین نے جو ٹیونس کی تجدید کی سعی کی وہ ایک دلچسپ مثال ہے۔ یہ شخص چرکسی نسل کا تھا۔ اور اپنے آقا "دوبے[۵۱]" کا معتمد تھا جسنے اسکو وزیر

---

[۵۱] بے دراصل ترکی لفظ بیک کا مخفف ہے اور کسی شہر یا صوبہ کے نسکی گورنر کو کہتے ہیں۔ ٹیونس کی پشتینی فرماں روا کو "دوبے" کے خطاب سے ملقب کرتے ہیں۔ ٹیونس کو باشندگان ملک ہنوز افریقیہ کہتے ہیں اس کی ابتدائی تاریخ کارتھیج سے وابستہ ہے اس کے بعد رومی صوبہ افریقہ میں شامل ہوگیا۔ پانچویں صدی میں ونڈل چھٹی صدی میں مشرقی سلطنت اور ساتویں صدی میں عربوں نے فتح کیا (بقیہ نوٹ صفحہ ۱۳۲ پر ملاحظہ ہو)

مقرر کیا۔ ۱۸۶۰ء میں اسنے یورپ کا سفر کیا اور وہاں کے تمدن سے بہت متاثر
ہوکر واپس آیا یورپ کی لاانتہا ہی تفوق سے متیقن ہو کر اوسنے ٹیونس میں مغربی خیالات
اور طریقوں کی پود لگانے کی از حد کوشش کی۔ اسکو وہ بالکل ممکن سمجھتا تھا اور وہ
خیال کرتا تھا کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ٹیونس کی نشأۃ ثانیہ بہت جلد ہو گی خیرالدین
ذرا بھی مغرب سے نفرت کرنے والا نہ تھا اس نے صاف طور پر پہچان لیا کہ اگر اسلامی
دنیا نے جلد اپنے گھر کو سنبھال نہ لیا تو اُسے مغربی تسلط کا بہت قریبی خطرہ ہے۔ لہذا
اسنے بالکل جائز حب وطن کے خیال سے یہ چاہا کہ اپنے ملک کو ترقی کے رستہ پر
زبردستی چلائے تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر اپنی آزادی کو قایم رکھ سکے

خیرالدین کی رپورٹ کا "بے" پر ایسا اثر ہوا کہ اُسنے خیرالدین کو اصلاحی
جد و جہد میں بالکل مختار کر دیا۔ کچھ عرصہ تک خیرالدین نے بڑی سرگرمی دکھائی۔ اگرچہ
فتنہ انگیز عمال نے اس کی سخت مخالفت کی اور اس کی ناوقت موت نے اس کام کو
ختم کر دیا۔ اور ٹیونس ہنوز غیر تجدید شدہ ہی تھا کہ بیس سال بعد دولت
فرانس نے فتح کر لیا۔ مگر خیرالدین نے آیندہ نسلوں کے واسطے کام کیا۔ اپنے
ہم وطنوں کو حقیقت حال بتانے کے لئے ایک مشہور کتاب الموسوم بہ
اُقوم المسالک فی احوال الممالک شائع کی۔ اس کتاب نے
کل مشرق ادنے بالخصوص شمالی افریقہ میں آزاد خیال اور قوم پرست دونوں پر بڑا
اثر ڈالا ہے۔ شمالی افریقہ میں یہ ٹیونسی اور الجزایری قوم پرستی کی مقدس کتاب

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۳۱) چودہویں لغایت سولہویں صدی میں خود مختار ملک رہا لیکن ۱۵۳۵ء
میں شارل پنجم نے فتح کیا ۱۵۷۴ء ترکوں نے تسخیر کیا سولہویں اور سترہویں صدی میں ٹیونس کے "بے"
ترکی اقتدار کو تسلیم کرتے تھے ۱۸۸۱ء میں فرانسیسی ضمانت میں آگیا۔ مترجم

ہوگئی ہے۔ خیرالدین نے اپنی کتاب میں اپنے ہم مذہبوں کو ماضی کی کورانہ تعریف اور اُس کے سوا دیگر امور سے متکبرانہ استغنا کو ترک کرنے اور جو کچھ بیرونی دنیا میں ہو رہا ہے اُسکو سیکھنے کی ضرورت کو دکھایا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ "کہ موجودہ ثروت نہ تو قدرتی فوایدکی وجہہ سے ہے اور نہ مذہب کی بلکہ "فنون اور علوم کی ترقی کی بدولت ہے جنسے دولت کی روانی میں آسانی ہوتی ہے۔ اور جن سے زراعت صنعت اور تجارت کی دوراندیشانہ متواتر سرپرستی کرکے زمین کے خزاین سے نفع اٹھانا ممکن ہوجاتا ہے۔ یہ سب قدرتی نتایج ہیں انصاف اور آزادی کے یعنی اُن دو چیزوں کے جو یورپیوں کے طبیعت ثانی ہوگئی ہیں" ازمنہ ماضیہ میں اسلامی دنیا عظیم الشان اور ترقی کرنے والی تھی کیونکہ وہ اسوقت آزاد خیال اور ترقی کی متلاشی تھی۔ وہ تعصب اور جہالت کی وجہہ سے زوال پذیر ہوئی لیکن اس کی نشاۃ ثانیہ اوایل ایام کی تجدید سے ہوسکتی ہے۔

میں نے مشہور ترکی مثالات کے مقابلہ میں ٹیونسی خیرالدین کی مثال پر اس لئے زور دیا ہے کہ اس سے وسط انیسویں صدی کے آزاد خیال مسلمانوں میں مغربی خیالات کی عام مقبولیت اور مغربی مخالفت سے آزادی کا پورا ثبوت ملتا ہے[۹۵]۔ مگر امتداد زمانہ کے ساتھ بہت سے وہ لوگ جو پہلے آزاد خیال تھے متعدد وجوہ بالخصوص یوروپی تعلی کی وجہہ سے مغرب کے قریب سے چھوڑکر مغرب کے سب سے بڑے

---

۹۵ اس مسئلہ پر ملاحظہ ہو اے وامبیری کی کتاب "مشرقی ممالک میں مغربی تمدن" مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۰۶ء۔ ڈبلیو اس بلنٹ کی کتاب "مستقبل اسلام" مطبوعہ لندن سنہ ۱۸۸۲ء۔ نیز "دو مضامین نوشتہ لیون کاہوں دربارۂ "انیسویں صدی میں اسلامی دنیا میں ذہنی اور معاشرتی ترقیاں" جو لاویز اور رامبو کی عام تاریخ جلد ۱۱ فصل ۱۵۔ اور جلد ۱۲۔ فصل ۱۴ میں شایع ہوئی۔ مصنف۔

دشمن ہو گئے - اور مغربی تہذیب کی روح سے نفرت[1] کرنے لگے -

یہ مغرب کی مخالفت کا خیال لاریب موجودہ صدی کے آغاز سے بہت بڑھ گیا ہے چنانچہ ایک بااثر مسلمان نے جنگ عظیم سے کچھ پہلے لکھا۔ "گذشتہ دس سال کے واقعات اور اسلامی دنیا کے مصائب نے اُن کے دلوں میں باہمی محبت اور وداد کے اُن خیالات کو پیدا کر دیا ہے جو اس سے قبل نامعلوم تھے اور اپنے ظالموں کے خلاف متحدہ نفرت کا طوفان سب مسلمانوں کے دلوں میں آج تلاطم پیدا کر رہا ہے[2]" اکثر مسلمانوں کے دلوں میں جو سخت بغض جوش مار رہا ہے اس کا اظہار ذیل کی بے ساختہ تحریر سے ہوتا ہے جس کو ایک ترکی مصنف نے جنگ بلقان کے ختم پر لکھا تھا "ہمکو شکست ہوئی! بیرونی دنیا نے ہم سے مخالفت کا اظہار کیا! کیوں؟ اس لئے کہ ہم اپنے تصورات کی بموجب نیک و بد اور انسانیت اور تہذیب میں ضرورت سے زیادہ سوچ بچار کرنے والے اور شایستہ و مہذب ہو گئے ہیں - افواج بلغاریہ نے ہم کو سبق دیا - کہ ہر سپاہی کو جو دشمن کے مقابل ہو ابتدائی بربریت کی طرف عود کرنا چاہئے - اس کو خون کا پیاسا، بچوں، عورتوں، کمزوروں اور بوڑھوں کے قتل کرنے میں بے رحم ہونا چاہئے - اور دوسروں کے مال و جان و عزت کا کوئی خیال

---

[1] ملاحظہ ہو وامبیری کی کتاب "انیسویں صدی کا اسلام" فصل ششم مطبوعہ لیپزگ ۱۸۷۵ء - مصنفؔ

[2] × کا مضمون "ایران کی سیاسی حالت" جو جون ۱۹۱۴ء کی ریویو دو موند مسلمان میں شائع ہوا جیسا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ایڈیٹر نے ہمکو یقین دلایا ہے کہ گمنام مضمون نگار ایک ممتاز مسلمان عہدہ دار ہے - مصنفؔ

نہ ہونا چاہیئے۔ ہمکو خوں ریزی اور مصائب و مظالم اور رنج کی اشاعت کرنا چاہیئے۔ اس طریقے ہی سے ہم شاہ فرڈی نینڈ کی افواج کیطرح مہذب دنیا کو یار بن سکتے ہیں[۵۱]"

جنگ عظیم کو خود اکثر مسلمانوں نے مغربی تکبر اور حرص پر حق بجانب قہر الٰہی تصور کیا۔ اور اس پر خوشیاں منائیں۔ ایک سر برآوردہ اخبار نے جس طور سے دول یورپ کا خاکہ اُڑایا ہے اس کا نمونہ یہ ہے "وہ اپنے ممالک یا اور کہیں کے خرابیوں کو نہ دیکھینگے لیکن چھوٹی سے چھوٹی بات کیلئے ہماری سرحدوں پر مداخلت کرینگے۔ ہر روز ہمارے حقوق اور ہماری سلطنت کے کسی حصہ کو قطع کر لینگے۔ وہ ہمارے پھڑکتے ہوئے جسموں پر عمل جراحی کر کے کوئی بڑا حصہ قطع کریں گے۔ اور ہم اپنے دلوں میں بغاوت کے جوش کو مجبوراً ضبط کر کے اور اپنی کمزور مٹھیاں باندھے خاموش اور مغموم ہیں۔ جب دل میں آگ لگتی ہے تو چپکے چپکے کہتے ہیں کاش یہ ایک دوسرے سے لڑ جاتے! کاش یہ ایک دوسرے کو کہا جاتے!۔ اور تماشا دیکھو کہ آج وہ ایک دوسرے کو ایسا ہی کہا رہے ہے جیسا کہ ترک چاہتے تھے[۵۲]"

---

[۵۱] احمد یمین کی تصنیف "موجودہ ترکی کی ترقی جسکا اندازہ اوسکی مطابع سے ہوتا ہے" صفحہ ۱۰۸ (یہ کولمبیا یونیورسٹی کی پی ایچ۔ ڈی کا مضمون ہے) مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۴ء۔ مصنّف

[۵۲] اخبار "طنین" جو قسطنطنیہ سے شائع ہوتا ہے۔ منقول از "مجموعہ ادبیات" مورخہ ۲ اکتوبر ۱۹۱۴ء صفحہ ۷۰۴۔ جنگ عظیم اور دول یورپ سے یہ طرز عمل صرف اسلامی اقوام تک محدود نہ تھا بلکہ ہر جگہ کے غیر یوروپی اقوام کا مشترکہ طرز عمل تھا۔ کل دنیا میں اس خیال کی تبصرہ کے لئے ملاحظہ ہو میری کتاب "گوروں کی عالمگیر اقتدار کے خلاف رنگ کا بڑھنے والا طوفان" صفحہ ۱۳ لغایت ۱۶۔ مصنّف

مغربی مخالفت کے ایسے خیال محض اخبار نویسوں اور سیاست دانوں تک محدود نہیں بلکہ شہزادے سے لے کر کسانوں تک سب میں عام ہیں۔ ہر طبقہ یورپی سیاسی تسلط سے نفرت کے لئے اپنے خاص وجوہات رکھتا ہے۔ دیسی شہزادے باوجود اس کے کہ اپنے تختوں پر قائم اور ان کے اعزاز و وثیقے برقرار رکھے جاتے ہیں اپنی ماتحتی کی حالت اور اپنے لا انتہا اختیارات خود مختاری کے مسلوب ہونے سے بہت ناراض ہیں۔ ایک ہندوستانی راجہ نے نہایت رنج سے کہا "تم جانتے ہو کہ میں ریزیڈنٹ کے بلا اجازت اپنے لئے ایک تلوار یا قلم بھی بمشکل خرید سکتا ہوں"۔ اس کا طرز عمل بالکل توفیق پاشا خدیو مصر کا سا تھا۔ جس نے برطانی مقابلت کے اوایل میں برطانوی افواج کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے وزرا میں سے ایک سے کہا "کیا تمہارے خیال میں میں اسکو پسند کرتا ہوں میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں جب کسی انگریزی پہرہ دار کو اپنی گلیوں میں دیکھتا ہوں تو میرا جی چاہتا ہے کہ گاڑی سے کود کر اسکا گلا گھونٹ دوں[۹۱]"۔ طبقات اعلے کے بھی احساسات اپنے بادشاہوں کی طرح ہیں۔ یہ اپنے سابقہ مراعات اور منصب کے کھونے کا افسوس کرتے ہیں۔ یہ بالخصوص مغربی تعلیم یافتہ روشنخیالوں پر صادق آتا ہے۔ انکا یقین ہے کہ حکومت کے سب عہدہ جات انکو ملنا چاہئیں۔ اور جو بڑی تنخواہ اور اختیارات کی جگہیں یورپیوں کے لئے محفوظ ہیں وہ انسے سخت ناراض ہیں۔ بلاشبہہ اکثر ذی ہوش آزاد خیال یورپی تسلط کے تعلیمی اثر کو اتنا زیادہ محسوس کرتے ہیں کہ اپنی تجدید کی تکمیل اور بالاخر با خوف انقلاب اور بدنظمی اپنے پیروں پر

---

[۹۱] بہ دو نون مثالیں اسی۔ ایس۔ کوپر کی کتاب "مشرق کی تجدید" مطبوعہ نیویارک سنہ ۱۹۱۴ء سے لیگئی ہیں صفحات ۲۳۹ و ۲۴۰۔ مصنف۔

کھڑے ہونے کے قابلیت کے لئے عارضی طور پر ازادی کے محرومی سے راضی ہیں۔
لیکن ایسی ازاد خیال جماعت اقل ہے۔ جن کو اعلے طبقات ابن الوقت اور بلا وجہ
سمجھکر نفرت کرتے ہیں ان میں اور جاہل عوام میں بڑا غار حایل ہے۔
بہ نظر اول ہمکو یہ خیال ہوسکتا ہے کہ عوام فی الجملہ یورپی تسلط سے خوش
ہوں گے۔ باوجودیکہ مغربی تہذیب کی ترویج سے بعض اقتصادی نقصانات
ہوئے۔ لیکن عوام نے بالیقین یورپی حکومت سے بہت نفع اُٹھایا پیشتر امراء
طبقات اعلے کسانوں اور قصبات کے کاریگروں سے بے رحمی کے ساتھ جلب منفعت
کرتے تھے۔ آج انکو اپنی اراضی اور ثمرات محنت کے لئے امن و امان و تحفظ حاصل
ہے یہ خیال کرنا غلطی ہوگا کہ عوام میں ان کا احساس نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ یورپی
حکومت کے فوائد تو جانتے ہیں۔ بایں ہمہ جدید حکمرانوں سے ہر چند رواداری کا برتاؤ
کیا جاتا ہے اور ان کی عزت بھی کیجاتی ہے لیکن اُن سے محبت بالکل نہیں ہے۔ مزید
براں جوں جوں وہ اشخاص جو قدیم حکومت سے واقف تھے مرجاتے ہیں اُنکی
خرابیاں فراموش ہوتی جاتی ہیں۔ اور نوجوان موجودہ فوائد کو مسلمہ مان کر موجودہ نظام
کی خرابیوں کے شاکی ہیں۔ اور ان دیسی شورش پسندوں کے باتوں پر کان دھرتے
ہیں جو عظمت حریت کی مدح سرائی اور "اچھے عہد قدیم" کو مطمح نظر بناتے
ہیں۔

حقیقت حال یہ ہے کہ عام مشرق قدیم طرز زندگی کے لئے باوجود اسکے
عیوب کے ترستا ہے۔ جبکہ وہ جدید حکومت کے فوائد سے واقف ہوکر بھی بلا وجہ
قدیم کا خواہشمند ہے۔ مسلمانوں کی پرانی ضرب المثل ہے "مسلمان حاکم ہو گو وہ مجھے
ستائے۔ اور کافر نہ ہو خواہ وہ میری بہبودی کے کام کرے" ہر نو آبادیات کی حکومت کو
خواہ وہ کتنی ہی روشن خیال ہو اس دائمی نفرت سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے جو مسلمانوں کو عیسائی

حکومت سے ہے۔ وسط ایشیا کے ایک روسی عامل نے بالعموم یورپی عمال کے خیالات کی ترجمانی اس منقولہ میں کردی ہے۔ "دیالیمان مسلمان گھروں کی حکومت سے خوش نہیں ہوسکتے"[1]

مزید براں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اکثر مشرقی یورپی حکومت میں بہت نفع نہیں دیکھتے۔ اور اگر نفع کثیر کا احساس بھی کرتے ہیں تو اُن کو ان باتوں کے بدل سے کم سمجھتے ہیں جو انکی نظروں میں جستوں خیز تکالیف اور بار ہیں۔ وہی باتیں جنپر ہم فخر کرتے ہیں کہ ہم نے مشرق کو عطا کی ہیں یعنی امن و امان و انصاف و سلامتی اُن کی مشرقی ہماری توقعات کے لگ بھگ بھی قدر نہیں کرتے۔ بلاشبہہ وہ ان چیزوں کو پسند کرتا ہے لیکن وہ انکا حصہ کم لینا پسند کرے گا اگر وہ اسکو بلجائے جو اسکے دیسی حکمراں دیا کرتے تھے۔ اور جو اس کے خیالات نصب العین میں شریک تھے۔ محض انصاف ہی کے عنصر کو لو۔ ایک انگریز مصنف لکھتا ہے "ایشیائی انصاف سے فی نفسہ خوش نہیں ہوتے۔ درحقیقت اس کی کم پرواہ کرتے ہیں اگر ان کو ہمدردی اس معنے میں حاصل ہو جائے جس میں کہ غلط فہمی سے اس لفظ کو وہ سمجھتے ہیں...... یہ اصلی وجہ ہے کہ کیوں ہر ایشیائی اپنے دل میں اپنی قوم کی حکومت کو وہ خراب ہی کیوں نہ ہو، اجنبیوں کی بہترین حکومت پر ترجیح دیتا ہے۔ کیونکہ جب اس کے ملک کے لوگ اس پر حکومت کرتے ہیں تو اسکو ان لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جو اس کی کمزوریوں کو سمجھتے ہیں۔ اور جو خواہ نہایت وحشیانہ تعزیر ہی کیوں نہ دیں کم از کم اُن

---

[1] منقول از کتاب روسی ترکستان مصنفہ اے وڈلیکوف مطبوعہ پیرس ۱۹۱۴ع

اغراض سے ہمدردی رکھتے ہیں جن کی بدولت وہ خلاف ورزی کرتا ہے"[۵۱]

اب امن و امان کو لو - عام مشرقی ہماری باقاعدہ اور باضابطہ زندگی کو صرف ناپسند ہی نہیں کرتے بلکہ اس سے نفرت کرتے ہیں - چونکہ صدیوں سے بے پروائی اور مرنجان و مرنج زندگی کے عادی ہو گئے ہیں - جس میں اگرچہ بہت سی بے انصافی تھی تو بہت سی طرفداری بھی تھی - وہ حفظان صحت اور قواعد پولس جیسے امور کو طبعاً ناپسند کرتے ہیں چونکہ وہ بدلظمانہ مفہوم میں "ذاتی آزادی" کے عادی ہو گئے ہیں - لہذا وہ اس آزادی کو رفاہ عام کے لئے محدود کرنا نہیں چاہتے - وہ اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنا چاہتے ہیں - خواہ اس کے لئے خطرہ بھی ہو - یعنی ایسے خطرات جو رشوت و طرفداری یا زبردستی سے ہمیشہ دور ہو جائیں - ایک امریکی نے جس نے فلپائن کے ایک باشندہ کی وہاں دو بار تقریر کو سنا تھا کہا "وہ کیا ہے جو تم آج نہیں کر سکتے ہو اور خود مختار ہو کر کر سکو گے؟"

"میں اگر چاہوں گا تو اپنا گھر بیچ سڑک پر بنا سکوں گا"

"لیکن فرض کرو کہ تمہارے پڑوسی نے اعتراض کیا اور اسمیں مداخلت کی"؟

"میں اس سے سمجھ لوں گا"

"لیکن فرض کرو اسنے تم سے سمجھ لیا"؟

اس کے جواب پر صرف کندھے اوکسا دیئے[۵۲] -

---

[۵۱] بی - ایل - پٹنام کی کتاب "دو رنگ کا مقابلہ" صفحہ ۱۹۳ مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۰ء - مصنف

[۵۲] منقول از کتاب "صلح عظیم" صفحہ ۸۲ مؤلفہ ایچ ایچ پاورس مطبوعہ نیو یارک سنہ ۱۹۱۶ مصنف

واقعہ یہ ہے کہ اکثر مشرقی باوجودیکہ مغربی خیالات و دستور سو سال سے خوب سرایت کر رہے ہیں ہنوز اپنے پرانے طریقوں کو پسند کرتے ہیں اور اُن سے ہٹنا ناگوار ہے۔ اُن کو یہ بھی احساس ہے کہ مغربی حکومت و دیگر امور سے زیادہ ان کی معاشرتی نظام و قدیم طرز زندگی میں مغربی تمدن کی اشاعت نو برباد ہی ہے لہذا وہ مجنونانہ طرز پر اس کے خلاف ردّ عمل کرتے ہیں۔ ہر نئی بات پر جس کو مستعمرات کے عمال جاری کرتے ہیں کورانہ مخالفت پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً چیچک کے جبریہ ٹیکہ کی الجزائر کے باشندوں نے مدتوں سخت مخالفت کی۔ فرانسیسی حکام نے بتایا کہ چیچک جو اس وقت بہت زور سے پھیلی ہوئی تھی نہایت تیزی سے بند ہو رہی ہے۔ دیسیون نے جواب دیا کہ ہماری رائے میں ہمارے نامرد بنانے کی یہ عیارانہ ترکیب ہے۔ تاکہ فرانسیسی نوآبادیوں کے لئے جگہ ہو جائے۔ اسپر حکام نے مردم شماری کے اعداد کو بتایا کہ دیسی عدیم المثال طور پر بڑھ رہے ہیں۔ دیسیون نے اپنے کاندھے اوچکا دئے اور جدید کی مخالفت جاری رکھی۔

اِس کل معاملہ کا ایک فرانسیسی مصنف نے جو اسلامی دنیا سے خوب واقف ہے خوب خلاصہ کیا ہے۔ لوی برتراند کہتا ہے "دراصل یہ سب اقوام چونکہ اپنی روایات و رسومات اور رمز و بوم کے لحاظ سے ہمارے معاشرتی نصب العین کے مطابق زندگی بسر کرنا نہیں چاہتے لہذا وہ ہماری پولس اور ہماری حکومت کے قیود کو، مختصر یہ کہ کسی قسم کی باضابطہ گورنمنٹ کو خواہ وہ کتنی ہی منصف اور ایمان دار کیوں نہ ہو برداشت کرنے سے نفرت کرتے ہیں۔ سب سے زیادہ بارِ تنظیمانہ اور تکلیف دہ مظالم سے خلاصی پاکر یہ باطنی طور پر کم و بیش ہمارے آوارہ گردوں کی طرح رہجاتے ہیں اور ہمیشہ محتسب سے بچنے کی امید لگائے رہتے ہیں ہم شمالی افریقہ کے عربوں کو یہ فضول جتاتے ہیں کہ فرانس کی حفاظت کا مشکور ہونا چاہیئے۔ جس کی بدولت ان کو نہ نو مطلق الخنان

ترک لوٹتے ہیں اور نہ رقیب قبایل قتل عام کرتے یا آزار پہونچاتے ہیں۔ وہ صرف ایک بانسلم کو دیکھتے ہیں۔ اور وہ بات یہ ہے کہ خارج از فہم امور کے لئے محصول ادا کرنے کی ضرورت یا ہمکو کبھی اسکا احساس نہیں ہوسکتا کہ محکمہ حفظان صحت کے اس قاعدہ سے کہ کوڑے خانے ایک وقت مقررہ پر خالی کئے جائیں ہمارے الخرآمر کے قصبات میں کیسا غیظ و غضب پیدا ہوتا ہے۔ قاہرہ اور دیگر مقامات میں بھی میں نے خچر والوں اور گاڑی والوں میں انگریزی پولسمین کے ضوابط کی پابندی پر ایسے ہی سرکشانہ خیالات کو دیکھا ہے۔

"یہ ہماری جنگی اور انتظامی ضوابط ہی نہیں ہیں جن کو وہ ناقابل برداشت سمجھتے ہیں بلکہ بحیثیت مجموعی ہمارے کل عادات مختصراً یہ کہ ہماری مہذب زندگی کے نظام ہی کو ناقابل برداشت سمجھتے ہیں بر سبیل تمثیل یافہ سے یروشلم کو جو ریل گاڑی جاتی ہے وہ ایک اسٹیشن پر ٹھہرتی ہے جس کے قریب کسی بزرگ کا مزار ہے۔ نظام اوقات کے لحاظ سے گاڑی یہاں پر ایک منٹ رُکتی ہے۔ مگر جونہی گاڑی وہاں پہونچی میں یہ دیکھکر حیران ہوگیا کہ سب مسلمان گاڑی سے اُتر کر اور جانماز بچھا کر نہایت اطمینان سے نماز پڑھنے لگے۔ اسٹیشن ماسٹر نے سیٹی بجائی۔ گارڈ چلایا۔ کہ وہ انکو چھوڑ جائے گا۔ لیکن کسی نے جنبش نہ کی۔ ریلوے کے ملازمین کا ایک دستہ بلایا گیا انہوں نے لات و مکا و گالی کو سنا دیکر ان شقیوں کو پھر گاڑی میں بھرا۔ یہ صورت حالات پاؤ گھنٹے تک رہی جس کیا دشواری ظاہر ہے۔ ان عابدین میں سے تنو مند اشخاص نے خوب مقاومت کی۔

مثال بالا محض اتفاقی ہے جو بغیر کسی خاص غور کے انتخاب کی گئی ہے۔ جو امر یقینی ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ ہنوز اسے سمجھنے سے قاصر ہیں کہ پابندی اوقات سے ہمارا کیا منشا ہے۔

اور یہ کہ با ضابطہ ہستی کا خیال اُن کے دماغوں میں نہیں سمایا ہو۔"

جو ہم نے اوپر لکھا ہے بلاشبہہ وہ جاہل عوام پر صادق آتا ہے۔ یہ دماغی میلان مشرقی اقوام کے سب طبقات میں کم و بیش مشترک ہے۔ صدیوں کے عادات آسانی سے نہیں بدلتے۔ درحقیقت یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ اعلےٰ طبقات غیر مرئی مشرق کی تنومند ذاتی آزادی سے پورا نفع اٹھاتے تھے اور یہ کہ اسی وجہ سے اگرچہ وہ مغربی تہذیب کے اشاعت کی قدر کو خوب سمجھتے ہیں لیکن ایک طور پر انہیں کو سب سے زیادہ نقصان ہوا ہے۔

فی الواقع سب مشرقیوں، اعلےٰ اور ادنےٰ ہر دو کے لئے "زریں عہد قدیم" یکساں طور پر دلفریب تھا اور اسکے لئے وہ نہایت رنج و غم سے تاسف کرتے ہیں۔ امراء پاشا اور درباریوں کے لئے زندگی حقیقتاً ایک مشرقی جنت تھی یہ یقینی بات ہے کہ امیر کسی وقت پر اپنے رقیب پادشاہ سے شکست کھا کر مار ڈالا جائے اور پاشا کو اس کے مالک کے حکم سے پھانسی دی جائے۔ اور درباری کسی بڑے شک پر گرفتار مصایب ہو۔ لیکن تاہم یہ اچھی اور خوب زندگی تھی ان میں سے ہر ایک اپنی مختص خصوصیات اور اپنی ابنائے وطن میں مختص شہرت رکھتا تھا اور ہر ایک کی وہ حیثیت تھی جو یورپ میں آج کوئی پیدا نہیں کر سکتا۔ اس حیثیت کے لحاظ سے وہ قانونی پابندی سے آزاد تھا اور اپنی مرضی کے مطابق بڑے اور اچھے کام کر سکتا تھا۔ اور ہر روز، ہر وقت اس کی ایسی خوشامد کی جاتی تھی جو الوہیت کے لئے مختص ہے۔ یعنی محض اشارہ پر وہ امادتمندانہ اطاعت جو پرستش کی مانند ہے اور اپنی ممدوح کے لئے سب سے زیادہ مدہوش کن فرحت ہے، ہر ایک اپنی تابعین کا جو ناگزیر ...

ملہ برتراند کی کتاب مشرقی سراب صفحات ۱۹۱ – ۱۹۲ مطبوعہ پیرس سنہ ۱۹۱۰ء ملہ اس مسئلہ پر ملاحظہ ہو مسٹر نکیٹ اور لسنیڈ کا نہایت دلچسپ مضمون موسومہ ایشیائیوں کو ایشیا کی دلفریبی جو اس کی کتاب ایشیا و یورپ کی صفحات ۱۲۰ لغایت ۱۲۸ پر درج ہے۔ مصنف

دربار بھی رکھتا تھا۔ اور ہر درباری اپنے آقا کے اختیارات و تعیش و خوشامد میں شریک تھا۔ اختیار تو موت و زیست کے تھے، اور تعیش میں حسب دلخواہ ہر عورت کی مقاربت شامل تھی۔ اور خوشامد تو جیسا میں نے بیان کیا ہے تقریباً مذہبی عبادت تھی۔

لیکن یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اُن غربا کی بابت کیا ہے جنہیں ان متوہم مطلق العنانوں کا نظام لوٹتا تھا، ان سب باتوں سے اسکو کیا نفع ہے؟ اکثر حالتوں میں انکا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ لیکن فائدہ ہونے کا امکان تو تھا۔ قدیم مشرق میں حیات کے بڑی بازی تھی۔ ہر شخص کتنا ہی غریب کیوں نہو اگر کسی بڑے آدمی کو خوش کر لیتا تھا تو دفعتاً شہرت اور ثروت کو پہنچ جاتا تھا۔ اور یہی وہ بات ہے جو مشرقی طبقوں کو بہت بھاتی ہے۔ کیونکہ مشرق میں "قسمت" اور متلون المزاجی کو اس امن و اماں کے مقابلہ میں جس کی مغرب میں قدر ہوتی ہے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ مشرق میں مرغوب قصص وہ ہیں جن میں قدرتی اور حیرت انگیز طور پر قسمت پلٹنے کا ذکر ہے۔ یعنی وزیر سے فقیر اور فقیر سے وزیر ہو جاتے ہیں۔ اور یہ سب ایک ہی رات میں ہو جاتا ہے۔ اکثر مشرقیوں کو اب تک زندگی کی بے ثباتی اور صاحب جاہ کی ہنگامی حمایت ہی میں نہ کہ ایمانداری اور باقاعدہ محنت کے یقینی انعامات میں لطف زندگی ہے۔ ان تمام امور سے مشرق کی زندگی سب کے لئے بیحد دلچسپ تھی۔ اور یہ قماربازی کا لطف ہی ہے جس کو مغربی تہذیب کی ترویج کم و بیش مٹا رہی ہے۔ چنانچہ ایک انگریز مصنف موجودہ مصر کی بابت بجا طور پر لکھتا ہے "ہماری حکومت کامل ہو مگر مشرقی اُسے غیر دلچسپ پاتا ہے۔ قدیم نظام پوسیدہ جامہ تھا لیکن وہ بھڑک دار تھا۔ اس کا انقلاب ہی دلفریب تھا"۔ ایک مصری نے ایک انگریزی حکومت کے حامی سے کہا "ہاں! لیکن قدیم زمانہ میں اگر کوئی فقیر جو دروازوں پر بیٹھتا تھا کسی بھی خاتون کی نظر میں پسندیدہ معلوم ہونے لگتا تو دوسرے ہی دن بڑا آدمی ہو جاتا تھا"۔

اور پر خطر ماضی کے لئے قدرتی اور لازمی افسوس ہے جبکہ انصاف کے بجائے طرفداری تھی اور زندگی کے نشیب و فراز - یعنی حضرت یوسف علیہ السلام، ہارون الرشید اور اسمٰعیل[1] پاشا کے زمانہ کے مصر کے لئے افسوس ہے - ہم نے چمکیلے کپڑہ پر لنکلاشٹ کا کوٹ پھیلا دیا ہے[2]"

---

[1] اسمعیل پاشا ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۹۵ء میں وفات پائی - یہ محمد علی بانی خاندان خدیو یہ کا پوتا ہے - اس کے عہد میں مصر بالکل سلطنت سے علیحدہ ہوکر آزاد ہوگیا اپنے دادا کی طرح اُس نے بہت سے اندرونی اصلاحات شروع کیں سڑکیں بنائیں ریلیں نکالیں وغیرہ - اُس نے سب سے بڑا کام جو کیا وہ نہر سوئز کی تعمیر تھی - لیکن اپنی اسراف اور قبل از وقت اور غیر ضروری صنعت و حرفت کے کام جاری کرنے سے مالی مشکلات میں مبتلا ہوگیا اور رعایا پر نہایت سخت محاصل قایم کرکے خود ملک مبتلائے عذاب کردیا ان دقتوں کی وجہ سے اُسے نہر کے حصص گورنمنٹ برطانیہ کے ہاتھ فروخت کرنے پڑے - ان اسرافات کی بدولت انگریزی اور فرانسیسی تسلط شروع ہوا - ۱۸۷۹ء میں سلطان ترکی کے حکم سے معزول ہوا اور اُس کا لڑکا توفیق پاشا جانشین ہوا - مصنف

[2] ہیچ اسپنڈر کا مضمون "انگلستان و مصر و ترکی" جو اکتوبر ۱۹۰۶ء کے کنٹمپریری ریویو میں شائع ہوا - مصنف

اتنی عزیز چیزوں کے نقصان کے خوف سے رنجیدہ و غضبناک ہو کر یہ تعجب خیز نہیں ہے کہ اکثر مشرقی قدامت پسند ماضی کو ایسا زرّیں عہد سمجھتے ہیں جو ہر اس چیز سے جو مغرب پیدا کر سکتا ہے بیحد رفیع ہے۔ اور اس میں بھت سے پہلے کے آزاد خیال ہم آہنگ ہیں جو مغربی تہذیب کی شعبدہ بازی سے رہا ہو کر ردّ عمل سے ہم آغوش ہو رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہر مغربی شئے سے نفرت ہے جو بعض اوقات نہایت غلو کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ لوئی برتراند کہتا ہے "قاہرہ کے مقام پر ایک لکچر میں جس میں میں موجود تھا لکچرار نے دعویٰ کیا کہ اس امر کو پیش نظر رکھ کر کہ ازمنہ متوسطہ سے لیکر ۱۷۹۳ء کے انقلاب تک جن مصلحین نے فرانس کی آزادی کے واسطے کوشش کی ہے یعنی فرقہ ایلبی جنیسس[۹۱] پیروان والڈو[۹۲] پیروان کالوین[۹۳] اور کمیساڈز[۹۴] غالباً عربوں کی اولاد سے تھے۔ فرانس (۱) اپنی تہذیب و علوم (۲) نصف اپنے لغات (۳) اور اپنے باشندوں کے دماغی اور خصایص خوبیوں کے لئے اسلام کا مرہون منت ہے۔ اسے تو یہی کہینگے کہ فرانس کا مراکش سے الحاق کلی ہوا اسی زمانہ میں پر جوش مصری قوم

---

[۹۱] ایلبی جنیسس سنہ ۱۲ء کے قریب جنوبی فرانس کا ایک مذہبی فرقہ اس نام سے موسوم ہوا۔ مشرقی و مغربی نصرانی دنیا میں جو تحریک آئمہ مذہب کے تقدس کے خلاف شروع ہوئے اس کی شاخ یہہ فرقہ ہی تھا۔ انکے صحیح عقاید معلوم نہیں ہیں لیکن یقینی بات ہے کہ یہہ فرقہ کیتھولک فرقہ کے طریقہائے اصطباغ و عشاء ربانی وغیرہ کا منکر تھا اور پادریوں کی خرابیوں کی بالاعلان مذمت کرتا تھا۔ یہ فرقہ مانی کے الحاد و مسئلہ اہرمن و یزداں سے متاثر تھا۔ انہیں سے اکثر فرقہ کتھارتی سے تعلق رکھتے تھے۔ سینٹ برنارڈ اور سینٹ ڈومینک نے ان کی اصلاح اور راہ راست پر لانے کی کوشش کی اور بالآخر تیرہویں صدی میں محکمہ احتساب نے نہایت ظلم کے ساتھ ان ملاحدہ کا استیصال کیا۔

[۹۲] والڈو۔ پیٹر والڈو لیانس کا ایک متمول تاجر تھا جسنے ۱۱۷۰ء میں (بقیہ صفحہ ۱۴۶ ملاحظہ ہو)

پہ[illegible] کی عادت ہوگئی ہے کہ وہ اسپین جاکر یا تو اشبیلیہ[51] القصر[52] کے باغوں میں یا غرناطہ[53] کے

(یعقوب [illegible]) اپنا مال و اسباب محتاجوں میں لٹا دیا اور جگہ بجگہ فقر و افلاس میں بسر کر نیکی تبلیغ کرنے لگا
اس [illegible] کہلاتے تھے کوئی ایلپ کی وادیوں میں مقیم ہوئے انہوں نے صرف
[illegible] اور روحی کلیسا کی اقتدار کی مخالفت کی۔ ابتدا میں انہوں نے مختص پادریوں کے نظام
کے [illegible] انکار کیا اور [illegible] کو عشائے ربانی کی ادائیگی کی اجازت دی۔ ان کی تکفیر ہوئی اور
[illegible] فرانس اور جرمنی میں یہ عقائد اشاعت پاتے رہے۔ ڈیوک آف سیوائے
پوپ اور [illegible] نے ان کی استیصال کی ہر امکانی کوشش کی۔ کچھ عرصہ کے لئے انگریزوں نے انکی مدد کی اور
بالآخر ۱۸۴۸ء میں کامل مذہبی اور سیاسی حقوق مل گئے۔ مترجم

[49] کالوین۔ جان کالوین پروٹسٹنٹ مصلح تھا جو ۱۵۰۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۶۴ء میں مرا۔ یہ رومن کیتھولک تھا
اور ۱۵۲۱ء میں اپنے وطن نویان کا چپلین مقرر ہوا اور ۱۵۲۷ء میں کیورٹ ہوگیا۔ ایک سال بعد اسنے
کلیسا کو ترک کرکے قانون پڑھنا شروع کیا۔ اسی زمانہ میں اسنے میلچیور وولمر سے یونانی زبان سیکھی
اور اصلاحی اصول سے واقفیت حاصل کی۔ ۱۵۳۱ء میں وہ پیرس واپس آیا۔ اور نئے مذہب کی تائید میں سنیکا
کی کتاب دی کلیمنشیا کی تفسیر لکھی۔ جب پروٹسٹنٹ فرقہ پر ظلم و جبر شروع ہوئے تو یہ باسل کو فرار ہوگیا اور
۱۵۳۶ء میں جنیوا میں سکونت پذیر ہوکر اپنی کتاب پروٹسٹنٹ کا اقرار ایمانی شائع کی جس سے اخلاقی حالت
بہت اچھی ہوگئی۔ اسکا زمانہ زیادہ تر مباحثے میں گذرا۔

[50] کمیسارڈ۔ چونکہ انکی وردی سفید قمیص تھی اسلئے اس نام سے موسوم ہوئے۔ سیوین کے کاشتکاران جو پروٹسٹنٹ تھے
اور ہیوگوناٹ کہلاتے تھے انہوں نے احکام نانٹس کی منسوخی پر بغاوت کی اور بوجہ اپنی قمیص کے اس نام سے مشہور ہوئے

[51] اشبیلیہ۔ جسکو انگریزی میں سیویل کہتے ہیں۔ یہ اسپین کا جنوبی صوبہ ہے جس میں دریائے وادی الکبیر بہتا ہے
آغاز آٹھویں صدی میں اسکو عربوں نے فتح کیا۔ اور فرڈیننڈ سوم نے ۱۲۴۸ء میں اسکو عربوں سے فتح کیا۔ مترجم

[52] القصر۔ عربوں کی عہد کے شاہی محلات واقع اسپین۔ مترجم [53] غرناطہ اسپین کا جنوبی صوبہ (بقیہ نوٹ بر صفحہ ثانی)

الحمرا[51] کے مرصع کاروالانوں میں مغربی اسلام کی تباہ شدہ سطوت پر غور کرتے ہیں[2]۔

اِس زرین عہد کے درسگاہوں میں فرقہ ہنود کی تعلیاں اور بھی حیرت انگیز ہیں۔ یہ ہندو
مجاذیب بلند پروازی میں اپنے مسلمان بھائیوں سے کہیں بڑھے چڑھے ہیں۔ ان کا نہایت
متانت سے دعوی ہے کہ ہندوستان کل مذاہب حقہ، فلسفہ، شائستگی، تمدن، علوم و
ایجادات اور ہر شے کی تربیت گاہ و مخزن ہے۔ اور وہ یہہ بھی کہتے ہیں کہ جب ہندوستان کا
موجودہ قابل افسوس گرہن چھوٹ جائیگا (یہ گرہن بلاشبہہ بالکل انگریزی حکومت کی بدولت ہے)
تو وہ پھر کل عالم کی نجات کے لئے نہایت شان سے نمودار ہوگا۔ اس پرانے مقولہ کو کہ زیر آسمان
کوئی جدید شے نہیں ہے پورے طور پر استعمال کر کے انکو ویدوں اور دیگر کتب مقدسہ میں اس
امر کی[53] "ناقابل تردید" شہادت "ملتی ہے" کہ قدیم ہندو رشی ہمارے کل جدید خیالات سے حتی کہ
طیاروں اور بم کے گولے پھینکنے، اور اقوام لیگ جیسے مخترعات سے بھی واقف تھے[54]۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۴۶) یہ عربی سلطنت کا پایہ تخت اور تیرھویں صدی میں فنون لطیفہ و تجارت کا بڑا مرکز تھا۔
عربی سلطنت کی تباہی کے بعد صرف یہی مقام مسلمانوں کا مامن تھا لیکن اسپین والوں نے ۱۴۹۲ء
میں اس کو بھی فتح کر لیا۔ اور عربوں کی ہستی کو ملک سے فنا کر دیا۔ مترجم

۵۱ الحمرا غرناطہ کے قصر شاہی کا نام ہے اور تفصیلی حالات بلگرامی کی کتاب تمدن عرب میں ملیں گے۔

۵۲ برٹرانڈ کی کتاب صفحہ ۲۰۹ و ۲۱۰ - مصنف

۵۳ اہل ہنود کی اس طرز عمل پر بحث کیلئے ملاحظہ ہو ڈبلیو آرچر کی کتاب "ہندوستان اور مستقبل" مطبوعہ [illegible]
۱۹۱۸ء ینگ اور فیرس کی کتاب "ہندوستان کی کشمکش" مطبوعہ لندن ۱۹۲۲ء نیز ملاحظہ اہل ہنود کے اعتقاد [illegible]
یعنی ایچ جیمز کی کتاب "مذہب ہنود یعنی عالم کا نصب العین" مطبوعہ لندن ۱۹۱۶ء۔ اے کمار سوامی کی کتاب "شیو کا
رقص" مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۸ء۔ ایم۔ این۔ چٹرجی کا مضمون "دنیا اور جنگ ثانی" جو اپریل ۱۹۱۶ء
کے جرنل آف ریس ڈیولپمنٹ میں شائع ہوا۔ مصنف

ماضی کی یہ سب مبالغہ آمیز تعلیاں بیکار ثابت ہوں گی ۔ مغرب کی طرح مشرق بھی اپنی مختص خوبیاں رکھتا ہے ۔ لیکن مشرق کے خاص عیوب بھی ہیں ۔ اور یہ عیوب ہی ہیں جو گزشتہ ہزار سال سے خوبیوں پر چھا گئے ہیں ۔ جنکا نتیجہ پستی وجمود و کمتری ہے ۔ آج مغربی اثرات کے جاری و ساری ہونے سے مشرق کا احیا ہو رہا ہے اس کا نتیجہ یہ کبھی نہ ہوگا کہ مغربی تمدن کی تکمیل اشاعت اس مفہوم میں ہو کہ مشرق کی یکسر قلب ماہیت ہر شے کی نقل اتار کر ہو جائے ۔ مشرق ہمیشہ اصلاً بذاتہ قایم رہیگا لیکن یہ ایک جدید ہستی ہوگی جو مغربی خیالات کی صحیح طور پر سرایت کرنے کا نتیجہ ہوگی ۔ مخالفین اس عمل میں صرف تعویق پیدا کر سکتے ہیں اور اس طور پر مشرق کی پستی و کمزوری کی مدت کو دراز کر سکتے ہیں ۔

بایں ہمہ اگرچہ انقلاب پسندوں کا طرز عمل غیر دانشمندانہ ہے لیکن قابل فہم ہے ۔ مغربی تمدن کی ترویج سے بہت سے عزیز حمایات اور عطا شدہ مفاد کو ایسا نقصان پہونچتا ہے کہ قدیم منافست لازمی طور پر پیدا ہو جاتی ہے اگر مغربی اثرات میں سب خوبیاں ہی ہوتیں ۔ اور مغربی بالکل فرشتے بھی ہوتے تو بھی یہی مخالفت ہوتی لیکن فی الحقیقت مغربی تمدن کی ترویج کا تاریک پہلو بھی ہے ۔ اور مغربی تمدن کے حاملین محض ایثار نفس کے روح سے زندہ نہیں ہیں ۔ بلکہ ان کے بعض اغراض بہت ہی رکیک ہیں ۔ اس سے مشرقی انقلاب پسندوں کو امداد ملتی ہے اور اخلاقی ضرورت کی آڑ مل جاتی ہے ۔ ہر انقلابی عمل بالخصوص اقتصادی اور معاشرتی امور کے انقلاب نہایت تکلیف دہ قسم کے ہوتے ہیں ۔ ان تکالیف کے علاوہ اور بہت سے ضمنی اجزا ہیں جو نہایت اشتعال انگیز ہیں ۔

ابتدا ہی سے لیجئے ۔ یوریپوں کی محض موجودگی اور ان کی قوت و ترقی کا لازمیہ تفوق ہی ایک مستقل سوہان روح اور ذلت ہے ۔ یہ یوریپوں کی جسمانی موجودگی غالباً

احیاء مشرق کے لئے ایسی ہی ضروری ہے جیسی کہ مشرق کی موجودہ پستی کے لحاظ سے لازمی ہے لیکن یہ کتنی ہی مفید کیوں نہ ہو بلا شبہہ سخت اشتعال کا باعث ہے یہ یورپی ہر چیز میں گڑبڑ کرتے ہیں۔ رسومات میں ترمیم، معیار زندگی میں ترقی کرتے ہیں۔ شہروں میں علیحدہ محلے بناتے ہیں۔ اور اُن محلوں کو گویا "خارج از حدود شہر" آبادیاں سمجھتے ہیں جو مقامی قانون اور رسمی ضابطوں سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ وسط قاہرہ میں ایک انگریزی شہر تعمیر ہوتا ہے اور عربی الجزائر میں "پیرس کو چک" دخیل ہے۔ اور یورپی پیرا تر کی استنبول کے مقابلہ میں گستاخانہ جلوہ افروزی کر رہا ہے۔

ہندوستان کا تو یہ حال ہے کہ اس میں جا بجا برطانوی مقبوضات قائم ہیں۔ بڑی بڑی پریذیڈنسی شہر یعنی کلکتہ، مدراس، بمبئی، یورپی شہر ہیں جو ہندوستانی زمین پر تعمیر کئے گئے ہیں۔ کل نمایاں عمارات یورپی ہیں۔ اگرچہ بعض نئی عمارات میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ "ہندی و عربی" طرز تعمیر کو اختیار کیا جائے۔ باقی تو سڑکوں کے نام بھی انگریزی ہیں۔ عموماً یہ کسی وائسرائے، گورنر یا اس سپاہی کے نام سے موسوم ہیں جنہوں نے ملک کو فتح کیا یا غدر کو فرو کیا۔ ان بہادروں کی یادگاریں ہر جگہ پر ملتی ہیں۔ دوکانیں بھی انگریزی ہیں۔ جن میں یورپی یا یوریشین معاونین انگریزی سامان کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ انگریزی گاڑیاں اور موٹریں قدیم انگلستان کی پختہ اور روغندار سڑکوں پر دوڑتے ہیں۔ ہر جگہ پر اس کی شہادت ملتی ہے کہ جہاں تک آب و ہوا نے اجازت دی ہے انگلستان کے حالات زندگی کو پیدا کرنے کی طبعاً کوشش کی گئی ہے۔ ہندوستانی آبادی تقریباً کل کے کل محلوں کے پس پشت ڈال دی گئی ہے۔ (اگر ان کو غربا کے محلے نہ کہا جائے) مدراس میں ایسے حصے کو بالاعلان کالا شہر کہتے ہیں۔

چند ہی امور ایسے ہیں یعنی کلب اور جمخانے جو خاص اسی غرض کے لئے بنائے گئے ہیں جن میں انگریز مرد اور عورتیں ہندوستانی متمول مرد اور عورتوں سے معاشرتی مساوات کے اصول پر ملتے ہیں۔ لیکن ایشیائی قصبات اور اُن یورپی شہروں کے درمیان جو برتر طور پر تعمیر کئے گئے ہیں بہت ہی کم نقاط اتصال ہیں۔ پادری یا ملکی فوج کے کارکن یا متلاشی عجائبات سیاح بازار چلا جائے لیکن یورپی جماعت من حیث الجماعت اپنے گرد و پیش کے بھورے مجمع کے بابت اس سے زیادہ پرواہ نہیں کرتے جس قدر کہ ایک جزیرہ کے باشندے ان مچھلیوں کی پرواہ کرتے ہیں جو محیط سمندر میں رہتی ہیں[1]

جو بات بڑے شہروں کی ہے وہی بیسیوں صوبجات کے مرکز "مقامات" اور چھاؤنیوں پر صادق آتی ہے۔ پیمانہ کم ہو لیکن نمونہ ایک ہی ہے۔

اس طرح مشرق میں یورپی ہر طرح بالکل اجنبی ہے جو شہروں کے قلب میں رہکر بھی دیسی زندگی سے الگ تھلگ رہتا ہے۔ اور یورپی محض غیر مربوط اجنبی ہی نہیں ہے بلکہ وہ حکمراں اجنبی بھی ہے۔ ہمیشہ اس کا طرز عمل ایک برتر اور آقا کا سا ہے۔ یہ طرز عمل سببیت یا تکبر کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ حالت اقتضاء کے وجہ سے لازمی ہے۔ بلاشبہ بہت سے یورپی بد خلق ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے حالت کی اصلی حقیقت نہیں بدلتی۔ اور یہ اصلیت یہ ہے کہ مستقبل کچھ ہو لیکن یورپیوں نے ابتدا مشرق میں اس لئے سکونت اختیار کی کہ اس وقت مغرب مشرق سے بہت آگے تھا۔ اور آج بھی وہ یہاں اس لئے موجود ہے کیونکہ باوجود تمام جدید انقلابات کے مشرق ہنوز مغرب سے پیچھے ہے۔ لہٰذا یورپی آج بھی مشرق

---

[1] آرچر کی کتاب صفحہ ۱۱ و ۱۲۔ مصنف

میں حکمرانی ہی کرتا ہے۔ اور جب تک وہ یہاں رہے گا انصاف اور اعتدال کے ساتھ حکومت ہی کرتا رہے گا۔ اور جوں جوں مشرق ترقی کا حامل اور آزاد خیالی سے انتخابات کو استعمال کرنے کا اہل ہوتا جائے گا اس کو اختیارات عطا کرنے کا مدبرانہ خیال رکھے گا مگر ان سب پر بھی وہ حکمراں ہی رہے گا۔ جس جس جگہ مغربیوں نے اپنا سیاسی تسلط قایم کیا ہے اس کو دو ہی چارہ کار ہیں یعنی یا تو حکومت کرے یا چلا جائے مزید براں اپنی دوران حکمرانی میں مغربی کو اپنے نقطہ نظر سے حکومت کرنا ہے مقامی رسومات کا لحاظ رکھکر بھی وہ آخر کار مغربی حکمراں کی طرح عمل کرے گا نہ کہ مشرقی حاکم کی طرح۔ لارڈ کرومر اپنے ان الفاظ میں سب مستعمرات کی حکومتوں کے دل کی بات بیان کرتا ہے "مشرقی اقوام پر حکمرانی کرنے میں اوّل خیال یہ ہونا چاہئے کہ اُن کی بہبودی کس چیز میں ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کا لحاظ رکھا جائے کہ وہ اپنے لئے کیا اچھا تصور کرتے ہیں"[1]

یہ سب امور لازمی اور بدیہی ہیں۔ باوجود ان سب باتوں کے امر واقعہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ روشن خیال مشرقی بھی اسے تلخ مگر صحت بخش دوا سمجھتا ہے اور اکثر مشرقی اسے آبرو ریز اور ناقابل برداشت سمجھتے ہیں اور بیرونی کی خوبیاں ہی ان کی غیر بردل عزیزی کا باعث ہیں۔ میریڈتھ ٹاونسنڈ نے اس کو خوب بیان کیا ہے "ایشیا میں یورپی ایسا شخص ہے جو اپنے پڑوسی سے کھانا کھانے کے بعد ہی کام کرنے پر اصرار کرتا ہے اور جب وہ نیم بیدار ہوتا ہے تو اس سے ہوشیار ہونیکو کہتا ہے۔ اور جب وہ تفریح کرنا چاہتا ہے تو وہ جلدی کرنیکو کہتا ہے۔ وہ ایشیا میں حکمراں ہے اور اسکے مطابق اس سے محبت کیجاتی ہے۔"[2]

---

[1] کرومر کے "سیاسی اور ادبی مضامین" صفحہ ۲۵۔ مصنّف

[2] ٹاونسنڈ کی کتاب "ایشیا و یورپ" صفحہ ۱۲۸۔ مصنّف

مزید براں مشرق میں یورپی نہ صرف بحیثیت حاکم اور مزاحم کے غیر ہر دل عزیز ہے بلکہ اس وجہ سے بھی ہے کہ وہ ایک بالکل جداگانہ نسل سے ہے۔ نسل کا معاملہ بہت پیچیدہ[1] ہے لیکن اس کا اثر دور رس اور نہایت اہم ہے۔ مشرق ادنےٰ اور وسطےٰ کے اکثر اقوام جنسے ہماری موجودہ بحث متعلق ہے، جنس انسان کی اس نوع سے ہیں جو "بھورے" کھلاتے ہیں۔ بلاشبہہ یہ لفظ علم تشریح الاجسام انسانی کے لحاظ سے غیر صحیح ہے۔ علم تشریح الاجسام کے لحاظ سے ہم کوئی بیّن جماعت "بھورے" قسم کی جو "بھوری نسل" کھلائے ایسے نہیں قائم کر سکتے جیسا کہ یورپ کے "گورے" قسم کو "گوری نسل" اور مشرق اقصےٰ کے "زرد" یا منغولی قسم کو "زرد نسل" کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرق ادنےٰ اور وسطےٰ النسلی طور پہ بڑی بھٹیاں یا بھٹیوں کا سلسلہ رہے ہیں جن میں فتوحات اور تبدیل سکونت کی وجہ سے جدید مختلف الاجسام عنصر ہمیشہ آتے رہے اور نہایت مختلف قسم کی نسلی اختلاط برابر ہوتے رہے چنانچہ آج مشرق ادنےٰ اور وسطےٰ کی اکثر اقوام زیادہ تر گوری ہیں مثلاً ایرانی اور عثمانی ترک دیگر اقوام مثلاً جنوبی ہندوستان کے باشندے اور یمنی عرب زیادہ تر کالے ہیں۔ اور ہمالیہ اور ایشیاے متوسط کے اقوام زیادہ تر زرد رنگ کے ہیں پھر چونکہ بھوری نسلی ساخت کا ایسا نمونہ نہیں ہے جیسے کہ گورے اور زرد ساخت کے نمونے ہیں اسی طرح سے کوئی عام بھوری تہذیب بھی زرد اور گوری اقوام کی تہذیب کی طرح نہیں ہے۔ بھوری اقوام کا بڑا روحانی اتحاد اسلام ہے۔ لیکن ہندوستان میں جو بھوری آبادی کا خاص

---

[1] میں نے اس پر کامل بحث اپنی کتاب "گوروں کی عالمگیر اقتدار کے خلاف رنگ کا اٹھنے والا طوفان" میں کی ہے۔ مصنّف

مقام ہے پیروان اسلام صرف پانچواں حصہ ہیں۔ آخر بات یہ ہو کہ اگرچہ اسلام کے حدود زیادہ تر بھوری دنیا کی نسلی حدود پر منطبق ہوتی ہیں تاہم چند مقامات پر اسلامی حدود پھیلی ہوئی ہیں اور اسمیں مشرقی یورپ کی گوری اقوام اور مشرق اقصیٰ کے اصلی زرد اور افریقہ کے بے شمار حبشی بھی شامل ہیں۔

ان چند ہی ترمیمات کے بعد بھی "بھوری اقوام" اور "بھوری دنیا" کے مصطلحات ایسے صحیح حقایق کا اظہار نہیں کرتے جنہیں علوم اور سیاسات دونوں اعلیٰ صحیح تسلیم کرتے ہوں۔ بلا شبہ بھوری اقوام میں ایک اصلی تہذیب ہے۔ اگرچہ یہ تہذیب نازک اور غیر محسوس قسم کی ہے تاہم اس کے وجود سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اور بعض اوقات یہ اہم طور پر ظاہر ہونے کے قابل ہے۔ اسکا نمایاں پہلو یہ ہو کہ تمام مشرقی ادنیٰ اور وسطیٰ کی اقوام طبعی طور پر اسکا احساس کرتے ہیں کہ وہ ایشیائی بھائی ہیں۔ خواہ انکے اندرونی نزاعات کتنے ہی شدید کیوں نہوں۔ اس طبعی ایشیائی ہونیکے احساس کو ہورینیوں نے دو ہزار سال قبل مشاہدہ کیا تھا۔ اور یہ آج بھی ایسا صحیح ہے جیسا کہ سابق میں تھا۔

انسانی تجربہ میں نوع انسان کی نسلی تقسیم سب سے زیادہ ضروری مستقل اور مختلف ہے۔ یعنی جسم انسانی کے مختلف رنگ نہیں ہیں یہ معاملات جیسے رنگ، قد، بالوں کی ساخت بعض ان لازمی دماغی اور روحانی اختلافات کے ظاہری اور محسوس علامات ہیں جو تمام تاریخ انسانی میں ظہور پذیر ہوتے اور تنوعات زندگی کے لا انتہا صورتوں میں منتقل ہوتی ہیں۔

ان اصولی نسلی تفرقوں سے ایک مشرق اور مغرب کے درمیان حایل ہے۔ تمام مفہوم کے لحاظ سے مشرق ادنیٰ و وسطیٰ بھوری دنیا ہے اور یہی اس کے اور مغرب کی گوری دنیا کے درمیان مابہ الامتیاز ہے۔ فی الحقیقت نسلی اختلافات اسقدر نمایاں ہیں کہ کی کوشش کرنا سب سے بڑی حماقت ہوگی مشرق اور مغرب باہمی تبادلہ خیالات اور ایک دوسرے کی تعلقات کو مفید کرسکتے ہیں۔ لیکن اختلافات ذاتی سے ایک دوسرے کی

سمجھکر تباہ کرنا شروع کیا انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ گوری نسل کے انفاق میں ایسی اخلاقی اور سیاسی خلیج پیدا ہوگئی جو خود گوروں کی بیان کی بموجب کبھی نہ بھر سکیگی۔ مشرقیوں کے نظر میں اس جنگ کی تلافی آزادانہ نظام عمل تھا۔ جس کو اتحادی مدبرین نے اپنے پرچموں پر ثبت کیا تھا۔ لیکن جب جنگ ختم ہوئی اور اتحادیوں کو فتح حاصل ہوئی تو فوراً ہی پتہ چل گیا کہ عین اس وقت میں جبکہ اتحادی لیڈر آزادی کے وعدوں سے لبریز تقریریں کر رہے تھے تو اسی کے ساتھ وہ تجزیہ مشرق ادنے کے لئے آپس میں نہایت حریصانہ ملک گیری کی خاطر متعدد خفیہ عہد نامے طے کر رہے تھے۔ خاتمۂ جنگ پر مجلس صلح میں آزادی کی تقریریں نہیں بلکہ یہی خفیہ عہد نامے تھے جن کے بنا پر مشرقی ممالک کی قسمت کا فیصلہ ہوا۔ اور جس کا نتیجہ کم از کم تحریر میں تو یہ ہوا کہ کل مشرق ادنے و وسطےٰ یورپ سیاسی تسلط کے تحت میں آگیا۔

اس پر غیظ و غضب کا سیلاب مشرق میں اُمڈا و قبل از جنگ کے احتجاجات کی طرح محض اظہار خشم و ناراضی تک ہی محدود نہ رہا۔ اس میں فوری مقاومت و بغاوت کی آہنگ جو پہلے نہ سنائی دی تھی، موجود تھی۔ یہ باغیانہ جوش جنگجویانہ عمل کی صورت میں متبدل ہوگیا جس کے بدولت دول یورپ کو اپنے بعض انتہائی مطالبات مجبوراً کم کرنے پڑے اور دیگر مطالبہ جات میں مستقبل قریب میں یقیناً تخفیف کرنا ہوگی۔[۵۱] جنگ کے

---

[۵۱] اس پیشنگوئی کی بہترین تصدیق واقعات حاضرہ سے ہوتی ہے فرانسیسیوں کو سلیشیا سے دستبردار ہونا پڑا اور حلقہ اثر جو ایشیا، کوچک کے بعض حصص پر مشتمل تھا غائب ہوگیا۔ اتحادیوں نے جنگ عظیم کے بعد قسطنطنیہ وغیرہ پر جو قبضہ کر رکھا تھا وہ آخر صلح ہونے سے ہٹ ہی گیا۔ مزید براں وہ سیاسی مراعات اور ترکی قوم کی تذلیل جو سالہا سال سے دول یورپ نے کر رکھی تھی وہ بھی جاتی رہی۔ شام و فلسطین و جزیرۃ العرب اور عراق کی (بقیہ نوٹ بر صفحہ ...

بعد کے ان شورشوں کے مفصل بحث فصول مابعد ہو گی۔ یہاں پر یہ بتا دینا کافی ہے کہ جنگ عظیم نے مشرق میں یورپی رعب و داب کو پارہ پارہ کر دیا۔ اور مغرب کی کمزوریوں کو مشرقیوں کے پیش نظر کر دیا۔ مشرق کے لئے یہ لڑائی بڑا انعاب تعلیم ثابت ہوئی ایک امر تو یہ ہے کہ لاکھوں مشرقی اور حبشی ایشیا و افریقہ کے دور و دراز جنگلوں سے گوروں کی جنگ میں سپاہی اور مزدوروں کی حیثیت سے بھرتی کئے گئے۔ اگرچہ ان معاونین کی زیادہ تعداد تو آبادیات کے مہمات میں مصروف جنگ رہی۔ لیکن دس لاکھ سے زیادہ مشرقیوں کے قدم سرزمین یورپ میں آ گئے۔ یہاں اُنہوں نے گوروں کو مارا۔ فرنگیوں سے مسرت کی۔ گوروں کے تعیش کے لطف اُٹھائے اور گوروں کی کمزوریوں کو معلوم لیا اور گھر جا کر سب قصے اپنے ملک والوں کو سنائے۔ یہ نتائج ایشیا

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۵۴) شورشیں مزید انقلابات کا پتہ دیتے ہیں۔ قابل اطمینان امر یہ ہے کہ گورنمنٹ برطانیہ کو اس حالت کا کامل احساس ہے اور اس کی کوشش ہے کہ یہ مناقشات بآسانی مٹ جائیں جیسا کہ مصنف نے فصل قوم پرستی کے آخرین پیراگراف میں اظہار کیا ہے (مترجم)

ملے ایشیا و افریقہ پر جنگ کے اثر کی بابتہ ملاحظہ ہو اسے۔ و مانڈیون کی کتاب "انحطاط یورپ" مطبوعہ پیرس سنہ ۱۹۲۰ء۔ ایچ۔ ایم۔ ہائینڈمین کی کتاب "بیداری ایشیا" مطبوعہ نیو یارک سنہ ۱۹۱۹ء۔ اسے۔ ڈی۔ سوربل کی کتاب "سیاہ رنگ والوں کا بار" مطبوعہ نیو یارک سنہ ۱۹۲۰ء۔ الف۔ جی فشر کی کتاب "ہندوستان کا خاموش انقلاب"

مطبوعہ نیو یارک۔ مصنفہ سنہ ۱۹۱۹ء

ہوگئی ہے۔ اور بالآخر صدیوں کی خواب کا خاتمہ ہوگیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ جس میں زندہ رہنا اچھا تھا" کیونکہ تاریخ دنیا کی کتاب میں جدید فصل لکھی جا رہی تھی۔[1]

بلاشبہ جنگ روس و جاپان نے اس روح کو پیدا نہیں کیا۔ بلکہ اس کی اصل قرون ماسبق کے مروجہ دقیق انقلابات سے پیدا ہوئی۔ جنگ روس و جاپان خود اعتمادی کے اس دل خوش کن لہر کا جو ۱۹۰۵ء میں ایشیا و افریقہ میں پھیل گئی بجائے سبب ہونے کے محض محل اظہار تھا۔ لیکن وہ خیالات جو لاکھوں مشرقیوں کے دماغوں میں لامعلوم طور پر پیدا ہو رہے تھے متشکل اور عیاں ہوگئے۔ اور اس طرح ان قوتوں کے ارتباط کے لئے جو احیاء مشرق کے لئے سرگرم عمل تھیں ہاتھ کا اشارہ تھے۔

مزید براں اس ہمدید مزاج نے ان جدید مغربی تعدیات کے سلسلے کی بابت جو اس زمانے میں شروع ہوئیں۔ مشرقی طرز عمل پر گہرا اثر ڈالا یہ عجیب بات ہے کہ

---

(۱) ریورینڈ سی۔ ایف۔ اینڈریوز کی کتاب "ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ" صفحہ ۱۱ مطبوعہ لندن ۱۹۱۲ء
مشرقی اقوام پر جنگ روس کا جو اثر ہوا اس کی حالات کے متعلق ملاحظہ ہوں اے۔ ایم۔ لو کا مضمون "مصری شورش" جو
اکتوبر ۱۹۰۷ء کے رسالہ "فورم" میں شائع ہوا۔ ایف۔ فرانشیل کا مضمون "جاپان اور اسلام" جو نومبر ۱۹۰۶ء کے
ریویو دو موند مسلمان میں شائع ہوا۔ "جنگ روس و جاپان سے مشرقی مطلع
نظر پر اثر" جو فروری ۱۹۰۸ء کے امریکن ریویو آف ریویوز میں شائع ہوا
اے۔ وامبیری کا مضمون "جاپان اور اسلامی دنیا" جو اپریل ۱۹۰۵ء
کے نائنٹینتھ سنچری اینڈ آفٹر میں شائع ہوا۔ یحییٰ صدیق
کی کتاب مذکورہ بالا صفحہ ۲۴۳ — مصنف

کہ ٹھیک اسی زمانہ میں کہ مشرق اقصےٰ نے یورپی تعدی کے خلاف کامیاب مقاومت
کی مشرق ادنےٰ اور وسطےٰ مغربی ظلم و تعدی کی عدیم المثال سختی کا شکار رہا۔ ہم نے
اُن اسلامی دنیا کے غضب ناک احتجاجات اور غیر معمولی اخلاقی استحکام کا ذکر کیا
ہے جو ان مغربی حقیقی سیاسی چالوں کے ظاہر ہونے پر ہوا۔ یہ معلوم کرنا خالی از دلچسپی
نہ ہوگا کہ اس معاندانہ طرز عمل میں فی الواقع جاپان کی ہمت افزا مثال کا کہاں تک اثر تھا۔
بلاشبہ ہمارے مغرب کے عالی حامیان شہنشاہیت سنہ ۱۹۱۴ء کے درمیانی قرن میں
ایک خطرناک چال چل رہے تھے۔ چنانچہ ارمینیس وامبیری نے طرابلس پر اطالوی
حملہ کے بعد لکھا ہے "جتنا جتنا دنیائے قدیم میں مغربی اقتدار اور اختیار قائم ہوتا جاتا ہے
اتنا ہی ایشیا کی منفرد فرقوں میں اتحاد اور باہمی سفاد کے تعلقات مستحکم ہوتے جاتے
ہیں۔ اور یورپ کے خلاف آتش نفرت زیادہ مشتعل ہوتی ہے کیا یہ مقتضائے عقل
اور تقاضائے ضرورت ہے کہ بے موقعہ اشتعال اور غیر ضروری حملوں سے خصوصیتاً
کے جذبات کو ترقی دی جائے۔ اور دنیائے جدید کی آویزش کے زمانہ کو قریب تر
لایا جاوے اور تمدن جدید کے شیوع کا جو کام آج کل ایشیا میں جاری ہے اُسے قبل
از وقت ختم کر دیا جاوے[15]۔"

جنگ عظیم نے اس نازک حالت کو نازک تر کر دیا۔ اہل مشرق نے دفعتاً دیکھا کہ
اقوام یورپ جو نسلی معاملات میں اب تک ایک قسم کا اتحاد باہمی قائم کئے ہوئے تھیں یا
ایک خونخوار اور خونریز اور مرگ و زیست کی فیصلہ کن جنگ میں مصروف اور دست و
گریبان ہو گئے۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ انہی اقوام نے ایک دوسرے کو جانی دشمن

---

[15] اے۔ وامبیری کا مضمون "مسلمانوں اور یورپ کی مفاہمت" جو اپریل ۱۹۱۱ء کی
رسالہ نائنٹینتھ سنچوری اینڈ آفٹر میں شائع ہوا۔ مصنف

دونوں نقصان پہونچا سکتے ہیں جسمانی طور پر متحد کرنا سب سے بڑی مصیبت ہوگی۔ مشرق اور مغرب دونوں نے ماضی میں ترقی کے لئے بہت کچھ کیا ہے اور مستقبل کے لئے ان سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ لیکن یہ کچھ بھی حقیقتاً قابل قدر خدمت کر سکتے ہیں وہ اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ یہ دونوں فی نفسہ اپنی اصلیت پر قایم رہیں۔ اختلاط نسل سے ان کی نسلی روح خراب ہوگی۔ جس کا نتیجہ ہولناک دوغلہ پن ہوگا۔ اور جس سے صرف انحطاط اور تنزل ہی پیدا ہوگا۔

مشرق اور مغرب دونوں کو اس کی صحت تسلیم ہے۔ اس کا اظہار دونوں اس مشترکہ عداوت سے ہوتا ہے جو انھیں بقول ٹاؤنسینڈ "دونوں نسلوں کے نتیجہ اتحاد دوغلوں" سے ہے۔ چنانچہ میریڈتھ ٹاؤنسینڈ نے خوب کہا ہے۔ بھورے اور گورے آدمی کا فصل بے پایاں ہے اور ہر زمانہ میں رہا ہے اور آج بھی ہر جگہ موجود ہے۔ جب کوئی بھورا آدمی گوری عورت سے اور گورا آدمی بھوری عورت سے شادی کرتا ہے تو اس کے دل میں یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ وہ کسی ابدی ازلی اور لازمی حکم کے خلاف ورزی کر رہا ہے[۱]۔

مغرب اور مشرق کے درمیان جو سیاسی و اقتصادی و معاشرتی و نسلی اختلافات ہیں ان کے مندرجہ بالا خلاصے سے ہمیں کافی اندازہ ان بے شمار متضاد تحریکات کا ہو جاتا ہے جو دونوں دنیاؤں کے تعلقات کو پیچیدہ کرتے اور مغربی تمدن کی اشاعت میں سد راہ ہیں۔ مغربی تمدن کی اشاعت یقینی طور پر رائج ہو رہی ہے اور فصول ما بعد میں ہم اسپر نظر ڈالیں گے کہ اس کی وسعت کتنی عظیم ہے لیکن جن اسباب پر ہم بحث کر چکے ہیں ان سے رد عمل کی امکانات کا اظہار ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مغربی رنگ

---

۱ ٹاؤنسینڈ صفحہ ۹۰ - مصنف

کی اشاعت کس درجہ تک ہو سکتی ہے۔

ایک بات یقینی ہے یعنی مشرق میں مغربی سیاسی تسلط کتنا ہی شدید اور ظاہر میں کتنا ہی پر شوکت کیوں نہ ہو مگر ایسی عمارت ہے جس کی بنیاد پانی پر ہے مغربی انگریز ہمیشہ اجنبی نو رقیے رہیں گے اُن سے رواداری کا برتاؤ کیا جائے۔ اور غالباً احترام بھی کیا جائے لیکن محبت کبھی نہ ہوگی۔ اور ہمیشہ اچنبھی ہی متصور ہونگے۔ مزید براں محکوم اقوام کی تعلیمی ترقی سے مغربی حالت بالضرور زیادہ نازک ہو جائے گی جتنے کہ جس امر پر ایک پشت خاموش رہتی تھی دوسری پشت کے لوگ مخالفانہ احتجاج کرینگے فی الحقیقت یہ توازن ناپائدار ہے۔ جس کا قایم رکھنا مشکل اور الٹ دینا آسان ہے۔

مشرق اور وسطے پر یورپی سیاسی تسلط کے مضمر ناپائیداری کا حیرت انگیز اظہار جنگ روس وجاپان کے اخلاقی نتیجہ سے ہوا۔ اس وقت تک یورپی تعدی کے مقابلہ میں مشرق ایسا لاچار تھا کہ اکثر مشرقی ما مغربی اقتدار کو تقدیری امر خیال کرتے تھے۔ لیکن ایک ایشیائی قوم نے جو ایک اعلیٰ درجہ کے یورپی سلطنت پر فتح پائی تو یہ طلسم باطل ہو گیا کل ایشیا، اور افریقہ ایسے نشہ میں سرشار ہو گئے جسکا اندازہ ہی ہم بمشکل کر سکتے ہیں ایک اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا پادری جو اس زمانے میں شمالی ہند میں تھا جاپانی فتح کے اثر کو یوں بیان کرتا ہے "شمالی ہند میں جوش کی ایک لہر دوڑ گئی۔ حتٰے کہ دور دراز دیہاتی بھی جب رات کو حلقہ میں بیٹھکر حقہ پیتے تھے تو جاپان کے کامیابیوں کا تذکرہ کرتے تھے۔ ایک معمر آدمی نے مجھ سے کہا غدر سے لے کر اس وقت تک ایسی بات کوئی نہیں ہوئی تھی ایک مغربی ایشیا کے تجربہ کار ترکی قونصل نے مجھ سے کہا کہ اندرونی ملک میں ہر جگہ اچھل کود ما۔ کو یا اس خبر سے شادمان ہو گئے۔ ایشیا کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک ایک

اور افریقہ یورپ سے ایسے واقف ہیں کہ پہلے کبھی نہ تھے - اور ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ اپنے علم سے پورا فائدہ اٹھائیں گے - اس حالت کا نازک ترین پہلو یہ ہے کہ مشرق کو اس امر کا احساس ہے کہ ورسیلیز کی وہ وہ مشہور صلح "" جس کا منشا امن یورپ ہے کوئی صلح نہیں ہے - بلکہ ایک غیر مستحکم اور غیر مدبرانہ لغویت ہے جس نے زخمہائے کہن کو غیر مندمل رکھا - اور جا بجا چرکے پہونچا دیئے - آج یورپ ضعیف اور مریض پڑا ہوا ہے اور اس کی بدولت افریقہ اور ایشیا کو غیر دانشمندانہ خیالات اور جبریہ عمل کی ترغیب ہوتی ہے -

آج تو یہ حالت ہے کہ مشرق جو قدیم اور جدید کے نزاعات میں منقسم ہے وہ اس یورپ کے مقابل ہے جو نااتفاقیوں سے پاش پاش اور اپنی حماقتوں میں مبتلا ہے غالباً اس سے قبل کبھی بھی دونوں دنیاؤں کے باہمی تعلقات میں ایسے بے شمار اور فتنہ انگیز امکانات کا موقع نہ تھا - یہاں پر قابل لحاظ امر یہ ہے کہ یہ اجنبی جدید مشرق جو ہمارے مقابل ہے زیادہ تر اُن مغربی اثرات کا نتیجہ ہے جو گذشتہ سو سال سے عدیم المثال طور پر مشرق میں اپنا عمل کر رہے ہیں -
اب ہم اس عمل کے خاص پہلوؤں کی طرف متوجہ ہونا چاہتے ہیں ❊

فصل چہارم

سیاسی تبدیلی

مشرق کا خاص نقص اس کی پر عیب سیاسی روایت رہی۔ اوائل ایام ہی سے مشرق میں سلطنت کی خاص صورت خود مختاری یعنی ایک مطلق العنان بادشاہ کی شخصی حکومت رہی ہے رعایا اس کی غلام اور جن کے خیال اور بلکہ لوگوں کا قیام و بقا اس کی خوشی اور مرضی پر منحصر ہے مشرقی خود مختاری کی صرف ایک با اثر روک مذہب رہا ہے۔ بعض ناقدین "رسوم" کا اضافہ کر سکتے ہیں لیکن نتیجہ ایک ہی ہے۔ کیونکہ مشرق میں رسم و رواج ہمیشہ مذہبی شان پیدا کر لیتے ہیں۔ بلاشبہ مذہب کی عبائے مقدس علماء کو اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے۔ جو من حیث الجماعت ایک واجب الاحترام گروہ ہے۔ ان مستثنیات کے سوا مشرقی مطلق العنانی قیود و حدود سے عموماً آزاد رہی اور مطلق العنان حاکم جب تک کہ وہ دین اور علماء کا احترام کرتا رہے۔ حسب دلخواہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ آغاز تاریخ ہی میں ہمیں فرعون کی مثال نظر آتی ہے کہ اس نے اپنی قبر کا عظیم الجثہ اہرام تعمیر کرنے کے خیال کی تکمیل کے لئے کل مصر کی دولت کو صرف کر ڈالا اور کل مشرقی سیاسی تاریخ میں اس مہلک سیاسی سادگی کا ادبار رہا ہے

اب متعدد انسانی تجربات سے یہ ناقابل تردید طور پر ثابت ہو گیا کہ شخصی سلطنت فی الجملہ بدترین طرز حکومت ہے۔ بلاشبہ قصص میں "فیاض مطلق العنان" یعنی "اپنی رعایا کا باپ" ایسا مذکور ہے جس کے گرد و پیش عاقل و مشیر رہتے تھے اور جو ایک اشارہ یا ایک جنبش قلم سے خرابیوں کا استیصال کر دیتا تھا۔ یہ باتیں قصوں اور کہانیوں کے لئے نہایت موزوں ہیں۔ لیکن واقعی زندگی میں "فیاض مطلق العنان" بہت کم ہوتا ہے اور شاذ و نادر ہی ان صفات سے متصف اس کا جانشین ہوتا ہے۔ عموماً رعایا کے

باپ "کالڑ" کا نمائش پسند اور پوتہ بدمزاج ہوتا ہے۔ جو رعایا کو تباہ کر ڈالتے ہیں۔ قابل افسوس تثلیث یعنی داؤد و سلیمان و رجعام کی مثال نہایت تواتر سے صفحات تاریخ میں ظاہر ہوئی۔

مزید براں فیاض مطلق العنان کی بھی ایک حد ہے۔ کل مطلق العنانیوں کی حکومت میں دقت یہ ہے کہ ان کی حکومت بالکل شخصی ہے ہر بات کا انجام کار بادشاہ کی ذاتی مرضی پر منحصر ہے۔ کوئی امر معین اور یقینی نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ رات گزرنے پر فیاض مطلق العنان خود ہی اپنی فیاضی کو ترک کر دے اور ایک سلطنت کی قسمت شاہ کے کسی عورت سے عشق یا سوءِ ہضم کے نتیجے سے معرض خطر میں آجائے۔

ہم مغربی فی الواقعہ خالص مشرقی رنگ کی مطلق العنانی سے کبھی حتٰی کہ رومی سلطنت کے ایام میں بھی واقف ہی نہیں ہوئے۔ در اصل ہمکو یہ اندازہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اس کا کیا مطلب ہے جب ہم کسی خیر اندیش مطلق العنان کا ذکر کرتے ہیں تو اٹھارویں صدی کے فریڈرک اعظم[1] جیسے "روشن خیال"

---

[1] فریڈرک اعظم یا فریڈرک دوم شاہ پروشیا ۱۷۱۲ء لغایتہ ۱۷۸۶ء جنگہائے پولینڈ میں شریک رہا ۱۷۳۰ء لغایتہ ۱۷۴۰ء میں زیادہ تر ادبیات کیطرف متوجہ رہا اور ۱۷۴۰ء میں تخت نشین ہوا۔ بروقت جلوس اسکے ملک میں نہایت اچھا انتظام و عمدہ لشکر اور خزانہ معمور تھا طرز سلطنت شخصی تھا۔ اس نے اپنے باپ فریڈرک اول کے کام میں ترقی کر کے پروشیا کو دول یوروپ میں ممتاز بنا دیا۔ ۱۷۴۰ء میں سلیشیا پر قابض ہوا اور ۱۷۵۶ء میں برطانیہ عظمٰی کا حلیف ہوا۔ اسی سنہ میں اس نے سیکسنی پر حملہ کر دیا اور سات سال تک روس و اسٹریا اور فرانس سے لڑتا رہا۔ فرانس کی نا داری اور ملکہ روس کی وفات کی وجہ سے اپنے ممالک مفتوحہ پر قابض رہا اور ۱۷۶۳ء میں صلح ہو گئی ۱۷۷۲ء میں پولینڈ کے پروشیا و کچھ پولینڈ کا حصہ حاصل کیا ۱۷۸۵ء میں بادشاہوں کی لیگ قایم کی یہ بادشاہ موقع کا منتظر۔ حکیم۔ مطلق العنانی۔ بڑا مدبر۔ خشک مزاج۔ خودغرض۔ جفاکش اور متحمل مزاج تھا۔ اگرچہ اس نے اپنی ملک کو ریاستہائے جرمنی میں سب سے ممتاز بنا دیا۔ لیکن اوس نے یہ وحشی حکمت عملی پر بے اصولی کا ایسا نقش چھوڑا جس کی انتہا جنگ عظیم میں ہوئی۔

(مترجم)

کا عموماً تصور کرتے ہیں لیکن یہ سلاطین مشرقی مفہوم کے مطابق مطلق العنان نہ تھے۔ فریڈرک ہی کی مثال لو۔ وہ مطلق العنان سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اس کی رعایا اس کی غلام نہ تھی۔ ان متکبر پروشی منصبداران اور باضابطہ اہل دفاتر اور ضدی قصبانیوں اور ہٹی کاشتکاروں میں سے ہر ایک کو ذاتی وجاہت اور آئینی مرتبت کا احساس تھا۔ ان لوگوں نے جو فریڈرک کی اطاعت بے چون و چرا کی وہ محض اسکے بادشاہ ہونے کی بنا پر نہ تھی بلکہ اسوجہ سے بھی تھی کہ وہ یہ جانتے تھے کہ فریڈرک پروشیا بھر میں امور سلطنت کے مشاغل میں سب سے زیادہ محنتی اور ان تھک تھا۔ اگر فریڈرک دفعتاً کاہل اور عیاش و متوہم و ظالم ہو جاتا تو اس کے "مطیع" اہل پروشیا اس کو بتا دیتے کہ اس کے اختیارات کی بھی حد ہے۔

مشرق میں حالت بالکل متضاد ہے۔ مشرق کا ہر شخص ایک ایسے قاعدہ کو بسر و چشم تسلیم کرتا ہے جو یورپی آئین میں معدوم ہے۔ "تو اس شخص کی جس کو خدا نے بطور تبیر سے بادشاہ کے تجھ پر مسلط کیا ہے عزت اور پرستش کرے گا" اگر وہ تیری پرورش کرے تو تو اس کو پیار کرے گا اور اگر وہ تجھ کو لوٹے اور ستائے تو بھی تو اس کو عزیز رکھے گا۔ کیونکہ تو اس کا غلام اور اس کی ملکیت ہے۔[۱] اگر کوئی مشرقی سلطان یا سلطنت کو وزیر اعظم کے دوش بدوش الگر حرم میں بند ہو جائے اس وقت سے اس وزیر کو غیر محدود اختیار ملجاتے ہیں۔ اور ہر شخص کی جان اس کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن شام کو کسی قاصہ کے جنبش لب پر بادشاہ اپنے حرم سے کسی حبشی "بے زبان" کو موگند کے وزیر کے محل کی طرف بھیج دے تو وزیر اس حبشی بے زبان کو دیکھکر بے چون و چرا اپنا خلعت اتار کر اپنی گردن پھندے کے لئے برہنہ کر دے گا۔ یہ ہے اصلی مطلق العنانی! وہ مطلق العنانی جس سے مشرق کو سابقہ پڑا ہے۔

یہ ہے مشرقی سیاسی روایت! اور بالیقین یہ امر بدیہی ہے کہ ان روایات کے تحت باضابطہ حکومت اور مسلسل ترقی ممکن ہی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مشرق کی تاریخ زیادہ تر فوری عروج اور اتنے ہی فوری زوال کی داستان ہے۔ ایک طاقتور اور قابل آدمی بدنظمی اور انحطاط کے زمانہ

[۱] سرٹی مارسن کی کتاب "ہندوستانی شہنشاہیت" صفحہ ۴۷ مطبوعہ لندن ۱۹۰۹ء۔

ہیں صاحب اختیار بن جاتا ہے اس کے لیے طاقت ور اور قابل ہونا اس لیے ضروری ہے کیونکہ ان صفات کے بغیر وہ ان اشخاص پر جو ایسی ہی طبیعت کے ہیں اور مطلوبہ انعام کے لئے کوشاں ہیں سبقت نہ لیجا سکے گا۔ اس کی قابلیت اور جوش حیرت انگیز نتائج پیدا کرتی ہے۔ وہ کام لینے کا درست اور سریع طریقہ جانتا ہے۔ اس کے عزم اور عمل سے وہ قوت محرکہ پیدا ہوتی ہے جو اس کے ماتحتوں کو کافی قابلیت سے کام کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ نالائقی اور بے ایمان کی سزا ایسی سختی سے دیجاتی ہے جیسی کہ ایرانی شاہ نے ایک ظالم صوبہ دار کی کھال زندہ کھنچوا کر منصب کی کرسی کو منڈھوا دیا۔ اور جدید گورنر نے اس پر بیٹھکر معدلت گستری کی۔

جب تک آقا زندہ ہے کام ٹھیک چلتا ہے۔ لیکن جب وہ مرا تو اس کا لڑکا جانشین ہوا اگر یہ بھی فرض کر لیا جاوے کہ اس لڑکے کو اکثر باپ کی قابلیتیں دراثۃً پہونچیں تاہم اس کی تربیت بدترین ہوئی۔ اس کی پرورش حرم میں خوشامدی غلاموں اور چاپلوس عورتوں میں ہوئی۔ اس کو اپنے غرور اور خواہشات کو پورے طور پر ضبط کرنے کی عادت نہیں ہوئی نتیجہ یہ ہے کہ وہ جوان ہو کر شاہانہ ظالم اور غالباً قبل از وقت سیاہ کار ہو جاتا ہے۔ ایسا آدمی لازمی طور پر باپ کی طرح نگرانی نہیں کرسکتا۔ جیسے ہی کہ آقا کی نظر چوکی معاملات درہم برہم ہوئے۔ اس کے خلاف کیسے ہو سکتا تھا؟ اس کے باپ نے ایسا کوئی نظام حکومت قائم نہیں کیا جس میں امور سلطنت مغرب کی طرح خود بخود ہی سرانجام پاتے۔ اس کے افسران یا تو خوف یا ذاتی وفاداری سے کام کرتے تھے۔ ان کو نہ تو وطن کی ہمدردی کی وجہ سے فرائض کا خیال اور نہ غیر شخصی روایات منصبی کا لحاظ تھا۔ پوتے کے عہد میں معاملات بد سے بدتر ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے نا قابل ہاتوں سے زمام اختیار نکلکر بہت سی مقامی خود سر حاکموں پر منقسم ہو جاتے ہیں۔ اور اگر بالفرض برباد شدہ سلطنت پر کسی غیر ملکی فاتح نے حملہ نہ کرو یا نوان میں سے قوی ترین حاکم صاحب اختیار ہو جاتا ہے۔ ہر دو صورتوں میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان والا دور جاہ و کامیابی والا دور ختم ہو کر جدید دور شروع ہوتا ہے۔ اور اس دور کا بھی وہی انجام ہوتا ہے۔ یہ سب مشرقی کی تاریخ سیاسی کا لب لباب مگر اس میں ترمیم بارکا وسطے بھی زیادہ آزاد

سیاسی اثرات کے اتصال سے ہوئی ہے۔ یہ اثرات بعض وقت خاص مشرقی ممالک سے اور بعض وقت مغرب کی بدولت پیدا ہوئے۔ کل مشرق اس مسلسل مطلق العنانی کے تحت نہیں رہا ہے۔ جابجا ایسی اقوام بھی آباد رہیں (زیادہ تر کوہستانی یا مویشی چرانے والے) جو شخصی حکومت سے نفرت کرتی تھیں قوم عرب ہمیشہ سے اسی قسم کی رہی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح سے عربوں نے نور اسلام سے منور ہو کر ایک عظیم خلافت قائم کی جو اوائل میں خدائی جمہوریت تھی۔ بلاشبہ ہم اس کا بھی تبصرہ کر چکے ہیں کہ شخصی سلطنت کے قدیم تر روایات نے کیونکر اسلامی دنیا کے بڑے حصے پر اپنا سکہ جما لیا اور کس طرح جمہوری خلافت شخصی سلطنت میں مبدل ہو گئی۔ اور کس طرح سے آزادی پسند عرب رنج و غصہ میں آخر صحرا میں کو واپس آئے۔ سیاسی آزادی بھی مذہبی آزادی کی طرح برباد ہو کر تقریباً فراموش ہو گئی۔ میں نے تقریباً کہا ہے۔ کلیتاً نہیں کہا۔ اسوجہ سے کہ کسی خلافت کی یاد لوگوں کے گوشہ ہائے دماغ میں خزانہ کی طرح باقی رہی اور مساعدت زمانہ کے ساتھ پھر عود کرنے کو مستعد تھی۔ ان تمام حالات کے باوجود آج بھی آزاد عربستان موجود تھا جس کا ہر آدمی سرتاپا اس لیے مسلح تھا کہ وہ اپنی حریت کو قائم رکھے اسی کے ساتھ اسلام بھی موجود تھا۔ کوئی درباری فقیہ ایسی حدیث جیسے "کل مومن اخوۃ" اور "کل مومن حر" کی تعبیر کر کے ان کے اثر کو زائل نہ کر سکا۔ کوئی درباری مورخ تاریخ اسلام سے اس کے ابتدائی عہد یعنی "وقت سعادت" کے واقعات کو مٹا سکا۔ بدترین زمانہ میں بھی وہ مسلمان جو آزادانہ میلان رکھتے تھے خلیفہ اول کے اس خطبہ کو جو انھوں نے اپنے انتخاب کے بعد دیا تھا بہت دلچسپی سے پڑھتے ہوں گے۔ انھوں نے فرمایا: "اے قوم تم نے مجھکو جو تم میں سب سے زیادہ ناقابل ہے۔ اپنا خلیفہ منتخب کیا ہے۔ جب تک میں انصاف پر عمل کروں میری مدد کرو اگر اس کے خلاف کروں تو مجکو نصیحت کرو اور انجام دہی فرائض کی یاد دلاؤ۔ چونکہ میں کمزور کا حامی ہوں میری اسوقت تک اطاعت کرو جب تک کہ میں شریعت کا اتباع کروں اور اگر تم یہ دیکھو کہ میں ذرہ بھر بھی شریعت سے انحراف کرتا ہوں تو میری اطاعت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

مختصر یہ ہے کہ تاویلات مابعد اس واقعہ کو محو کرنے میں کامیاب نہ ہوئیں کہ ابتدائے اسلام ایک آزادی پسند قوم کا بڑا اظہار خیال تھا جس کے مذہب میں بھی بہت سے حریت کے میدان ہونا ضروری ہیں شریعت یعنی قانون دین بھی بقول پروفیسر لائبر کے اصلاً جمہوری ہے اور اس کا منشاء مطلق العنانی کے خلاف ہے۔" اس معاملہ کا وامبیری نے اپنی تحریر میں خوب

یہ خطبہ خلیفہ اول کا اصل عربی میں علامہ سیوطی کی تاریخ الخلفاء سے نقل کیا جاتا ہے صفحہ ۱۰ مطبوعہ فخر المطابع لکھنؤ ۱۳۲۱ھ

فبايع الناس ابابكر بيعة العامة بعد بيعة السقيفة ثم تكلم ابوبكر فحمد الله واثنى عليه ثم قال اما بعد ايها الناس فانى قد وليت عليكم ولست بخيركم فان احسنت فاعينونى وان اسأت فقومونى۔ الصدق امانة والكذب خيانة۔ والضعيف فيكم قوى عندى حتى اريح عليه حقه ان شاء الله والقوى فيكم ضعيف حتى آخذ الحق منه ان شاء الله۔ لا يدع قوم الجهاد فى سبيل الله الا ضربهم الله بالذل ولا تشيع الفاحشة فى قوم قط الا عمهم الله بالبلاء۔ اطيعونى ما اطعت الله ورسوله فاذا عصيت الله ورسوله فلا طاعة لى عليكم۔ قوموا الى صلوتكم يرحمكم الله۔

بیعت بنی شقیفہ کے بعد لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بیعت عام کی اس کے بعد ابوبکرؓ نے خدا کی حمد ثنا کے بعد کہا اے لوگو! میں تم پر والی بنایا گیا ہوں درانحالیکہ میں تم سے افضل نہیں ہوں۔ اگر میں عمل صالح کروں تو میری مدد کرو اور اگر غلطی کروں تو مجھکو بتاؤ۔ سچ امانت ہے۔ اور جھوٹ خیانت۔ تم میں سے جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے۔ جبتک کہ میں انشاءاللہ اس کا حق نہ دلا دوں اور تم میں سے جو قوی ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے جبتک میں اس سے حق نہ ادا کرا لوں۔ جب کوئی قوم جہاد فی سبیل اللہ کو ترک کرتی ہے تو اس کو خدا ذلیل کر دیتا ہے اور جب قوم میں بدکاری پھیلتی ہے تو خدائے تعالیٰ اسکو عام بلا میں مبتلا کرتا ہے جبتک میں اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کروں میرا اتباع کرو اور جب میں خدا اور اس کے رسول سے خلاف کروں تمکو میرا اتباع نہ کرنا چاہیے۔ نماز کے لئے اٹھو اللہ تم پر رحم کرے۔ مترجم

خلاصہ کیا ہے۔ "اسلام یا اس کی تعلیم مغربی ایشیا کی بربادی کا باعث نہیں ہے اور نہ اس سے موجودہ افسوسناک صورت حال پیدا ہوئی ہے بلکہ یہ اُن مسلمان بادشاہوں کے ظلم کی بدولت ہے جنھوں نے دیدہ و دانستہ تعلیم رسول اللہ صلعم کو بدلکر قرآن مجید میں تلاش کر کے اپنی شخصی سلطنت کے موافق اصول دریافت کیے۔ انھوں نے امور مذہبی میں ذرا بھی شک وشبہ کی گنجایش نہ چھوڑی اور انھوں نے نہایت کامیابی سے کل آزادانہ اصول کی تحریف وتخریب کر کے مسلمانوں کے نشأۃ ثانیہ کے طلوع کو روکدیا۔" [۱]

تمہیدی باب میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اٹھارویں صدی میں مشرقی مطلق العنانی کیونکر بدترین حالت کو پہونچی۔ اور مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ محض مذہب کی خالص اصلاح نہ تھی بلکہ جرگان بدکار اور قابل نفریں ظالموں کے خلاف جو اسلامی دنیا میں برسے طور پہ حکمراں تھے۔ ایک سیاسی احتجاج بھی تھی۔ اس اندرونی سیاسی حریت کی تحریک کا تقاطع ایک دوسری لہر سے ہوا جو مغرب سے آئی۔ اسلامی دنیا کی واجب الرحم تباہ حالی و بے دست وپائی کا مقابلہ یورپ کی مرفہ الحالی اور زورمندی سے کر کے دور اندیش مسلمان اپنی کمی کو محسوس کرنے لگے اور لازمی طور پر اس نتیجہ پر پہونچے کہ ان کی موجودہ تکالیف زیادہ تر ان کے منحوس طرز حکومت کی بدولت ہیں بلاشبہ بعض مسلمان حکمرانوں کو بھی اس کا یہ احساس ہوا کہ اگر ملک کو تباہی سے بچانا ہے تو کچھ مغربی سیاسی طریقوں کو اختیار کرنا چاہیے۔ اس نئی قسم کے مشرقی سلاطین میں سے سب سے زیادہ معروف مثال سلطان محمود ثانی والی ترکی اور محمد علی خدیو مصر کی ہے۔ یہ دونوں انیسویں صدی کے آغاز میں حسنا اختیاً

نوٹ صفحہ ۱۶۷ سطر ۱۰ اے۔ ایچ لائبیر کا مضمون ترکی پارلیمنٹ جو ۱۹۱۰ء کی امریکہ کی پولیٹیکل سائنس ایسوسی ایشن کی کارروائی کی جلد ہفتم صفحہ ۷۶ پر شایع ہوا۔

اے وامبیری کی کتاب متذکرہ بالا صفحہ ۳۰۷

ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ مصلح سلاطین میں سے کسی کو اس کا ذرا بھی خیال نہ تھا کہ وہ اپنی رعایا کو دستوری حریت دیں یا اپنے اختیارات کو محدود کریں وہ خود مختار رہنا چاہتے تھے خود مختاری کا مفہوم بجائے خالص مشرقی مطلق العنانی کے مغربی روشن خیال بااختیاری تھا۔ وہ جن چیز کے خواہاں تھے وہ اصلی نظامات سلطنت یعنی فوجی ملازمت ملکی و دیوانی وغیرہ کے نظامات جو پوری طور پر قابلیت سے کام کریں اور محض بھیڑوں کا مجمع ایسے افراد کا نہوں جنکو کام کرانے کے لئے روز روز سلطان کو ہانکنا اور سزا دینا پڑے۔ محمود ثانی و محمد علی اور انکے مشیر ان نے اس جدید پالسی میں سرگرمی دکھائی۔ لیکن ان بالائی اصلاحات کا نتیجہ فی الجملہ مایوس کن ہوا۔ بادشاہوں نے بارکیں اور دفاتر یورپی نمونے کے بنائے اور ان میں انگریزی ملبوس پہنے ہوئے سپاہی اور اہل دفاتر بٹھا دئے۔ لیکن وہ پورے نتائج نہ حاصل کر سکے۔ ان "مغربی نمونے" کے عمال میں سے اکثر بالکل مغرب سے ناواقف تھے۔ اور اس لئے مغربی طرز پر کام انجام نہ دے سکتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کا کام میں جی ہی نہ لگتا تھا۔ چونکہ ان کو ان نظامات اور خیالات سے جو ان کے فہم سے باہر تھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ انھوں نے اصلاح کے کام کو بادل ناخواستہ اور باطنی نفرت کے ساتھ کیا۔ اور وہ اس کو محض حکم سلطانی کی کورانہ متابعت میں کر رہے تھے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ فوجی شعبہ جات میں کچھ جدید قابلیت پیدا ہو گئی۔ لیکن ملازمت ہائے ملکی نے کوئی ترقی نہ کی اور ان میں بہت سی مغرب کی دفتری خرابیاں تو آگئیں لیکن محاسن سے محرومی رہی۔

اس اثناء میں مختلف قسم کے مصلحین پیدا ہو گئے جو مغرب کی ایسی اختراعات کا مطالبہ کرتے تھے جیسے دستوریت و پارلیمنٹ اور موجودہ سیاسی زندگی کے دیگر صور۔ ان مصلحین کی تعداد میں یوماً فیوماً اس گروہ کے افراد سے ترقی ہوتی گئی جو کثیر الشیوع کتب و رسائل و جرائد اور مغربی نمونے کے مدارس کے ذریعہ یورپی خیالات سے واقف ہو گئے تھے انیسویں صدی کے ربع ثالث میں ترکی میں اصلی سیاسی فرقوں کی ابتداء ہونے لگی اور ۱۸۶۷ء میں لبرل پارٹی

نے ایک کمزور سلطان سے پارلیمنٹ کی منظوری حاصل کرلی۔

مسلمانوں کی سیاسی حریت کی ان کامیابیوں کے بعد رد عمل کا دور آیا۔ مسلمان سلاطین اپنی رعیت کے روزافزوں سیاسی شورشوں سے بے حد مرعوب ہوکر اپنے شخصی اختیارات قائم رکھنے پر تلے ہوئے تھے۔ جدید سلطان ترکی یعنی سلطان عبدالحمید نے فوراً پارلیمنٹ کو بند کردیا اور احرار پر وحشیانہ مظالم کرکے۔ اور نہایت سخت مطلق العنانی کو قایم کیا۔ شاہ ایران نے بھی ایسی ہی سختی سے نوزائیدہ تحریک آزادی کا انسداد کیا۔ اور مصر میں خاندیو اسمٰعیل کی مسرفانہ حکومت نے یورپی مداخلت اور برطانوی حکومت کی اقامت کو برانگیختہ کر کے کل ملکی سیاسی زندگی کا خاتمہ کردیا چونکہ نوجوان ترکوں کے ۱۹۰۸ء والے انقلاب کے زمانہ تک ان اسلامی ممالک میں جو خودمختار تھے آزادانہ شورشوں کے بہت کم آثار نمایاں تھے۔ تاہم شورش موجود تھی۔ اگرچہ خفیہ عمل کررہی تھی صدہا نوجوان محبان وطن حصول تعلیم اور اپنی آزادخیالی کی اشاعت کے لئے دیارغیر کو چلے گئے اور سوئٹزرلینڈ جیسے امن سے ان "نوجوان ترکوں" اور "نوجوان ایرانیوں" وغیرہم نے اعلانات نتایج اور انقلابی مضامین طبع کئے جو ان کے وطنوں میں خفیہ طور پر اشاعت پاتے تھے اور جنھیں اُنکے مظلوم بھائی نہایت شوق سے پڑھتے تھے[۱]

امتداد زمانہ کے ساتھ حریت کی آواز رفتہ رفتہ بلند ہونے لگی۔ اسی زمانہ میں ایک نوجوان ترک شاعر نے کہا "یورپی تمدن آپ جس کی ہم بحیثیت ثمرات علوم وفنون معترف ہیں وہ محض آزادی کا نتیجہ ہے۔ ہر شے اپنا نور آزادی کے کوکب درخشاں سے اخذ کرتی ہے بلا آزادی کے

---

[۱] انیسویں صدی میں ان تحریکات آزادخیالی کا اچھا حال وامبیری کے مضمون "ایشیائی مسلمانوں میں تحریک آزادی" جو اکتوبر ۱۸۹۳ء کے جرمن ریویو میں شایع ہوا۔ وامبیری کے خیالات کا خلاصہ اوس کی کتاب "مشرقی ممالک میں مغربی تمدن" بالخصوص فصل پنجم میں ہے۔ نیز ملاحظہ ہو لیون کاہون کا مضمون متذکرہ بالا جو لاوسیں اور رامبو کی تاریخ عام جلد ۱۱ و ۱۲ میں شایع ہوا۔ مصنف

کوئی قوم نہ با اختیار ہوسکتی ہے اور نہ مرفہ الحال۔ بلا آزادی کے مسرت و اطمینان نہیں۔ بلا مسرت و اطمینان کے زندگی حقیقی زندگی، دوامی زندگی ناممکن ہے۔ آزادی کی نور زخشاں کے لئے دائمی تعریف و تبریک!،، انیسویں صدی کے اختتام پر یورپی مبصرین نے شخصی انتداب، ادبیت کی پرسکون سطح کی تہ میں حریت کے ہیجانی عمل کو محسوس کیا چنانچہ ارمنیس وامبیری جب ۱۸۹۶ء میں دربار قسطنطنیہ میں گیا تو یہ دیکھکر اس کی حیرت کی انتہا نہ تھی کہ اس زمانہ سے لیکر جبکہ چالیس سال قبل وہ پہلے پہل قسطنطنیہ آیا تھا آزادی میں کس درجہ ترقی ہوگئی تھی۔ باوجودیکہ اس زمانہ میں قسطنطنیہ میں حمیدی مطلق العنانی کا شد بد تر یا دور تھا۔ وامبیری نے لکھا[1] شخصی سلطنت سے ترکوں کو جو فدیمی لگاؤ تھا وہ ختم ہوگیا۔ ہم یورپ میں نوجوان ترکوں کی جماعت کا ذکر بہت سنتے ہیں۔ ہم دستوری تحریکات وسیاسی جلاوطنان اور انقلابی رسالوں کا بھی حال سنتے ہیں۔ لیکن وہ چیز جسکا ہم اندازہ نہیں کرسکتے وہ ہیجان ہے۔ جو مختلف معاشرتی طبقات میں پیدا ہو رہا ہے۔ اور جس سے یقین واثق ہوتا ہے کہ ترک ترقی کر رہے ہیں۔ اور اب مطلق العنان کو زہ گر کے ہاتھ میں محض گندہی ہوئی مٹی نہیں ہے۔ لہذا ترکی میں نوجوان ترکوں کی جماعت کا سوال ہی نہیں ہے۔ کیونکہ ہر مہذب عثمانی اس جماعت میں شریک ہے[2]،،

اس سلسلہ میں ہمیں ان شورشوں کے نشو ونما کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ جو ان بلاد مشرقی میں جو یورپی سیاسی تسلط میں تھے باسرعت سے ترقی کر رہی تھی۔ انیسویں صدی کے ختم پر صرف چار بڑی اسلامی سلطنتوں یعنی ترکی وایران، مراکش، افغانستان کی ایسی حالت رہ گئی جس کی نسبت کہا جا سکے کہ یورپی تسلط سے آزاد ہیں۔ چونکہ افغانستان ومراکش اتنے پیچھے تھے کہ وہ مشکل سے متمدن ممالک کہلائے جا سکتے ہیں۔ اس لئے صرف ترکی وایران ہی ہیں وہی

---

[1] وامبیری کی تصنیف مذکور الصدر صفحہ ۳۳۲ مصنف

[2] وامبیری کی کتاب "موجودہ اور چالیس سال قبل کی ترکی" مطبوعہ پیرس ۱۸۹۸ء مصنف

مطلق العنانی کے خلاف اصلی حریت کی تحریکات اٹھ سکتی نہیں لیکن ان ممالک میں جو دول یورپ کے زیر فرماں تھے مثلاً ہندوستان ومصر والجزائر باشندوں کی تمدنی سطح اتنی رفیع ہوگئی تھی کہ آزادانہ سیاسی توقعات اور نیز حکومت غیر سے نفرت محض بھی پیدا ہو جس کا احساس وحشیوں اور متمدن اقوام ہر دو کو ہوتا ہے

ان آزادانہ توقعات میں ان تحریکات سے اشتعال پیدا ہو گیا جو ترکی اور ایران میں دیسی حکومتوں کے خلاف شروع ہوئیں مگر ان دونوں انواع کی صورتوں میں فرق ہے۔ ترکی اور ایرانی شورشیں اصلاً آزادانہ اصلاحی تحریکات تھیں بخلاف اس کے ہندی ومصری والجزائری اور اس قسم کی دیگر تحریکات دراصل خالصاً تحریکات آزادی نہ تھیں اور ان کا کوئی نظام عمل منضبط نہ تھا کہ اگر یہ آزادی مل بھی جاوے تو اس کا استعمال کیونکر کیا جائے گا۔ آخرالذکر بجائے آزادانہ اصلاحی تحریکات کے قوم پرستی کی تحریکات ہیں۔ اس موقع پر اور اس اعتبار سے ان کا تذکرہ ان فصول میں کیا جاویگا جو قوم پرستی سے مخصوص ہیں۔ اس موقع پر جو امر ملحوظ خاطر رہنا چاہیے وہ یہ ہے کہ دراصل یہ حکومت غیر کے خلاف اور ان اشخاص کا اجتماع ہے جو نہایت متضاد سیاسی خیالات رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان قوم پرستوں کے اجتماع میں نہ صرف اصلاً آزاد خیال اشخاص ہیں بلکہ اس میں خود مطلق تفرقہ پرداز واعظین اور برہنہ شمشیر انقلاب پسند بھی ہیں۔ جو اپنی خلاصی یافتہ ممالک میں بدترین مطلق العنانی قایم کرنا پسند کریں گے۔ بلاشبہ سب قوم پرست جماعتیں آزادی اور "حریت" کے معروف نعروں کو استعمال کرتی ہیں باایںہمہ ان میں سے اکثر کا یہ منشا رہے کہ اغیار کی اتالیقی سے آزادی اور خلاصی یا بالفاظ دیگر خودمختاری لیجائے ہمیں ہمیشہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وطن پرستی کو آزاد خیالی سے کوئی لازمی ربط نہیں ہے۔ اسپین کے کاشتکاروں نے جب نپولین کی افواج کا مقابلہ کیا تو آزادی کے نعرے لگائے اور اپنے قابل النفرت ظالم بادشاہ کا نہایت مجنونانہ سرگرمی سے خیر مقدم کیا۔ اور اس کی مطلق العنانی کی عظمت کا استقبال "زندہ باد سلاسل" کے نعروں نے کیا۔

مطلق العنانی کے رد عمل کا دور جس میں انیسویں صدی کے آخر ربع میں ترکی اور ایران مبتلا تھے سنہ ۱۹۰۸ء میں دفعتاً ختم ہو گیا۔ اس سنہ میں دونوں ممالک بغاوت کی آگ سے مشتعل ہو گئے ترکوں نے ظالم سلطان عبد الحمید کو معزول کیا۔ اور ایرانی اپنے بدکار فرمانروا محمد علی شاہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ محمد علی شاہ غالباً سب سے زیادہ کج رائے بزدل و پر عیب عفریت تھا جس نے بہت سی نسلوں کے بعد تخت ایران کو نجس کیا۔" ان انقلابات نے آزادی کی ان قوموں کو جو پچھلی نسلوں کے ظلم و عدوان کی وجہ سے آہستہ آہستہ نشو و نما پا رہی تھیں اور اب تک مقید تھیں دفعتاً آزاد کر دیا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی اور ایران دونوں میں دستوریت و پارلیمنٹ اور مغرب کے دیگر سیاسی انتظامات کے شگوفے کھلے۔

معمولی حالات میں یہ چلو نہیں کیسا کام کرتیں؟ اس پر رائے زنی بے سود ہے کیونکہ ان کے لئے زمانہ نہایت ناساعد تھا۔ ترکوں اور ایرانیوں کی بدقسمتی تھی کہ انھوں نے بغاوتیں اس وقت کیں جبکہ دنیا اس مرض میں مبتلا ہو رہی تھی جس کا انجام جنگ عظیم (میں) ہوا۔ نہ ترکی کو سیاسی اصلاح حال پر عمل پیرا ہونے کا موقع ملا اور نہ ایران کو۔ گرگس چشم مغربی وزارت خانوں نے ہر غلطی کو دیکھا اور عین اس حالت کمزوری میں جو انقلاب کی وجہ سے لازمی تھی جھپٹ کر دبا لیا اور ان ممالک کو تباہ کر دیا۔ مغربی تعدی اور مداخلت کا جو عمل چند سال پہلے شروع ہوا تھا جنگ عظیم نے اس کی تکمیل کر دی۔

چونکہ مواد واقعات حقیقتاً بالکل معدوم ہے۔ لہذا اب متنازعہ مسئلہ پر بحث کرنا کہ آیا مشرق ادنے واقصے کی اقوام سیلف گورنمنٹ یعنی باضابطہ دستوری سیاسی زندگی کے قیام و بقا کے قابل ہیں یا نہیں؟ زیادہ تر ایک علمی مباحثہ رہ جاتا ہے۔ اس مسئلہ میں سخت اختلاف آرا رہے ہیں خود اس مسئلہ پر کوئی رائے قائم نہ کر سکا لہذا بجائے عام نتائج مستنبط کرنے کی کوشش کے میں صرف دلائل مختلفہ

سا: ڈبلیو مارگن شوسٹر کی کتاب "اختناق ایران" صفحہ ۱۲ مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۲ء مصنف

کے اظہار و بیان ہی پر اکتفا کروں گا۔ مگر ان متضاد نقاطِ نظر کے بیان کرنے سے پہلے میں اس امتیاز کی طرف توجہ دلاؤں گا جو مسلم اقوام اور ہندوستان کے غیر مسلم ہنود کے درمیان ملحوظِ خاطر رہنا چاہیے۔ ہر جگہ کے مسلمانوں کے پیشِ نظر دو چیزیں ہیں۔ عرب جمہوریت کی سیاسی مثال۔ اور ایسے مذہب کی تعلیم جس میں وسیع الخیالی کے رجحانات بہت زیادہ ہیں خواہ یہ رجحانات اس مذہب کے متبعین کے باہم ہی کیوں نہ ہوں۔ ہنود کے پیشِ نظر نہ ایسی مثال ہے نہ ایسی تعلیم مذہب۔ ان کی سیاسی روایت تو عملاً مشرقی تجبر و تشدد کا سلسلہ ہے جس کے مصائب سے کبھی نجات ہی نہ ملی مستثنیات محض یہ ہیں کہ اوائل ایام میں چند ابتدائی خود اختیاری حکومت کی جماعتیں تھیں جن کا دائرہ اثر کبھی وسیع نہ ہوا اور جو بہت جلد فنا ہو گئیں مذہب براہمہ یعنی ہندو مذہب غالباً سب سے زیادہ تنگ نظر اعتقادات کا مجموعہ ہے جو بنی نوع انسان پر مسلط ہوا کیونکہ یہ جماعت کو ایسے لاانتہا غیر متبدل ذاتوں میں منقسم کرتا ہے جن کے درمیان کوئی باہمی ربط ممکن ہی نہیں۔ ہر ذات اپنے سے کمتر کو ناپاک واچھوت اور جانوروں کے برابر سمجھتی ہے یہ ظاہر ہے کہ ایسے موانع کی موجودگی سے مسلمانوں کے مقابلہ میں ہنود کے لئے حقیقی سیلف گورنمنٹ کا قایم کرنا زیادہ دشوار ہوگا۔ ناظرین کو یہ امر بحث مابعد میں پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

ہم پہلے ان اشخاص کے خیالات کو بیان کرتے ہیں جن میں یہ یقین نہیں ہے کہ مشرق ادنیٰ و وسطیٰ کی اقوام فی الحال یا مستقبل قریب میں مغربی مفہوم کے مطابق حقیقی سیلف گورنمنٹ کے قابل ہیں۔ اس مسئلہ کو لارڈ کرومر نے پرزور الفاظ میں خوب بیان کیا ہے۔ لارڈ کرومر کو یہ یقین تھا کہ قدیم روایات اس قدر مستحکم ہیں کہ کم از کم ہمارے زمانہ میں مشرقی ان سے سر بر نہیں ہو سکتے۔ اوسکا دعویٰ ہے "آغاز تاریخ ہی سے مشرقی سیاسیات ایک مہلک سادگی کا شکار رہیں ہم کو ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نکرنا چاہیے۔ کہ مطلق العنانی کی حکومت کا تباہ کن سادہ تصور منضبط آزادی کے پیچیدہ ترین تخیل سے باسانی بدل جائیگا۔ یہ انقلاب اگر کبھی وقوع پذیر بھی ہوا تو وہ نسلوں کا نہیں بلکہ صدیوں کا کام ہوگا۔ لہذا ہمارا فرض اولین یہ ہے کہ ہم ایسے طریقہ رائج نکریں جن کی بدولت دسیوں کی جماعت اقل کو آزاد نظامات کے پردے میں اپنے ہموطنوں پر غیر عادلانہ حکومت کرنے کا موقعہ ملے۔ ہم کو

ایسا نظام قایم کرنا چاہیئے جس کے ذریعہ سے عوام پر مسیحی اخلاق کے بموجب حکومت ہو سکے اگر یہ فرض کر لیا جاے کہ ایک مصری پارلیمنٹ آزادی سے منتخب کیجاے تو ظن غالب ہے کہ یہ پارلیمنٹ ایسا قانون وضع کرے گی کہ اگر بردہ فروشوں کی نہیں تو مالک غلاماں کی حفاظت ضرور منصور رہو گی اور اس کا بھی یقین نہیں ہے کہ انتخاب کنندگان راجپوتانہ اگر ان کو حسب دلخواہ عمل کا موقعہ ملے تو رسم ستی کو از سر نو جاری نکر دیں گے۔ حکومت کی خوبی یہ ہے کہ وہ کم و بیش قابل حصول نصب العین کو پیش کرے۔ قبل اس کے کہ اہل مشرق برطانوی نصب العین سیلف گورنمنٹ کے لگ بھگ کوئی شے حاصل کریں ان کو اپنے سیاسی خیالات کے بہت سے پہلو بدلنے ہوں گے" لارڈ کرومر بکمال یاس اس استدلال کو یوں ختم کرتے ہیں" غالباً یہ کبھی بھی ممکن نہ ہوگا کہ مشرقی کے گوشت خر بے سے مغربی ریشمی کیسہ[2] بنجائے"

---

[1] ہندوستان کی سیاسیات میں فرقہ بندی کی روح ذات و پات کی تفریق ہنوز ایسی رائج ہے کہ وسیع النظری پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اجتماع و اتفاق کے ترانے کیسے ہی بلند کیوں نہ گائیں جائیں لیکن ہر فرقہ دوسرے فرقوں کی بیخ کنی میں مصروف ہے اور اسیکو اپنی سب سے بڑی کارگذاری سمجھتا ہے۔ موجودہ سیاسیات میں حصہ لینے والوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اس کا انتخاب محض ان کی خصوصی میلان کی عصبیت پر منحصر ہے اور اس دایرہ سے نکلنے کی کوشش کرنا تو درکنار ہر منفعت پر ان اختلافات کو شدید تر کیا جاتا ہے جو نام نہاد عارضی اتفاق کسی وقت قایم ہو جاتا ہے وہ محض مشترکہ نفرت یا ناراضگی پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ بنیاد تو بالکل ہی بر آب ہے اور اس سے کوئی مستقل نصب العین حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہندوستانیوں کو ہنوز کامل رواداری اور اتحاد باہمی کا سبق قرنوں میں یاد ہوگا جب تک ان کے دلوں سے فرقہ بندی اور خصوصی میلانات محو نہ ہوں گی حقیقی ترقی ناممکن۔ گاؤکشی و محرم و رام لیلا کے فسادات اس پر شاہد ہیں۔ ہندو قوم کے دامن پر یہ کیسا بدنما دھبہ ہے کہ وہ انسان کو ایک جانور سے بدتر اور کمتر سمجھتے ہیں اسی طرح پر مسلمانوں کی ارتغتی اور صدا سے ناقوس پر خفگی قابل ملامت ہے

(مترجم)

[2] کرومر کے سیاسی و ادبی مضامین صفحہ ۲۵ لغایت ۲۸ مصنف

اسی لہجہ میں تجربہ کار برطانوی ماہر سیاسیات ڈاکٹر ڈلن نے ترکی وایرانی انقلابات کے
جو مضامین لکھے ہیں ان میں ان انقلابات کی کامیابی سے ناامیدی ظاہر کی ہے اور اس "مروجہ یقین
کا کہ دستوری حکومت میں ربانی خوبیاں ہیں" مذاق اڑایا ہے۔ چنانچہ وہ آگے کہتا ہے کوئی نظام
جو بنی نوع انسان نے مرتب کیا ہو اور کوئی کاغذ جو کسی کارخانے میں بنایا گیا ہو اور جس پر یہ
نظام قلمبند ہوا ہو یہ طاقت نہیں رکھتا کہ قومی خصایص کی اصلیت کو مٹا دے۔ گرما گرم فقرے اور
فصیح تقریریں ہر چند لوگوں کو ان کے قلب ہیئت کا یقین دلا دیں لیکن واقعات اس سے نہیں
تبدیل ہو سکتے۔ واقعات سے یہ پتا لگتا ہے کہ ایران تو سیلف گورنمنٹ کی اہلیت ہی نہیں رکھتا
ڈاکٹر ڈلن یہ بھی کہتا ہے "دراصل صرف اشخاص اور اشیاء کے نام تبدیل ہوئے ہیں آدمی مر
جائیں لیکن بدنظمی کا دور ہمیشہ قایم رہتا ہے۔ نئی حکومت کو مالی امداد دینا ناممکن ہے کیوں کہ
ممالک غیر کے سرمایہ دار اپنے روپیہ اس لئے نہ دیں گے کہ اس کو غارت گر اور غیر ذمہ دار شورش انگیز
جو کہ حباب کی طرح پیدا ہو کر دفعتاً غائب ہو جاتے ہیں اڑا دیں"۔

فرانسیسی مستعمرات کا ایک افسر اعلیٰ اہالیان الجزائر اور فرانسیسی شمالی افریقہ کے دیگر
مسلمان باشندگان کی خصوصیات کو یوں بیان کرتا ہے "ہمارے دیسی اس کے محتاج ہیں کہ ان پر
حکمرانی کی جائے۔ یہ ایسے بڑے بچے ہیں جو تنہا راستہ طے نہیں کر سکتے۔ ہم کو چاہیے کہ ہم ان کی
رہنمائی بلا پس و پیش کریں۔ اور ان کی لغو و مہمل باتوں کو نہ سنیں اور چالبازوں اور مشغولوں کا
استیصال کر دیں۔ اسی کے ساتھ ہم کو ان کی حمایت اور بزرگانہ ہدایت کرنی چاہیے۔ اور خصوصیت
کے ساتھ ہم کو اپنی اخلاقی فوقیت کی مسلسل مثال سے ان پر خاص اثر پیدا کرنا چاہیے اور سب
سے بڑی بات یہ ہے کہ فرانس اور خود دیسیوں کے مفاد کے لحاظ سے ہم کو انسانی ہمدردی کے

---

۳ ای۔ جے۔ ڈلن کا مضمون "ایران سیلف گورنمنٹ کے قابل نہیں ہے" جو اپریل ۱۹۱۰ء کی کنٹمپریری
ریویو میں شایع ہوا۔ مصنف۔

سراب سے دھوکہ نہ کھانا چاہیئے۔"

یورپی حکمرانوں کی امتحاناً عطا کردہ ابتدائی مدارج سیلف گورنمنٹ مثلاً مجلس شوریٰ کو جس طور پر مشرقیوں نے استعمال کیا ہے اس سے اکثر مبصرین بالخصوص عمال مستعمرات کو نہایت مایوسی ہوئی ہے۔ ان لوگوں نے خدمات مفوضہ کو انجام دینے کی بجائے ان کو سیاسیات کا تماشہ بنانے اور مزید اختیارات کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنالیا۔ چنانچہ لارڈ کچنر نے اپنی ۱۹۱۳ء کی رپورٹ[۲] متعلق حالات مصر میں بیان کیا۔ "نمائندوں کی جماعتوں میں بلااندیشہ اسی وقت ترقی ہوسکتی ہے جب یہ معلوم ہوجائے کہ وہ اپنے موجودہ فرائض پورے طور پر ادا کر سکتے ہیں۔ اور اس کی قوی امید ہو کہ وہ اہم تر اور دشوار تر ذمہ داریوں کا بار بھی اپنے سر لے سکتے ہیں۔ اگر حکومت ہو تین اپنی سادہ ترین صورت میں بھی ناقابل عمل ہو تو اس کی قطعی امید نہیں کہ مزید توسیع کے بعد وہ زیادہ کارآمد ہوگی۔ کوئی حکومت ایسی لائیقل نہ ہوگی کہ چونکہ مجلس شوریٰ معقول اور قابل اطمینان طور پر اپنے فرائض انجام دینے کے ناقابل ثابت ہوئی لہٰذا اس کو مزید اختیارات اور اقتدار دیا جائے۔"

قوم پرستی کی موجودہ شورشیں خواہ ان جاہل عوام کو برانگیختہ کرتے ہیں کتنی ہی کامیاب ہوجائیں جو اکثر روشن خیال یورپی حکومت کے مادی فوائد سے بالکل مطمئن ہیں حقیقتاً ان کا تعلق طبقہ اعلیٰ کی دلیپیوں اور مغربی تعلیم یافتہ منتخبین سے ہے۔ چند سال ہوئے کہ اس بات کو ایک امریکی سربرآوردہ پادری نے جسے ہندوستان کا عمر بھر کا تجربہ تھا خوب لکھا ہے "ہندوستان کے عوام فی الجملہ موجودہ حکومت سے بیش از بیش خوش ہیں۔ یہ زیادہ تر جماعات ہیں جو بے چینی کا اظہار کرتی ہیں۔ اگر فتنہ انگیز عوام کو نہ چھیڑیں تو باشندگان ہند سے زیادہ وفادار کوئی قوم روئے زمین پر نہ ملے گی لیکن تعلیم یافتہ طبقہ میں جدید سیاسی تمنائیں پیدا ہوگئی ہیں اور وہ اب کم ذمہ داری کے مناصب

سلہ ای میبر سی ایبر کی کتاب "دلیسی سٹانہ" صفحہ ۲۲۰ مطبوعہ پیرس ۱۹۰۸ء مصنف

سلہ ۲ "مصر" ۱۹۱۴ء صفحہ ۶ مصنف

اور کم تنخواہوں کے عہدوں سے مطمئن نہیں رہ سکتے۔ ان لوگوں کو اس قسم کی حکومت سے جو
بند نیچ ان کو دیجا رہی ہے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ دراصل وہ نمایندگی کے نظامات کے
خواہاں نہیں ہیں۔ جن کے ذریعہ سے وہ اپنے وطن کی حکومت میں حصہ لے سکیں۔ بلکہ
جس چیز کے وہ متلاشی ہیں وہ اقتدار کلی ہے۔ برہمن جن کی آبادی صرف پانچ فیصدی ہے
اپنے آپ کو منجانب اللہ ملک کا حکمراں سمجھتے ہیں۔ اور دوسروں کو حق رائے دہندگی سے
بھی باز رکھنا چاہتے ہیں۔ شودر[1] یعنی ہندوستان کا درمیانی طبقہ یا تاجر حق رائے دہندگی
کے دینے میں ملک کی ۵ کروڑ بہریہ کا اتنا ہی خیال کرے گا جتنا کہ اپنے کتے کا۔ یہ دولت برطانیہ
ہی ہے۔ جس نے باشندگان ملک میں مساوات حقوق اور مراعات پیدا کی۔ اور اس کو
قائم رکھتی ہے[2]"۔

مغربی مبصرین کے علاوہ نیچ ذات ہندوؤں کو بھی جو مجموعی طور پر پست اقوام

---

[1] شودر۔ مصنف نے شودروں کو ملک کا درمیانی یا تاجر پیشہ طبقہ لکھا ہے یہ غلط فہمی ہے۔ گویدہ میں آریوں کے
تین اقسام لکھے ہیں یعنی پوجاریوں اور فوجوں کی ماتحت آریوں کا بڑا حصہ ویش کہلاتا تھا چنانچہ ژند اوستا کے اتھروہ۔ تھیشٹا و
اور واسٹریا بلحاظ حیثیت وخدمت ویدوں کی برہمن راجن اور ویشوں کی طبقات سے ملتی ہیں۔ چنانچہ ژنداوستا کی مصلحات بالا
ویدوں میں ہی پائی جاتی ہیں یعنی اتھرون بمعنی پیشہ ور پوجاری اور رتھن ہار بھی ویدہ میں ملتی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے
کہ آریوں میں یہ ذاتیں ہندوستانی اور ایرانی آریوں کی مفارقت سے پہلے قایم ہو چکیں تھیں۔ زاں بعد ہندوستان
کے اصلی باشندوں کی مفتوح ہونے سے ایک چوتھا فرقہ پیدا ہو گیا۔ ویدوں میں اس فرقہ کے تفریق کو لفظ "ورن" سے
بیان کیا گیا ہے جسکے معنی رنگ کے ہیں چونکہ یہ لوگ کالے تھے اور آریہ گورے تھے۔ لہذا رنگ حد فاصل تھا۔ مصنف
نے شودروں میں ویشوں کو بھی شامل کر کے ویشوں کی ہستی کو فنا کر دیا ہے۔ (مترجم)

[2] رپورٹ جے۔ پی۔ جونس کا "ہندوستان کی موجودہ حالات" جو جولائی ۱۹۱۰ء کے جنرل آف ریبادیو
لیمنٹ میں شائع ہوا۔ مصنف

کہلاتے ہیں یہ خوف لگا ہوا ہے کہ اگر ہندوستان برطانوی تسلط سے خلاصی پا جائے. تو ظالم برہمنوں کی جماعت اقلیت اس سے ذاتی نفع اٹھائے گی. یہ اقوام ہندوستانی قوم پرستوں کی شورش کی مخالفت اسوجہ سے کرتی ہیں کہ مبادا جو امن ان کو برطانوی راج میں حاصل ہے وہ بھی نہ جاتا رہے. ان کا خیال ہے کہ قبل اس کے کہ ہندوستان آزادی کا نو کیا ہوم رول کے قابل ہو پشت ہا پشت کی تعلیم اور معاشرتی اصلاح کی ضرورت ہے. ان لوگوں نے ایک ہا قتدار جماعت عاسدر کے نام سے قایم کی ہے جو قوم پرستوں کی مخالف اور گورنمنٹ کی وفادار ہے.

تمام ... کے نقطہ خیال کو ان کے سرگروہ ڈاکٹر نایر نے خوب بیان کیا ہے وہ کہتا ہے "جمہوریت کا لفظ بحیثیت ایک افسوں کے ہندوستان تک پہونچ گیا ہے. اور عام طور پر استعمال ہوتا ہے لیکن جمہوریت کی روح ہنوز سویز کے مشرق سے آگے نہیں بڑھنے پائی ہے. اور اسے ایک ایسے ملک میں جہاں ذات مستقلاً اقامت گزیں ہے بمشکل جگہ ملے گی. میں کسی خاص ذات کو نیچ ذاتوں پر ظلم کرنے کا ملزم قرار دینا نہیں چاہتا اس میں سبھی اونچی ذاتیں شریک ہیں. برہمن کل غیر برہمنوں پر ظلم کرتے ہیں. اور غیر برہمن اونچ ذاتیں اپنے سے کمتر ذاتوں پر ظلم کرتے ہیں. ہم حقیقی جمہوریت کے خواہاں ہیں نہ کہ کسی خاص طبقہ کی حکومت کے. گو کہ کیسے ہی شاندار الفاظ میں کیوں نہ دہوکا دیا جائے. علاوہ بریں اگر اسوقت معدودین کی حکومت قایم ہو گئی تو ہمیشہ ہی رہے گی. ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم فوری معدودین کی حکومت پر دیر میں حاصل ہونے والی جمہوری حکومت کو ترجیح دینگے. کیونکہ ہم کو ہمدرد برطانوی دفاتر پر ان غیر ہمدرد اونچ ذاتوں کے مقابلہ میں زیادہ اعتماد ہے جو ماضی میں ہم پر ظلم کرتے رہے ہیں. اور برطانوی گورنمنٹ کی عدم موجودگی میں ہم پر ظلم کرینگے. ہمارا یہ طرز عمل صرف ہمارے یقین پر نہیں بلکہ خلقی خود حفاظتی کی بنیاد پر ہے"[1]

---

[1] ڈاکٹر ٹی - مدادن نایر کا مضمون "ذات اور جمہوریت" جو اکتوبر ۱۹۱۸ء کی اڈنبرا ریویو میں شایع ہوا - مصنف

بہت سے مسلمان اور نیز ہنود اس کو محسوس کرتے ہیں کہ ہندوستان ہنوز سیلف گورنمنٹ کے قابل نہیں ہوا ہے۔ نیز یہ کہ اگر برطانوی اقتدار فی الحال مستقبل قریب میں کم ہو جائے تو خود ہندوستان کے لئے بڑی مصیبت ہوگی وفادار مسلمان جن اصول پر قوم پرستوں کی شورش کو ناپسندیدہ سمجھتے ہیں ان کو صلاح الدین خدا بخش نے واضح طور پر بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں "خواہ یہ میرا رویہ صحیح ہو یا غلط لیکن میں ہمیشہ موجودہ ہندوستانی سیاسیات سے الگ رہا اور ہمیشہ سے میری رائے یہی ہے کہ ہم کو سیاسیات کی طرف کم اور معاشرتی مسائل اور دینی ترقی کی طرف زیادہ متوجہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ ہماری موجودہ حالت کے لحاظ سے یہ سیاسیات قطعاً مضر ہیں۔ میری پختہ رائے ہے کہ ہمارا مفاد اسی میں ہی ہے کہ ہم سیاسیات سے بالکل کنارہ کش رہیں..... یہ اُن معدود چند اشخاص کا کام نہیں ہے جو مغربی تعلیم و تہذیب سے بہرہ اندوز ہیں بلکہ عوام کا کام ہے کہ وہ اپنے معاملات کو سوچیں سمجھیں، ہوشیاری سے اس میں دلچسپی لیں تعلیم یافتوں کی بیحد قلیل جماعت ہی تو آخر ہندوستان کی کل آبادی نہیں ہے۔ لہٰذا یہ عوام ہی ہیں جن کو تعلیم و تربیت دیکر راستبازی اور خدمت عظمیٰ کی ناموں سطح پر لانا چاہیے یہ منزل مقصود ہنوز بہت دور ہے۔ اور جب تک ہم اس درجہ پر نہ پہنچیں گے ہماری امیدیں خواب و خیال اور ہمارے مساعی بیکار۔ اور فریب باطل ہیں۔ تعلیم یافتہ جماعت اوّل نے بھی اپنی سیاسی رضاعت کے تنگ ملبوس کو ہنوز نہیں اتارا ہے۔ اور نہ جاہ طلبی کے فریب اور حصول ثروت کی تمناؤں سے برتر ہوئے ہیں۔ ہم کو ابھی صیانت اصول اور استقامت عمل کا درس لینا ہے۔ جبتک ہم اپنے ملک و قوم کے مفاد کو ذاتی اغراض سے کمتر نہ سمجھیں گے ہم کو انفرادی اور اجتماعی اخلاق کے معیار کے بلند کرنے کی امید نہیں ہو سکتی۔"

سلہ بخش کے مضامین ہندوستانی اور اسلامی صفحہ ۲۱۳ و ۲۱۴ مطبوعہ لندن ۱۹۱۲ء۔ مصنف

دیسی آبادی کے بڑے حصہ کے اس قسم کے بڑے اعلانات سے وہ آزاد خیال اگریز ماہرین معاملات ہند بھی دم بخود ہو جاتے ہیں۔ جن کو ہوم رول کی ضرورت کا اصولاً یقین ہر چنانچہ ان خیالات کا ایک شخص اٹیڈورل یوں کہتا ہے "جب ہندوستانی قوم پرست مطالبہ آزادی کرتے ہیں تو اس کا منشا خود مختاری ہے وہ اجنبیوں سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں ہمارا جواب جیسا کہ اصلاحات[1] میں درج ہے یہ ہے "ہاں تم کو خود مختاری ملے گی لیکن ایک شرط یہ کہ تم کو جمہوریت بھی لینا ہوگی۔ جس وقت ایسی ہندوستانی قوم پیدا ہو جائے گی جو اپنے دیسی حکمرانوں پر قابو رکھ سکے ہم فوراً ہی اپنا تسلط اٹھا لیں گے۔ لیکن ہم اس اختیار کو ہندوستانی حکومت معدودین کو نہ دینگے" یہ ان دو فریق کے درمیان میں اختلاف کی اصل جڑ ہے۔ جن میں سے ایک فریق یہ کہتا ہے کہ ہندوستان کو فوراً سیلف گورنمنٹ ملجائے اور دوسرا کہتا ہے کہ ہندوستان صرف امتداد زمانہ سے سیلف گورنمنٹ کے قابل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ سیلف گورنمنٹ سے اول الذکر کی مراد خود مختاری ہے اور یہ بالکل صحیح ہے کہ ہندوستان فوراً ہی خود مختار ہو سکتا ہے اگر آج تسلط اغیار ہٹا لیا جائے تو کسی نہ کسی قسم کی دیسی سلطنت یا متعدد حکومتیں کچھ زمانہ کی گڑبڑ کے بعد ہندوستان میں پیدا ہو جائیں گی لیکن یہ جمہوری سلطنت نہ ہوگی یہ سب سے طاقتور یا سب سے بیکار اشخاص کی مطلق العنان حکومت ہوگی۔"[2]

اقتباسات بالا سے ان مشرقی و مغربی ناقدین کا نقطہ خیال منکشف ہو جاتا ہے جو اس کا ادعا کرتے ہیں کہ کم از کم فی الحال یا مستقبل قریب میں مشرق ادنے و وسطے کی اقوام ہمارے مفہوم کے مطابق سیلف گورنمنٹ کے ناقابل ہیں۔ اب ہم کو ان اشخاص کے خیالات پر غور کرنا

---

[1] یعنی مانٹیگو چیمسفورڈ کی رپورٹ پر جو برطانیہ نے ہندوستان کو مزید سیلف گورنمنٹ کے اختیارات عطا کیے ہیں۔

[2] ای۔ بوان کا مضمون "ہندوستان میں اصلاحات" جو ۲۴ جنوری ۱۹۲۰ء کے دی نیو یورپ شائع ہوا۔ مصنف

چاہیے جو زیادہ امید افزا روش اختیار کرتے ہیں۔ بعض مبصرین اسلام کے میلانات آزاد خیالی پر بڑا زور دیکر یہ کہتے ہیں۔ کہ ان میلانات کی بنیاد پر موجودہ مفہوم کے مطابق سیاسی تعمیر اٹھائی جائے۔ وامبیری کہتا ہے۔"اسلام اسوقت بھی دنیا میں سب سے زیادہ جمہوری مذہب ہے یعنی یہ ایسا مذہب ہے جو حریت اور مساوات کا حامی ہے۔ اگر کبھی بھی کوئی دستوری حکومت تھی تو وہ خلفاء راشدین کی تھی"[1] مشرق ادنےٰ کا ایک بڑا انگریز ماہر بیان کرتا ہے"جمہوری سلطنت کی حقیقی اور صحیح تصویر قبائل عرب ہی میں ملے گی۔ اور عرب قبیلہ کا ہر فرد اس جمہوریت کے قیام کے لئے ہر وقت مسلح رہتا ہے جیساکہ بہت سے شخصی حکومت کے خواب دیکھنے والے بہت کچھ کھوکر واقف ہوگئے ہیں۔"[2] ۱۹۰۸ء کے نوجوان ترکوں کے انقلاب کی بابت پروفیسر لیبی آبر لکھتا ہے"ترکی سلطنت نظامات پارلیمنٹ کے لئے ایسی غیر مستعد نہ تھی جیساکہ ناواقف ادل میں معلوم ہوتا ہے حکومت مبعوثین کے لئے وہاں کچھ تو سابقہ مثال اور بڑی تیاریاں اور زبردست خواہش مخفی طور پر موجود تھی ترکی کے دینی و دنیوی نظامات دونوں میں پارلیمنٹ کی مثالیں متضمن تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عقلمند ترین اصحابؓ سے مشورہ فرماتے تھے. علماء بھی زمانہ موجودہ تک باہم مشورہ کرتے رہے ہیں. قانون مقدس یعنی اسلامی شریعت اصلاً جمہوری ہے۔ اور وہ اصلاً مطلق العنانی شخصیت کے خلاف ہے. ہر مسلمان کو اسی اصلی قانون سمجھنے کی عادت ہوجانے سے جاہل مسلمان میں دستوریت کے سمجھنے کی قابلیت پیدا ہوجاتی ہے۔" وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ ابتدائی زمانہ کے سلاطین "دیوان" یعنی افسران اعلےٰ کی اجتماعی مجلس منعقد کرتے تھے، اس مجلس کے جلسے سلاطین کو اطلاع و مشورہ دینے کے لئے باقاعدہ ہوتے تھے اور زمانہ حال میں مجلس مشیران سلطنت اور مجلس وزراء،

---

[1] وامبیری کی کتاب "موجودہ اور چالیس سال قبل کی ترکی" صفحہ ۵۸ مصنف

[2] جی۔ ڈبلیو۔ بری کی کتاب "اتحاد اسلام" صفحہ ۲۰۲ و ۲۰۳ مطبوعہ لندن ۱۹۱۹ء۔ مصنف

بھی تھی ۱۸۷۶ء کی پارلیمنٹ کی مثال بھی موجود تھی۔ اگرچہ یہ پارلیمنٹین ناکامیاب رہیں اور ان کے بعد حمیدی مطلق العنانی کا دور رہا۔ ان قانونی مثالوں کی یاد دل سے کبھی نہ محو ہوئی ان جملہ امور سے پروفیسر لیبی اہر یہ نتیجہ نکالتا ہے"۔ لہذا ترکی پارلیمنٹ کو بالکل جدت ہی نہ سمجھنا چاہیے بلکہ یہ نظامات معلومہ کی توسیع و ترقی ہے"[۱]۔

ڈبلو مارگن شوسٹر امریکی جسے ایرانی انقلابی گورنمنٹ نے ملک کے مالیات کے انتظام کو بلایا تھا اور جسے روسی و برطانوی دباؤ کی وجہ سے ایک سال سے کم عرصہ میں مستعفی ہونا پڑا ایرانی قوم کی سیاسی قابلیت کی بابت امید افزا خیال یوں ظاہر کرتا ہے۔ "مجھ یقین ہے کہ تاریخ عالم میں ایسی کوئی مثال نہیں ہے کہ کسی قوم نے دفعتاً مطلق العنان بادشاہی کو دستوری یا مبعوثین کی سلطنت میں تبدیل کیا ہو اور سیاسی صیانت اور ضوابط حکمرانی کے علم کا اعلےٰ معیار فوراً ہی ظاہر کیا ہو یہ نہ قیاس میں آسکتا ہے اور نہ کوئی معقول پسند اس کی امید کرسکتا ہے پہلی مجلس[۲] کے ممبران کو قیام پارلیمنٹ کے پہلے ہی دن سے اپنی ہستی کے لئے لڑنا پڑا ان کو نہ قانون سازی کے کام کو سنجیدگی سے بجالانے کا موقعہ ہی ملا اور نہ اس کی ذرا بھی امید تھی کہ جو قانون وہ بناتیں گے اوس کا نفاذ بھی ہوگا"!

"دوسری اور آخر مجلس جس کے تقریباً کل ممبروں سے بذات خود میں واقف تھا اگر اس کا مقابلہ برطانوی پارلیمنٹ یا امریکہ کی کانگریس سے کیا جاے تو بلاشبہ ناقابل تھی یہ امر حیرت انگیز ہوتا کہ ایک ایسے ملک میں جو عرصہ دراز سے انحطاط میں مبتلا ہو ایک بالکل جدید اور غیر آزمودہ حکومت ابتدا ہی سے اپنے فرایض ان سلطنتوں کی طرح بخوبی انجام دیسکے جنہیں پشت ہا پشت

---

[۱] اے۔ ایچ لائبیر کا مضمون "ترکی پارلیمنٹ" جو امریکہ کی پولیٹیکل سائنس ایسوسی ایشن کی جلد ہفتم صفحات ۹۰، ۷۷ میں سنہ ۱۹۱۰ء میں شایع ہوا۔ مصنف

[۲] ایرانی پارلیمنٹ کو مجلس کہتے ہیں۔ مصنف

کیا بلکہ صدیوں کا نتیجہ ہو۔ ہمیں علم ضابطہ کی کمی کا لحاظ رکھنا چاہئے کیونکہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ مجلس فی الجملہ ایرانی قوم کے جذبات اور صحیح نصب العین اور توقعات کی نمایندگی کرتی تھی۔ اس کے ممبروں کی تعلیم اوسط درجہ سے زیادہ تھی۔ اور ان میں سے بعض نے قابل تعریف قابلیت اخلاقی جرات و ہمت دکھائی۔ انھوں نے حب وطن کے متعلق ہر ایسی تجویز کا پرجوش خیر مقدم کیا جو ان کے سامنے پیش کی گئی۔ انہیں خود گورنمنٹ کے مالیات سے بڑی واقفیت نہ تھی لیکن موقعہ کی نزاکت کا احساس ضرور تھا۔ اور وہ ہر ایسے ممالک غیر کے مشیر پر پورا اعتماد کرنے کو مستعد اور خواہشمند تھے جو اپنے آپ کو سیاسی چالوں اور رشوت ستانی سے محفوظ رہنے اور ایرانی قوم کی بہبودی کے لئے کام کرنے کے قابل ثابت کرے۔"

"کوئی پارلیمنٹ بجا طور پر ناقابل نہیں کہی جاسکتی جبکہ ایک پوری قوم اس کی معین ہو اور وہ خود اپنے حدود سے بھی واقف ہو اور اس کے اراکین اپنی قومی منزلت اور حقوق سلطنت کے لئے بڑی قربانیاں کرنے کے لئے آمادہ ہوں۔"

"اب رہے اہل ایران نو ان کی بابت کوئی کلیہ بیان کرنا مشکل ہے۔ آبادی کا بڑا حصہ دہاقین اور اہل قبائل ہیں جو سخت جاہل ہیں۔ برخلاف اس کے ہزاروں ایسے ہیں جنھوں نے ممالک غیر میں تعلیم پائی ہے یا گھر پر تعلیم ختم کرنے کے بعد ممالک غیر میں سیاحت کی ہے۔ انھوں نے یا کم از کم ان کے بعض افراد نے جنھیں عوام کی مدد پہنچی یہ ثابت کر دیا کہ ان میں مغربی تہذیب اور نصب العین کے قبول کرنے کی صلاحیت ہے باوجود بے شمار موانع کے انھوں نے شخصی حکومت کو جمہوریت میں بدل دیا۔ حالات میں اس حد تک یکسانی کر دی گئی تھی کہ ہر شخص جس میں جوہر قابلیت موجود ہو اونچے منصب تک پہونچ سکتا تھا۔ گزشتہ پانچ سال میں انھوں نے قومی حیثیت سے حصول تعلیم کی عدیم المثال سرگرمی دکھائی دستوری حکومت کے عہد میں صدہا مدارس قایم ہو گئے۔ چشم زدن میں قابل تعریف آزاد مطابع پیدا ہو گئے اور بیخوف

اہل قلم آمادہ ہو گئے کہ وہ ہر ظلم و تعدی کا پردہ فاش کریں چاہے وہ اہل ملک کی طرف سے ہو یا اغیار کی۔ ایرانیوں کو سب سے زیادہ جدید ترین اور ترقی یافتہ اقوام کے سیاسی اخلاقی اور کاروباری قوانین کے اختیار کرنے کی فکر تھی۔ ان کے قلوب میں ایشیائی بیچینی کا وہی جوش موجزن تھا جو ہندوستان میں ساری وطاری ہے اور جس نے نوجوان ترکوں کی تحریک پیدا کی اور حال میں وہ چینی جمہوریت کی شکل میں ہویدا ہوا[1]۔"

مسٹر شوسٹر خاتمہ پر کہتے ہیں "کیپلنگ نے اشارۃً بتایا ہے کہ تم مشرق کو تیز نہیں بنا سکتے اس میں ایک تنبیہ اور سرزنش متضمن ہے۔ مغربی اشخاص اور مغربی الصب العین مشرق کو حرکت میں لا سکتے ہیں بشرطیکہ مشرقیوں کو یہ احساس ہو جائے کہ وہ جس راستہ پر چلائے جا رہے ہیں وہ عقلاً انھیں کے نفع کے لیے ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اخلاقی جذبات اور قومی و ملکی مفاخرت کے احساسات مشرق میں اسی قدر مضبوط ہیں جیسا کہ مغرب میں اگرچہ اس قدر نمایاں نہیں ہے۔ جب مشرقی ایسے راستہ پر ڈال دیئے جاتے ہیں جو صرف مغرب والوں کے لئے مفید ہے۔ تو وہ قدرتی طور پر بڑا شوق نہیں دکھاتے[2]۔"

فی الحقیقت بہت سے مغربی آزاد خیالوں کو یقین واثق ہے کہ یورپی حکومت کتنی ہی رعیت پرور اور قابل کیوں نہ ہو مشرقی اقوام کو کبھی بھی حقیقی سیلف گورنمنٹ کیلئے تیار نہ کریگی اور حقیقی سیلف گورنمنٹ کے سیکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے یعنی انھیں خود آزمائش کا موقعہ دیا جاوے۔ اس نقطۂ خیال کو مشہور و معروف برطانوی ماہر سیاسیات لیونل کرٹس نے نہایت قابلیت سے بیان کیا ہے ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر کرٹس کہتے ہیں "کہ تعلیم اور اسی نوع کے دیگر فوائد جو ہندوستان کو برطانوی حکومت نے پہونچائے ہیں وہ خود ہندوستانیوں کو ذمہ دار حکومت کے کام کیواسطے تیار کرنے میں کارآمد نہ ہونگے برخلاف اس کے تعلیم ایک خطرہ اور صریح خرابی ثابت ہوگی۔ اگر اسکے ساتھ سیاسی ذمہ داری کی ایک معین

---

[1] شوسٹر کی کتاب "اختناق فارس" مصنف

[2] مذکور الصدر مصنف

قسط نہ دی گئی۔ یہ عملی تجربے کے کارخانے میں ہی ہوسکتا ہے کہ انتخاب کنندگان خواہ کتنے ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہوں سیلف گورنمنٹ کے فن کو سیکھ سکیں"۔

"میں اسپر زور دیتا ہوں کہ حلقہ ہائے انتخاب کو اختیارات دیئے جائیں۔ عمال سلطنت[1] جدید صاحبان اختیار کو ان کی استدعا پر ہر قسم کی امداد و مشورہ دیں ان جدید صاحبان اختیار کے ساتھ عمال حکومت کا سلوک رضاعی ماں کا ایسا ہونا چاہیئے نہ سوتیلی ماں کا ایسا اور اگر جدید منصبداران کو ذمہ وار حکومت کا فن سیکھنا ہے تو وہ نگرانی بالادست سے بالکل آزاد رہیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو وہ اپنے آپ کو انتخاب کنندگان ماتحت کا ذمہ دار نہ سمجھیں گے۔ اور نہ انتخاب کنندہ ان کو اس کا سبق ملیگا کہ ان کی تکالیف کا علاج خود انہیں کے ہاتھ میں ہے۔ اس میں مصائب تو ہوں گے لیکن ان مصائب اور خود کردہ اور غالباً دیرپا مصائب ہی سے ایک قوم میں خود اپنی امداد کی لیاقت اور صحیح جماعت انتخاب کنندگان پیدا ہوسکتی ہے"۔

"یہ خیال میرے لئے باعث فخر ہے کہ انگلستان نے ہندوستان میں امن و امان پیدا کر کے بہت نفع پہونچایا۔ اور ہندوستان کو دکھایا کہ باضابطہ حکومت کا کیا مطلب ہے۔ لیکن اس درجہ کے حصول کے بعد مجکو یہ یقین نہیں ہے کہ موجودہ نظام قومی خصایص کو بلا ضرر پہونچائے جاری رکھا جاسکتا ہے اب یہ بار امانت قسط بہ قسط انگریزی کندہوں سے ان ہندوستانی کندہوں پر اسطرح منتقل ہونا چاہیئے کہ وہ اسکے متحمل ہوسکیں انکی قوت اور تعداد میں ترقی دینا چاہیئے لیکن یہ اسیوقت ہوسکتا ہے کہ ان کو عملی ذمہ داری کے کام کرنے کا موقعہ دیا جائے۔ اور اس میں انکی طاقت کے موافق بتدریج ترقی کیجائے۔ یہ کسی نصاب تعلیم مدارس سے حاصل نہیں ہوسکتا گو درسی تعلیم اس عمل کے لئے لازمی ہے"۔

"وزیر ہند کے حال کے اعلان میں جو منزل مقصود[2] معین کی گئی ہے اس تک رسائی دشوار ہوں

---

[1] یعنی برطانوی حکومت ہند کے عمال مصنف

[2] یعنی مانٹیگو چیمسفورڈ کی اصلاحات مذکورۂ بالا مصنف

کے ساتھ ہوگی۔ گو ہمارے سامنے مشکلات کا زمانہ ہے۔ لیکن ہندوستان میں ہمارا کام اس درجہ پر پہونچ گیا ہے جو ہماری روایات کے مطابق ہے یہ کام ایسا ہے جو ہمارے تاریخ کے اس دور کے شایاں ہے خواہ اسکی وجہ صرف یہی ہو کہ اس میں اپنا مٹانا منظور ہے"

مسٹر کرٹس کے آخری الفاظ اس امر کی پیشنگوئی کر رہے ہیں جو حقیقتاً نہ صرف ہندوستان میں بلکہ مشرق کے دیگر حصص میں بھی جاری ہے۔ جنگ عظیم نے مشرقی قوم پرستوں کے توقعات کو ایسا قوی اور یورپی اقتدار و قوت کو ایسا ضعیف کر دیا ہے کہ مشرق پر یورپ کا تسلط عام طور پر کم ہو رہا ہے۔ اس کا نتیجہ بُرا ہو یا اچھا لیکن بظاہر یہ ناگزیر ہے۔ ایک پشت یا ایک قرن کے بعد مشرق ادنے و وسطے کا بڑا حصہ خود مختار یا بالکل آزاد ہو جائے گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ آیا آزاد شدہ اقوام اپنے مواقع کا بُرا استعمال کر کے شخصی حکومت یا طوائف الملوکی میں مبتلا ہوں گے یا باقاعدہ اور ترقی کن اور دستوری حکومتیں قایم کرنے میں کامیاب ہوں گے ہمنے اس مسئلہ کے اطراف و جوانب کے مخالف و موافق پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے اور ہم اس مسئلہ کو اس حالت میں چھوڑتے ہیں جسطرح پر آجکل یہ عملی طور پر چھوڑا جاسکتا ہے یعنی اس کے بعد کیا ہوگا؟

سلسلہ لیونل کرٹس کے خطوط بنام باشندگان در بارہ حکومت ذمہ دار صفحہ ۱۵۹ و ۱۶۰ مطبوعہ لندن ۱۹۱۸ء مصنف

فصل پنجم

"قوم پرستی"

قوم پرستی کی روح عہد حاضرہ کے بڑے قوائے محرکہ میں سے ہے - یوروپ میں (جہاں یہ اولاً خود شناس بلوغ کو پہنچی) اس نے اُنیسویں صدی میں واضحات کی شکل کو بالکل بدل دیا - چنانچہ اس صدی کو اکثر "قوم پرستی کا عہد" کہتے ہیں - لیکن قومیت کا یہ احساس محض یوروپ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ دنیا کے بعید ترین گوشوں تک میں پھیل گیا ہے اور بظاہر اُس کے ذریعہ سے اہم تر انقلاب ہونا مقدر ہے -

ایسے اہم قسم کے ہیولی کو تسلیم کرنے کے بعد فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قوم پرستی کیا ہے ؟ عجیب بات یہ ہے کہ اس مسئلہ پر بے انتہا بحث ہوئی ہے - بہت سے اصول پیش کیے گئے جن میں مختلف طور پر یہ کوشش کی گئی کہ قوم پرستی کو زبان یا تمدن - نسل - سیاسیات - جغرافیہ - معیشت یا مذہب سے تعبیر کیا جائے - ممکن ہے کہ یہ اور نیز دیگر امور قومی احساس کے تعمیر کے اجزائے ترکیبی یا اسباب حمایت ہوں لیکن بنتیجہ تحلیل میں قومیت اپنی اجزائے ترکیبی سے کچھ برتر اور بہتر شے ہے جو ان اجزائے ترکیبی سے ایک جدید اور رفیع تر مرکب بناتی ہے - باوجود اُن تمام دلائل کے جو اس کے صحیح معنوں کے متعلق پیش کیے گئے ہیں قومیت فی نفسہ کوئی معما یا راز سربستہ نہیں ہے - امر واقعہ یہ ہے کہ قومیت ایک دماغی کیفیت ہے اور بہت بڑی تعداد افراد کے اس عقیدہ کا نام ہی کہ اُن سے ایک قوم بنتی ہے یعنی حیثیت القوم باہمی تعلق کا احساس ہے - یہ "قوم" جس طور سے اپنے معتقدین کے ادراک میں متصور

ہوتی ہے وہ ایک آبادی یا جماعت ہے جو ایک حکومت کے ماتحت آپس میں مجتمع اور منضبط ہیں اور ایک جداگانہ قطعہ ارض میں ملکر رہتی ہیں۔ جب قومی نصب العین حاصل ہو جاتا ہے تو ماحصل یا سی جماعت یا "سلطنت" کہلاتا ہے۔ ہم کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ "سلطنت" ایک ایسے نصب العین کا مادّی اظہار ہے جو ممکن ہے پشتہا پشت سے محض ایک نیک آرزو کی حیثیت سے موجود ہو لیکن اُس کی ظاہری صفات مثلاً شاہی حکومت یا ارضی سرحدیں موجود نہوں۔ بالعکس ہمکو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر سلطنت ایک قوم ہو چنانچہ ہیپسبرگ[۱] خاندان کی مردہ سلطنت آسٹریا ہنگری اس پر شاہد ہے۔ یہ سلطنت متضاد قومیتوں کا اجتماع تھی جو جنگ کے تصادم سے پاش پاش ہو گئی۔

۱؎ ہیپسبرگ یا ہیبسبرگ - امرار جرمنی میں سے ایک خاندان کا نام وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ۱۰۲۰ء میں جو قلعہ دریائے آر کے کنارے ہیبسبرگ کا بنا اُس کے مالک تھے روڈلاف آف ہیپسبرگ ۱۲۷۳ء میں مقدس رومی شہنشاہ ہوا اور اُس نے تیرھویں صدی میں آسٹریا حاصل کی۔ اُس کی اولاد بھی مختلف اوقات میں شہنشاہ رہی اور ۱۴۳۸ء سے متواتر اسی خاندان میں شہنشاہ کا خطاب رہا۔ لیکن اس خاندان نے الحاق ممالک میں بڑی شہرت حاصل کی۔ چونکہ توریث میں ملک تقسیم ہو جاتا تھا لہٰذا کبھی کبھی یہ خاندان کمزور ہو جاتا تھا لیکن فریڈرک سوم اور میکسمیلین کے عہد میں متحد ہو گیا ۱۴۷۷ء میں برگنڈی کے شمول سے یہ بڑی یوروپی سلطنت ہو گئی۔ شارل پنجم کے زمانہ میں اسپین بھی شامل سلطنت ہو گیا لیکن جب اُس نے سلطنت ترک کی تو اسپین اُس کے لڑکے کو اور آسٹریا اُس کے بھائی فرڈیننڈ کو ملا۔ اسپین کا سلسلہ نسل ختم ہو گیا اور شاہ آسٹریا نے وراثت کا دعویٰ کیا لیکن فرانس سے جنگ ہونے کی وجہ سے اسپین کا تخت نشین خاندان بوربون سے ہوا ۱۷۴۰ء میں آسٹریا کی خاندان کا مخصوص سلسلہ ذکور ختم ہو گیا اور شارل ششم کی لڑکی میریا تھریسا وارث ہوئی اسکی شادی فرینسس والی لورین سے ہوئی جو ۱۷۴۵ء میں شہنشاہ ہوا۔ اس وقت سے ۱۸۰۶ء تک اس خاندان میں مقدس رومی شہنشاہ رہے اور ۱۹۱۸ء تک آسٹریا کے شہنشاہ رہے۔ مترجم

گزشتہ جنگ قوم پرستانہ صور کے لیے بالخصوص جہاں تک اُن کا یورپ پر اطلاق ہوتا ہے ایک نہایت اچھا سبق تھی جس سے قومیت کی بابت بہت سی غلط فہمیاں رفع ہوگئیں۔ اس کی بابت سوئٹزرلینڈ کی مثال کو نقل کردینا کافی ہے۔ یہ ایسا ملک ہے جس کی ہستی ہی ایسے معیاروں کا ابطال کرتی ہے جیسے زبان۔ تمدن۔ مذہب یا جغرافیہ اور اس پر بھی اس کا قومی احساس اس ہنگامہ رستخیز کے سخت امتحان میں کامیاب ہوا۔

ان امور کا عوام کو ایسا کافی علم ہے کہ یہاں پر صرف ایک ہی بات پر زور دینا کافی ہے یعنی قومیت اور نسل میں کیا فرق ہے؟ بدقسمتی سے ان دونوں اصطلاحات کا اگر بطور مرادف کے نہیں تو نہایت لاپروائی سے استعمال کیا گیا ہے اور موجودہ تخیّل میں ہنوز اس بارہ میں بہت ابتری ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ان اصطلاحات سے بالکل مختلف امور مراد ہیں۔ قومیت ایک ذہنی ادراک یا دماغی کیفیت ہے۔ نسل ایک جسمانی واقعہ ہے جس کی صحیح تحقیق علمی آزمایش سے ہوسکتی ہے مثلاً کاسۂ سر کی پیمایش۔ بالوں کی ساخت اور آنکھوں اور کھال کا رنگ۔ بہ الفاظ دیگر انسانوں کی جو کیفیت جسمانی ساخت کے لحاظ سے ہے اُسے "نسل" کہتے ہیں اور جماعت جو کچھ اپنے آپ کو سیاسی طور پر سمجھتی ہے اُسے "قومیت" کہتے ہیں۔

اسی موقع پر ہم کو ایک نہایت بعید از فہم مسئلہ سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نسل اور قوم میں نسل زیادہ اصلی اور فی الجملہ اہم تر شئے ہے۔ ہر شخص کی جبلّی قابلیت بظاہر اُس کے موروثی اوصاف پر مبنی ہے اور اُس کا ماحول کتنا ہی جوش انگیز کیوں نہ ہو لیکن اُس کی پیدایش ہی پر اس ماحول سے اُس کے نظائر عمل کے امکانی حدود مقرر ہوجاتے ہیں۔ بااین ہمہ واقعہ یہ ہے کہ عام طور پر

نسل کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے درانحالیکہ قومیت اُن کی روح تک کو متحرک کر دیتی ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابھی نصف صدی کا ہی عرصہ ہوا ہے کہ علماء کو نسل کی اہمیت اور حقیقی فطرت کا احساس ہوا۔ جب کوئی خیال علمی طور پر مسلمہ بھی ہو جاتا ہے تب بھی اس کے قبولِ عام میں بڑا عرصہ لگتا ہے اور اُس پر عمل اُس وقت ہی ہو سکتا ہے جب وہ عام طور پر مقبول ہو جائے۔ اس زمانہ میں قومیت کا نہایت قدیم خیال عوام کے ادراک میں سرایت کر گیا ہے اور اسی وجہ سے اُس نے نمایاں نتائج پیدا کئے۔ مختصر یہ ہے کہ ہماری سیاسی زندگی میں ہنوز نسل کے مقابلہ میں قومیت کا اثر غالب ہے۔ اور عملی سیاسیات اشخاص کی اصلی ہستی کی بجائے اُن کی خیالی ہستی سے وابستہ ہیں۔

گزشتہ جنگ اُس کی نہایت موزوں مثال ہے۔ عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ لڑائی "نسل" کی لڑائی تھی اس خیال نے فی الحقیقت لڑائی میں بہت کچھ سختی اور تلخی پیدا کر دی لیکن صحیح نسلی نقطۂ خیال سے اُس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ ماہرین علم تشریح اجسام نے ناقابل تردید طور پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ حجریہ[۱] قدیم کے پسماندگان اور چند نو وارد ایشیائیوں کے علاوہ یوروپ میں صرف تین فرقے آباد ہیں۔ (۱) گورے رنگ اور لمبے سر والی "شمالی" نسل (۲) اوسط رنگ اور گول سر والی "الپ" کی نسل اور (۳) سانولے رنگ اور لمبے سر والی "بحیرہ روم کی" نسل۔ یہ نسلیں

---

[۱] آثار قدیمہ کا باقاعدہ درس و تدریس انیسویں صدی میں شروع ہوئی اور علماء اسکینڈینیویا نے انسانی ترقی کے مختلف ادوار کو منقسم کر کے یہ کوشش کی اسکو صحیح علمی درجہ تک پہنچا دیں۔ ڈنمارک کے ماہر آثار قدیمہ نے جو تقسیم کی ہے وہ حسب ذیل ہے:۔ (۱) حجریہ قدیم جو تین ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ (۲) حجریہ جدید ۲۰۰۰ تا ۱۰۰۰ قبل مسیح (۳) قدیم برنجی عہد ۱۰۰۰ تا ۵۰۰ قبل مسیح (۴) جدید برنجی عہد ۵۰۰ قبل مسیح سے لیکر پیدائش مسیح تک (۵) جدید قدیم آہنی ۵۰ تا ۵۰۰ء (بقیہ نوٹ بصفحہ آئندہ)

ایسی منتشر اور مخلوط ہیں کہ ہر یوروپی قوم ان نسلوں میں سے کم از کم دو اور بعض تینوں نسلوں سے مرکب ہیں لہٰذا یوروپی جنگ صحیح معنی میں نسل کی لڑائی قطعاً نہ تھی بلکہ ایک ہی خون کے رشتہ داران قریبی کی خانہ جنگی تھی۔

اگرچہ اکثر تعلیم یافتہ یوروپی یہ باتیں ۱۹۱۴ء کی جنگ سے پہلے سے جانتے تھے لیکن اس سے ذرا بھی فرق نہ پڑا۔ وجہ یہ ہے کہ اکثر یوروپی اپنے آپ کو بالکل مختلف زمرۂ نسل کا جانتے ہیں اور اپنے آپکو "ٹیوٹن"[1] "لاطینی"[2] یا "سلافی"[3] یا "اینگلو سیکسن"[4] نسل کا سمجھتے ہیں۔ یہ امر بالکل غیر متعلق ہے کہ ان نام نہاد "نسلوں" کا کوئی وجود ہی نہیں ہے بلکہ فی الحقیقت زبان اور تمدن

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۹۴) (۶) حدیدیہ وسطی ۵۰۰ء لغایت ۱۰۰۰ء (۷) حدیدیہ جدید یا حجری قزاقوں کا زمانہ آٹھویں لغایت گیارھویں صدی۔ اس سے کوئی حقیقی تقسیم دہور منظور نہیں ہے بلکہ انسانی تہذیب کے مختلف مدارج دکھائے گئے ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ ممکن ہے کہ ایک ملک میں حجری عہد ہو اور دوسری میں برنجی۔

[1] ٹیوٹن۔ جرمنی کے قدیم باشندے بالخصوص وہ قبیلہ جو دریائے ایلب کے شمال میں رہتا تھا اور جس نے والس پر حملہ کیا۔ ماریس نے ۱۰۲ء قبل مسیح میں ان کو غارت کیا۔ عہد حاضرہ کی ٹیوٹنی اقوام کے تین فرقے ہیں اول باشندگان اسکینڈ نیویا جس میں ڈنمارک۔ سویڈن۔ ناروے۔ فنلینڈ اور آئس لینڈ کے باشندے شامل ہیں دوم جرمنی اقوام یعنی خاص جرمنی۔ اسٹریا و ہالینڈ کے باشندگان اور بلجیم اور سوئٹزرلینڈ کی آبادی کا کچھ حصہ شامل ہے۔ سوم اینگلو سیکسن جس میں اہالیان برطانیہ عظمیٰ اور اُس کی مستعمرات شامل ہیں۔

[2] لاطینی۔ قدیم لاطیم بالخصوص مدینۃ الکبری کے باشندے جن میں وہ نسلیں بھی شامل ہیں جو بوجہ زبان۔ نسل۔ یا تمدن کی لاطینی اقوام سے وابستہ ہیں۔ [3] سلافی۔ اور نسل کا ایک شعبہ ہے جن کی تعداد تقریباً ساڑھے ۱۲ کروڑ ہے انکی دو شاخیں یعنی مشرقی و مغربی ہیں۔ مشرقی شعبہ میں روسی بلغاری سرب کروٹ۔ اور کارنتھیا اور کارنیولا کے سلووِن شامل ہیں مغربی شعبہ میں اہالیان پولینڈ و بوہیمیا اور لوسٹی وینڈ ساکنان سیکسنی و پروشیا ہیں۔

کی تاریخی امتیازات ہیں جو صحیح سلسلۂ نسل کا خوب تقاطع کرتے ہیں۔ تمھارے یوروپ والے ذہنی طور پر اس کو سمجھتے ہوں لیکن جب تک یہ محض ذہنی جدت رہے گی اس کا کوئی نمایاں اثر عمل پہ نہ پڑے گا اپنے دل میں ہر شخص اپنے آپکو لاطینی سلافی ٹیوٹنی یا اینگلو سیکسن ہی سمجھے گا۔ کوئی شخص اپنے خون کی نسل کے لیے جنبش بھی نہ کرے گا لیکن اپنی مفروضہ نسل کے لیے جان دینے کو آمادہ ہو جائے گا۔ لمبے سر والے "شمالی" یا گول سر والے "باشندگان الپ" کے لیے کوئی ہاتھ ہلانا یا کوڑی خرچ کرنا نہیں چاہتا لیکن "ٹیوٹن" اور "سلافی" کامیابی کے لیے جان و مال قربان کرنے کو تیار ہیں۔ بہ الفاظ دیگر اس سے یہ مراد ہے کہ یہ بیکار ہے کہ درحقیقت ہم کیا ہیں اصل چیز یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے یوروپ میں خیالی نسل کی یہ با اقتداری اور خونی نسل کی یہ لاچاری نظر اول میں حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے متعدد اسباب ہیں قومیتِ موجودہ یوروپ کی بڑی قوتِ محرکہ ہی نہیں ہے بلکہ اُس نے نوزائیدہ نسلی ادراک کو بھی مسخر کر کے اپنی اغراض کے مطابق بنا لیا ہے۔ زمانہ حال تک "قومیت" ایک نمایاں ذہنی ادراک تھا جس سے تمدن و زبان و تاریخی ماضی کی تقریباً مطابقت مراد تھی۔ یہ یوروپی تنگ خیالی کا منطقی نتیجہ تھی۔ بلاشبہ یہ مزید تنگ نظری سے پیدا ہوئی جواز منہ مظلمہ میں ارضی و جنگی و زبانی وفاداری تک محدود تھی۔ لیکن اُنیسویں صدی کے اول حصہ میں یہ دائرۂ خیال وسعت پاکر براعظم یوروپ بلکہ دُنیا کے آخری تک محیط ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قومیت کا ابتدائی تصور

(بقیہ نوٹ صفحہ ۵) ؎۲ اینگلو سیکسن کا اُن ٹیوٹنی اقوام پر اطلاق ہوتا ہے جنھوں نے برطانیہ عظمےٰ کو فتح کیا۔ مصنّف

فوراً اطمینان بخش نہ رہا بلکہ اُس کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ اور اُس میں وہ سب اشخاص شامل ہو گئے جو ایک ہی زبان و تمدن و تاریخی روایات رکھتے تھے چاہے یہ اشخاص ایک دوسرے سے کیسے ہی متبائن کیوں نہوں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے جدید مصطلحات کی ضرورت تھی۔ اس کا حل جلد مل گیا اور وہ لفظ "نسل" تھا۔ بدیں وجہ ہم کو بہت سے "نسل" سے مرکب فقرے ملتے ہیں مثلاً "اتحاد بین الایمان" "اتحاد بین السلامی" وغیرہ وغیرہ۔ فی الحقیقت یہ نسل سے بالکل تعلق نہیں رکھتے۔ ان سے صرف موجودہ مفہوم قومیت کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن یوروپی اقوام اپنے قلبی عقیدۂ قومی کے جوش میں اس کے نسلی ہونے کی تصدیق و تقریر کرتے ہیں۔ لہذا عملی سیاسیات میں یہ نسلی ہی ہیں اور جبتک قوم پرستی کی قوت محرکہ قایم ہے یہ نسلی ہی رہیں گے۔

قومیت کی یہ جدید ترقی جس کو ہم "نسلی" درجہ کہتے ہیں اولاً یوروپی تمدن کے قدیم مراکز تک محدود تھی لیکن مغربی خیالات کی اشاعت کے ساتھ یہ غیر متوقع مقامات میں رونما ہوئی مثلاً بلقان میں اس کی رسائی نے وہ مجنونانہ تبلیغیں جو "اتحاد بین الیونانی" اور "اتحاد بین السروی" نہایت سرعت سے پیدا کر دیں جس نے اس بدقسمت ملک کو پہلے تو خرس کی آرام گاہ اور بعد میں شیاطین کا دارالشوریٰ بنا دیا۔

اسی اثناء میں اُنیسویں صدی کے آخری قرون میں قومیت کی ابتدائی صورت ایشیا میں جا پہنچی۔ "نوجوان ترکوں" اور "نوجوان مصریوں" کی تحریکات اور الجزائر و ایران و ہندوستان جیسے دور افتادہ ممالک میں قوم پرستی کی تحریک کا ہونا اس کی نمایاں علامتیں تھیں کہ ایشیا رہی قوم پرستی کی ابتدائی تکالیف میں مبتلا ہے۔ مزید برآں بیسویں صدی کی ابتدائی سنین میں متعدد آثار سے

یہ معلوم ہوا کہ بلقان کی طرح ایشیا میں بھی قوم پرستی کا دوسرا یا "نسلی" درجہ شروع ہو گیا۔ ان سنین میں بعید الاشاعت "جامعی" تحریکات پوری طور پر ہویدا ہونے لگیں مثلاً اتحاد بین التورانی و اتحاد بین العرب اور سب سے زیادہ حیرت انگیز معمہ یعنی اتحاد بین الاسلامی کی تحریکات پیدا ہوئیں۔

اوّل

اب ہم مشرق ادنیٰ و وسطیٰ میں قوم پرستی کے ظہور اور ترقی پر تبصرہ کرینگے۔ قوم پرستی کی تحریک نے اسلامی دنیا میں باستثنا ہندوستان جو کچھ نشو و نما اس وقت تک حاصل کیا ہے اُس کے بیان کے لیے موجودہ فصل کو وقف کرتے ہیں۔ ہندوستان کے لیے جداگانہ بحث کی ضرورت ہے کیونکہ وہاں قوم پرستی کی سرگرمیاں زیادہ تر غیر مسلم ہندو عنصر کا کام ہے۔ ہندوستانی قوم پرستی ایسے طریقے پر جاری ہوئی ہے جو اسلام کے طریقے سے بالکل مختلف ہے اور لہذا اُس پر فصل مابعد میں بحث کی جائے گی۔

قبل اس کے کہ اسلامی دنیا میں اُنیسویں صدی کا مغربی تصادم شروع ہوا اسلامی دنیا خود شناس قوم پرستی سے قطعاً معرا تھی۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں میں مقامی اور قبائلی وابستگی ضرور تھی نیز خاندانی احساس بھی موجود تھا جس کی مثال ترکوں کی وہ وفاداری ہے جو اُنہیں اپنی بادشاہوں یعنی سلاطین آل عثمان کے ساتھ تھی۔ اس کے ساتھ ہی نسلی افتخار کا بیّن ظہور بھی تھا جیسے کہ عربوں کا یہ تیقن کہ وہ "برگزیدہ قوم" ہیں۔ لاریب کہ یہ قوم پرستی کے زبردست عناصر تھے مگر ہنوز منتشر اور بے ربط تھے اور ہنوز خود شناس قومیت کی جدید رنگ میں رنگے نہ گئے تھے۔ اسلامی اقوام میں صرف ایک ہی قوم ایسی تھی

جس کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ اُن میں ایسی روح موجود تھی جسے کسی حد تک قوم پرستی کی صحیح روح کہا جا سکتا ہے - یہ قوم ایرانیوں کی تھی جن میں اپنے مرتفع ملک ایران کے ساتھ روائتی جذبہ محبت موجود تھا۔ اسلامی دنیا کی مختلف اقوام میں زیادہ سے زیادہ ابتدائی اور غیر مستقل قومی بیداری یعنی ایک مجہول اور غیر متحرک اتحادی روح موجود تھی جس میں شاید ترقی کی اہلیت ہو لیکن اس کا ابھی تک شاید بیرونی اشخاص کو علم اور یقیناً خود اُن کو احساس بھی نہ تھا۔

مزید براں اسلام خود چند لحاظ سے قومیت کا مخالف تھا۔ کلُ مومنٌ اخوۃٌ کا اسلامی مسئلہ اور امامت یا عام خدائی جمہوریت کا اسلامی سیاسی نصب العین خالص قومی اجادکی شہنشاہی کی استقامت کا قدرتی طور پر سدِّراہ ہوا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسی کہ یورپ کے نشأۃ ثانیہ کی نوزائیدہ اقوام کا تصادم از منہ متوسط کے نصب العین عالمگیر پاپائیت اور مقدس روحی سلطنت" سے ہوا تھا۔

ایسے ناموافق ماحول کے ہوتے ہوئے یہ تعجب انگیز نہیں معلوم ہوتا کہ انیسویں صدی کے پہلے نصف حصہ میں مسلمانوں میں میلان قوم پرستی مجہول اور منتشر طور پر پیدا ہوا۔ لیکن اسی صدی کے دوسرے نصف حصہ تک مغربی مفہوم کے مطابق "قومیت" کا صریح ادراک نہ ہو سکا۔ سید جمال الدین الافغانی کی تعلیم میں کھلے ہوئے قومی میلانات پائے جاتے ہیں۔ (اور یہی شخص اسلامی قومیت اور اتحاد بین الاسلامی کا سلسلہ ربط ہے) اور انیسویں صدی کے وسط میں جو ترکی مصلحین پیدا ہوئے ان پر قومیت کا ایسا ہی صریح اثر تھا جیسے دیگر مغربی خیالات کا۔ فی الحقیقت ترکی ہی ایسا ملک تھا جس میں سب سے پہلے قوم پرستی کا صحیح احساس پیدا ہوا۔ ترکی قوم پرستوں نے اُس قدیم خلوص سے جو ترکوں کو اپنے خاندان سے اور اُس افتخار قومی سے جو اُن کو متعدد عیسائی اور مسلمان محکوم اقوام پر حکمراں ہونے

کی بنیاد پر حاصل تھا فائدہ اُٹھا کر قوم پرستی کی تحریک کو نہایت سُرعت سے ترقی دی۔

یوروپ کی طرح ترکی میں بھی قوم پرستی کی تحریک تاریخی روایات کی احیاء اور زبان کی صفائی سے شروع ہوئی نصف صدی قبل عثمانی ترک اپنی اصل اور تاریخ سے بالکل نابلد تھے۔ اُن کو اپنے اجداد کے جنگی کارنامے اور اپنی سلطنت کے ولولہ انگیز واقعات محض قصص اور خواب وخیال کی طرح یاد تھے۔ اور وہ قومی تاریخ کے پڑھنے سے بالکل غافل تھے۔ دولت عثمانیہ کی فتوحات کے واقعات جو دنیا کے تین براعظموں سے تعلق رکھتے تھے عوام کے لیے ایسے دلچسپ نہ تھے جیسے کہ مذہبی مباحث یا آنحضرت صلعم کے حیات کا تذکرہ اور ابتدائی اسلام کے حالات۔ پیشوایان قوم پرستی نے اپنے ہموطنوں کو اُن کی تاریخی عظمت بتاکر گزشتہ پر افتخار اور آیندہ کے لیے اعتماد سکھایا۔

یہی حال ترکی زبان کا ہوا۔ ابتدائی قوم پرستوں کو اس کے دو مختلف شعبے ملے۔ ایک طرف تو "سرکاری" ترکی زبان تھی جو عربی اور فارسی کے فصیح اور بلیغ فقرات سے بری طرح مخلوط تھی۔ یہ غیر معمولی معجون مرکب اور ادق طرز عوام کی فہم سے بالاتر تھی۔ عوام میں عام ترکی زبان مروج تھی جس میں ابتدائی اور محدود محاورات تھے اور مقامی بول چال کے لحاظ سے اُس کی مختلف شاخیں تھیں۔ تعلیم یافتہ اشخاص اُس کو دہقانی اور غیر مہذب سمجھکر حقیر جانتے تھے قوم پرستوں نے اس سب کو بدل دیا۔ جوشیلی قوم پرستوں نے جو مغربی اصول قواعد اور علم اللغات سے واقف تھے ترکی زبان کی سادگی اور جامعیت کا احساس کرکے مغربی مفہوم کے مطابق اصلی ترکی زبان کی تدوین شروع کی۔ اُن کو اسمیں ایسی کامل کامیابی ہوئی کہ ایک ہی پشت میں ایک سادہ اور معنی خیز ترکی زبان عالم وجود میں آگئی جس کو نامہ نگاروں اور ادیبوں نے پُر اثر طور پر استعمال کیا اور ہر طبقہ

کے اشخاص سمجھنے لگے۔ اور وہ مسلمہ ذریعۂ اداۓ خیال اور طرزِ تحریر بن گئی[۵۱]۔

بلاشبہ ترکی قوم پرستی کی خاص محرک مغربی سیاسی لتنذی ہی تھی۔ عوام کو جس قدر وطن کی محبت اور اُس کے مستقبل سے توقعات پیدا ہوئیں اُسی قدر ترکی ممالک پر یورپی حملوں نے اُن کو اپنی آزادی کی حفاظت کے لیے جو معرضِ خطر میں تھی آمادہ کر دیا۔ قوم پرستوں کا نصب العین "عثمانیت" یعنی ایک ایسی حقیقی "قوم" کو متحد کرنا تھا جس میں تمام باشندگان بلالحاظ نسل و مذہب "عثمانی" ہوں ترکی زبان بولیں اور عثمانی حبِ وطن کی روح سے زندہ ہوں۔ مگر اس کا تصادم اُس رقیب اور دیرینہ تر قومیت سے ہوا جو سلطنت کے عیسائی اقوام میں پیدا ہو چکی تھی۔ اسی زمانہ میں جو جدید عرب قوم پرستی متشکل ہو رہی تھی اُس کا تصادم نا قابلِ ذکر ہے ترکی قوم پرستی کی تحریک کو سلطان عبد الحمید نے نظرِ عتاب سے دیکھا۔ سلطان موصوف کو کلّ قومی تحریکات سے طبعاً نفرت تھی کیونکہ اُن سے اُن کے اختیارات محدود ہوئے جاتے تھے اور اتحاد بین الاسلامی کی اُس عام تحریک کی مخالفت لازم آتی تھی جس پر اُن کی حکمتِ عملی مبنی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ترکی قوم پرست بھی جو کامل وفاداری کا اعلان کرتے تھے مشتبہ سمجھے گئے اور حریت پسند اشخاص پر یہاں تک جبر و ظلم ہوئے کہ وہ بالآخر ترکِ وطن پر مجبور ہوئے۔

مگر ۱۹۰۸ء کے انقلاب نے قوم پرستی کو برسرِ اقتدار کر دیا نوجوان ترکوں میں دیگر امور کی بابت کتنا ہی تخالف کیوں نہ ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ سب سرگرم قوم پرست

---

[۵۱] ترکی قوم پرستی کی ان ابتدائی منازل کے لیے ملاحظہ ہو وامبیری کی کتاب "موجودہ اور چالیس سال قبل کی ترکی" اور نیز اُس کی کتاب "مشرقی ممالک میں مغربی تمدن"۔ نیز لادیذ اور ورامبوس میں لیون کاہون کے مضامین متذکرہ بالا اور ایل روزو کی کتاب "عثمانی مساعی" مطبوعہ پیرس سنہ ۱۹۰۶ء۔ مصنف

تھے۔ فی الواقع اُن کا جوش قومیت ہی اُن کے مصائب مابعد کا باعث اول تھا۔ نوجوان ترکوں نے مجنونانہ جوش سے کل ملک کو "عثمانی" بنانے کی کوشش کی۔ اس سے دیگر اقوام ناراض ہو کر انقلاب کے مخالف ہوگئیں اور سنہ ۱۹۱۲ء میں عیسائی بلقانی ریاستوں کو تباہ حال ترکی پر حملہ کرنیکا موقع مل گیا۔

نفس الامر یہ ہے کہ ترکی قوم پرستی ایسی روش پر ترقی کر رہی تھی جس کا صرف یہی نتیجہ ہو سکتا تھا کہ ایک طرف ترکی اور دوسری طرف غیر ترکی (جس میں خواہ مسلمان ہوں خواہ عیسائی) جماعات میں مخالفت بڑھی۔ ترکی قوم پرستی فی الواقع اس وقت "دوسری" یعنی "نسلی" منزل پر پہنچ گئی تھی۔ ترکی قوم پرستی نے "عثمانیت" کی محدود و ارضی خیال کی حدود سے گزر کر اُن دور اُفتادہ اور نسلی تصورات کو قبول کر لیا تھا جو "اتحاد بین الاتراک" اور "اتحاد بین التورانی" کہلاتے ہیں۔ ہم ان وسیع ترقیوں پر اسی باب میں بعد کو غور کرینگے۔ اس سے قبل ہمیں دنیائے اسلام کے دیگر حصص کی قومیت کی "پہلی منزل" کے آغاز پر تنقید کرنا چاہیے۔

عثمانی ترکوں میں قوم پرستی کی علامات ظاہر ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد اسی قسم کے آثار عربوں میں بھی نمودار ہونے لگے جیسا کہ ہر خود شناس قومی تحریک میں ہوتا ہے یہ تحریک بھی زیادہ تر کسی دوسری جماعت کے خلاف احتجاج تھی۔ عربوں کی تحریک میں یہ احتجاج قدرتی طور پر اُن کے ترکی حکمرانوں کے خلاف تھا۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ عرب کے ریگستان یعنی نجد نے کس طرح اپنی آزادی کو ہمیشہ قائم رکھا اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ وہ عرب ممالک یعنی شام و عراق و حجاز جو ترکی حکومت کے تحت میں تھے اس امر سے کیسے متنفر تھے کہ اسلام کی "برگزیدہ قوم" ایک ایسی قوم کے ماتحت ہوں جو عربوں کی نظر میں نو دولت وحشی تھے۔ باوجودیکہ ترک ہزار سال سے صاحب اقتدار تھے لیکن یہ دونوں اتفاق سے نہ رہ سکیں۔ اُن کی نسلی طبائع

ایسے مختلف تھے کہ اُن میں ارتباط ناممکن تھا۔ عربوں اور ترکوں کی ناموافقت کا ایک فرانسیسی مصنف نے خوب خلاصہ کیا ہے۔ ڈاکٹر بیرارڈ کہتا ہے "یہ دو زبانیں اور یہ دو قومیں ایسی ہیں۔ ترک خواہ وہ ادرنہ کا ہو یا عدالیہ کا۔ روم کے عرض البلد میں رہتا ہو یا الجزائر کے عرض البلد میں آخر شمالی اور انتہائی شمالی ہی ہے۔ اور عرب ہر مرز بوم میں جنوبی اور انتہائی جنوبی ہے۔ عرب کی چستی و تیزی و تخئیل فنون لطیفہ کا مذاق۔ صحیح وجمہوری میلانات اور فتنہ انگیز تشخص کے مقابلہ میں ترک اپنی سستی و سنجیدگی اور حسیات انضباط و انتظام کا احساس اور پیدایشی حربیت کا اظہار کرتا ہے۔ ترکی آقا ہمیشہ سے "جدت طراز دہقان" سے نفرت کرتا ہے جس کی وضع و حرکات و سکنات اور بیقاعدگی سے ترک کو سخت صدمہ ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے عربوں کی نظر میں ترک محض ایک احمق۔ اُس کی طمانیت و خاموشی محض حماقت و جہالت۔ اُس کا احترام قانون محض غلامانہ انقیاد اور اُس کا مادی خوشحالی کا شوق محض بہیمیت ہے۔ فنون لطیفہ میں ترکوں کی ناقابلیت کا عرب بڑا مذاق اُڑاتے ہیں۔ چینیوں اور ایرانیوں اور عربوں اور یونانیوں سے درس لینے پر بھی ترک عربوں کی نظر میں بارک اور کھلیان کا احمق ہی دکھائی دیتا ہے۔[1]

اس پر طرہ یہ ہے کہ عرب ترکوں کو مذہب اسلام کا مخرب سمجھتے ہیں اور ہمکو اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے کہ ترکی کی عرب رعایا نے ہمیشہ باغیانہ شورش کی علامات ظاہر کیں۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ وہابی تحریک خاص طور پر مقامات مقدسہ پر ترکی تفوق کے خلاف تھی۔ باوجودیکہ وہابیوں کو شکست ہوئی لیکن عرب شورش باقی رہی۔ سنہ ۱۸۲۰ء کے قریب جرمن متفحص برکھارڈٹ نے عربستان کی بابت لکھا تھا "جب

---

[1] بیرارڈ کی کتاب "سلطان و اسلام اور دول عظمی" صفحہ ۱۶ مطبوعہ پیرس سنہ ۱۹۰۷ء۔ مصنف

حجاز میں ترکی اقتدار کا زوال ہوگا تو عرب اپنی محکومیت کا بدلہ لیں گے"۔[۵۱] تقریباً بیس سال بعد شریف مکّہ نے ایک فرانسیسی سیاح سے کہا "ہمیں جو رسول خدا صلعم کی اولاد ہیں اپنے سروں کو کمبخت پاشاؤں کے سامنے جھکانا پڑتا ہے۔ ان پاشاؤں میں سے اکثر پہلے عیسائی غلام تھے جنھوں نے نہایت شرمناک طریقوں سے عروج پایا ہے"[۵۲] اُنیسویں صدی میں یورپ میں ترکی کو جو شکست ہوئی اُس کے بعد عرب صوبوں میں لازمی طور پر مغویانہ ہنگامہ ہوا۔

اُنیسویں صدی کے وسط تک یہ مغویانہ شورشیں مذہبی یا قبائلی یا مقامی احساسات کے منتشر اور بے ربط ہنگامے تھے جن میں کوئی صحیح "قوم پرستانہ" نظام عمل یا نصب العین نہ تھا۔ لیکن سنہ ۱۸۷۰ء کے قریب ایک حقیقی قوم پرستی کی شورش اُٹھی۔ اس شورش کی پیدائش شام میں ہوئی۔ یہ امر بالکل ہی امید کے موافق تھا کیونکہ ترکی کے عرب ممالک کا شام ہی ایسا حصہ تھا جو مغربی اثرات سے مستفیض تھا۔ یہ پہلی قومی عرب تحریک کچھ اہم نہ تھی۔ چونکہ اس کے کارکن شور مچانے والے فتنہ انگیز اور ناقابل اشخاص تھے لہذا ترکی حکومت نے اس کو بآسانی فرو کر دیا۔

سنہ ۱۸۷۷ء کی تباہ کن روسی جنگ نے ان سلگتی ہوئی چنگاریوں کو پھر مشتعل کر دیا۔ چند سال تک ترکی کے عرب صوبے سخت فتنہ و فساد میں مبتلا رہے۔ قوم پرستوں نے علانیہ طور پر کہا کہ ترکی کے طوق غلامی کو اُتار ڈالا جائے اور عرب ممالک کو ایسی جماعت میں منسلک کیا جائے جس کا سرگروہ ایک مذہبی

---

[۵۱] ہیرارڈ نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۹ پر نقل کیا ہے۔ مصنف

[۵۲] ہیرارڈ نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۰ پر نقل کیا ہے۔ مصنف

با اختیار غالباً شریف مکہ[۵۱] ہو - دراصل اس کا منشاء یہ تھا کہ مغربی قوم پرستی کو ایک

۵۱؎ اس عرب آرزومندی کی تعبیر و تکمیل جنگ عظیم میں ہوگئی - عرب صوبوں نے ترکی طوق غلامی کو اتار
ڈالا اور عرب ممالک کے حصے بخرے بھی ہو گئے لیکن اس سوال کا جواب ابھی تک اثبات میں نہیں دیا
جا سکتا کہ کیا اُن کو اپنے نصب العین کے حصول میں کامیابی ہوئی - اس ناکامیابی کی وجہ پر غور کرنا اور
اُس کی اصلیت کو دریافت کرنا ہی موجودہ مشرق کی نجات کی کلید ہے - یہی وہ سحر - طلسم یا اسم اعظم
ہے جس سے ہماری آیندہ بہبودی و فلاح وابستہ ہیں - یہ صحیح ہے کہ ترک ہی عربوں کی فاتح اور بالآخر
حکمراں ہوئے ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد عربوں نے جو ترکوں کو قیام دستوریت میں امداد دی اُس کا
یہ صلہ نہ تھا کہ اُن کو آزادی ہی سے محروم نہ رکھا بلکہ پارلیمنٹ میں اُن کے نمایندوں کی تعداد بھی گھٹا دی
تاکہ وہ کبھی بھی بااثر ہو کر اپنی آرزو کو پورا نہ کر سکیں - علاوہ ازیں آزادی بذات خود ایسی دلفریب شے ہے
جس کے حصول کے لیے عرب جیسی قوم جس کی روایات روح حریت سے مالا مال اور جس کا ماضی عظمت
و جبروت و تہذیب کی بہترین مثال ہے جو کچھ کرے کم ہے - پھر دربار رسالت سے خلیفہ کے لیے
قریشی ہونے کی تخصیص یہ ایسے امور تھے جن سے عربوں میں لازمی طور پر حریت کی خواہش پیدا ہوتی -
لیکن آرزو اور اُس کے حصول میں بڑا فرق ہے ؎

جب کرے قصد کسی کام کا کوئی انساں | پہلے سوچے کہ وہ اُس کام کے ہے بھی شایاں

عہد حاضرہ میں مغربی جوع الارض کی وجہ سے سب سے مقدم یہ امر ہے کہ آیا بعد حصول آزادی ہم اُس کو یورپی
دول کے مقابلہ میں قایم رکھ سکتے ہیں آیا ہم میں حکومت خود اختیاری کی صلاحیت اور اہلیت بھی پیدا ہوئی
یا نہیں مثلاً کسی مشرقی ملک کو محض اپنے تحفظ کے لیے جو صرف کثیر سامان حرب و جہازوں وغیرہ پر کرنا پڑیگا
اُس کے لیے ضروری ہے کہ ملک کی اقتصادی حالت کو ایسا رفیع کیا جائے کہ وہ ان مصارف کا متحمل ہو سکے
اس میں ملک کے قدرتی ذرایع صنعت و حرفت و تجارت و تعلیم وغیرہ میں ترقی مشتمل ہے - عربوں نے اس طرف
توجہ نہ کی اور محض آزادی کے دلدادہ ہو کر دوسروں کے آلہ کار بن گئے نتیجہ یہ ہو کہ وہ (بقیہ نوٹ بصفحہ آیندہ)

خدائی جمہوریت کے قدیم عرب نصب العین کے مطابق بنایا جاوے جس کی تکمیل پکی خلافت اور نجد کی وہابی حکومت کی صورت میں پہلے ہی ہو چکی تھی۔

عرب قوم پرستی کی یہ دوسری شورش بھی دیرپا نہ تھی۔ اس وقت ترکی میں سلطان عبدالحمید حکمران تھے اور عبدالحمید کے اتحاد بین الاسلامی کی حکمت عملی کا مقصد یہ تھا کہ عرب رعایا سے اچھے تعلقات پیدا کئے جائیں۔ لہذا عربوں کا قسطنطنیہ میں خیر مقدم کیا گیا اور عرب شیوخ و مشاہیر مورد عنایات ہوئے۔ اور اسی کے ساتھ سلطنت کے عرب صوبوں میں امن و امان پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسی زمانے میں شام اور حجاز میں فوجی ریل کی تعمیر سے ترکی حکومت کو اپنے عرب ممالک پر بیش از بیش

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۰۱) حصہ عرب یعنی حجاز جس پر عربی حکومت کے قیام پر شادیانے بج رہے ہیں جن مصائب میں گرفتار ہے وہ اظہر من الشمس ہے اس کے ذرائع آمدنی اسقدر کم ہیں کہ وہ نہ تو موجودہ مفہوم کے مطابق کوئی آزاد سلطنت قائم کرسکتا ہے اور نہ امن و امان۔ گویہ نکبت و فلاکت ہی موجودہ آزادی کا سبب اول ہے اگر حجاز بھی شام کی طرح زرخیز ہوتا تو اس میں بھی جنرل گوروو کی "زبردست تدابیر" رائج ہوتیں۔ حجاز کی موجودہ آزادی بالکل موہوم ہے اور اس کو سلطان مسقط و عمان کی طرح ایک محافظ کی ضرورت ہے۔ حجاز میں تو یہ نام نہاد آزادی ہی ہے لیکن شام کی حالت تو بالکل ہی خسر الدنیا والاخرۃ کا مصداق ہے نہ اس کو آزادی نصیب ہوئی اور نہ امن۔ یہ سب کچھ محض مغربی قوم پرستی کے نصب العین کی متابعت کی وجہ سے ہے اس امر میں مغربی فلسفہ نہایت متضاد ہے ایک طرف تو میکی اول کے فلسفہ اور اس کی کتاب بنام شہزادہ کو پیش کرکے اخوت اسلامی یا اتحاد بین الاسلامی کا مذاق اڑایا جاتا ہے اسی کے برخلاف شہنشاہیت کے فوائد بتا کر اس کا جدید فلسفہ پیدا کیا جاتا ہے اور اقوام محکوم کو اخوت عام کا دلدادہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے مسلمانوں کو ان ارضی اور مادی اخوتوں سے برتر رکھنے کی تعلیم دی گئی ہے ہمارا نصب العین ہماری اخوت مکان اور زمان سے اعلی ہے اور اسی کی تکمیل کی (بقیہ نوٹ بصفحہ آیندہ)

قابو حاصل ہوگیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب بغاوت کی کامیابی کا امکان بہت بعید ہوگیا۔ مزید برآں سلطان عبدالحمید کے تبلیغ اتحاد بین الاسلامی کا خاص منشا یہ تھا کہ مسیحی مغرب کے خلاف عرب اور ترکوں کے درمیان اسلامی استحکام کا خیال پیدا کیا جائے۔ ان مساعی میں ایک درجہ تک کامیابی ہوئی۔ مشرق ادنیٰ میں ہر مغربی تعدی سے عرب اور ترکوں کو یہ سبق ملتا تھا کہ وہ عام دشمن کے مقابلہ کے لیے اپنے خانگی نزاعات کو فراموش یا کم از کم ملتوی کر دیں۔

سلطان عبدالحمید کو اگرچہ اپنی مساعی میں جزوی کامیابی ہوئی لیکن عرب رعایا کا بڑا حصہ ناراض رہا اور انیسویں صدی کے اختتام پر عرب قوم پرستی کی شورش از سر نو پیدا ہوئی۔ ترکی عمال کی بے رحمانہ جبر و استبداد کی وجہ سے غیر مطمئن عرب قوم پرست جو اکثر شامی تھے ترک وطن کر گئے۔ ان جلاوطنوں نے مصر جیسے قریب مقام (جو اب برطانوی مقابضت میں تھا) اور مغربی یوروپ میں جمع ہو کر ایک انقلابی تبلیغ کا نظام قایم کیا۔ اُن کی باضابطہ تنظیم ۱۸۹۵ء سے شروع ہوتی ہے جبکہ " عربی قومی جماعت " پیرس میں قائم کی گئی۔ ایک عرصہ تک اُن کی تبلیغ غیر معروف طور پر جاری لیکن بظاہر معقول اثر پیدا کرتی رہی کیونکہ ۱۹۰۵ء میں صوبجات حجاز اور یمن میں بغاوت ہوئی۔ یہ بغاوت ترکی حکومت کی بہترین مساعی کے باوجود کلیتاً فرو نہ ہوئی بلکہ سال بسال جاری رہی جس سے ترکی خزانہ اور افواج پر بڑا بار پڑا اور اسی کی بدولت ۱۹۱۱و۱۲ء میں طرابلس اور بلقان کے مصائب رونما ہوئے۔

۱۹۰۵ء کی عرب بغاوت سے " مسئلہ عرب پر " کل دنیا کی نظریں پڑنے لگیں

بقیہ نوٹ صفحہ ۱۶) کوشش کرنا چاہیے تاکہ ہم قعر مذلت سے نکلکر اُس درجہ پر فائز ہوں جس کیلئے خلق ہوئے ہیں۔ مترجم

اور جلا وطن قوم پرستوں نے اپنی مساعی کو وطن اور مغرب میں دو بالا کرکے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔ "نوجوان عرب" کی شکایات اور توقعات سے یوروپ بخوبی واقف ہو گیا بالخصوص ایک عرب قوم پرست لیڈر نے ایک کتاب الموسوم بہ عرب قوم کی بیداری[۱] نہایت خوبی سے لکھی جس نے خاص جوش پیدا کر دیا۔ عرب قوم پرستوں کے مقاصد بالوضاحت اُس اعلان میں درج ہیں جو عربی قومی جماعت نے دول عظمیٰ کو مخاطب کرکے ۱۹۰۶ء میں شائع کیا۔ اس اعلان میں تحریر ہے "ترکی میں یا امن انقلاب بہت جلد ہونے والا ہے۔ اہل عرب جن کو ترکوں نے غیر ضروری مسائل دین اور معاملات رسوم پر متفرق کرکے نشانہ ظلم بنا یا ہے اپنی قومی اور تاریخی اور نسلی یکجہتی سے واقف ہو گئے ہیں اور بوسیدہ عثمانی تنہ سے جدا ہو کر خود اپنی آزاد سلطنت قایم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جدید عرب سلطنت اپنی قدرتی حدود میں یعنی دجلہ و فرات کی وادیوں سے لیکر ابنا سویز تک اور بحیرہ روم سے لیکر بحیرہ عمان تک وسعت پذیر ہوگی اور اس پر ایک عربی سلطان کی آزاد اور دستوری حکمرانی ہوگی۔ موجودہ ولایت حجاز و علاقہ مدینہ طیبہ ایک آزاد سلطنت ہوگی جس کا حکمراں کل مسلمانوں کا مذہبی خلیفہ بھی ہوگا۔ اس طور سے ایک بڑا عقدہ یعنی اسلام میں مذہبی اور ملکی اختیارات کی علیحدگی کا مسئلہ حل ہو جائیگا جس سے سب کا نفع متصور ہے"۔

اس جماعت نے اپنے ہم قوم عربوں کے لیے حسب ذیل اعلان شائع کیا "عزیز ہموطنو! ہم سب اس سے بخوبی واقف ہیں کہ عرب کے باشندے کا با عظمت اور معروف لقب فی زمانہ کل اجانب خصوصاً ترکوں کی زبانوں پر کیسا ذلیل اور حقیر ہو گیا ہے۔ ہم سب دیکھتے ہیں کہ ان ایشیاء متوسط سے آنے والے بربریوں کے جبر و ظلم سے

---

[۱] مصنفہ نجیب آذری مطبوعہ پیرس ۱۹۰۵ء مصنف

ہم کیسے نکبت وجہالت میں مبتلا ہیں۔ ہمارا ملک جو روئے زمین کا بہترین اور زرخیز
ترین حصّہ ہے آج بالکل بیابان ویرانہ ہے۔ جب ہم آزاد تھے تو ہم نے دنیا کو سو سال
میں فتح کر لیا۔ ہم نے ہر جگہ علوم وفنون وادب کی اشاعت کی۔ اور صدیوں تک
ہم ہی دنیا کے امام تمدن رہے لیکن جب سے ارطغرل[1] کی ذریت نے خلافت
اسلامیہ کو غصب کیا اُنھوں نے ہمیں لوٹنے کے لیے ایسا حقیر وحشی بنایا ہے کہ ہم دنیا
کی مفلس ترین قوم ہوگئے[2]" زاں بعد عرب آزادی کا اعلان ہے۔

بلاشبہ "نوجوان عرب" اس وقت آزاد نہ ہوا۔ بغاوت محض مقامی ہی
اور ترکی نے اکثر ولایات عرب پر اپنا تسلط قایم رکھا۔ تاہم شورش برابر جاری رہی۔
سلطان عبدالحمید کے آخر عہد میں اُن کی عرب ولایات میں ایک قسم کا ناپایدار توازن
تھا یعنی قوم پرستی کے مغویانہ خیالات ایکطرف اور اتحاد بین الاسلامی اور یوروپی
مخالفت کے جذبات دوسری طرف عمل پیرا تھے۔

سنہ ۱۹۰۸ء میں نوجوان ترکوں کے انقلاب نے ان حالات میں جدید نوعیت

---

[1] سلطنت عثمانی کا نیم فرضی بانی (مصنف) صاحب تاریخ الدہور اس کو ارطغل لکھتا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے بلکہ ارطغرل صحیح ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ارطغرل کا باپ سلیمان نواح خوارزم سے علاء الدین سلجوقی کی خدمت میں سنہ ۱۲۳۱ء میں آیا اور جزیرہ خزر کے قریب بیرہ کا حاکم ہوا۔ اُس کی وفات کے بعد اُس کا لڑکا ارطغرل ہر غونیہ میں آیا اور ۲۵ سال تک وہاں امیر رہا۔ سنہ ۱۲۹۶ء میں فوت ہوا۔ اُس کا لڑکا عثمان خاں غازی دولت عثمانیہ کا بانی ہے (مترجم)

[2] ان دونوں تحریرات کا کل اصل مضمون بآسانی ای ہنگ کی کتاب "عرب بغاوت [illegible] خلافت قوینں یعنی عالم فردا کا خطرہ" کے صفحہ ۲۳ لغایت ۲۵ پر مل سکتا ہے (مطبوعہ پیرس سنہ ۱۹۰۶ء) مصنف

پیدا کر دی۔ عرب صوبوں نے دیگر حصص سلطنت کی طرح مطلق العنانی کے زوال پر خوشی منائی اور آیندہ کے لیے بہت کچھ امیدیں باندھیں۔ ترکی پارلیمنٹ میں عرب صوبوں کے بہت سے نمایندے تھے اور اُنھوں نے یہ مطالبہ کیا کہ معاہد ریاستوں کی خود مختاری کے لیے تدابیر عمل میں لائی جائیں۔ اُس کو نوجوان ترکوں نے جو "عثمانیت" پر تُلے ہوئے تھے قطعی نامنظور کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عرب صوبجات کی آنکھیں کُھل گئیں اور تجزیہ کی شورش پھر شروع ہو گئی۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ جدید آزادی کی شورش کا نظام عمل چند سال قبل کے نظام کار سے بھی بڑھا چڑھا تھا۔ ترکی کے عرب قوم پرست اس دوران میں مصری اور فرانسیسی شمالی افریقہ کے قوم پرستوں سے پورے طور پر اتحاد کر رہے تھے کیونکہ ان ممالک میں عربی زبان بولی جاتی تھی اور یہاں کے باشندے جز و۴ عربی النسل تھے عرب قوم پرستی نے اب اُس راز کو بہ بانگ دُہل کہنا شروع کیا جس کی بابت پہلے سرگوشیاں ہو رہی تھیں یعنی ایک بڑی "اتحاد بین العرب" کی سلطنت کا اعلان کیا گیا جس میں کُل شمالی افریقہ اور جنوبی ایشیا بحر ظلمات سے لیکر بحر ہند تک شامل ہو۔ اس طریقہ پر عرب قوم پرستی بھی ترکی قوم پرستی کی طرح "دوسری" یعنی نسلی منزل کی طرف ترقی کر رہی تھی۔

اس وسیع تر ترقی پر مزید بحث کو ملتوی کر کے آؤ ہم اُس محدود تر قوم پرستی کے نشو و نما کے حالات معلوم کریں جو سلطنت ترکی میں سرگرم عمل تھی۔ باوجودیکہ ۱۹۱۱ء و ۱۹۱۲ء کے یورپی تعدی سے اتحاد بین الاسلامی کے خیال میں برانگیختگی پیدا ہوئی لیکن نوجوان ترکوں کی "عثمانیت" کی تدابیر سے قوم پرستی کے خیالات متواتر بڑھتے رہے۔ اور آزادی کی شورش فوراً بڑے شد و مد سے جاری ہو گئی۔ ۱۹۱۳ء میں عرب قوم پرستوں نے پیرس میں کانگریس کر کے انقلابی تدابیر بڑے پیمانہ پر شروع کر دیں۔ دوسری سال جنگ عظیم کے شروع ہونے کے وقت ترکی کے عرب صوبجات مغویانہ شورش

کے جوش سے اُبل رہے تھے[1]۔ ترکی حکام نے ہر امکانی فتنہ کے خلاف سخت تدابیر اختیار کیں اور کل سربرآوردہ قوم پرستوں کو جن پر دسترس ہوئی قید کیا یا پھانسیاں دیں۔ اعلان جہاد پر عرب رائے عامہ کا ایک حصہ بالخصوص فتح مصر کی امید سے ترکوں کا حامی ہوگیا۔ مگر جب دوران جنگ بڑھنے لگا تو اسباب شورش پھر رونما ہونے لگے۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں شریف مکہ کی بغاوت نے ترکی حکومت کے زوال کا نشان دیا۔ سلطنت ترکی کے کل عرب عناصر نے اس بغاوت کی عملاً یا دیگر طور پر مدد کی جس کی سلطنت برطانیہ نہایت فیاضی سے حمایت کر رہی تھی۔ عرب اُن وعدوں سے جوش میں آکر جو اتحادیوں نے اُنھیں قومی آزادی دلوانے کے متعلق بڑی شد و مد سے کیے تھے ترکی سے خوب لڑے اور سنہ ۱۹۱۸ء کی خزاں میں جو عثمانی فوجی قوت شکست ہوئی اُس کا خاص باعث تھے[2]۔

قبل اس کے کہ ہم اُن واقعات پر بحث کریں جو سابق عثمانی سلطنت کے عرب صوبجات میں سنہ ۱۹۱۸ء سے پیش آئے ہیں ہم شمالی افریقہ کے مستعرب ممالک کی (جو

---

[1] جنگ عظیم کے عین آغاز سے پہلے جو عرب معاملات کی حالت تھی اُس کی اچھی تفصیل مسلمان ماہر سیاسیات ''...'' اپنے مضمون ''عرب دنیا میں موجودہ سیاسی معاملات'' میں دی ہے جو دسمبر سنہ ۱۹۱۳ء کے ریویو دو موند مسلمان میں شائع ہوا۔ نیز ملاحظہ ہو جی۔ ڈبلیو۔ بری کی کتاب ''ناشاد عرب یا یمن میں ترک'' مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۵ء۔

[2] دوران جنگ میں عرب معاملات کی بابت ملاحظہ ہو اے۔ جنگ کا مضمون ''عرب آزادی اور واقعی بغاوت'' جو یکم اگست سنہ ۱۹۱۶ء کے دی ریویو میں شائع ہوا۔ آئی۔ ڈی۔ لیوین کا مضمون ''عربوں اور ترکوں کا تقابل'' جو نومبر سنہ ۱۹۱۶ء کے امریکن ریویو آف ریویوز میں شائع ہوا۔ اے۔ مینوزیل کی کتاب ''ہمعصر عربستان کی تاریخ'' مطبوعہ لیپزگ سنہ ۱۹۰۸ء۔ جی ڈبلیو۔ بری کی کتاب ''اتحاد بین الاسلامی'' مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۹ء۔ ایس مالمریا کا مضمون ''عرب میں سیاسی اور مذہبی حالت'' جو جولائی سنہ ۱۹۱۹ء کے دی مسلم ورلڈ میں شائع ہوا۔ ایل۔ ٹامس کا مضمون ''لارنس یعنی عرب بغاوت کی روح'' جو اپریل و مئی و جون سنہ ۱۹۲۰ء کے رسالہ ایشیا میں شائع ہوا۔

بجانب عرب واقع ہیں) قومی تحریکوں پر غور کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم مصری تحریک ہے۔ مصری آبادی کا بڑا حصہ آج بھی فراعنہ کے عہد کی طرح قدیم "نیل" کی نسل کا ہے۔ مصری فلاحین جو سست اور باطمینان کسان ہیں بہت سے فاتحین کے مطیع رعایا رہے ہیں۔ اگرچہ گاہے ماہے اس سکوت میں سخت غضبناک جوش سے خلل پڑا لیکن یہ جوش پھر بہت جلد سکون و سکوت پر منتج ہوا۔ وادی نیل کے ان عوام کے اوپر ایک قلیل التعداد اعلیٰ طبقہ ہے جو زمانہ حال کے مصر کے ایشیائی فاتحین یعنی عربوں۔ کردوں۔ چرکسیوں۔ البانیوں اور ترکوں کی اولاد ہیں۔ اس طبقہ اعلیٰ کے علاوہ جو برطانوی قبضہ سے پہلے کل سیاسی اقتدار کے اجارہ دار تھے بڑی یورپی "مستعمرات" ہیں جن کے غیر معمولی حقوق ہیں۔ مزید پیچیدگی ایک کثیر التعداد دیسی عیسائیوں کی عنصر مقاومت سے پیدا ہو گئی ہے جو قبطی کہلاتے ہیں اور جنہوں نے عرب فتوحات کے وقت اسلام لانے سے انکار کیا اور جو آج تعداد میں کل آبادی کا دسواں حصہ ہیں۔

نسل و تمدن و مذہب کے ایسے اجتماع اور غیر ملکی حکومت کی امتدادی روایات کی وجہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوم پرستی کی نشوونما کے لیے مصر کی آب و ہوا بالکل ناموافق ہوگی۔ برخلاف اس کے مشرق ادنیٰ کے دیگر حصص کے مقابلہ میں مصر ہی میں سب سے زیادہ مغربی اثرات سرایت کر رہے ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے ختم پر بونا پارٹ کے حملہ نے مصری طرز زندگی پر بڑا اثر پیدا کیا اور باوجودیکہ فرانسیسی مصر سے بہت جلد خارج کر دی گئی لیکن وادی نیل میں یورپی اثرات نشوونما پاتے رہے۔ محمد علی نے جو ایک قابل البانی سپاہی تھا اور فرانسیسی حکومت کے زوال کے بعد مصر کا مالک بن بیٹھا تھا یورپی تدابیر کی فوقیت کو محسوس کر کے یورپی تمدن کی اشاعت کا عمل شروع کیا۔ اگرچہ

یہ عمل بالکل ہی سطحی تھا لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی خیالات بہت کچھ سرایت کر گئے - محمد علی کی پالیسی کو اس کے جانشین نے جاری رکھا - وہ شاندار اور فضول خرچ خدیو اسمعیل جس کی یورپ سے غیر مآل اندیشانہ قرضہ ستانی یورپی مداخلت کا باعث ہوئی اپنی "منفر بخیت" پر فخر کرتا تھا اور یورپیوں کو اپنے پاس مجتمع رکھتا تھا-

فی الواقع مصری قوم پرستی کی پہلی تحریک خدیو اسمعیل اور اس کے درباریوں کے ضرر رساں اور تباہ کن "انگریزیت" کے خلاف احتجاج کی صورت میں نمایاں ہوئی جس طور پر خدیو اسمعیل اہل یورپ سے کثیر الرقم قرضے لیکر مصر کی آزادی کو گرو رکھ رہا تھا اور بے رحمانہ محاصل سے مصر کا خون پی رہا تھا اس سے دور اندیش مصریوں کے خوف میں روز بروز ترقی ہوتی گئی اور "حب وطن" کے مغربی ادراک سے دانستہ یا نادانستہ طور پر متاثر ہو کر ان لوگوں نے اسمعیل کی تباہ کن روش کو روکنا اور مصر کے مستقبل کو محفوظ کرنا چاہا - فی الواقع اُن کی مساعی صرف اُن یورپی دیدہ دلیروں اور مراعات جو اشخاص کی مختلف الاقسام جماعت کے خلاف نہ تھی جو خدیو کو مزید اسراف کی طرف راغب کر رہے تھے بلکہ اُن خوشامدی ترکی و چرکسی پاشاؤں اور ارمنی اور رشوت خواروں کے خلاف بھی تھے جو اسمعیل کی مرضی کا آلۂ تکمیل تھے - اس طور پر یہ بڑھنے والی تحریک اُن اجانب اور دلیسیوں کے خلاف اصلاً ایک "حب الوطنی" کا احتجاج تھی جو ملک کو خطرہ میں ڈال رہے تھے - شورش پسندوں نے جو مقولہ اُس وقت اختیار کیا تھا اُس سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا - یہ مقولہ ایسا نعرہ تھا جو پہلے کبھی سننے میں نہ آیا تھا یعنی "مصر مصریوں کے لیے ہی ہے"

اس ابتدائی ہیجان میں فوراً ہی جمال الدین کی شخصیت متحرک نے نئی روح پھونک دی - اس عظیم الشان ہستی نے ایسا زبردست اور دیرپا اثر کہیں بھی نہ پیدا

کیا جیسا کہ مصر ہیں۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ وہ مصری قوم پرستی کے ہر شعبہ کا جدّاعلیٰ ہے۔ اس کے زیر اثر صرف عربی پاشا جیسے جبر پسند اور شورش انگیز ہی نہ تھے بلکہ شیخ محمد عبدہ جیسے قدامت پسند مصلحین بھی تھے جو مصر کی کمزوریوں کو محسوس کرکے مقاصد بعیدہ کے لیے ارتقائی ذرایع سے تحمل کے ساتھ کام کرنا پسند کرتے تھے۔

کچھ عرصہ کے لیے میدان حامیان اشتداد ہی کے ہاتھ رہا۔ ۱۸۸۲ء میں انقلابی شورش پسند بسر کردگی عربی پاشا رونما ہوے۔ یہ عربی پاشا فوج کا افسر اور قابل لحاظ بات یہ ہے کہ یہ فلاحین میں سے تھا۔ اور وادی نیل کی نسل سے یہ پہلا شخص تھا جو موجودہ زمانہ میں مصر کی قسمتوں پر حکمران ہوا۔ انقلاب پسندوں نے اپنے نعرے "مصر مصریوں کے لیے" بلند کیے اور کل اجانب کو خواہ وہ یورپی ہوں یا ایشیائی مصر سے نکالنے کی کوشش کی۔ اس سعی میں ناکامیابی مقدر تھی۔ اسکندریہ میں یورپیوں کے قتل عام کی بدولت یورپی مداخلت فوراً شروع ہوگئی۔ ایک انگریزی فوج نے باغیوں کو تل الکبیر پر شکست فاش دی اور اس ایک لڑائی کے بعد ابتر اور دیوالیہ مصر برطانوی حکومت کے تحت میں آگیا جس کا مجسمہ اولین بیرنگ لارڈ کرومر تھا۔ خاندان خدیویہ قایم رکھا گیا اور ویسی طرز حکومت کا احترام کیا گیا لیکن اصلی اختیارات سب برطانوی "مشیر مالیات" کے ہاتھ میں آگئے جو برطانوی شہنشاہی مرضی کا نمایندہ تھا۔

۲۵ سال لارڈ کرومر نے مصر پر حکومت کی اور اس قابل گورنر کی خدمات ایسی تھیں جن کی بدولت وہ دنیا کے بہترین حکمرانوں کی صف اول میں شمار کیا جائیگا۔ اس کے مضبوط ہاتھوں نے مصر کو افلاس سے کھینچکر بیحد خوشحالی میں پہنچا دیا۔ مگر اس مادی خوشحالی نے مصری قوم پرستی کو فنا نہ کیا۔ برطانوی سنگینوں کے حملہ سے منتشر ہوکر بیچینی کا بیج زرخیز نیل کی زمین کی تہ میں جمنے لگا۔ اولاً تل الکبیر کے ہلاک کن صدمہ سے جذبات قوم پرستی تقریباً ناپید ہوگئے لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ وہ بتدریج ترقی

کرنے لگے اور انیسویں صدی کی آخری دو قرن میں تیز نظر یورپی مبصرین کو نظر آنے لگے ۱۸۹۵ء میں جب مشہور افریقی متفحص شوینفورتھ مصر سے گزرا تو وہ عظیم الشان روحانی انقلاب کو محسوس کرکے متحیر ہو گیا جو وادیٔ نیل میں اُس کی سابقہ سیاحت کے بعد پیدا ہو گیا۔ اُس نے لکھا ایک حقیقی قومی خودشناسی پیدا ہونا شروع ہو گئی ہے۔ مصری ایک حقیقی قوم ہونے سے ہنوز بہت دور ہیں لیکن اس کا آغاز ہو گیا۔[۱]

بیسویں صدی کے ابتدائی سنین میں جو چیز پہلے صرف اہل بصیرت کو دکھائی دیتی تھی دفعتاً اور حیرت انگیز طور پر عالم شہود میں آ گئی۔ بلاشبہ اس زندہ شدہ مصری قومیت کا ایک اعتدال پسند پہلو بھی تھا جس کے نمائندے ایسے قدامت پسند اشخاص تھے مثلاً جامعہ ازہر کے مفتی اور لارڈ کرومر کے محترم دوست محمد عبدہ۔ انھوں نے اپنی ہموطنوں کو یہ تعلیم دینے کی کوشش کی کہ جادہ روشن خیالی و ترقی ہی حصول آزادی کے لیے صراط مستقیم ہے۔ مگر اس تحریک کا زیادہ تر یہ مقصد تھا کہ برطانوی حکومت کے خلاف نہایت بے صبری اور شدت سے احتجاج کیا جاوے۔ غالباً سب سے اہم یہ بات تھی کہ سب مصری فی الحقیقت دل سے قوم پرست تھے۔ قدامت پسند اور حامیان جمہوریت دونوں مصر کو برطانوی سلطنت کا مستقل جزو خیال کرنے سے انکار کرتے تھے۔ قوم پرستوں کا یہ طرز عمل ایک مستحکم قانونی احساس پر مبنی تھا۔ کیونکہ برطانوی حکومت ناپائدار سیاسی مصلحت عملی کی بنیاد پر قائم تھی۔ انگلستان نے مصر میں یورپی مالی مفاد کے خود ساختہ حکم بردار کی حیثیت سے مداخلت کی تھی۔ اُس کی اس حرکت سے یورپ بالخصوص

---

[۱] جارج شوینفورتھ کی کتاب "آزادی پسند اسلام کی روشنی میں مصریوں کی نشاۃ ثانیہ" مطبوعہ برلن ۱۹۲۲ء مصنف

فرانس میں بہت مخالفت پیدا ہوئی تھی۔ اور اس مخالفت کو فرو کرنے کے لیئے برطانیہ نے بار بار اس کا اعلان کیا تھا کہ مقابضت مصر محض عارضی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ مصری نے چینی کو فرانس نے ۱۹۰۴ء میں مفاہمت باہمی کی تکمیل تک دیا یہ وابستہ مشتعل کیے رکھا۔ مصری تمناؤں سے فرانس کی یہ ہمدردی قوم پرستی کی تحریک کی ترقی میں بہت کارآمد ہوئی۔ مصر میں فرانس کی تمدنی روایات نمایاں تھیں۔ مصریوں کی نظر میں یورپی تعلیم فرانسیسی تعلیم کے مرادف تھی لہذا آنے والی نسلوں نے ہمیشہ فرانسیسی اساتذہ کے سامنے خواہ مصر میں خواہ فرانس میں زانوادب تہہ کیا۔ ان فرانسیسی اساتذہ نے جو عموماً انگلستان کے مخالف تھے اپنے شاگردوں کے دل میں انگلستان سے نفرت اور برطانوی حکومت سے مخالفت پیدا کرنے کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

جمہوری قوم پرستوں کا سردار ایک جوان آدمی مصطفےٰ کامل تھا۔ وہ دراصل شورش انگیزوں کا شاہ تھا۔ پرجوش۔ دلکش۔ سرگرم۔ اور ایسا فصیح تھا کہ اپنے سامعین اور قارئین دونوں کو مبہوت کر دیتا تھا۔ وہ ان تھک مبلغ بھی تھا اور اخبارات اور رسائل کے ایک سلسلہ کی ایڈیٹری کرتا تھا۔ اور جب کسی رسالہ کو برطانوی عمال بند کر دیتے تھے وہ فوراً دوسرا جاری کر دیتا تھا۔ اس کی بے لوث قوم پرستی کا اندازہ اس کی ذیل کی تحریر سے ہو سکتا ہے۔ ۱۸۹۶ء میں اس نے اس عنوان سے ایک مضمون لکھا "مصر مصر کے لیئے اور مصر مصریوں کے لیئے ہے" اگر خود اہل مصر ہی مصری تمدن کی بنیاد نہ ڈالیں گے تو یہ تمدن آئندہ قایم نہ رہے گا۔ جب تک فلاحین۔ تجار۔ اساتذہ طلاب المختصر ہر مصری فرد واحد کو یہ علم نہ ہو کہ انسان کے مقدس اور غیر محسوس حقوق ہیں اور یہ کہ وہ ایک آلہ کے طور پر مستعمل ہونے کو خلق نہیں ہوا ہے بلکہ اسے ایک دانشمندانہ اور باعزت زندگی بسر کرنا ہے اور یہ کہ حب وطن نہایت ہی اچھا خیال ہے جو روح کو تقویت پہونچاتا ہے۔ اور یہ کہ جو قوم آزاد نہیں وہ ایسی قوم ہے جس کی کوئی ہستی ہی نہیں

یہ حب وطن ہی ہے جس سے وہ خون بنتا ہے۔ جو بہادر اقوام کی رگوں میں دوڑتا ہے۔
اور یہ حب وطن ہی ہے جس سے ہر ذی روح حیات پاتا ہے"

بلا شبہ انگریزوں کی بڑی مذمت کی جاتی تھی۔ مصطفےٰ کامل کے اخبار
اللوا کے ایک ایڈیٹوریل کا اقتباس ہدیہ ناظرین ہے۔ "ہم تباہ ہو گئے اور
ہمارے تباہ کرنے والے انگریز ہیں۔ ہم ایک مقدس حق کا مطالبہ کرتے
ہیں انگریز اس حق کے غاصب ہیں۔ اور اسی وجہ سے ہمیں جلد یا دیر میں کامیابی
کا یقین ہے۔ جب کوئی حق پر ہوتا ہے تو اس کی کامیابی کے لیے صرف وقت کا
سوال ہوتا ہے"

باوجود اپنی پرجوش توقعات کے مصطفےٰ کامل کو حقایق کا احساس
تھا اور وہ اسے تسلیم کرتا تھا کہ کم از کم فی الحال برطانوی اقتدار جبراً نہیں ہٹایا جاسکتا ہے
لہذا اس نے کسی ظاہری اشتداد کی کوشش نہ کی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس سے خود
وہ اور اس کے متبعین تباہ ہو جائینگے۔ اوائل ۱۹۰۸ء میں اس نے بعمر ۳۴ سال
وفات پائی۔ اس کے سربرآوردہ شاگرد فرید بے کو اس کا خرقہ ملا۔ یہ اس قابلیت
کے نہ تھے لہذا انھوں نے حقیقی فصاحت کی کمی کو اپنی بدزبانی کی شدت سے
پیدا کیا۔ دونوں لیڈروں کا فرق اللواء کے ایڈیٹوریل کے صفحات سے ظاہر
ہو سکتا ہے۔ ستمبر ۱۹۰۹ء کا ایک ایڈیٹوریل حسب ذیل ہے:۔

"اس سرزمین کو انگریزوں نے ناپاک کر دیا اور اپنے ان مظالم سے
جو انھوں نے ہمارے عزیز دستور کے دبانے میں کیے متعفن کر دیا۔ انھوں نے
ہماری زبانیں بند کر دیں ہمارے ہم قوموں کو زندہ جلایا اور ہمارے بے گناہ
عزیزوں کو پھانسیاں دیں اور دیگر وحشیانہ مظالم کا ارتکاب کیا۔ جن پر قریب تھا
کہ زمین متزلزل ہو آسمان پھٹے اور پہاڑ گر جائیں۔ اب ہم کو جدید تدبیر سے

کام لینا چاہیے۔ آزادی کی تلاش میں ہمکو جانیں ارزاں کر دینا چاہیئں۔ اگر تم موجودہ حالت ہی میں رہو تو اس زندگی سے موت بہتر ہو"

مخالف تحریک کی ہر قسم کی مخالفت میں مجنونانہ بے صبری کرنے سے اہم غلطیاں واقع ہوئیں مثلاً اس نے اُن دیسی عیسائی قبطیوں کو جن کو مصطفےٰ کامل نہایت ہوشیاری سے راضی رکھتا تھا بددل کر دیا۔ ذیل کا مسلسل مقالہ جو مغربی و مشرقی خیالات کا معجون مرکب ہو اُس احتجاج کا جواب ہو جو قبطیوں نے اُس کی تبلیغ کے روز افزوں اشتداد پر کیا "قبطیوں کو ٹھوکروں سے مار ڈالنا چاہیے۔ ان کے چہرے اور جسم ہنوز شیطانوں اور بندروں کے سے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ یہ اپنے سینوں میں زہریلی روح مخفی رکھتے ہیں۔ صفحہ ارض پر ان کے وجود سے ڈاروِن کے اس مسئلہ کی تصدیق ہوتی ہو کہ انسان بندر سے پیدا ہوئے ہیں۔ تم بدکار عورتوں کے بچو! تم طشت برداروں کی اولاد! تم اونٹ کی دم اور بندر کی صورت! تم مُردوں کی ہڈیاں!"

قوم پرستوں کو ایسا سخت طرز عمل اختیار کرنے کی ہمت چند وجوہات سے ہوئی۔ امر اول یہ ہو کہ ۱۹۰۷ء میں لارڈ کرومر اپنے عہدہ پر وکونسل سے سبکدوش ہوئے اور اُن کے جانشین سر ایلڈن گورسٹ ہوئے۔ نئے حکمراں برطانوی لبرل پارٹی کے خیالات کے نمائندے تھے جو اُس وقت برسر اقتدار تھے اور یہ چاہتے تھے کہ لارڈ کرومر کے خودسرانہ اور بے پروایانہ طرز عمل کو ترک کر کے مصری شورش انگیزوں کو باہمی مصالحت سے رام کیا جاوے۔ دوسری بات یہ ہو کہ ۱۹۰۸ء میں جو نوجوان ترکوں کو انقلاب میں کامیابی ہوئی اُس سے مصریوں کا مطالبہ حکومت خود اختیاری بہت زور پکڑ گیا۔ آخر الامر یہ کہ فرانس و انگلستان کے روز افزوں اتحاد سے یہ دیرینہ اُمید ٹوٹ گئی کہ برطانیہ بیرونی اثرات سے مجبور ہو کر اپنی سیاسی وعدہ کو وفا اور

وادی نیل کو خالی کرے گا لہذا اُن کو زیادہ تر اپنے مساعی پر اعتماد کرنا پڑا۔

قوم پرستوں کے جذبات اور توقعات کا جب یہ عالم ہو تو مساعی صلح کی کامیابی معلوم! کیونکہ سر ایلڈن گورسٹ فروعات میں کیسا ہی صلح کن رویہ اختیار کرتے لیکن وہ اُس شے یعنی آزادی کا جس کے قوم پرست سب سے زیادہ خواہشمند تھے وعدہ نہیں کر سکتے تھے۔ انگلستان نے اس مطالبہ پر غور و خوض کرنے سے ہی انکار کیا تقریباً کل انگریزوں کو یہ یقین تھا کہ برطانوی سلطنت کے مشرقی و مغربی حصوں کے درمیان مصر و نہر سویز اہم سلسلہ تھا اور اسی وجہ سے مصر پر مستقل تسلط بالکل ضروری تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صلح کی برطانوی لبرل پالیسی بالکل ناکامیاب ثابت ہوئی۔ سر ایلڈن گورسٹ نے بھی اپنی رپورٹ میں اعتراف کیا کہ مراعات محض کمزوری کی علامت سمجھی جاتی تھی۔

تھوڑے ہی عرصہ میں مغویانہ شورش اور اُس کا لوازمہ جبر و تشدد اتنا بڑھ گیا کہ حکومت برطانیہ کو یقین ہو گیا کہ صرف تشددی کارروائی ہی سے حالت سنبھل سکتی ہے۔ لہذا ۱۹۱۱ء میں سر ایلڈن گورسٹ کی بجائے لارڈ کچنر مقرر ہوئے یہ تقرر قوم پرستوں کو علانیہ تنبیہ تھی کہ وہ فولادی بازو جس نے اُم درمان پر خلیفہ اور اوس کی جماعت ہائے دراویش کا استیصال کیا تھا۔ مغویانہ سازشوں کا بہت جلد خاتمہ کر دے گا۔ کچنر مصر میں امن قایم کرنے کو مامور ہوا اور اُس نے بوجہ اتم اور کماحقہ امن قایم کیا۔ مصریوں کو صاف صاف بتا دیا گیا کہ انگلستان نہ تو وادی نیل کو خالی کرنا چاہتا ہے اور نہ دیسیوں کو ایک عرصہ تک سیلف گورنمنٹ کے قابل سمجھتا ہے۔ اُن کو یہ بھی فہمایش کی گئی کہ وہ سیاسیات سے جن میں اونھیں دستگاہ نہیں ہے قطع نظر کرکے کاشتکاری میں مصروف ہوں جس کی قابلیت اُن میں موجود ہے۔ جدید قوانین نے لارڈ کچنر کو ایسے اختیار دیدیئے جس سے وہ

مغویانہ نظامات کا سر سری طور پر استیصال کر دیں۔ قوم پرست اخبارات تقریباً کل بند کر دیئے گئے۔ اور قوم پرست لیڈران کو مقید یا نظر بند یا جلاوطن کر دیا گیا۔ فی الواقع برطانوی حکومت نے اس کی سعی بلیغ کی کہ مصری معاملات سے توجہ ہٹالی جائے۔ اور برطانوی اخبارات نے بھی اس مضمون کو ناجائز قرار دیکر پورا اتحاد عمل کیا۔ ماحصل یہ تھا کہ مصر ایسا پُر امن تھا کہ ایک قرن سے کبھی نہ ہوا تھا۔

مگر یہ سکوت سطحی تھا۔ یہ آگ تہ خاکستر ہو جانے کی وجہ سے اور بھی تیز ہو گئی جس سے مبصرین خائف ہونے لگے۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں مشہور برطانوی ماہر سیاسیات سڈنی لو نے مصری معاملات کی کامل تحقیقات کرنے کے بعد کہا۔ "ہم مصر میں ہر دلعزیز نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض ہم سے ڈرتے ہوں اور بلاشبہ اکثر ہماری عزت کرتے ہیں لیکن اس کا مجھے یقین ہے کہ بہت کم اشخاص ہمیں پسند کرتے ہیں"[1] اس سے بھی زیادہ صاف اظہار حال اُس مضمون میں کیا گیا تھا جو "منحنی خیز طرز پر مصر پر تاریکی" کے عنوان سے جنگ عظیم کے آغاز سے قبل شایع ہوا[2]۔ چونکہ یہ مضمون اس رسالہ میں شایع ہوا جو مشرقی مسایل کے ماہرین کے لیے نیم علمی رسالہ ہے لہٰذا یہ کامل توجہ کا مستحق ہے۔ اِس مضمون میں تحریر تھا کہ "برطانوی اخبارات میں مصر کی اندرونی معاملات پر بالکل بحث نہ ہونا یا اُس کا ذکر تک نہ آنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ صورت معاملات اچھی نہیں ہے۔ مصر کا ظاہری سکون دبی ہوئی بے چینی کا سکون ہے۔ یعنی یہ ایسا سکون ہے جو دلی اور بے اعتباری کی بدولت پیدا ہوا ہے۔ حال کے بعض واقعات سے مصریوں کو یقین کامل ہو گیا ہے کہ گورنمنٹ ملک کے الحاق کلی کی تیاری کر رہی ہے۔ . . . . . ہم کو

---

[1] لوئی کتاب "مصر کے حالات نقل و حرکت" صفحہ ۲۰۰ لندن ۱۹۱۴ء مصنف
[2] اپریل ۱۹۱۴ء کو ایشیاٹک ریویو مصنف

اس سے بحث نہیں کہ گورنمنٹ کے جو اغراض و مقاصد بتائے جاتے ہیں وہ کہانتک صحیح ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ حکومت مقابضنت اس میں ناکامیاب رہی کہ وہ اپنے آپ کو مصریوں میں ہر دلعزیز یا قابل التفات بھی ثابت کرتی برخلاف اس کے اُس نے اپنے آپ کو مشتبہ اور مصریوں کو دشمن بنالیا ہے۔ اس مضمون میں اس امر کی بابتہ سخت شکوک ظاہر کیے گئے ہیں کہ لارڈ کچنر کی انسدادی تدابیر میں بے چینی کو محض ظاہری طور پر دبانے سے زیادہ بھی کچھ کامیابی ہوئی اور یہ بھی دکھایا گیا کہ سیاسی رائے کی آزادی کو قطعاً مٹا دینے کی مستقل مساعی کے باوجود آج مصر میں حمایت قومی کا خیال کیسا راسخ ہے۔ آزادی مطابع کو بالکل سلب کرنے سے نہ صرف مسلمانوں کی تعداد کثیر میں اندرونی جوشش پیدا ہو گیا ہے بلکہ جیسے کہ اس حرکت سے اُمید ہوسکتی تھی اُن قبطیوں میں بھی سخت منافرت پیدا ہو گئی جو اس وقت تک وفادار تھے۔ اس کی خواہ یہ وجہ ہو کہ گورنمنٹ اہل مصر کی نظر میں قابل اعتماد اور پسندیدہ ہونے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور صورت نہیں پیدا کرسکتی تھی۔ خواہ بے چینی کی ظاہری علامت کے فوری انسداد ہی سے وہ اپنے قبضہ کو محفوظ کرسکتی تھی۔ اگر صورت حال یہ ہے تو یہ انتہائی کمزوری یا قبضہ کے مسلمہ غیر محفوظی کا اعتراف ہے"۔ یہ مضمون مسئلہ کے وسیع تر پیچیدگیوں کی بابت حسب ذیل تنبیہ پر ختم ہوتا ہے "مصر کی بابت اگرچہ انگریز رائے دہندگان بالکل بے پرواہ ہیں لیکن اس کو ہندوستانی مسلمان اور مغربی اور وسطی افریقہ کے کل ہماری رعایا بہت بے صبری کے ساتھ دیکھ رہے ہیں یہ اقوام بہت سخت اسلامی ہمدردی رکھتی ہیں۔ اور اس دور میں نصرانی شہنشاہیت کی جد و جہد کو حاسدانہ اشتباہ کی نظر سے دیکھتی ہیں"

سنہ ۱۹۱۴ء میں جب مصری خدمات کی یہ حالت تھی تو لازمی تھا کہ جنگ عظیم کے چھڑنے سے شدید بے چینی پیدا ہو۔ درحقیقت مصر میں دولت انگلشیہ کی حالت بہت نازک تھی۔ فی الواقع اگرچہ انگلستان کامل طور پر مسلط تھا لیکن قانوناً مصر اس وقت

بھی عثمانی سلطنت کے ماتحت تھا اور انگلستان کا قبضہ عارضی تھا۔ اب یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ترکی سلطنت انگلستان کے دشمنوں یعنی سلاطین ٹیوٹن کا ساتھ دے گی۔ اور یہ بھی معلوم تھا کہ مصریوں کو ترکوں سے ہمدردی ہے حتیٰ کہ خدیو عباس حلمی نے ترکوں سے محبانہ خیالات کو کسی طور پر پوشیدہ نہیں کیا۔ یورپی جنگ کے پہلے چند ماہ میں جبکہ ترکی ہنوز برائے نام غیر جانبدار تھا مصری دیسی اخبارات برطانوی نگرانی کی موجودگی میں بھی در پردہ مغویانہ مضامین سے بھرے ہوئے تھے اور مصری عوام الناس کے متمردانہ طرز عمل اور مصری دیسی افواج کی شورشوں نے ہوا کا رُخ صاف بتا دیا انگلستان کو بہت خوف پیدا ہوگیا۔ لہٰذا جب نومبر ۱۹۱۴ء میں ترکی شریک جنگ ہوا تو انگلستان نے فیصلہ کن عمل کیا یعنی عباس حلمی کو معزول کر کے اُس کے چچازاد بھائی حسین کامل کو "سلطان" بنا دیا اور مصر پر برطانوی صیانت اعلان کی۔

اس ضرب سے قوم پرستوں کا غیظ و غضب بڑھا چونکہ برطانیہ اور مستعمرات کی افواج کثیر سے ملک بھر دیا گیا تھا لہٰذا باضابطہ بغاوت جیسی کوئی حرکت ناممکن تھی۔ بایں ہمہ جا بجا جبر و استبداد کے بہت سے واقعہ رونما ہوئے جن کا انسداد صرف "حالت محاصرہ" کو سختی سے اطلاق کرنے سے ہوا۔ ان نازک ایام کی تصویر ایک فرانسیسی ناظر نے حسب ذیل الفاظ میں کھینچی ہے۔

"اعلان جہاد عیسائیوں کے خلاف اس تعصب کو مشتعل کر رہا ہے جس سے ہر سچے مسلمان کا قلب متحرک ہو جاتا ہے۔ اکتوبر کے آخر ایام سے طبقہ ادنیٰ کے مسلمانوں کی آنکھوں سے ہی ہر شخص یہ معلوم کر سکتا تھا کہ اُن کو عیسائیوں کا قتل عام کرنے کی اُمید ہے۔ قاہرہ کی گلیوں میں اہل مصر یورپی آیندہ روند کو گستاخ نظر سے دیکھتے تھے۔ بعض تو سلطان کے اعلان جہاد کو معلوم کر کے خوشی میں ناچنے لگے۔ جب اس کی اطلاع پولیس کو ہوتی تھی تو اُن کو قریب ترین تھانہ میں سزائے تازیانہ فوراً دی جاتی تھی۔ جامعہ ازہر

میں بھی یہی حال تھا اور مجھ سے بیان کیا گیا ہے کہ جو یوپی اس معروف اسلامی جامعہ کو دیکھنے جاتے تھے اُن کے کان گنشیر اللغات عربی زبان کے دشنام سے بھر جاتے تھے؛؛[۱]

قوم پرست جلاوطنوں نے اُن باتوں کو جو اُن کی ہم وطن ملک میں نہ کہہ سکتے تھے نہایت زور سے ممالک غیر میں کہنا شروع کیا۔ اُن کے لیڈر محمد فرید نے "جدید ناجائز حکومت کی خلاف جو انگلستان نے ۱۸ دسمبر کو قایم کی"، ایک باضابطہ اعلان احتجاج جنیوا سے شایع کیا"۔ انگلستان جو یہ دعوے کرتا ہے کہ وہ حفاظت بلجیم کے لیے جرمنی سے لڑ رہا ہے اُس کو مصر کے حقوق پامال نہ کرنا چاہئیں اور نہ اوس کے متعلقہ عہدنامجات کو کاغذ کے پرزے سمجھنا چاہئیں؛؛[۲] یہ جلاوطن اشخاص نہایت شدومد سے جرمنوں سے مل گئے چنانچہ اس کا اندازہ قوم پرست جماعت کے سکرٹیری یعنی عبدالملک ہمسہ کی ذیل کی تحریر سے ہوتا ہے جو ایک جرمنی رسالہ میں شایع ہوئی :-

"مشکل سے کوئی مصری ہوگا جو انگلستان کی شکست اور اُس کی سلطنت کی تباہی کی دعا نہ مانگتا ہو۔ جنگ کے اوائل میں جب میں مصر ہی میں تھا میں نے اس علم خیال کو بچشم خود دیکھا۔ شہروں اور دیہاتوں میں فرزانہ سے لیکر سادہ لوح کسان تک کو قیصر کی محبت اسلام اور مودت خلیفۃ المسلمین کا یقین ہے۔ اور یہ سب جرمنی کی فتح کی دعا مانگتی اور امید کرتے ہیں؛؛[۳]

---

[۱] ۱۵ جون ۱۹۱۵ء کے رسالہ ریویو دی سائمینز پولیٹک میں بعنوان "مصر اور دھیانت کا آغاز" مصنف

[۲] محمد فرید بے کا مضمون "مصر اور جنگ" جو مئی ۱۹۱۵ء کے رسالہ ریویو پولیٹک انٹرنیشنل میں شایع ہوا مصنف

[۳] عبدالملک ہمسہ کا مضمون "مسئلہ مصر" ۳ نومبر ۱۹۱۶ء کے رسالہ ایشیا میں شایع ہوا مصنف

بلاشبہ کثیر التعداد برطانوی افواج کی موجودگی میں ایسے بیانات محض ہوائی باتیں تھیں۔ نہر سویز سے ترکی کے وہ حملے جن سے اُمیدیں وابستہ تھیں پسپا کر دیئے گئے۔ اور "حالت محاصرہ" سختی سے عمل پذیر ہوئے اور مصر پر جس میں برطانوی افواج کا طوفان اُمنڈ آیا تھا خشمگیں خاموشی طاری ہو گئی۔ یہ سکوت اختتام جنگ تک قایم رہا۔

اس موقع پر ہم باقی شمالی افریقہ میں قوم پرستانہ اظہارات کی طرف توجہ کرنے کے لیے عود کرتے ہیں تو ہم کو مصر کی طرح کہیں ارضی حب وطن کے آثار نہیں ملتے۔ یوروپیوں کے خلاف نفرت تو بکثرت موجود ہے لیکن "حب الوطنی" کے ایسے خیالات جو موجود ہیں زیادہ تر اُن قوم پرستانہ خیالات کے شایع شدہ طرز کے ہیں جو "اتحاد بین الاسلامی کی قوم پرستی" اور "اتحاد بین العربی" کے نام سے موسوم ہیں جن پر ہم جلد بحث کرینگے۔

شمالی افریقہ میں اس محدود المفہوم قومی احساس کی فقدان کی اصلی وجہ یہ ہے کہ مصر کے علاوہ اور کوئی سرزمین ایسی نہیں ہے جو کبھی بھی ایک "حقیقی قوم" رہی ہو یا جس میں "قوم" بننے کے نمایاں آثار ظاہر ہوں۔ بحیرہ روم اور ریگستانی صحارا کے درمیان قطعہ ارض میں زیادہ تر آبادی بربرہ کی ہے جو ایک قدیم نسل کے ہیں اور ایشیائی یا حبشی ہونے کی بجائے نسلاً یورپی ہیں اور اُن لاطینی نسلوں سے جو بحیرہ روم کے دوسرے کنارے پر آباد ہیں بہت متقارب ہیں۔ بربرہ کو دیکھ کر دہقانی البانیوں کی یاد آتی ہے۔ یہ لوگ اپنی زبان اور اپنی رسوم کے بڑے پابند ہیں اور ان میں جبلی قومی احساس ہے۔ لیکن یہ لوگ نہایت پختہ اختصاص پسند ہیں اور ہمیشہ سے متعدد قبائل میں منقسم ہیں اور بعض وقت جنونی مجاہدین کی حیثیت سے متحد ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان میں حقیقی قومی حب الوطنی

کبھی پیدا نہ ہوئی۔[1]

براہرہ کے ساتھ ہی ساتھ عرب مختلف تناسب میں ہر جگہ موجود ہیں۔ بارہ سو سال ہوئے کہ عربی فتوحات کے ساتھ ہی عربوں نے ہر جگہ نوآبادیاں قایم کیں۔ اُنھوں نے بربروں کو اسلام اور عربی تمدن میں داخل کیا لیکن وہ شمالی افریقہ کو اسلامی دنیا کا ایسا جزو نہ بنا سکے جیسا کہ شام یا عراق یا کمتر درجہ پر مصر کو بنا لیا تھا۔ یہ دونوں قومیں حقیقی طور پر کبھی مختلط نہ ہوئیں۔ باوجودیکہ براہرہ ہزار سال سے عربی اتالیقی میں ہیں لیکن اُن کا طرز معاشرت بالکل جدا رہا۔ انھوں نے اپنی زبان کو زیادہ تر قایم رکھا اور آپس میں شادیاں بھی بہت کم ہوئیں۔ اکثر بڑی جماعتوں میں خالص نسل کے عرب بکثرت پائے جاتے ہیں لیکن یہ آج بھی ایک طور پر اجانب میں شمار کیے جاتے ہیں۔[2]

ایسے متضاد عناصر کی موجودگی سے شمالی افریقہ کی سیاسی زندگی ہمیشہ پرشور رہی۔ سب سے زیادہ مستقل حصہ مراکش تھا لیکن یہاں بھی کوہستانی قبایل نے اصلاً کبھی بھی سلطانی اقتدار کو تسلیم نہیں کیا۔ رہے وہ حصے جن میں ممالک بربر اور الجزائر، ٹیونس، طرابلس شامل ہیں سواحلی بندرگاہ سے کچھ زیادہ حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔ اور اندرون ملک میں عملاً بالکل قبائلی آزادی کا دور رہا۔ اس پراگندہ شور و شغب میں فرانسیسی فتوحات کا سیلاب آیا جو ۱۸۳۰ء میں الجزایر کی فتح سے شروع ہو کر اب مراکش کی فتح پر ختم ہوتا ہے۔[3] فرانس کی بدولت ملک میں

---

[1] تاریخ براہرہ کا اچھا خلاصہ ایچ ڈاشجر کی تاریخ "افریقہ گے گذ رہے"، مطبوعہ پیرس ۱۹۰۰ء میں ہے۔ مصنف

[2] عرب اور براہرہ میں فرق کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو کیکس دی سینتا نور کی کتاب "اعراب و قبائل"، مطبوعہ پیرس ۱۹۱۱ء اے بیل کی کتاب "ممالک بربریہ اسلام پر ایک نظر"، مطبوعہ پیرس ۱۹۱۳ء۔ مصنف

[3] مختصر تاریخی حالات کے لیے ملاحظہ ہو اے۔ سی گوبیج کا مضمون "شمالی افریقہ کی یوروپی فتح تا بہ جنگ ۱۹۱۱ء"

امن و امان تو قایم ہوا اور مادی خوشحالی پھیلی لیکن دیگر بلاد اسلامی کی طرح یہاں بھی یوروپی انانیقیت کے ان فوائد ہی کی بدولت اہل ملک میں اپنی یوروپی فاتحین سے مشترکہ نفرت اور آزادی کی مشترکہ توقعات رکھنے کی وجہ سے ایک جدید قسم کا اتحاد پیدا ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گزشتہ نسل میں "نوجوان الجزایری" اور "نوجوان ٹیونسی" سیاسی جماعتیں عالم شہود میں آئیں۔ ان جماعتوں کے سرگروہ فرانس کے تعلیم یافتہ اشخاص تھے جن میں "سیلف گورنمنٹ" اور "آزادی" کے مغربی خیالات سرایت کر چکے تھے[1]۔ مگر جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے ان کا نصب العین خالص الجزائری یا ٹیونسی اقوام کا قایم کرنا نہیں ہے بلکہ ان کا مقصد وسیع تر شمالی افریقہ کا اتحاد یا غالباً "اتحاد بین الاسلامی" ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ جماعتیں سنوسیوں اور اسی قسم کے اُن دیگر اثرات سے قریبی اتصال رکھتی ہیں جن کا ذکر اتحاد بین الاسلامی کی فصل میں ہو چکا ہے۔

عربی یا مستعرب بلاد میں حمایت قومی کی ترقی گمیہ "ابتدائی درجہ" کا تو یہ حال ہے۔ مگر بلاد اسلام میں ایک اور اہم قوم پرستانہ خیالات کا مرکز یعنی ایران ہے جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ فی الحقیقت ایران ایسا ملک ہے جہاں کہ عقلاً اصلی تحریک قوم پرستی کی سب سے زیادہ اُمید ہو سکتی تھی۔ وجہ یہ ہے کہ مشرق ادنیٰ

بقیہ نوٹ صفحہ ماقبل۔ کے امریکن ہسٹاریکل ریویو میں شایع ہوا۔ مصنف

[1] فرانسیسی شمالی افریقہ کی ان تحریکات قوم پرستی کے لیے ملاحظہ ہو اسے بمروی ایری کی کتاب "مسلمانوں کی قوم پرستی" مطبوعہ قسطنطین۔ الجزایر ۱۹۱۳ء۔ پی۔ لابی کی کتاب "اہل ٹیونس کا تمدن" مطبوعہ پیرس ۱۸۹۸ء بی میلی کا مضمون "نوجوان الجزائری" جو یکم نومبر کو ریویو دی پیرس میں شایع ہوا۔ مصنف

کی دیگر اقوام کے مقابلہ میں ایرانیوں میں سب سے زیادہ مستحکم "وطنی" احساس پایا جاتا ہی۔

اونیسویں صدی میں ایران قعر مذلت میں پھنسا تھا کہ اوس کی نمایاں کمزوری سے زار روس کی اور کچھ کمتر درجہ پر برطانیہ کی جوع الارض بھڑک اوٹھی۔ لیکن صاحب فکر ایرانیوں نے ایران کے انحطاط اور بیرونی خطرات کا اندازہ کرلیا تھا اور اصلاحی شورشوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اُن کا آغاز اوائل اونیسویں صدی میں بابی تحریک مذہبی سے ہوکر ۱۹۰۶ء کے انقلاب پر ختم ہوا[1]۔ ۱۹۰۷ء کے روسی اور انگریزی معاہدہ نے اس انقلاب کو دفعتاً رونما کردیا۔ اس معاہدہ کی رو سے انگلستان اور روس نے فی الحقیقت ایران کو آپس میں تقسیم کرلیا اور شمال میں "روسی حلقۂ اثر"، اور جنوب میں "انگریزی حلقۂ اثر"، اور درمیان میں "غیر جانبدار علاقہ"، قایم کردیئے گئے۔ لہذا اس انقلاب کا زیادہ تر یہ منشار اور مقصد تھا کہ ایرانی محبان وطن اپنا گھر درست کرکے آخر دم پر یورپی تسلط کے اُس خطرے کو دفع کرنے کے لیے جان توڑ کوشش کریں جو ملک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لیکن یہ انقلاب محض یورپی تعدی کے خلاف صدائے احتجاج نہ تھا بلکہ اس کا منشار اجنبی قاچار[2] خاندان کی

---

[1] انقلاب سے قبل اصلاحی تحریکات کا مشرح حال "×" کے مضمون "ایران کی سیاسی حالت" میں درج ہی جو جون ۱۹۱۴ء کے ریویو موند مسلمان میں شایع ہوا۔ نیز ملاحظہ ہو دامبیری کی کتاب "مشرقی ممالک میں مغربی تمدن"، +جنرل سر ٹی۔ ای گارڈن کا مضمون "ایران میں اصلاحی تحریک" جو ۱۴ مارچ ۱۹۰۰ء کو سنٹرل ایشیا سوسائٹی کی کارروائی میں شایع ہوا۔ مصنف

[2] قاچار موجودہ شاہی خاندان ایران کا نام ہی۔ دولت صفویہ کے زوال کے زمانہ میں فتح علی قاچار نے طہماسپ ثانی کو پناہ دی اور شاہ کا عرصہ دراز تک معاون رہا۔ نادر شاہ نے اُسے اس خدمت کی وجہ سے قتل کرڈالا۔ نادر شاہ کے بعد جو طوائف الملوکی پھیلی اُس میں محمد حسن نے اپنے وطن استراباد پر قبضہ کرکے علم آزادی بلند کیا اور احمد شاہ درانی کے حملوں کو کامیابی سے روکا اور بالآخر گیلان مازندران و استراباد پر قابض ہوگیا۔ اس زمانہ میں کریم اور آزاد دو اور سربرآوردہ اشخاص تھے لہذا سہ گونہ جنگ شروع ہوئی کریم نے اولاً محمد حسن پر حملہ کیا اور شکست کھائی۔ دوبارہ

مخالفت بھی تھی جس نے عرصہ دراز سے ایران میں بدنظمی پھیلا رکھی تھی۔ یہ شاہان قاچار ترکمانی نسل کے تھے۔ ان پر کبھی بھی ایرانی رنگ نہ چڑھا چنانچہ درباری زبان بجائے فارسی کے ترکی تھی۔ اُن کی حالت کم و بیش ایسی ہی تھی جیسے کہ چینی انقلاب سے پیشتر مانچو[۵] خاندان کی تھی۔ لہذا یہ ایرانی انقلاب اصلاً جملہ اثرات اغیار کے خلاف

بقیہ نوٹ متعلق صفحہ : ۔ کریم نے آزاد پر حملہ کیا۔ آخر الذکر نے قزوین میں محصور ہو کر کریم کو نقصانات عظیم پہونچائے۔ بالآخر کریم نے چیرہ دستی حاصل کر کے ۱۹ سال تک بحیثیت وکیل السلطنت حکومت کی۔ اُس کے بعد قاچار خاندان کے زمانہ نے مساعدت کی اور آغا محمد قاچار نے کل مدعیان سلطنت کا استیصال کیا۔ فرماں روایان قاچار حسب ذیل ہیں:۔ ۱۔ آغا محمد شاہ ۲۔ فتح علی شاہ ۳۔ محمد شاہ قاچار ۴۔ ناصر الدین شاہ ۵۔ مظفر الدین شاہ ۶۔ محمد علی شاہ ۷۔ اعلیٰ حضرت سلطان احمد شاہ قاچار موجودہ شاہ ایران۔ مترجم

۵۔ مانچو خاندان کی اصل کی بابت یہ متفقہ امر ہے کہ خاندان کن، کا شعبہ ہے جو شمالی چین پر حکمراں رہا۔ یہ تاتاری الاصل ہیں۔ اس خاندان کا ابتدائی قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ تین لڑکیاں آسمان سے پیدا ہوئیں اور کوہ ایض میں رہتی تھیں۔ ایک دن یہ تینوں بہنیں ایک جھیل میں نہا رہی تھیں اور ایک پھل چھوٹی بہن کی گود میں گرا جس نے اُسے کھالیا وہ حاملہ ہوئی ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام آئی سین گھیورو یعنی "زریں خاندان کی اصل" رکھا گیا۔ اپنی ماں کی وفات کے بعد یہ لڑکا ایک کشتی میں سوار ہو کر دریا ہر کا میں روانہ ہو گیا حتیٰ کہ وہ ایسے مقام پر پہنچا جہاں تین قبیلے رہتے تھے۔ اور آپس میں لڑتے تھے۔ اس لڑکے کی ذاتی وجاہت اور شکل و شباہت کا قبائل کے امیروں پر ایسا اثر پڑا کہ باہمی جنگ و جدال کو فراموش کر کے اسے اپنا بادشاہ بنا لیا اور شہر او تو لے اس کا پایہ تخت ہوا۔ اُس وقت سے یہ خاندان ترقی کرتا رہا یہاں تک کہ ۱۶۲۷ء میں خاندان منگ کا آخری فرماں روائے چین تخت نشین ہوا اور ملک میں طوائف الملوکی پھیل گئی۔ اس بغاوت کے فرو کرنے کے لیے خاندان مانچو سے مدد طلب کی گئی انھوں نے ایک مانچو شہزادے کو تخت نشین کر کے تاتسنگ خاندان کی بنیاد ڈالی اس نے ۱۶۶۱ء تک سلطنت کی ۱۶۶۱ء میں اُس کا بیٹا کانگی تخت نشین ہوا۔ ۱۷۳۶ء میں کین لنگ ۱۷۹۵ء میں کیا لنگ

خواہ مشرقی ہوں یا مغربی ایک ایرانی حب الوطنی کا مظاہرہ تھا۔

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ یہ حب الوطنی کی تحریک یوروپی شہنشاہیت کی جابرانہ مداخلت سے کیسی پامال ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں انگلستان اور روس نے پورا قابو حاصل کر لیا محبان وطن مجرم قرار دیئے گئے اور اُن پر ظلم کیے گئے۔ اور ایران حالت یاس میں غرق خاموشی ہو گیا۔ چنانچہ ایک برطانوی اہل قلم نے اُس وقت یہ تحریر کیا "ایسی شکستہ دلی و مایوسی اور نیز ایران کی موجودہ بدنظمی کے روس اور برطانیہ عظمیٰ دونوں براہ راست ذمہ دار ہیں۔ اگر کوئی روز شمار ہو تو اُن کو اس کا جواب دینا ہوگا۔ حالت میں ترقی کا ذکر کرنا محض یاوہ گوئی ہے درانحالیکہ ایران میں جو حکومت ہے وہ کابینہ ہے جو ملک کی غیر معتمد اور روس سے خائف ہے اور جس کو روس و انگلستان دونوں مالی حیثیت سے نہایت مفلس و نادار بنا کے تھوڑا تھوڑا روپیہ سخت سود پر دیتے ہیں اور اُس کو یہ بھی اجازت نہیں کہ وہ مسٹر شوسٹر جیسے ایماندار اور قابل ممالک غیر کے ماہرین ملازم رکھے۔ شاہ ہنوز کمسن نائب السلطنت غیر حاضر اور پارلیمنٹ معزول ہے اور بہترین اور دلیر ترین باایمان محبان وطن قتل یا جلاوطن کر دیئے گئے۔ ایسی حالت میں سرمایہ داروں و مراعات طلبوں اور حریصان ارض

بقیہ نوٹ متعلق صفحہ ۱ ۔ ۱۸۲۱ء میں تاؤ کوانگ جسے برطانیہ کو پہلی مرتبہ جنگ کرنی پڑی ۱۸۵۱ء میں ہیں لنگ تخت نشین ہوا اس کی زمانہ میں ٹائی پنگ کی بغاوت ہوئی۔ ۱۸۵۰ء لغایتہ ۱۸۷۵ء تنگ چی رہا جو لاولد مرا اور اُس کا ایک چچا زاد بھائی تخت نشین ہوا جس کا نام کوانگ سیو تھا اور ۱۴ نومبر ۱۹۰۸ء کو مرا۔ دسمبر ۱۹۰۸ء میں پوائی بعمر دو سال شہنشاہ ہوا ۱۹۱۱ء میں مستعفی ہوا۔ اور ۱۲ فروری ۱۹۱۲ء کو جمہوریت قایم ہوئی۔ مترجم

۱ ملاحظہ ہو ڈبلیو۔ ایم۔ شوسٹر کی کتاب "اختناق ایران" مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۲ء۔ انقلاب کے

کی گرگ خصال جماعت صید زبوں پر ٹوٹی پڑتی ہے جس کی مقاومت روز بروز کمزور تر ہوتی جاتی ہے۔ اب ایران کا بچنا اعجاز ہی ہوگا۔[1]

بلاد اسلامی میں قوم پرستانہ تحریک کی "ابتدائی منزل" کا ہمارا تبصرہ اس طور پر ختم ہوتا ہے۔ ہم کو یہ بھی ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ اسی عرصہ میں ہندوستان میں بھی قومی حمایت کی تحریک پیدا ہو رہی تھی اگرچہ یہ ایک مختص اور عجیب و غریب دائرہ میں چل رہی ہے۔ ہم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مندرجہ بالا تحریکات کے سوا اسلامی اقوام میں اور بھی چھوٹی چھوٹی حمایت قومی کی تحریکات مثلاً روسی تاتاریوں، چینی مسلمانوں اور ڈچ انڈیز کے اہل جاوا میں جاری تھیں۔ ہم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہ قومی حمایت کی تحریک کم و بیش اتحاد بین الاسلامی کے غیر قومی تحریک اور نیز ان "دوسری منزل" کی "نسلی" قومی تحریکات سے وابستہ ہیں جن پر ہم بہت جلد بحث کرینگے۔

دوم

اس فصل کے شروع میں ہم لکھ چکے ہیں کہ بیسویں صدی کے ابتدائی سنین میں ایشیا بالخصوص ترکی اور عرب اقوام میں پرستی کا دوسرا یعنی "نسلی" درجہ رونما ہو گیا تھا۔ قوم پرستی کی اس وسیع تر درجہ نے سب سے زیادہ ترکوں میں ترقی کی اور ان میں اس کی دو مختلف صورتیں پیدا ہو چکی تھیں جن کو ہم مصطلحات "اتحاد بین الاتراک" اور "اتحاد بین التورانی" سے موسوم کرتے ہیں۔ ہم ترکی قوم پرستی کی ابتدائی صورت یعنی اس کے محدود "عثمانی" ادراک کا ذکر سنہ ۱۹۱۲-۱۳ء کی

بقیہ صفحہ :- ابتدائی صور کے لیے ملاحظہ ہو ای-جی-براؤن کی کتاب "ایران میں انقلاب" مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۰ء مصنف

[1] ای-جی-براؤن کا مضمون "ایران کی موجودہ حالت" جو نومبر سنہ ۱۹۱۲ء کے کنٹیمپریری ریویو میں شایع ہوا۔ مصنف

جنگ ہائے بلقان کے اختتام تک کہہ چکے ہیں۔ اور اسی عہد میں ترکی قوم پرستی کا دوسرا پایا "نسلی"، پہلو اوّل مرتبہ نمایاں نظر آتا ہے۔

اس زمانہ تک عثمانی ترک یہ احساس کرنے لگے کہ وہ دنیا میں یکہ و تنہا نہ تھے اور یہ کہ وہ اصلاً اُن کثیر الجماعات اقوام کا مغربی شعبہ تھے جو مشرقی یورپ اور کل ایشیاء میں بحیرۂ بالٹک سے لیکر بحر الکاہل تک اور بحر روم سے لیکر بحر شمالی تک پھیلی ہوئی تھیں جن کو ماہرین تشریح اجسام انسانی "ارالو آلٹائک" اور عرف عام میں تورانی کہتے ہیں۔ اس جماعت میں بہت سے دور افتادہ منتشر اقوام یعنی قسطنطنیہ اور اناطولیہ کے عثمانی ترک۔ ایران اور ایشیائی متوسط کے ترکمان جنوبی روس و ماورائے قفقاز کے تاتاری۔ ہنگری کے گیار[1] اور صوبجات بالٹک کے قوم فین اور سائبیریا کے اصلی باشندے اور نیز دور اُفتادہ مغل اور مانچو بھی شامل ہیں اگرچہ یہ اقوام تمدن وروایات و نیز ذاتی شباہت میں مختلف ہیں تاہم اُن میں خاص اور نمایاں صفات مشترک ہیں۔ ان کی سب زبانیں مشابہ ہیں اور ان کی جسمانی اور دماغی ساخت سے مسلمہ قرابت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ سب اقوام اپنی بڑی جسمانی قوت اور غیر معمولی قوت تحمل کے لیے مشہور ہیں اگرچہ ان میں قوت تخیل اور فنون لطیفہ کی ایجادی احساس کی کمی پائی جاتی ہے لیکن ان میں صبر و استقلال اور تحمل کی قوت بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ مزید براں انھوں نے ہمیشہ مافوق العادت جنگی قابلیت اور اسی کے

---

[1] مگیار۔ یا باشندگان ہنگری فنی اور ترکی اقوام کا شعبہ ہیں جو نشہ ء میں کوہ یورال سے والگا کے کنارے آئے اور ایک عرصہ کے بعد اُن کو قبیلہ خزر نے نکال دیا۔ اپنی بادشاہ ارپد کی سرکردگی میں یہ قوم مستقلاً پنونیا میں آباد ہوگئی اور اب موجودہ ہنگری میں آباد ہیں ان کی خصوصیات سڈول چہرہ خوبصورت جسم۔ بال و آنکھیں سیاہ۔ گندمی رنگ میانہ قد۔ مغرور المزاج اور حب الوطنی ہیں ان کی تعداد ایک کروڑ ہے۔ مترجم

ساتھ اقوام محکومہ پر اچھی حکمرانی کی قابل تعریف صلاحیت کا اظہار کیا ہی۔ بلاشبہ تو دنیا کے سب سے بڑے فاتحین میں سے ہیں مثلاً اٹیلہ[۱] اور اُس کے ہنس کی افواج اور ارپد اس کی قوم مگیار۔ اس پرنیج[۲] اور اس کے بلغاری۔ الپ ارسلان[۳] اور اس کی سلجوق

۱؎ اٹیلہ۔ یہ قہر خدا کہلاتا ہی اور قوم ہنس کا بادشاہ تھا۔ یہ قوم مغلوں کی شاخ تھی جس نے چوتھی صدی میں یورپ پر حملہ کیا اور رومی سلطنت کو تباہ کر کے ایک بڑی سلطنت قایم کرلی۔ اب یہ قوم یورپ سے مفقود ہوگئی ہی۔ اس کا زمانہ تقریباً ۴۰۶ء لغایتہ ۴۵۳ء ہی۔ اٹیلہ مندزوک کا لڑکا ہی اور اپنے چچا رہوا کے بجائے بمعیت اپنے بھائی بلیڈا کے ۴۳۳ء میں تخت نشین ہوا ۴۴۵ء میں بلیڈا کو مار کے تنہا حکمراں ہوا۔ اس کی اصلی سلطنت ہنگری ٹرانسلوینیا میں تھی۔ یہ یونان۔ تھریس اور مقدونیہ پر تاخت کر کے وسطی یورپ کا مالک بن بیٹھا ۴۵۱ء میں فرانس پر حملہ کیا اور رومی جنرل اٹیس سے شکست کھائی۔ دوسری سال اُس نے شمالی اطالیہ کو تباہ کردیا اور رومتہ الکبری پر چڑھ آیا۔ یہ شہر محض پوپ کی درخواست پر بچا۔ جس دن اُس نے برگنڈی کی شہزادی ہلڈہ سے شادی کی اسی شب میں مرگیا۔ مترجم

۲؎ بلغاری یہ یوگری یا فینی نسل کے ہیں اولاً ۱۲۰ء قبل مسیح ان کا ایک گروہ بسر کردگی وانڈار مینیا میں سکونت پذیر ہوا۔ اس کے بعد پانچویں صدی عیسوی میں یہ دریا ڈانیوب کے کنارے پہنچ گئے اور مشرقی سلطنت سے طرح مخالفت ڈالی۔ ۶۶۰ء میں یہ مختلف فرقوں میں منقسم ہوگئے۔ ان میں سے ایک زبردست گروہ نے بسر کردگی اسپریج یا اسپاچ دریائے ڈانیوب کو عبور کر کے میزیا میں مقیم ہوا اور سلافی آبادی کو محکوم بنایا۔ یہ اسپریج کبرات کا پوتا تھا جس نے اس قوم کو اواروں کی حکومت سے آزاد کیا۔ مترجم

۳؎ الپ ارسلان جس کے معنی بہادر شیر کے ہیں اس کا نام محمد ابن داؤد ہی ۱۰۲۹ء لغایتہ ۱۰۷۲ء خاندان سلجوق کا دوسرا سلطان ہی اس کا دادا سلجوق تھا جو خاندان سلجوقی کا بانی ہی اس نے کل ایران کو فتح کر کے دیگر حصص ایشیا پر قبضہ کیا۔ نظام الملک اس کا وزیر تھا۔ مترجم

ارطغرل اور اوسکی عثمانی۔ چنگیز خاں[۱] اور تیمور لنگ[۲] اور اُس کی اٹل مغل قبایل۔ بابر فاتح ہند اور نیز دور افتادہ ختا کے قبلائی خاں[۳] اور نورہاچو[۴] سب ایک ہی نمونہ کے بنے تورانی سواروں کے نشان سُم تاریخ کے مسودہ پر سب سے گہرے منقوش ہیں؂

---

[۱] چنگیز خاں (۱۱۶۲ لغایۃ ۱۲۲۷ء) یہ مغل بادشاہ بڑی فاتحین میں سے ہے یہ دریائے اونوں کے قریب منغولیا میں پیدا ہوا۔ اس کا اصلی نام تموجن ہے اور ۱۱۷۵ء میں تخت نشین ہوا۔ اس نے مغل قبائل کو متحد کر کے دو بار چین پر حملہ کیا اور ۱۲۰۸-۱۴ء میں چین کی دو سلطنتیں یعنی ہیا اور کین کو فتح کیا۔ ۱۲۱۹ء میں اُس کا سفیر مارا گیا اور اُس نے مشرق کی طرف حملہ کیا۔ اُس نے بخارا اور مرو کو لوٹا ہرات اور دیگر شہروں کو فتح کیا۔ جنوب و مشرق میں ترکوں کو پسپا کیا اور اُس کی افواج نے جنوبی روس اور شمالی ہند کو تباہ کیا۔ چین پر تیسرے حملہ میں وہ مرا۔ مترجم

[۲] تیمور لنگ ۱۳۳۶ء لغایۃ ۱۴۰۵ء۔ مشہور مشرقی فاتح جو بمقام کش پیدا ہوا اور جنگی زندگی ۱۳۵۸ء میں شروع کر کے سمرقند کا بادشاہ ہو گیا۔ اس نے بڑا حصہ ایران اور قفقاز کا فتح کیا اور ۱۳۹۸ء میں ہندستان پر حملہ کیا۔ شام میں حلب و دمشق کو تسخیر کیا۔ ۱۴۰۲ء میں سلطان بایزید کو بمقام انگورہ شکست دی جب وہ چین پر حملہ کی تیاری کر رہا تھا مر گیا۔ مترجم

[۳] قبلائی خاں ۱۲۱۶ء لغایۃ ۱۲۹۴ء چنگیز خاں کا پوتا اور مغلوں کا شاہ تھا۔ ۱۲۵۹ء میں اپنے بھائی منگو خاں کا جانشین ہوا۔ ۱۲۶۷ء میں چین پر حملہ کر کے خاندان مغلیہ قایم کیا اُس کی فتوحات میں کوچن چین تبت اور مغرب میں یورال کے پار تک تھیں۔ مگر اُس کو جاپانی مہم میں ناکامیابی ہوئی۔ مترجم

[۴] نورہاچو۔ خاندان مانچو سے سولھویں صدی میں یہ ایک چھوٹے سے قبیلہ کا سردار تھا اس نے اپنی دانشمندی اور بہادری سے اہل قبائل کو یکے بعد دیگرے مطیع بنا کر کل منچوریا پر قبضہ کر لیا اور چنگیز خاں کی طرح تینک منگ کا خطاب اختیار کیا اس خطاب کے معنی ”بہادر اور مشہور“ ہیں اور اپنے دوران حکومت میں ”طین منگ“ کا لقب اختیار کیا اس نے سلطنت چین سے آزاد ہو کر اصل خاندان مانچو کی بنیاد ڈالی جو چین پر حکمراں ہوا۔ مترجم

توران کا ماضی مختلف نقطہائے خیال سے خواہ باعظمت خواہ منحوس تصور کیا جاوے لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ ماضی نہایت پُر ولولہ ہے۔ بلاشبہ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ یہ مختلف اقوام دراصل ایک ہی صحیح نسل سے ہیں یا نہیں لیکن جیسا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اس سے عملی سیاسیات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ چونکہ ان کی زبانیں ملتی جلتی اور طبائع بھی یکساں ہیں اور روح کی تڑپانے والی روایات کے ذخائر سے بہرہ اندوز ہیں لہذا اُن کا باہمی یگانگت کا خیال ہی نہایت زور دار قومی تحریک کا سنگ بنیاد ہو سکتا ہے۔

فی الحقیقت ایک نسل پہلے اس قسم کی تحریک کی کوئی علامت موجود نہ تھی۔ فینی اور مانچو جیسے دور افتادہ قبائل ہی اپنی مشترکہ تورانی قرابت سے بالکل نابلد نہ تھے بلکہ ایسی قریبی اقوام جیسے عثمانی ترک اور وسط ایشیا کے ترکمان ایک دوسرے کو نے النفاقی اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ بلاشبہ عثمانی ترکوں میں نسلی احساس ایسا ہی مفقود تھا جیسا کہ قومی۔ ارمینس وامبیری ہم کو بتاتا ہے کہ ۱۸۵۶ء میں جب وہ پہلی مرتبہ قسطنطنیہ گیا تو لفظ ترک لوک (یعنی ترک) بہیمیت اور حماقت کا مرادف سمجھا جاتا تھا۔ اور جب لوگوں کو ترکی قبایل کی جو ایڈریانوبل سے بحر الکاہل تک پھیلے ہوئے تھے نسلی اہمیت کی طرف توجہ دلائی جاتی تھی تو وہ یہ جواب دیتے تھے کہ تم ہم کو کرغزی اور تاتاری خانہ بدوش جہال میں تو نہیں شمار کرتے ہو۔۔۔۔۔۔ چند مستثنیات کے سوا قسطنطنیہ میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جو ترکی قومیت یا زبان کے مسئلہ میں سنجیدگی سے دلچسپی رکھتا ہو۔[۵]

فی الواقع یہ ہنگری وامبیری اور فرانسیسی لیون کاہون جیسے مغربی ماہرین تشریح

---

[۵] وامبیری کی کتاب "موجودہ اور چالیس سال قبل کی ترکی"، صفحات ۱۱ و ۱۲۔ مصنّف

اجسامِ انسانی کے مساعی ہیں جنھوں نے اولاً توران سے اُس حجاب کو دفع کیا جس میں وہ مخفی تھا۔ اِن مساعی نے تورانی دنیا کی غیر متوقعہ وسعت کو روشن کر دیا۔ اور اُس نے فوراً ہی غیر مستند اہمیت حاصل کرلی۔ وامبیری اور اُس کے رفقار کی تصانیف کل توران میں شایع ہوگئیں اور ان تصانیف کو توران کی اُن صاحب فکر اشخاص نے جو عصر جدید کے مجہول داعیات سے بیدار ہو رہے تھے نہایت شوق سے پڑھا۔ اس تورانی تحریک کی جامعیت کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ یہ ترکی قسطنطنیہ اور کنارہ واگا کے تاتاری مراکز جیسے مقامات بعیدہ میں ایک ساتھ نمودار ہوئی۔ فی الواقع اگر کوئی تفاوت تھا تو صرف یہ کہ اس ہیجان نے باسفورس کے بالمقابل والگا میں اپنا عمل پہلے شروع کیا۔ یہ تاتاری نشاۃ اگرچہ غیر معروف ہے لیکن قوم پرستی کی تاریخ میں سب سے زیادہ مافوق العادت مظاہرہ ہے۔ تاتاری کسی زمانہ میں روس کے مالک تھے اور اگرچہ اُن کی زوالِ سلطنت کو ایک زمانہ ہوگیا لیکن وہ سلافی نسل کے سیل میں فنا نہ ہوئی۔ اگرچہ یہ قوم چارسو سال سے روسی حکومت کے ماتحت ہے۔ لیکن اُنھوں نے اپنی مذہبی و نسلی و مدنی شخصیت کو سختی سے قایم رکھا ہے۔ یہ تاتاری جنگی والگا کے کنارے بالخصوص قازان میں گنجان آبادی ہے اور جو کریمیا کے بڑے حصہ پر قابض اور ماورائے قفقاز میں بڑی تعداد میں اہم جماعت اقل ہیں سلافی سلطنت میں بالکل جدا گانہ "بستیوں" میں اگرچہ متفرق اور منتشر آباد ہیں لیکن غیر مرعوب ہیں۔

روسی تاتاریوں میں خود شناس قوم پرستی کی پہلی تحریک ۱۸۹۵ء میں نمودار ہوئی اور اُس وقت سے یہ تحریک تعجب انگیز سرعت سے ترقی کرتی رہی۔ ۱۹۰۵ء کے روسی انقلاب میں حکومت کی پابندیاں رفع ہونے سے باقاعدہ علمی شگفتگی شروع ہوگئی۔ کتابوں رسالوں کی کثرت متعدد اخبارات اور مستقل موقت الشیوع مطبوعات سے تاتاری نشاۃ کی زورمندی اور بارآوری کا ثبوت

ملتا ہو۔ روسی تاتاریوں کی معیشتی رفعت سے یہ یقین ہو گیا کہ جنگ کے مادی اسباب
اُن کے پاس موجود ہیں۔ باکو کے تیل کے کروڑپتی تاتاری تاجروں نے اس موقع پر
نمایاں حصہ لیا اور انھوں نے تحریک کی امداد میں نہایت فیاضی سے تھیلیوں کا
مُنھ کھول دیا۔ روسی تاتاریوں نے نمایاں قابلیت کا اظہار کر کے روسی ایشیائی متوسط
کے ترکمان بھائیوں کا جو قوم پرستی کے نقش سے زندہ ہو رہے تھے اعتماد حاصل کر لیا
پہلے روسی دوما میں مسلمانوں کی بڑی جماعت تھی جو ایسے جوش اور قابلیت سے
عمل پیرا تھے کہ روسی عوام نے سراسیمہ ہو کر گورنمنٹ کو اس پر آمادہ کیا کہ مسلمانوں
کی نمائندوں کی تعداد گھٹا کر روسی پارلیمنٹ میں تاتاری اثر کم کر دیا جائے[۱]۔
بلا شبہ روسی مسلمانوں نے نہایت ہوشیاری سے سلطنت روس
سے سیاسی وفاداری کا اعلان کیا۔ بااینہمہ بعض پرجوش طبائع نے ترکی استنبول
میں ایسا میدان عمل تلاش کر کے جس میں آزادی اور کامیابی کی زیادہ امید تھی
اپنی خفیہ توقعات کا اظہار کر دیا۔ یہاں سلطنت عثمانیہ کے اندر **اتحاد بین الاتراک** اور

---

[۱] تاتاری نشاۃ ثانیہ کے لیئے ملاحظہ ہو۔ ایس بروبلنیوس کا مضمون "روسی مسلمان" جو جنوری ۱۹۱۱ء
کے دی مسلم ورلڈ میں شایع ہوا۔ فیورٹ کا مضمون "کریمیا کے تاتاری" جو اگست ۱۹۰۷ء کے ریویو دو موند
مسلمان میں شایع ہوا۔ ایل شاتلی ایر کا مضمون "روسی مسلمان" جو دسمبر ۱۹۰۶ء کے ریویو
دو موند مسلمان میں شایع ہوا۔ فان میکے کا مضمون "سلطنت روس میں ایشیائی اقوام کی
بیداری" جو مارچ ۱۹۱۸ء کے جرمن ریویو میں شایع ہوا۔ آرمینس وامبیری کی کتاب "مشرقی
ممالک میں مغربی تمدن"۔ ایچ۔ ولیمس کا مضمون "روسی مسلمان" جو فروری ۱۹۱۲ء کے روسی
ریویو میں شایع ہوا۔ "X" کا مضمون "اتحاد بین الاسلامی اور اتحاد بین الاتراک" جو مارچ ۱۹۱۳ء
کے ریویو دو موند مسلمان میں شایع ہوا۔ (مصنّف)

اتحاد بین التورانی تحریکات میں روسی تاتاریوں نے نمایاں حصہ لیا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ والگا ہی کا ایک تاتاری یوسف بے اکچورہ اوگلو نامی تھا جو دراصل قسطنطنیہ کی پہلی جماعت اتحاد بین التورانی کا بانی تھا۔ اور اسی کی مشہور کتاب "تین سیاسی طریقے" ہی پر اس بحث کے متعلق مابعد کی تصانیف[۱] مبنی ہیں۔

نوجوان ترکوں کے ۱۹۰۸ء والے انقلاب تک استنبول میں اتحاد بین التورانی کی تحریک مشتبہ تھی۔ سلطان عبدالحمید جیسا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اتحاد بین الاسلامی کے موید اور جملہ تحریکات قوم پرستی کے دلی دشمن تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ حامیان اتحاد بین التورانی اگر مبتلائے عذاب نہ تھے تو ان کو سلطان نظر استحسان سے بھی نہ دیکھتے تھے۔ مگر نوجوان ترکوں کی قوم پرستی کے بااقتدار ہونے سے حالت بالکل بدل گئی۔ جدید حکومت کے عثمانی سازاعیان نے۔ اتحاد بین التورانی کے مواعیظ کو بہت شوق سے سنا اور ان میں سے اکثر اس تحریک میں شریک ہوگئے۔ یہ امر پیش نظر رکھنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ روسی تاتاری بدستور نمایاں حصہ لیتے رہے۔ اتحاد بین التورانی کا مبلغ اعلیٰ قابل ماہر سیاسیات احمد بے اغایف والگا کا ایک تاتاری تھا۔ اس کا اخبار الموسوم بہ ترک اردو (یعنی ترکی وطن) ترکی و تاتاری دنیا کے ہر حصہ میں پہنچتا تھا اور رائے عامہ کی ترقی میں بڑا اثر رکھتا تھا۔

اگرچہ احمد بے اغایف جیسے لیڈر ان نے کل تورانی دنیا یعنی فنلینڈ سے لیکر منچوریا تک کو ایک زبردست جماعت کے طور پر پیش نظر رکھا اور اس طرح وہ مکمل اتحاد بین التورانی کے حامی تھے لیکن ابتدا میں ان کے علمی مساعی قریبی تعلق کے

---

[۱] ان سرگرمیوں کی بابتہ ملاحظہ ہو "" کا مضمون مذکورہ بالا۔ نیز احمد یمین کی کتاب "موجودہ ترکی کے مطالعہ سے اس کی ترقی کا اندازہ"، مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۴ء (مصنف)

ترکی و تاتاری اجزا یعنی ترکی آل عثمان۔ روسی تاتاری۔ وسط ایشیا اور ایران کے ترکمانوں تک محدود تھے۔ چونکہ یہ سب اقوام مسلمان بھی تھیں نتیجہ یہ ہوا کہ اس تبلیغ میں مذہبی نیز نسلی رنگ بھی تھا اور چند لحاظ سے اتحاد بین الاسلامی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بلا شبہ اس مذہبی جزو کو نظر انداز کر کے بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ یہ تحریک اصولاً اتحاد بین التورانی تھی لیکن عملاً اُس وقت تک اتحاد بین الترکی سے زیادہ نہ تھی۔

سنہ ۱۹۱۲ء و سنہ ۱۹۱۳ء کی بلقانی جنگ نے اتحاد بین التورانی کی تکمیل میں سرعت پیدا کر دی۔ ان لڑائیوں نے نہ صرف ترکوں کو بلقان سے نکال کر اُن کی اُمیدیں ایشیا سے وابستہ کر دیں بلکہ ہنگریوں اور بلغاریوں کے دلوں میں فاتح سرویوں سے ایسی نفرت پیدا کر دی کہ ان دونوں اقوام نے اپنی تورانی الاصل ہونے کا اعلان کیا۔ اور سرویا اور روس کے اتحاد بین السلافی کے خطرے کے مقابلہ میں اتحاد بین التورانی کی استحکام کے خیالات سے شغفت[1] ظاہر کیا۔ اتحاد بین التورانی کے صاحب فکر حامی فی الحقیقت ایسے عظیم الشان اصول قایم کر رہے تھے جو بڑی سے بڑی امیدوں کو پورا کرنے کو کافی تھے۔ تورانی نسل کی مردانگی اور جفاکشی پر زور دیکر ان اصحاب فکر نے یقین کر لیا کہ تورانی ہی آئندہ با اقتدار ہونگے۔ چونکہ یہ مغربی مسئلہ ارتقا اور تشریح الاجسام کے سرگرم متعلم تھے انھوں نے نسلی ترقی و تنزل کے خود مخصوص نظریے قایم کیے۔ اتحاد بین التورانی کی تعلیم کی رو سے جنوبی ایشیا کی تاریخی اقوام یعنی عرب۔ ایرانی اور ہندی۔ انتہائے تنزل کو پہونچ گئی ہیں۔ یوروپی اقوام کی بابت اُن کا مقولہ ہے کہ یہ اس وقت اپنے نصف النہار سے گزر کر اور موجودہ حرفتی جد و جہد کی تپ سے زوال سے

---

[1] ہنگری اور بلغاریہ کے میلانات اتحاد بین التورانی کی بابت ملاحظہ ہو مصنف کا مضمون "اتحاد بین التورانی" جو فروری سنہ ۱۹۱۷ء میں امریکن پولیٹکل سائنس ریویو میں شایع ہوا۔ (مصنف)

ماندہ ہو کر مدارج انحطاط کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ تورانی ہی ہیں جو اپنی جبلی مردانگی اور تحمل و ہمت کی بدولت مغربی تہذیب کی دستبرد سے محفوظ ہیں اور مستقبل کے لیے بڑے محرک ہوں گے۔ بلاشبہ اتحاد بین التورانی کے بعض بافکر حامی تو یہ بھی اعلان کرتے ہیں کہ یہ اُن کی نسل کا مقدس فرض ہے کہ تازہ اور محفوظ تورانی خون کے نفوذ سے کل متنزل اور درماندہ دنیا کو از سر نو قوت پہونچائیں۔

بلاشبہ اتحاد بین التورانی کے حامیوں کو اس کا احساس ہو گیا کہ اُن کے رفیع منصوبوں کی تکمیل روسی سلطنت کی کامل تباہی پر منحصر تھی۔ بلاشبہ روسی سلطنت اپنی تاتاری و ترکمانی و کرغیزی و فنی اور اسی قبیل کی دیگر اقوام کی آبادی کی وجہ سے اتحاد بین التورانی کے موئدین کو تورانی زمین پر مختلف ضخامت کی سلافی نہ معلوم ہوتی تھی۔ لہذا روس کو وسیع "غیر آزاد توران" قرار دینا بڑی بلند پروازی تھی۔ با اینہمہ اتحاد بین التورانی کے موئدین کو زبردست مغربی امداد کی اُمید تھی۔ ان کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ جرمنی اور آسٹریا ہنگری بہت جلد روس سے جنگ کرنے والے تھے۔ نیز یہ بھی احساس ہوا کہ یہ ہنگامہ خواہ کتنا ہی خطرناک کیوں نہ ہو گرانقدر امکانات پیش کرے گا۔

اتحاد بین التورانی کی ان توقعات ہی نے اس جنگ عظیم میں ترکی کو سلطنتہائے وسطی کا زیادہ تر جانب دار بنا دیا۔ بلاشبہ انور پاشا اور دیگر حکمران جماعت کے لیڈران عرصہ سے تحریک اتحاد بین التورانی کے کم و بیش حامی ہو چکے تھے۔ فی الحقیقت ترکی حکومت کی کمان میں متورد چلے تھے۔ اس نے تحریکات اتحاد بین التورانی اور

---

۵ ملاحظہ ہو مضمون نوشتہ "×" مذکورہ بالا اور نیز اس کا مضمون "ہمعصر ترکی میں سیاسیات حاضرہ" جو اسلامی دنیا کے ریویو میں دسمبر ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا۔ مصنف

اتحاد بین الاسلامی دونوں سے ایک ساتھ کام لینا شروع کیا۔ دنیا کے کل مسلمانوں کے لیے "جہاد" کی شورش شروع کی اور تاتاری و ترکی اقوام میں اتحاد بین التورانی کی تبلیغ کو المضاعف کر دیا۔ اوایل جنگ میں جو اتحاد بین التورانی کی امنگیں تھیں اُن کی بہترین توضیح ماہر سیاسیات تکین الپ کی کتاب موسومہ "ترکی و اتحاد بین الترکی کا نصب العین" ہی۔ یہ کتاب ۱۹۱۵ء میں شایع ہوئی۔ تکین الپ کہتا ہی "اگر جرمنی و اسٹریا اور ترکی افواج نے روسی مطلق العنان حکومت کو پامال کر دیا تو تین چار کروڑ تورانی آزاد ہو جائیں گے۔ اس میں ایک کروڑ عثمانی ترک مل کر پانچ کروڑ نفوس کی قوم بن جائے گی۔ جو ایک بڑے تمدن کی طرف ترقی کرے گی۔ یہ تمدن غالباً جرمنی تہذیب کے مقابلہ کا ہو گا۔ اور اس میں رفیع تر صعود کی اہلیت و استعداد ہو گی بعض حالتوں میں فرانسیسی اور انگریزی انحطاط یافتہ تہذیب سے برتر ہو گا۔"

۱۹۱۷ء کے آخر میں بالشویک انقلاب کے بعد سلطنت روس میں جو تباہی آئی تو اس سے حامیان اتحاد بین التورانی کی توقعات کی حد نہ رہی۔ ان لوگوں کو اپنی کامیابی کی ایسی اُمید واثق ہو گئی کہ اُنھوں نے اپنے حلیف جرمنی کا بھی منھ بنانا شروع کیا۔ اور اس طرح اُنھوں نے اس نفرت کا اظہار کیا جو کل یوروپی اقوام کے خلاف ہمیشہ سے ان کے دل میں چھپی تھی۔ ایک جرمنی اسٹاف کا افسر خلیل پاشا کی گفتگو کو جو محاذ عراق کے کمانڈر اور انور پاشا کے چچا ہیں یوں بیان کرتا ہی "اولاً تمام قبایل جن کی مادری زبان ترکی ہی ایک قوم بنائے جاہیں۔ چونکہ قومی اصول کو سب پر فوقیت حاصل ہی۔ لہٰذا یہ ترکی عظمت وجلالت کی مہد یعنی ترکستان کی فتح کی تدبیر تھی۔ یہ پہلا کام تھا۔ از اں بعد اس مستقر سے سائبیریا کی قوم یا قوتن سے جو اپنے زبان کے تعلق کی وجہ سے ترکی نسل کی دور افتادہ مشرقی کونہ سے ملتی جاتی تھی تعلقات پیدا کیے جائیں۔ اس اتحاد میں قفقاز کے تاتاری قبایل کی شرکت بھی لازمی تھی جو قرابت قریبہ رکھتے تھے۔

ارمنی اور گرجستانی جو اس حصۂ ملک میں قلیل التعداد اقوام تھیں ان کو خواہ مخواہ مطیع بنایا جائے۔ ایسی متحد ترکی سلطنت جو کل بلاد اسلامی پر حکمراں ہو افغانستان اور ایران کے لیے بڑی دلفریب ہوگی۔ ..... دسمبر ۱۹۱۷ء میں جب عراق کے محاذ پر ترکی افواج کے ہتھیار ڈالنے کا خطرہ تھا تو خلیل پاشا نے کچھ غصہ اور کچھ مذاق میں مجھ سے کہا فرض کرو کہ ہم اس ریگستانی گڑھے کو انگریزوں کو لے لینے دیں اور ترکستان چلے جائیں وہاں میں اپنے بچے کے لیئے ایک جدید سلطنت بناؤنگا' اس نے اپنے لڑکے کا بڑے فاتح اور غارت گر چنگیز خاں کے نام پر نام رکھا تھا،،

فی الواقع ۱۹۱۸ء کے موسم گرما میں ترکی افواج نے ماورائے قفقاز اور ایران میں بارادۂ ایشیائے متوسط تاخت کی اس کے بعد مغربی محاذ پر جرمنی کو شکست اور لڑائی ختم ہوئی۔ اور بظاہر ترکی نصیب میں تباہی معلوم ہوتی تھی۔ اس وقت تو حامیان اتحاد بین التورانی بالکل بدحواس ہوگئے۔ مگر ان کی امیدیں پھر تازہ ہوگئیں جسے ہم بہت جلد بیان کرینگے۔

قبل اس کے کہ مشرق ادنیٰ کے اُن واقعات پر بحث کریں جو ۱۹۱۸ء

سلہ عثمانی جنرل اسٹاف کے سابق سردار ارنسٹ پاراکین کا مضمون جو برلنر تاجبلاٹ میں ۲۴ر جنوری ۱۹۱۹ء کو شایع ہوا۔ دوران جنگ میں ترکی حمایت قومی کی سرگرمیوں اور طرز عمل کے لیے ملاحظہ ہو انٹیلجنس ڈویزن جلد ۱۱۹۹ تورانی اور جامعہ تورانی کا رسالہ جس کو بحری معلومات کی ڈویزن کے جغرافی شعبہ نے مرتب کیا تھا مطبوعہ لندن ۱۹۱۹ء ای۔ ایف۔ بینسن کی کتاب "ہلال اور صلیب آہنی" مطبوعہ لندن ۱۹۱۸ء۔ ایم۔ اے۔ زابلیکا کی کتاب "ایشیا متوسط کے ترک مسئلہ جامعہ تورانی کی تحقیقات" مطبوعہ اکسفورڈ ۱۹۱۸ء ایچ مورگنتھو کی کتاب سفیر مورگنتھو کی حکایت مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۸ء۔ ہیری اسٹورمر کی کتاب "قسطنطنیہ میں جنگ کے دو سال" مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۷ء اور اے منڈلسٹام کا مضمون "ترکی جوش" جو ۲۲ر اپریل ۱۹۱۹ء کو نیو یورپ میں شایع ہوا۔ مصنف

سے کے بعد وقوع پزیر ہوئے، جن پر ایک ساتھ بحث کرنے کی ضرورت ہی۔ یہ بہتر ہوگا کہ ہم اسلامی دنیا کی دیگر تحریکات حمایت قومی کی "منزل دوم" کے ابتدائی ارتقا پر غور کریں۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ترکی قوم پرستی کے ہم عنان عربی حمایت قومی کی تحریک بھی "نسلی" منزل میں بتدریج ترقی کر رہی تھی۔ اور اُس کا نصب العین یہ تھا کہ "اتحاد بین العرب" کی ایک عظیم سلطنت قایم کی جائے۔ جس میں قومی اوطان یعنی جزیرہ نما عرب، شام و عراق کے علاوہ مصر و طرابلس و فرانسیسی شمالی افریقہ اور سوڈان کی مستعمرات بھی شامل ہوں۔

تحریک اتحاد بین العرب کی ترقی ذہنی طور پر ایسی نہیں ہوئی جیسی کہ اتحاد بین التورانی کی۔ اگرچہ اس کی عام روش ایسی مشابہ ہی کہ اس کے اصولوں پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہی۔ دونوں تحریکوں میں اہم فرق یہ ہی کہ اتحاد بین العرب کی تحریک اپنے خصائص میں زیادہ تر مذہبی اور اتحاد بین الاسلامی ہی۔ عرب اپنے آپ کو "برگزیدہ قوم" تصور کرتے ہیں۔ جو منجانب اللہ کل اسلامی دنیا کی امارت کی مستحق ہیں۔ اتحاد بین العرب کی تحریک میں اتحاد بین التورانی جیسی یکجہتی مفقود ہی اس کے دو مختلف ادراکی مراکز یعنی شام اور مصر ہیں۔ واقعہ نفس الامری یہ ہے کہ اتحاد بین العرب کی تجاویز کو مصر ہی میں بہت زیادہ ترقی دی گئی اور مصری نظام عمل کا رخ یہ ہی کہ کل عربی بولنے والے ممالک کو بسر کردگی خدیو متحد کیا جاوے۔ گو ابتدا میں غالباً برطانوی اتالیقی کے ماتحت ہو لیکن آگے چلکر برطانوی تسلط کو اتحاد بین العرب کے متحدہ عمل سے دفع کیا جاوے۔ یہ خیال کیا جاتا ہی کہ سابق خدیو عباس حلمی نے اس تحریک کی ہمت افزائی کی جسے انگریزوں نے ۱۹۱۴ء میں معزول کر دیا۔[۱۵]

---

[۱۵] اتحاد بین العرب کی ترقیوں کے لیے ملاحظہ ہو اے میوزل کی کتاب "ہمعصر عرب کی تاریخ" مطبوعہ

بلاشبہ گزشتہ جنگ عظیم نے بالخصوص حجاز میں ایک آزاد سلطنت قایم کرکے جو شام اور عراق کی بھی دعویدار ہی۔ اتحاد بین العرب کو مشتعل کر دیا۔ مگر مختلف عرب اقوام فی الحال مقامی آزادی کی اُن شورشوں میں مصروف ہیں جن کا جن کا نصب العین مصر و شام و عراق و طرابلس جیسے مقامات سے برطانیہ و فرانس و اطالیہ کا تسلط ہٹانا ہی۔ اسی مصروفیت کا نتیجہ یہ ہی کہ اتحاد بین العرب کی تحریک کا وسیع تر ادراک اگرچہ حمایت قومی کا اصلی جزو ہی لیکن بالفعل وہ اُن کے نظام عمل میں مقدم جزو نہیں سمجھا جاتا۔

مزید براں جیسا اوپر بیان کیا گیا ہی اتحاد بین العرب "اتحاد بین الاسلامی" اور "بین الاسلامی حمایت قومی" کے غیر نسلی ادراک کے ساتھ مخلوط ہی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہی کہ بین الاسلامی قوم پرستی میں تناقض و تضاد ہی یہ تضادم مغربیوں کے نقطۂ نظر سے ہی لیکن یہ ضروری نہیں کہ مشرقی تخئیل میں بھی ایسا ہو مشرق نے ہمارے خیالات قومیت و وطنیت کو کتنے ہی ذوق سے کیوں نہ قبول کیا ہو لیکن یہ خیالات اُن دماغوں میں پہونچے ہیں جو اسلامی اتحاد اخوت کے تصورات سے لبریز تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم نے جدید پر عجیب رنگ آمیزی کی ہی جس کا اثر یہ ہی کہ مسلمان جب ہمارے مصطلحات "قومیت" اور "نسل" وغیرہ کو استعمال کرتے ہیں تو ان الفاظ سے اُن کا مفہوم ہمارے ادراک سے بالکل جدا ہوتا ہی۔ فی الواقع یہ

بقیہ نوٹ صفحہ ؎ :- لینزک ۱۹۱۰ء ایم پکتھال کا مضمون "ترکی و انگلستان اور موجودہ خدشہ" جو یکم اکتوبر ۱۹۱۴ء کے ایشیاٹک ریویو میں شایع ہوا۔ اسے سر ڈی ایر کی کتاب "مسلمانوں کی قوم پرستی" + شیخ عبدالعزیز شاویش کا مضمون "عربی زبان کا حلقہ اثر" جو ستمبر ۱۹۱۶ء کے پروشی اینوئل میں شایع ہوا۔

اختلافات تمام سیاسی تصورات میں طاری ہیں بجز بسبیل تمثیل "سلطنت" کے لفظ کو لو۔ خالص اسلامی نمونہ کی سلطنت خالص مغربی نمونہ کی سلطنت کی طرح ایک معین اور منفرد قطعہ نہیں جس کی حدود مستقل اور جس کی سرحدوں کے اندر کابل اختیارات شاہی نافذ ہوں۔ برخلاف اس کے اسلامی سلطنت کم وبیش ایک غیر متشکل اور غیر معین مجموعہ ہے جس میں ایک مرکز یعنی مستقر حکومت ہے جس کے اختیارات بعد مسافت سے کم ہو کر غیر متعین اور بدنظمانہ آزادی میں غایب ہو جاتے ہیں۔ بلاشبہ گزشتہ نصف صدی میں اکثر اسلامی سلطنتوں نے مغربی طریقوں پر اپنی تنظیم کی کوشش کی لیکن قدیم میلان کا نمونہ افغانستان میں ملتا ہے جہاں کہ ہندوستان کی شمال و مغرب کی اقوام اگرچہ برائے نام افغان ہیں عملاً بالکل آزاد ہیں جنھوں نے انگریزوں کے خلاف بطور خود جنگ کی جس سے امیر نے بے تعلقی ظاہر کی اور گورنمنٹ برطانیہ نے بھی امیر کو ان کا ذمہ دار نہ سمجھا۔[1]

یہی حالت لفظ قومیت کی ہے۔ مسلمان کی نظر میں کسی اسلامی قومیت کا فرد بننے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی شخص اُس قوم میں پیدا ہو یا باضابطہ طور پر

---

[1] یہ سرحدی قبائل جو سلطنت برطانیہ سے لڑا کرتے ہیں دراصل امیر کے ماتحت نہیں ہیں۔ مصنف نے نہ معلوم کس وجہ سے یہ رائے قایم کی واقعہ یہ ہے کہ معاہدہ ۱۸۹۳ء میں بمقام کابل طے ہوا اس کی رو سے متعدد قبائل "خود مختار" تسلیم کیے گئے اور یہ دراصل سرحد افغانستان اور سرحد ہندوستان کے درمیان کی خود مختار ریاستیں ہیں۔ اس معاہدہ کی رو سے کابل کی سلطنت کی حدود بالکل معین ہو گئے ہیں۔ یہ حد بندی ۱۸۹۵ء میں شروع ہو کر ۱۸۹۶ء میں ختم ہوئی اس معاہدہ کے بعد سے اکثر قبائل برطانوی نگرانی میں آتے جاتے ہیں لیکن ان قبائل کے فتنہ و فساد آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ مترجم

حق پیدا ایش حاصل کرے۔ بلاد اسلامی کے ہر حصہ میں ہر مسلمان کم و بیش بے تکلف رہتا ہے۔ لہذا کوئی شخص اگر کسی خاص ملک میں موجود ہو اور وہ چاہے تو اس موجودگی ہی سے اچھا خاصہ فرد قوم بن سکتا ہے۔ بر سبیل تمثیل "مصر مصریوں کے لیے" اس کا فی الواقع وہ منشاء نہیں ہے جو ہم سمجھتے ہیں۔ الجزائر یا دمشق کا کوئی مسلمان قاہرہ میں سکونت پذیر ہو جائے تو اس میں کوئی چیز مانع نہیں ہے کہ وہ ایک مصری حامی قوم کی حیثیت سے ہر طور پر کام کرے اور مانا جاوے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں ہمیشہ سے ارضی و نیز روحانی اتحاد کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ تمام بلاد اسلامی کے متعلق مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ وہ دار الاسلام[1] ہیں جو ایک نوع پر کل مسلمانوں کا مشترکہ مقبوضہ ہیں اور کل مسلمانوں پر مشترکاً اس کا تحفظ فرض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی اسلامی ملک میں مداخلت غیر پر اسلامی دنیا کے دوسرے گوشہ کے مسلمان جن کو اس میں کوئی مادی نفع نہیں ہے اظہار ناراضگی کرتے ہیں۔

ان امور کو ذہن نشین کرنے کے بعد ہم اس امر کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ کیوں اکثر مسلمان اصحاب فکر نے قومیت نے مغربی ادراک کو دار الاسلام

---

[1] دار الاسلام کے لفظی معنی اسلام کا گھر ہیں اور غیر مسلم ممالک بحیثیت مجموعی "دار الحرب" کہلاتے ہیں جس کے معنی جنگ کا گھر ہے۔ (مصنف) مصنف نے دار الحرب کی تشریح میں غلطی کی ہے ہر دو مصطلحات کی تعریف جیسی شامی نے لکھی ہے پیش ناظرین ہے۔ دار الحرب ما یحکم فیہا باحکام اہل الشرک و لا یحکم فیہا باحکام اہل الاسلام (جس میں اہل شرک کے احکام جاری ہوں اور اسلامی احکام جاری نہوں) دار الاسلام ما یحکم فیہا باحکام اہل الاسلام (جس میں احکام اسلامی جاری ہوں) لو اجریت احکام المسلمین و احکام اہل الشرک لا تکون دار الحرب (جس جگہ مسلمانوں اور مشرکوں دونوں کے احکام جاری ہوں وہ دار الحرب نہیں ہے)

مترجم

کے قدیم خیال سے متحد کر کے ایک جدید ترکیب پیدا کی ہے جس کو اصطلاحاً "بین الاسلامی قوم پرستی" کہتے ہیں۔ اس طرز خیال کو ایک ہندوستانی مسلمان نے خوب بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے "مغرب میں حکمرانی کا کل علم اس اصول متعارفہ پر مبنی ہے کہ انسانوں کی تقسیم اصلاً نسل اور جغرافیہ کی بناء پر ہوتی ہے لیکن یہ خیالات مشرقیوں کے لیے اصول متعارفہ سے بہت دور ہیں۔ ان کے خیال میں نوع انسانی مذہبی خیالات کے بموجب منقسم ہوتی ہے اور اس اعتبار سے قوم یا سلطنت کی بناء پر اتحاد نہیں ہے بلکہ ملت[1] کی بنا پر ہے یوروپیوں کو اس میں اپنی ازمنہ متوسط کی تصویر نظر آتی ہے۔ یہ وہ منزل ہے جو اسلام کو مغربی مفہوم کے مطابق تجدید کے درجہ تک پہونچنے کے لیے طے کرنا چاہیے تعجب ہے کہ یہ لوگ اس امر کو نہیں سمجھ سکتے کہ مذہب ایک مسلمان کی نظر میں کیا چیز ہے۔ وہ یہ فراموش کرتے ہیں کہ اسلام صرف مذہب نہیں ہے بلکہ ایک معاشرتی نظام ایک مدنی ضابطہ اور ایک قومیت ہے۔ . . . . . اخوۃ اسلامی کا اصول خواہ اُس کو اتحاد بین الاسلامی کہو حب وطن کے مثل ہے صرف فرق یہ ہے کہ یہ اخوت اسلامی گو قوانین اور رسوم کی مطابقت میں منتج ہوتی ہے لیکن یہ مغربی قومیت کی طرح نسل، ملک یا تاریخ کی یگانگت سے پیدا نہیں ہوئی ہے بلکہ ہمارے عقیدہ کے بموجب براہ راست منجانب اللہ[2] ہے"

بین الاسلامی قوم پرستی نسبتاً حال کا مظاہرہ ہے اور ہنوز اس کے اصول

---

[1] یعنی کسی خاص مذہب کی باضابطہ جماعت (مصنف)

[2] محمد علی کا مضمون "ہند میں مسلمانوں کی تحریک" جو جنوری ۱۹۱۴ء کے ریویو پولیٹک انٹرنیشنل میں شایع ہوا۔ عہد نامجات صلح میں جو سلطنت عثمانی کا تجزیہ ہوا اُس کی خلاف احتجاج کرنے کے لیے جو وفد ۱۹۱۹ء میں مسلمانان ہند نے بھیجا وہ اُن کی سرکردگی میں تھا۔ (مصنف)

پایہ تکمیل کو نہیں پہونچے ہیں۔ تاہم یہ کل اسلامی دنیا میں روشناس ہو چکی ہو اور قوت پکڑ رہی ہو بالخصوص شمالی افریقہ اور ہندوستان جیسے ممالک میں جہاں پر کسی نہ کسی وجہ سے قومی حب وطن نے سرزمین کے لحاظ سے ترقی نہیں کی ہو۔ چنانچہ ایک فرانسیسی مصنف لکھتا ہو "اسلامی حمایت قومی کوئی منفرد یا منتشر شورش نہیں ہو یہ ایک سیل عظیم ہو جو ایشیا و ہندوستان اور افریقہ کے کل اسلامی دنیا پر موجزن ہو۔ قوم پرستی مسلمانوں کے عقائد کی ایک صورت ہے جو یورپی تمدن کے اتصال سے کمزور ہونے کی بجائے مزید مذہبی جوش حاصل کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہو۔ اور اپنی توسیع اور پیرو بنانے کی خواہش میں عوام کے مذہبی تعصب کو برانگیختہ اور منتخبین کے سیاسی میلان کی ہدایت اور ہر جگہ پُرخطر شورش کی کاشت کرکے اپنا اتحاد قایم کرنا چاہتی ہو[1]"۔ ممکن ہو کہ بین الاسلامی قوم پرستی اس طرح مستقبل میں ایک جزو عظیم ہو جائے جس کا مقابلہ نہایت سنجیدگی سے کرنا ہوگا[2]۔

---

[1] اے سروی ایر کی کتاب "مسلمانوں کی قوم پرستی"، صفحہ ۱۸ (مصنف)

[2] اتحاد بین الاسلامی کی قوم پرستی کے لیے علاوہ سروی ایر و محمد علی مذکورہ بالا ملاحظہ ہو اے لی شاتلی ایر کی کتاب "انیسویں صدی کا اسلام"، مطبوعہ پیرس ۱۸۸۸ء اسی مصنف کا مضمون "مسلمانوں کی سیاسیات"، جو ستمبر ۱۹۱۰ء کے ریویو دو موند مسلمان میں شایع ہوا۔ سر تھیوڈور ماریسن کا مضمون "انگلستان اور اسلام"، جو جولائی ۱۹۱۱ء کے رسالہ نائن ٹینتھ سنچوری اینڈ آفٹر میں شایع ہوا۔ جی موریلی کی کتاب "مسئلہ ایران"، صفحات ۲۳ لغایت ۳۱ مطبوعہ پیرس ۱۹۱۶ء ڈبلیو ای ڈی ایلن کا مضمون "موجودہ اور گزشتہ ماورائے قفقاز"، جو اکتوبر ۱۹۲۰ء کے کوارٹرلی ریویو میں شایع ہوا۔

(مصنف)

سُوم

دنیاے اسلام میں حمایت قومی کی تحریک پر ہمارا تبصرہ اِس طور پر ختم ہوتا ہو۔ ایسے پیچیدہ توقعات کی گتھی کی موجودگی ہیں جو اس ہنگامۂ رستخیز سے اور بھی اُلجھ گئی ہو یہ اقتضاے فطرت تھا کہ جنگ عظیم کے اختتام پر مشرق نے چینی کی جولانگاہ بن جائے۔ یہ ظاہر تھا کہ حقیقی تدبیر ہی سے کوئی تعمیری تصفیہ ہو سکتا تھا۔ بدقسمتی سے ورسیلز کی کانفرنس صلح حقیقی تدبیر سے معرّا تھی اور جو "تصفیہ" قرار پایا وہ صرف یورپ ہی میں اَمن قایم کرنے سے قاصر نہ رہا بلکہ اُس نے مشرق کے متعلق ایسا طرز عمل ظاہر کیا جو قبل از جنگ کی نسے موقع شہنشاہیت اور حریصانہ عملی سیاسیات کی رو سے زندہ تھا۔ ظاہرا یہ معلوم ہوتا ہو کہ فاتح اتحادی علم النفس کی اون بڑی تبدیلیوں کو جو جنگ عظیم سے پیدا ہوئی تھیں اور نیز اس لحاظ سے جو طرز عمل اور حکمت عملی میں تبدیلی ضروری تھی اُس کو بالکل فراموش کر کے مشرق سے ایسا برتاؤ کرنے لگے گویا یہ کہ ہنگامۂ رستخیز محض ایک سرحدی تاخت اور ایشیا ایک صدی قبل کا خوابیدہ عفریت[1] تھا۔

---

[1] صلح کانفرنس کے معاہدے کے خاص خاص شرائط کا خلاصہ حسب ذیل ہی:-

اوّلا لیگ اقوام کے شرائط میں حسب ذیل امور شامل ہیں یعنی لیگ کے فرایض کو ایک کونسل اور ایک اسمبلی انجام دے گی۔ کونسل میں سلطنت برطانیہ و فرانس و اطالیہ و جاپان کے نمائندے ہیں۔ ریاست ہاے متحدہ امریکہ کی نمائندگی کے لیے بھی جگہ رکھی گئی ہو بشرطیکہ سلطنت مذکوران شرائط کو منظور کرے۔ علاوہ ازیں چار اُن دیگر ممالک کے نمائندے شامل

فی الواقع اب اتحادیوں نے اُصول حریت کے عام اعلانات اور اقوام مشرق قریبہ کے لیئے خود انتظامی کے اُن مواعید خاص کو پس پشت ڈال کر

بقیہ نوٹ صفحہ سابق ۱۔ ہونگے جن کو اسمبلی نامزد کرے۔ اس تعداد میں اضافہ کی گنجایش ہو اسمبلی میں اُس کے ممبران میں سے ہر ایک کے زیادہ سے زیادہ تین نمائندے ہونگے۔ اسمبلی اور کونسل کے فیصلے متفق ہونگے۔ لیگ کے فرایض یہ ہیں کہ دنیا میں امن قایم رکھے فوجی سامان کی کمی کیجائے اور تعداد ایسی معین کردی جائے جو محض قومی تحفظ کے لیے کافی ہو۔ ممبران لیگ کے درمیان جو نزاعات پیدا ہوں اُس کو طے کرے یا اُن میں ثالثی کرے ایک بین الاقوامی عدالت قایم کی جارے۔ لیکن کونسل کسی ایسے معاملہ میں دخل نہ دے گی جو کسی ممبر کے خالص اندرونی معاملات سے تعلق رکھتا ہو۔ اگر کسی نزاع کی فریقین میں سے کوئی فریق ممبر لیگ نہیں ہو تو وہ اغراض تصفیہ نزاع کے لیے ممبر بنا لیا جائے گا۔ اگر کوئی ممبران شرائط کے خلاف جنگ شروع کرتا ہو تو دیگر ممبران اُس کا اقتصادی مقاطعہ کرینگے اور کونسل یہ سفارش کرے گی کہ ہر ممبر کس قدر افواج لیگ کے شرائط کے تحفظ کے لیے دیگا۔ بین الاقوامی دفاتر اور کمیشن لیگ کے ماتحت ہوں گے۔ لیگ کو اُن اقوام پر حکم بردار مقرر کرنے کا حق ہوگا جو خود ترقی نہیں کرسکتی ہیں۔

دوم و سوم۔ جرمنی کے سرحدیں اور یورپ کے ملکی شرائط۔ السیس لورین فرانس کو واپس دیا جاوے اور وادی سار کی کوئلہ کی کانیں فرانس کو دی جاویں اور اس ملک کی حکومت ایک کمیشن منجانب لیگ اقوام کرے آئندہ کے لیے انتخاب عامہ سے طے ہوگا۔ جرمنی رائن کے ۵۰ میل تک کوئی قلعہ نہ بنائے۔ علاقہ جات موری سینٹ یوبن۔ مالمڈی بلجیم شلیزوگ ڈنمارک کو صوبہ پوسن اور مغربی پروشیا پولینڈ کو دی گئی ڈینزگ آزاد کر دیا گیا۔ چہارم۔ جرمنی سے باہر کل مستعمرات اور حقوق سے باز دعوے اور مصر و مراکش پر برطانوی و فرانسیسی صیانت تسلیم کی جاوے۔ پنجم جرمنی صرف ایک لاکھ فوج رکھے ۶ بڑے جنگی جہاز ۶ ہلکی کروزر ۱۲ تباہ کن کشتی ۱۲ تارپیڈو کشتی۔ کوئی کشتی زیر آب نہ رکھی جاوے۔ نہ بنائی جاوے اور نہ

جو انھوں نے دوران جنگ میں کیے تھے خفیہ عہدناموں کا ایک سلسلہ پیش کیا۔ یہہ عہدنامے اُنھیں سنین جنگ میں ہوئے تھے۔ جبکہ وہ ایسے فریب وہ تقریریں کر رہے تھے۔ ان عہدناموں کی رو سے باشندگان ملک کی خواہشات کے خلاف سلطنت عثمانیہ

بقیہ صفحہ ماسبق ۔ سامان حرب کی درآمد و برآمد ہو۔ بقیہ کل سامان حرب اتحادیوں کو دیدیا جائے۔ ششم شرائط دربارہ میدان جنگ ہفتم۔ اتحادیوں نے پانچ جج شہنشاہ جرمنی کے مقدمہ کی سماعت مقرر کئے۔ ہر شخص جس نے دوران جنگ میں جرایم کیے تھے وہ اتحادیوں کے سپرد کی جاویں۔ ہشتم تاوان۔ جرمنی نے ۲۰ ارب مارک طلائی دو سال میں ادا کرنے کا وعدہ کیا اور ایک ارب سالانہ سال تک دے گا اُس کے بعد دو ارب چالیس کروڑ سال ادا کرے۔ اس کے معاوضہ میں جرمنی کو تجارتی جہازوں اور سعار کے کوئلے کی کانوں اور دیگر سامان فروخت شدہ کی قیمت محسوب کی جاوے بقیہ شرائط دربارہ مالیات و مسایل اقتصادی و بنادر وغیرہ کے تھیں۔ رائن مشترکہ کمیشن کے قبضہ میں رہے اور مجلس کل اقوام کے لیئے تجارتی اغراض کے لیے کھلی رہے۔ جرمن گورنمنٹ نے اس صلح کو جنوری ۱۹۲۰ء میں تصدیق کیا اور اُس کے بعد بہت سے مباحثہ اور بالآخر سان ریمو کی کانفرنس میں یہ طے ہوا کہ وادی رہور میں قیام امن کے فرایض جرمنی کے سپرد کیے جاویں جو بغاوت فرو کرنے کے لیے اضلاع پر شرطیہ قبضہ کر سکتے تھے۔ یہ اعلان کیا گیا کہ اتحادی جرمنی کے کسی حصہ ملک کا الحاق نہیں کرنا چاہتے ہیں یہ اعلان اس وجہ سے لازمی ہوا کہ فرانسیسی یہ کوشش کر رہے ہیں کہ وادی رائن پر قبضہ کر لیا جاوے۔ ادائگی تاوان کے تعین کے لیئے نمائندے بمقام رسپا طلب کیے جاویں۔ چونکہ جرمنی نے صلح نامہ پر دستخط کرنے سے تین ماہ کے اندر اپنے قرضہ جات کے تصفیہ کے لیے تجاویز پیش نہیں کیں لہذا یہ ضروری ہوا کہ یہ طے کیا جاوے ۲۸ رجون ۱۹۱۹ء کے خط میں جو شرائط تحریر تھیں اُس کی تعمیل کے لیے کیا کارروائی کی جاوے۔ شام کی حکمبرداری فرانس کو جزیرۃ العرب کے بشمول موصل برطانیہ کو۔ اور فلسطین کی حکمبرداری برطانیہ کو دی گئی اور مسٹر بالفور نے جو اعلان یہودیوں کے متعلق کیا تھا اُس کو قایم رکھا گیا۔ جبتک ترکی صلحنامہ پر دستخط نہ کرے برطانیہ درہ دانیال کی حفاظت کرے

کو فاتحین میں تقسیم کیا گیا۔ اتحادیوں کی مزید اغراض کا اظہار اس طرز عمل سے ہوا جو ورسیلز کی کانفرنس نے ایرانی نمائندوں کی شرکت سے انکار کرنے میں اختیار کیا حالانکہ ایران اصولاً ہنوز آزاد تھا۔ لیکن ان نمائندوں کو پیرس میں پڑا رہنے دیا۔ اور برطانوی دباؤ نے شاہ کی سلطنت کو طہران میں ایک "اقرار نامہ" کی تکمیل پر مجبور کیا۔ جس کی رو سے ایران معناً سلطنت برطانیہ کی صیانت میں آگیا۔ اب رہے مصری سو وہ تو ہمیشہ ہی سے اس صیانت کے خلاف احتجاج کر رہے تھے جس کا برطانیہ نے بطور خود ۱۹۱۴ء میں اعلان کیا۔ کانفرنس نے اُن کے نمائندوں کی طرف توجہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اُن کو یہ سمجھا دیا گیا کہ کانفرنس مصر پر برطانوی صیانت کو امر مسلمہ سمجھتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جنگ کی بدولت مشرق ادنیٰ و وسطےٰ پر یورپی اقتدار کمزور ہونے کی بجائے مستحکم تر ہو گیا۔

بقیہ متعلق صفحہ ماسبق:- اور سلیشیا فرانس کی حفاظت میں رہے اور نہ اطالیہ کے۔ سپریم کونسل امریکہ سے درخواست کرے کہ وہ ارمینیا کی حکم برداری اپنی ذمہ لے اگر اس سے انکار ہو تو مسٹر ولسن حدود کا فیصلہ کریں۔ اس کے بعد رسپا کانفرنس میں جرمنی کی شرائط میں کچھ رعایت کی گئی اور ترکی کے لیے یہ تجویز ہوا کہ جو شرائط ترکی کو بھیجی گئیں اُن میں کوئی تبدیلی نہ ہو اور ترکی معاہدے پر دستخط دس روز کے اندر کرے۔ معاہدے سیورے مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کی رو سے سلطنت ترکی یورپ سے معدوم ہو گئی اور خاص ترکی ایک چھوٹی سی ایشیائی سلطنت رہ گئی۔ آسٹریا ہنگری سے صلح ۱۰ ستمبر ۱۹۱۹ء کو ہوئی لیکن اس سے قبل ہی اس سلطنت کی مختلف اقوام منفرد ہو کر متعدد ریاستیں قایم ہو گئیں۔ زیکوسلوواک کی آزادی کو اتحادیوں نے اگست ۱۹۱۸ء میں تسلیم کیا۔ رو تھینس اور سلافیوں نے بھی آزادی کا ادعا کیا اور ہنگری بھی علیحدہ ہو گئی۔ ۱۲ نومبر ۱۹۱۸ء کو جرمنی اور آسٹروی جمہوریہ کا اعلان ہوا اور اسی کے مبعوثین نے ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کے معاہدہ پر دستخط کیے۔

(مترجم)

لیکن اس عجیب کارروائی کا عجیب ترین پہلو ابھی باقی ہے۔ یہ خیال ہوسکتا ہے کہ اتحادی لیڈروں نے اس کو محسوس کرلیا ہوگا کہ وہ آگ سے کھیل رہے ہیں اور اُن کی کامیابی محض کامل رفاقت کار اور سرعت عمل پر منحصر ہے۔ لیکن حقیقت میں واقعہ بالکل اس کے برعکس تھا۔ اتحادیوں نے پہلے تو سب اپنی چالوں کا اظہار کیا جس سے مشرق میں طلسم فریب ٹوٹنے پر یاس اور غصہ کی لہر پھیل گئی۔ پھر غنایم پر آپس میں لڑنے لگے۔ تقریبًا دو سال تک لڑنے جھگڑنے کے بعد کہیں جاکر انگلستان و فرانس اور اطالیہ کے درمیان تجزیہ سلطنت عثمانیہ کی بابت کوئی سطحی تصفیہ ہوسکا۔ اور اس عرصہ میں اتحادی کل مشرق قریبہ میں ایک دوسرے کے خلاف سازشیں اور بدگوئیاں کرتے رہے یہ قطعی دیوانگی تھی۔ اس سے اُن اقوام کو جو اتحادی چالبازی کا شکار ہونے والی تھیں یہ معلوم ہوگیا کہ یوروپی اقتدار کا دارومدار نہ صرف اخلاقی "احساسات" سے عدم توجہی بلکہ معاملہ فہمی کے فقدان پر بھی مبنی تھا۔ یہ نتیجہ ظاہر تھا کہ اقتدار کی جو عمارت ایسی بوسیدہ بنیاد پر قائم ہو اوس کا انہدام ہی مناسب ہے۔

بہر نوع کثیر التعداد مشرقیوں نے اس حالت کو اس نظر سے دیکھا اور اُن کی باغیانہ خیالات کو صرف اپنی قوم کی واقفیت اور مغرب کی نااتفاقی ہی سے نہیں بلکہ اُن کے جدید معاون یعنی بالشویک روس کی ہمت افزا سرگرمی سے اشتعال ہوا۔ روسی بالشویکوں نے مغربی تمدن کے مقابلہ کا اعلان کیا۔ اور اس نے خوف لڑائی میں جو درپیش تھی بالشویک سرداروں نے مشرق کے ان زریں مواقع کو نہایت ہی خطرناک مسرت سے دیکھا۔ مشرق میں بالشویک کارروائیوں پر بحث معاشرتی شورش کی فصل میں کی جائے گی۔ اس موقع پر یہ یاد رکھنا کافی ہے کہ بالشویک تبلیغ اوس عظیم ہیجان میں بڑا عنصر ہے جو کل مشرق ادنےٰ و وسطےٰ میں پھیلا ہوا ہے۔ ہیجان ایسا ہے کہ اس نے بعض ممالک کو بدنظمی کے کنارہ پر پہونچا دیا ہے اور مستقبل قریبہ میں

اِس کے کم ہونے کی بجائے بڑھنے کا خوف ہے۔

اِس زمانہ کی مشرقی نئے چینی کو بالتفصیل بیان کرنے کے لیے خود ایک کتاب درکار ہے۔ اس وقت ہم اس پر اکتفا کرینگے کہ اِس نئے چینی کے خاص مراکز پر غور کریں یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ نئے چینی کل بلاد اسلام میں فرانسیسی شمالی افریقہ سے لیکر ایشیائے متوسط اور ڈچ انڈیز تک موجود ہے۔ جن مراکز کا بیان تبصرہ کیا جائے گا وہ مصر۔ ایران۔ اور سابق سلطنت عثمانیہ کے ترکی و عربی ممالک ہیں۔ نئے چینی کے پانچویں بڑے مرکز یعنی ہندوستان پر دوسری فصل میں بحث کی جاوے گی۔

اِس طوفان کا آغاز مصر میں ہوا۔ دوران جنگ میں مصر میں برطانوی افواج کا ٹڈی دل جمع تھا اور نہایت ہی سخت مارشل لا جاری تھا لہٰذا مصر میں سکوت رہا لیکن یہ فقدان عمل کی وجہ سے نہیں بلکہ انسدادی تشدد کی بدولت تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بیسویں صدی کے اوائل میں سب تعلیم یافتہ مصری کم وبیش حمایت قومی کے خیالات سے متاثر ہو چکے تھے۔ اگرچہ ان کا بڑا حصہ انقلابی ذرائع کی بجائے ارتقائی تدابیر کا حامی تھا۔ معتدلین کی سب سے بڑی اُمید برطانوی حکومت کی عارضی حالت تھی جب تک انگلستان نے مصر میں اپنے "عارضی قبضہ" کا اعلان بحال رکھا ہر بات ممکن تھی لیکن ۱۹۱۴ء میں جیسے ہی اعلان صیانت ہوا جس کی رو سے مصر سلطنت برطانیہ کا ایک جزو قرار پایا صورت حالات بالکل بدل گئی۔ بڑے سے بڑے معتدل قوم پرستوں تک کو یہ احساس ہوا کہ بلا سماعت اُن کے خلاف مستقل کا فیصلہ کر دیا گیا۔ اور اُن کی آخری تمناؤں کا راستہ مسدود ہو چکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اعتدال پسندوں کو بھی انتہا پسندوں میں شامل ہونا پڑا۔ اور ضرورت کے وقت اعتدال پسند بھی جبریہ عمل کے لیے انتہا پسندوں کے شریک ہونے کو تیار ہو گئے۔

بلاشبہ انتہا پسند قوم پرستوں نے شروع ہی سے اس صیانت کے خلاف بڑی سختی سے احتجاج کیا تھا اور اختتام جنگ پر ایک وفد جس میں دونوں قسم کے قوم پرست شامل تھے ورسیلز کانفرنس کے سامنے اپنی دعاوی پیش کرنے کو پیرس روانہ ہوا۔ کانفرنس نے جو مصر پر برطانوی صیانت کو تصفیہ صلح کا ایک جز قرار دے چکی تھی جب انھیں بے نیلِ مرام واپس کر دیا تو مصری وفد نے باضابطہ احتجاج جاری کیا اور مشکلات سے متنبہ کیا۔ اِس احتجاج کا اقتباس حسب ذیل ہے:-

"ہم نے یکے بعد دیگرے ہر در کو کھٹکھٹایا ہے لیکن ہم کو کوئی جواب نہ ملا۔ اگرچہ فاتح اقوام کے سربرآوردہ مدبرین نے اس بارہ میں صریح وعدے کیے کہ اُن کی فتح کے معنی یہ ہیں کہ حق جبر پر غالب آئے گا اور قلیل التعداد اقوام کے لیے "خود انتظامی" کے اصول کا قیام و استحکام ہوگا۔ لیکن مصری قوم سے اُن کی سیاسی حیثیت کی بابت صلاح لیے بغیر مصر پر برطانوی صیانت کی توثیق ورسیلز اور سینٹ جرمین[1] کے عہد ناموں میں درج کر دی گئی۔"

ہماری قوم کے خلاف یہ جرم اور اُن دول کا یہ خلاف دیانت فعل جنھوں نے اوسی ایک عہد نامہ میں مجلس اقوام کی ترتیب کا اعلان کیا ہے اوس کی تکمیل ہونے سے قبل ہم یہ آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ مصری قوم تصفیہ پیرس کو کالعدم سمجھتی ہے۔ اگر ہماری بات نہیں سُنی جاتی تو اُس کی صرف یہ وجہ ہوسکتی ہے کہ ابتک

---

[1] سینٹ ژرمین یا جرمین فرانس کا ایک شہر ہے جو پیرس سے ۱۳ میل بجانب مغرب واقع ہے بموسم گرما میں اکثر اشخاص یہاں آتے ہیں اور اس میں جنگل اچھے ہیں۔ ۱۹۱۹ء میں آسٹریا نے اسی مقام پر عہدنامہ صلح پر دستخط کیے۔ (مترجم)

جو خونریزی ہوئی ہو وہ قدیم نظام کے انہدام اور جدید نظام کے قیام کے لیے کافی نہیں ہے۔"[1]

قبل اس کے کہ یہ سطور طبع ہوئیں مصر میں مشکلات رونما ہوگئیں۔ مصری وفد کے پیرس پہونچنے کے ساتھ ہی قوم پرستوں نے اپنے مطالبات کو برطانوی حکام کے سامنے پیش کیا۔ قوم پرستوں کے پروگرام میں مصر کی کامل حکومت خود اختیاری کا مطالبہ تھا اور انگلستان کو پبلک قرضہ جات اور نہر سویز پر نگرانی کا حق دیا گیا تھا۔ قوم پرستوں کی قوت کا اظہار اس امر سے ہوا کہ ان تجاویز کو مصری وزارت نے بھی تصدیق کیا جس کو خدیو مصر نے برطانوی تجویز سے مقرر کیا تھا۔ دراصل مصری وزیر اعظم رشدی پاشا نے اپنے چند رفقار کے ساتھ لندن جاکر معاملہ پیش کرنے کی اجازت مانگی۔ اس سے برطانوی حکام کی حالت مصر میں نہایت نازک ہوگئی۔ لیکن اُنھوں نے استقلال سے کام لینے کا ارادہ کرلیا اور یہ جواب دیا کہ اب مصر برطانوی صیانت میں ہے اور سلطنت کا اصلی جزو ہے لہذا انگلستان مصر میں امن و امان اور اچھی گورنمنٹ کے قیام کی ذمہ داری کو نظرانداز نہیں کرسکتا اور مصری لیڈروں کو انگلستان جانے اور وہاں پر ایسے فضول اور ناقابل سماعت مطالبات پیش کرنے کی اجازت دینے سے کوئی مفید مطلب نہیں حاصل ہوسکتا۔

انگریزوں نے مضبوط طرز عمل اختیار کیا۔ مصری روش بھی کچھ کم مضبوط نہ تھی وزارت نے فوراً استعفا دیدیا۔ کوئی جدید وزارت نہ قایم ہوسکی اور نہ برطانوی ہائی کمشنر جنرل البنائی کو کھلم کھلا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لینا پڑا۔ اسی اثنار میں قوم پرستوں نے یہ اعلان کیا کہ وہ مصری قوم کے طرز عمل کی توضیح کے لیے عوام کی رائے کو معلوم کرینگے اگرچہ برطانوی حکام نے اس کی مانعت کردی لیکن عوام کی رائے خلاف قانون لی گئی اور

---

[1] مصری صحیفۂ ابیض یعنی مصری وفد کی صلح کانفرنس سے مراسلت کا سرکاری مجموعہ۔ مصنّف

قوم پرستوں کے بیان کے مطابق اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کے مطالبات کی کثرت رائے سے تصدیق ہوگئی۔ اس سرکشانہ طرزِ عمل نے برطانیہ کو تشددی عمل پر مجبور کیا لہٰذا ۱۹۱۹ء کی بہار میں بہت سے قوم پرست لیڈر گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیئے گئے۔

مصر کی طرف سے اس کا جواب ایک طوفان کی صورت میں رونما ہوا ملک کے ہر گوشہ میں آتش بغاوت بھڑک گئی۔ ہر جگہ ایک ہی صورت تھی۔ ریلیں اور تار باقاعدہ توڑ دیئے گئے۔ گاڑیاں روک کر لوٹ لی گئیں۔ اکا دُکا برطانوی افسر اور سپاہی قتل کر دیئے گئے۔ تنہا قاہرہ میں ہزاروں گھروں کو مجمع نے لوٹ لیا۔ ریگستان سے اُن بدوی اعراب کی تعداد کثیر کے خروج نے جو غارتگری کے لیے تلی ہوئی تھی خطرہ کو دوبالا کر دیا۔ چند روز تک مصر طوائف الملوکی کی حالت کے قریب معلوم ہوتا تھا اور برطانوی حکومت نے پارلیمنٹ میں اعتراف کیا کہ کل مصر بغاوت کی حالت میں تھا۔

برطانوی حکام نے اس نازک حالت کا مقابلہ نہایت شدومد اور استقلال سے کیا۔ مصر میں کثیر التعداد برطانوی فوج موجود تھی اور معتمد کالی فوجیں سوڈان سے فوراً بلائی گئیں اور باضابطہ مصری پولیس نے عام طور پر احکام کی تعمیل کی۔ چند ہفتوں کی سخت لڑائی اور شدید اتلاف جان کے بعد مصر پر پھر تسلط ہو گیا۔

امن تو قایم ہو گیا لیکن مطلع نہایت ہی غبار آلود رہا۔ کثیر التعداد برطانوی اور سوڈانی افواج کی موجودگی ہی سے امن قایم رہا تھا۔ متواتر مارشل لا کے نفاذ سے بھی قوم پرستوں کے مظاہرے بند نہ ہوئے جن کا نتیجہ بعض وقت بلوہ و لڑائی اور نقصان جان ہوتا تھا۔ اس موقع کی سب سے زیادہ نازک صورت یہ تھی کہ صرف طبقہ اعلیٰ ہی کے اشخاص متحدہ طور پر قوم پرست نہ تھے بلکہ کروڑوں فلاحین بھی جو اس وقت تک خاموش تھے اُن کے حامی تھے۔ جنگ کا زمانہ فلاحین پر سخت گزرا تھا۔

فوجی ضروریات نے برطانیہ کو مجبور کیا تھا کہ دس لاکھ فلاحین کو مشرق ادنےٰ اور یوروپ میں بیگار کرنے کے لیے جبر بہ طور پر بھرتی کرے۔ علاوہ ازیں اناج و چارہ اور دیگر اشیا کی بھی فراہمی بڑے پیمانہ پر ہوئی تھی۔ اِن امور سے سخت بے چینی پیدا ہوئی اور فلاحین میں برطانوی حکومت سے صرف باطنی ناراضگی ہی نہیں بلکہ نمایاں نفرت بھی پیدا ہوئی۔ مسایل مصر کے مستند ماہرین نہایت خائف تھے۔ ان ہنگاموں کے بعد ہی معروف انجینیر سر ولیم ولکاکس نے ایک پبلک بیان میں کہا "مصر پر برطانوی مقابضت کی بنیاد یہ تھی کہ فلاحین اُس کے حامی تھے۔ جب تک لاکھوں فلاحین متفقہ طور پر حامی صیانت تھے اس کا کچھ اثر نہ تھا کہ شیوخ عمائد۔ حکمران طبقہ۔ پیشوایان مذہب خلاف ہیں یا موافق۔ بلاشبہ آج برطانیہ نے فلاحین کی دوستی اور اعتماد کو کھو دیا" اور سر ویلنٹائن چرول نے لنڈن ٹائمس میں لکھا "مسلمہ طور پر برطانوی مقابضت کے بعد پہلی مرتبہ اس منحوس واقعہ سے ہمارا سامنا ہی کہ مصری فلاحین کی تعداد کثیر میں بے چینی اور نفرت پیدا کر دی گئی ہی درآنحالیکہ یہ فلاحین دیگر مصری طبقات کے مقابلہ میں ہمارے سب سے زیادہ مرہون منت ہیں۔ میرے خیال میں انگلستان میں بلکہ ذمہ دار حلقوں میں بھی بہت کم اشخاص کو اس کا احساس ہی کہ یہاں کی کشمکش کس خطرناک درجہ تک پہونچ گئی ہی۔"

ممالک غیر کے کل مبصرین قوم پرستوں کے جذبات سے جن میں ہر مذہب اور ملت کے لوگ متحد تھے متاثر ہوئے۔ ۱۹۱۹ء کے موسم گرما میں جو بڑے مظاہرے ہوئے اُس کی بابت ایک اطالوی ماہر سیاسیات لکھتا ہی "تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ جو علم بلند کیے گئے اُس میں ہلال اور صلیب دونوں یکجا نمایاں تھے۔ کچھ عرصہ قبل تک مسلمان و عیسائی ایک دوسرے سے ایسے جدا تھے جیسے کہ یہ دونوں یہودیوں سے۔ آج جیسا کہ ہندوستان میں

ہندو اور مسلمانوں میں ہوا اوسی طرح مذہبی تفرقہ یہاں سے بالکل رخصت ہوگیا۔ سب مصری ایک ہی جھنڈے کے نیچے کھڑے ہیں۔ ہر شخص اپنے نقاب سکوت کے پس پردہ ایک ہی عقیدہ سے فروزاں ہی اور یقین کامل رکھتا ہی کہ اس کی بات

لہ افسوس ہی کہ ہندوستان کا وہ اتحاد جو مصریوں کے لیے مثال تھا آج درہم و برہم ہوگیا۔ ہندوستان میں بھی مساجد و منادر میں بلا تفریق ملت و مذہب واعظین منبروں پر جلوہ افروز ہوئے۔ جامع مسجد دہلی کے ممبر کی جگہ پر سوامی سردھانند نے اجلاس فرماکر مسلمان اور ہندو کے مجمع کو مخاطب کیا۔ ایک مندر میں مولانا محمد علی وغیرہ کے ہند و خواتین نے چندن لگایا۔ لیکن افسوس ہی کہ وہ اتحاد اس طرح پارہ پارہ ہوا کہ اس سے احیار کے مستقبل قریب میں کوئی اُمید نہیں ہی۔ ملتان امرتسر۔ سہارنپور۔ کانگلج۔ شاہجہانپور اگرہ گونڈا کے فسادات اس پر شاہد ہیں۔ ظاہر ہی کہ یہ اتحاد کسی مستقل بنا پر قایم نہ تھا اور ذرا دیر میں برباد گیا۔ دیکھنا یہ ہی کہ یہ اتحاد کس بنیاد پر قایم ہوا اور نیز یہ کہ ایسی کوئی بنا بھی ہو سکتی ہی کہ یہ پھر قایم مستقل طور پر قایم ہو جائے۔ اتحاد کی میری عقل کی رسائی کے مطابق تین ہی اصول ہو سکتے ہیں یعنی اشتراک خیال اشتراک اغراض اور مشترک منافرت۔ قسم اول تو اس ملک کی ایک ہی ملت کے مختلف طبقات سے ایسی مفقود ہی کہ نا اتفاقی باشندگان ملک میں سب سے زیادہ نمایاں اور ہندوستان کی پھوٹ ہی مشہور ہی۔ قسم دوم کے متعلق یہ ہی کہ ہندو قوم اپنے آپ کو تنہا ہندوستانی سمجھتی ہی اور یہ خیال کرتی ہی کہ دیگر اقوام جو ملک میں آباد ہیں اُن کو ملک میں کوئی حق نہیں۔ جب ایک جماعت کا نصب العین ہو کہ ملک کے کل عہدے اور فوائد اوسی تک محدود ہوں تو اشتراک اغراض معلوم۔ ہندو قوم کے مذکورہ بالا نصب العین کی تصدیق پنڈت مدنموہن مالوی کی تقریر متعلقہ ہندوستان اور دیگر ہندو لیڈران کی تقاریر کے سلسلہ تحریک شودھی و سنگھٹن سے ہوتی ہی۔ تحریک شدھی سے مجھ کو کوئی خاص مخالفت نہیں بلکہ میں تو اس کو دو نوع سے ضروری اور لازمی سمجھتا ہوں۔ اول یہ کہ ملاموجودہ انحطاط محض پستی اخلاق کی وجہ سے ہی اور ایسی تحریکیں کی

بالآخر بڑھی رہے گی،، ایک فرانسیسی خاتون نے جو عمر بھر سے مصر میں رہتی ہی لکھا۔
اُس ملک میں جو اکثر فریق بندی اور مذہبی نزاعات میں پھنسا رہتا تھا ہم عجیب
باتیں دیکھ رہے ہیں۔ قبطی پادری مساجد میں اور علمار کلیساؤں میں وعظ

بقیہ نوٹ صفحہ ۔۔ موجودگی میں مذہبی جد وجہد اور امور دینیات کا چرچا لازمی ہو لہٰذا لابد ہے کہ اخلاقی نتیجہ اچھا ہی ہوگا کیونکہ ہر مذہب تربیت اخلاق کی تعلیم دیتا ہو۔ دویم یہ کہ مسلمانوں کو اپنے فراموش کردہ فرض یاد آئینگے ممکن ہو کہ جوش قومی اور ناموس دین کے لیے کچھ ہاتھ پیر ہلاکر اپنے برادران وطن کو سچے دین فطرت کی دعوت دیں اور تبلیغ اسلام میں کامیابی حاصل کریں۔ قابل اعتراض تو یہ امر ہی کہ مذہب کا نام رکھ کر سیاسی اغراض حاصل کی جاتی ہیں اور سیاسی غرض بھی ایک ہی ہو یعنی مسلمانوں کی تعداد گھٹا کر اون کی اہمیت کو مٹانا بلکہ اُن کی ہستی ہی کو فنا کر دینا۔ مسلمان بھی اسی قبیل کی تنگ خیالی کا کافی اظہار کرتے ہیں۔ ہنود میں خود ہی کشمکش ہے آریہ نسل کے اشخاص اصلی باشندگان ملک کو جو شودر یا اچھوت ذات کہلاتے ہیں ان حقوق میں شریک نہیں کرنا چاہتے۔ تیسری قسم مشترکہ منافرت دراصل بنا، اتحاد تھی۔ مسلمانوں اور ہنود دونوں کو سلطنت سے نفرت پیدا ہوئی۔ اور اوسی غیظ و غضب میں متحد ہو گئے حصول مدعا کی ناکامیابی اور وجوہ منافرت میں کمی پیدا ہونے سے وہ اتحاد غایب ہو گیا جب تک ہندوستان کے کل فرقے افراط و تفریط و خودغرضی اور حرص کو خیرباد نہ کہینگے اصلی اتحاد ہرگز ہرگز قایم نہ ہوگا۔ کانگریس کے پلیٹ فارم پر اتحاد کا ریزولیوشن پاس کرنا شی دیگر ہو لیکن نااتفاقی کے اصلی اسباب کو معلوم کرنا اور شورش انگیزوں کو علانیہ ملعون کرکے حقیقی اتحاد پیدا کرنا شی دیگر۔ جب تک تنگ نظری کا استیصال، اور اصلی رواداری کی روح پیدا نہ کی جاوے گی ہندوستان حصول سوراج کے قابل نہیں ہوسکتا۔ مترجم

لے جی یوینی کا

کھو رہے ہیں۔ شامی و مارونی[۱] اور مسلمان طلبا، مصری و ترکی نسل کی خواتین ایک ہی جوش میں متحد ہیں اور سب کی یہ دلی آرزو ہے اپنے قدیم ملک میں مہر آزادی کی طلوع کی شعاعیں درخشاں دیکھیں۔ اُن لوگوں کے لیے جنھوں نے میری طرح توفیق پایا تھا گے زمانہ کا مصر دیکھا ہے گزشتہ چند سال میں وادی نیل میں تمام تبدیلیوں میں سب سے تعجب انگیز خواتین کا طرزِ عمل ہے۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ وہ لاپرواہ ہستی جو ہر سیاسی امر سے بالکل بے تعلق تھی گزشتہ چند ماہ کی بڑی جدوجہد کی مداح ہے مثلاً گزشتہ موسم گرما میں مظاہرہ کرنے والی عورتوں کے جلوس کو سنگینیں چڑھائے ہوئے برطانوی سپاہیوں نے گھیر لیا۔ ایک سپاہی نے ایک عورت کو دھمکایا اوس نے لوٹ کر اپنے سینے کو کھول دیا اور کہا وفٹ مجھے مار ڈالو تاکہ ایک دوسری مس کیول[۲] کا سانحہ ہو جائے۔"

بقیہ نوٹ متعلق صفحہ ماقبل:۔ مضمون جو ۳۰ دسمبر ۱۹۱۹ء کو کوریر دیلا سیرا، میں شایع ہوا (مصنف)

۱؎ مارونی شامی قدیم زبان میں مورونوئی اور عربی میں موارین کہتے ہیں۔ قدیم مشرقی نصرانی دستور کے مطابق یہ معاشرتی اور سیاست کے لحاظ سے بالکل جدا تھے اور لبنان اور اوس کے نواح میں آباد تھے ابتدا میں یہ موحد تھے اور ۱۱۸۲ء میں لاطینی کلیسا میں شریک ہوئے۔ یہ نام سینٹ مارون کی نسبت سے ہے جو چھٹی صدی میں شام کی خاص خانقاہ ہے یا جان مارون کے نام پر ہے جو ۷۰۷ء میں مرا اور اس نے لبنان کے مسیحیوں کو راسخ الاعتقاد بنا دیا۔ مترجم

۲؎ میڈم جہاں دیورسے کا مضمون "مصریین" جو ۱۵ ستمبر ۱۹۲۰ء کے رسالہ ریویو دی پیرس میں شایع ہوا۔ میڈم دیورسے نے اسی قسم کے دیگر مناظر کا عجیب نقشہ کھینچا ہے۔ نیز مصری صحیفہ ابیض مذکورہ بالا کے ملحقات ملاحظہ ہوں۔ ان ملحقات میں اکثر ہیڈ ناسف و نصاری بردی ملتی ہیں جس سے برطانوی افواج کے جبر و مظالم ظاہر ہوتے ہیں۔ (مصنف)

اس عدیم المثال حمایت قوم کے جوش سے سامنا ہونے پر جو انگریز موقع پر تھے ان کی دو رائیں تھیں۔ کچھ تو سر ولیم ولکاکس اور سر ولنٹائن چرول کی طرح یہ کہتے تھے[۵] کہ بہت زیادہ مراعات وسیع پیمانے پر ہونا چاہئیں اور بعض اہل الرائے یہ کہتے تھے کہ مراعات کا دینا کمزوری ہوگی اور اس سے مصیبت پھیلے گی چنانچہ مسٹر ایم میکل ریتھ نے کہا "قوم پرستوں کے پنج سالہ حکومت کا نتیجہ لاعلاج بدنظمی اور ابتری ہوگی۔ اگر مصر کی قسمت میں افلاس اور بدنظمی کے اُس دلدل میں پھر پھنسنا نہیں لکھا ہو جس سے ہم نے اس کو ۱۸۸۲ء میں نکالا اور اگر اسی عظیم تر بالشیوکی مصائب میں گرفتار ہونا نہیں جس کی علامات ظاہر ہو رہی ہیں تو برطانیہ کو اپنا تسلط کم نہ کرنا چاہئے"[۶] مصر کے واقعات سے انگلستان میں بہت فکر پیدا ہوئی اور ۱۹۱۹ء کے موسم گرما میں گورنمنٹ نے مصری معاملات میں کامل تحقیقات کے لیے ایک تحقیقاتی کمیشن کی تقرری کا بسرکردگی لارڈ ملنر اعلان کیا۔

بقیہ نوٹ[۴] متعلق صفحہ ماقبل:۔ مس ایڈیتھ کیول انگریزی نرس تھی جس نے لندن کے شفاخانہ میں تعلیم پائی اور بلجیم میں ملازم ہوئی اور برسیلس کے شفاخانہ میں نرس اعلیٰ ہوگئی۔ جب جنگ عظیم میں جرمن قابض ہوئے تو بھی اپنا کام کرتی رہی اور اسی زمانہ میں ایک جماعت کی تنظیم کی جس کا کام یہ تھا کہ راہ گم کردہ اتحادی سپاہیوں کو ہالینڈ میں پہونچا دینے کی امداد کرتے تھے۔ اس راز کے افشا ہونے پر جرمنوں نے گرفتار کرلیا اور ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو سزائے موت دی یہ مس ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئی۔ مترجم

[۵] دیکھیے اخباریانات مذکورہ بالا میں درج ہو۔ مصنّف

[۶] مسٹر میک الریتھ کا مضمون "مصری قوم پرستی"، جو جولائی ۱۹۱۹ء کے ایڈنبرا ریویو میں شایع ہوا۔ نیز ملاحظہ ہو آنریبل ڈبلیو۔ اوبسی گور کا مضمون "مصر کا مستقبل" جو ۲۲ نومبر ۱۹۱۹ء کو نیو یورپ میں شایع ہوا۔ مصنّف

یہ تقریر نہایت دانشمندانہ تھا۔ لارڈ ملنر برطانوی سیاسی زندگی کے قابل ترین اشخاص میں سے تھے ان کو عرصہ دراز سے مسایل شہنشاہی کا بشمول مصر تجربہ تھا۔ طبیعت بھی ایسی پائی تھی کہ نہ تو فضائے آزادی میں گسستہ مہار نہ ماضی پرستی کی زنجیروں میں دست و پابستہ۔ مختصر یہ کہ لارڈ ملنر صحیح مفہوم میں حقایق شناس تھے اور اس کا ثبوت بہت جلد ان کے عمل سے ہو گیا۔ شروع سنہ ۱۹۲۰ء میں لارڈ ملنر اور ان کے رفقاء کو مصر پہونچ کر نہایت مشکلات سے سابقہ پڑا۔ مصر میں یہ اعلان ہو چکا تھا کہ کمیشن کا مقاطعہ کیا جائے۔ صرف قوم پرست سیاست دانوں ہی نے نہیں بلکہ مفتی اعظم جیسے پیشوایان مذہبی نے بھی معاملات پر اس وقت تک بحث کرنے سے انکار کیا جب تک کہ کمشنران پہلے مصری خود مختاری سے اتفاق رائے نہ کر لیں۔ معاملات یہیں پر ختم ہوتے معلوم ہوتے تھے مگر لارڈ ملنر نے بے انتہا حزم و استقلال کا کام لیا اور بالآخر زاغ لول پاشا اور دیگر ذمہ دار قوم پرست لیڈروں سے آزادانہ گفت و شنید ہونے لگی۔

بلاشبہ لارڈ ملنر کی مساعی کو مصر کے بعض اندرونی حالات سے مدد ملی۔ مشرق کے دیگر حصص کی طرح مصر میں بھی سیاسی شورش کے ساتھ معاشرتی بے چینی کے بھی علامات رونما ہو رہے تھے نئی قسم کے شورش انگیز پیدا ہو رہے تھے جو عوام کو نہایت ہی انقلابی اصول کی تلقین کرتے تھے۔ ان نوعمر شورش انگیزوں کی وجہ سے اصلی قوم پرست لیڈروں میں پریشانی پیدا ہو گئی جن کو یہ احساس ہوا کہ ان کی حالت بر گروہ جماعت و نیز صاحب حیثیت اور جائداد ہونے کے لحاظ سے معرض خطر میں ہے نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۹۲۰ء کے موسم خزاں میں لارڈ ملنر اور زاغلول پاشا ان اصولوں پر متفق ہو گئے جن کی بنا پر سچا تصفیہ ممکن ہے۔ ان اطلاعات کی بنیاد پر جو اس زمانہ میں اخباروں کو دی گئی تھیں اور جن کی تصدیق لارڈ ملنر کی سرکاری رپورٹ

سے ہوگئی آزمایشی تصفیہ کی شرائط حسب ذیل تھے.

"انگلستان اپنی صیانت کو واپس لیکر مصر کی آزادی کا اعلان کردے۔ یہ آزادی اونھیں شرایط سے مشروط تھی جن پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے کیوبا کو آزادی دی ہی۔ مصر میں کامل حکومت خود اختیاری قایم ہوجائے اور برطانوی قلعہ بند افواج اور غیر مصافی حکام واپس بلا لیے جاویں۔ لیکن مصر برطانیہ عظمےٰ سے دایمی اتحاد کرے اور یہ عہد کرے کہ وہ کسی دوسری سلطنت سے عہدوپیمان نہ کرے۔ الا بہ استرضاء برطانیہ نیز نہر سوئز اور اگر کوئی اجنبی طاقت مصر پر حملہ آور ہو تو خود مصر کی حفاظت کے لیے برطانیہ کو ایک فوجی اور بحری مقام دیا جاوے۔ سوڈان کا پریشان کن مسئلہ عارضی طور پر غیر منفصل رہے۔

ان تجاویز میں سچے تعمیری تصفیہ کے آثار ہویدا تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ان پر فوراً عمل نہ کیا گیا۔ انگلستان اور مصر دونوں جگہ ان کی سخت مخالفت ہوئی۔ انگلستان میں عہدہ داروں کے مخالفانہ اثرات نے رپورٹ کو فروری ۱۹۲۱ء تک تعویق میں ڈال رکھا۔ مصر میں انتہا پسند قوم پرستوں نے عادل پاشا پر دغا بازی کا الزام لگایا۔ اگرچہ اعتدال پسند بالکل مطمئن معلوم ہوتے تھے۔ کمیشن کی رپورٹ بالآخر جس صورت میں شایع ہوئی اُس میں یہ اعلان کیا گیا کہ مصر کو حکومت خود اختیاری دینا لے خطری کے ساتھ ملتوی نہیں کیا جا سکتا اور نہ حمایت قومی کی روح کو معدوم کیا جا سکتا ہے یہ کہ مخالف رعایا کی مرضی کے خلاف مصر پر حکومت کرنے کی کوشش کرنا "نہایت مشکل اور شرمناک" کام ہوگا۔ نیز یہ کہ یہ بڑی بدنصیبی ہوگی اگر تصفیہ کے موجودہ

---

[۱] اس تعویق کے نامبارک پہلو کے لیے ملاحظہ ہو سر ولنٹاین چرول کا مضمون "مشرق میں متضاد تدابیر" جو یکم جولائی سنہ ۱۹۲۱ء کی نیو یورپ میں شایع ہوا۔ مصنف

موقع کو ضایع کیا جاوے۔ مگر گورنمنٹ نے پوری رپورٹ کو منظور نہیں کیا اور لارڈ ملنر نے فوراً استعفا دے دیا۔ زاغلول پاشا کی یہ حالت ہو کہ وہ اب بھی قوم پرستوں کے لیڈر ہیں مگر ان کا اقتدار بہت کم ہو گیا ہو سطور ہذا کی تحریر کے وقت مصر کی حالت تو یہ ہی اور سچ یہ ہو کہ یہ حالت اس قدر امید افزا نہیں ہو جیسی پچھلی سال تھی۔

اسی اثنار میں جو طوفان مصر میں اُٹھا تھا مدت سے مشرق ادنےٰ کے دیگر حصص میں پھیل گیا تھا۔ فی الواقع ۱۹۲۰ء کے ابتدائی مہینوں میں طوفان کا مرکز عثمانی سلطنت میں منتقل ہو گیا۔ اس کا الزام زیادہ تر خود اتحادیوں پر ہی۔ بلاشبہ ان پُرآشوب ممالک کی بابت کوئی تعمیری تصفیہ بہت مشکل تھا تاہم اگر اتحادیوں کی حکمت عملی انصاف اور راست بازی پر مبنی ہوتی تو تصفیہ محال ثابت نہ ہوتا۔ اختتام جنگ پر سلطنت عثمانیہ کی اکثر اقوام کو یہ اُمید تھی کہ وہ آزادانہ مقاصد جنگ جن کی تبلیغ اتحادی صاحبان اختیار وقتاً فوقتاً کرتے رہے ہیں پورے ہوں گے۔ عرب عنصر کو خاص اُمید لگی تھی کیونکہ اتحادیوں نے اُن سے بہت سے وعدے کیے تھے (ان میں سے بعید کو بہت جلد پس پشت ڈال دیا گیا جیسا کہ آگے بیان کیا جاوے گا) اور شکست خوردہ ترک بھی مستقبل سے بالکل مایوس نہ تھے اور آزادانہ برتاؤ کے اُس عام اعلان کے علاوہ جو پریسیڈنٹ ولسن کے چودہ دفعات

لے اس رپورٹ کی نامنظوری کا یہ اثر ہوا کہ مصر میں تشدید نے چینی کا دور شروع ہوا اور برطانوی ہائی کمشنر نے "زاغلول پاشا کو سیلان (لنکا) جلا وطن کیا۔ لیکن ہندوستانی شورش کی وجہ سے سیلان سے سیشلیز اور پھر جبل الطارق میں نظر بند رہے لیکن شورش متواتر جاری رہی اور بالآخر مصر کی کامل آزادی کا برطانیہ کو اعلان کرنا پڑا۔ اور ممالک غیر سے سفارتی تعلقات قایم کرنے کا حق بھی دینا پڑا۔ اور قانون دستور شایع کیا گیا۔ چنانچہ پارلیمنٹ بنائی جارہی ہے۔

والے پروگرام میں منضبط تھے اور اس کی تصدیق اتحادیوں نے بھی کی تھی ترکوں سے اور بھی خاص قسم کے وعدے کیے گئے تھے خصوصاً وزیر اعظم لائڈ جارج نے ۵ جنوری ۱۹۱۸ء کو کہا تھا "ہم اس لیے نہیں لڑ رہے ہیں کہ ترکوں سے اُن کا دار السلطنت یا ایشیائے کوچک اور تھریس کی وہ زرخیز اور مشہور زمین جو باعتبار غلبۂ آبادی ترکی ہیں چھین لیں۔ بالفاظ دیگر ترکوں کو صریح الفاظ میں یہ بتا دیا گیا تھا کہ اگرچہ ان کی حکومت غیر ترکی ممالک مثلاً عرب صوبجات سے ختم ہو گئی لیکن سلطنت کے ترکی صوبجات حکومت غیر کے تحت میں نہ جائیں گے بلکہ اُن میں ترکی قومی سلطنت قائم ہوگی۔ ترکوں کو اُن خفیہ معاہدوں کا کوئی علم نہ تھا جو ۱۹۱۵ء سے اتحادیوں میں ہو رہے تھے اور ان کی رو سے تقریباً کل ایشیائے کوچک اتحادیوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ان کا اظہار بعد کو ہونے والا تھا فی الحال ترک اُمیدوار رہ سکتے تھے۔

عربوں کے لیے اس سے بھی زیادہ روشن وجوہ اُمید اور باعتبار نتیجہ زیادہ تاریک پہلو موجود تھے۔ ہم ۱۹۱۶ء کی عرب بغاوت کا ذکر کر چکے ہیں جو بسر کردگی شریف مکہ حجاز سے شروع ہو کر سلطنت عثمانیہ کے کل عربی صوبجات میں پھیل گئی اور ترکی طاقتِ مقاومت کی بربادی کا بڑا باعث ہوئی۔ مگر یہ بغاوت فوری یا بلا سوچے سمجھے نہ ہوئی تھی۔ اس کی تدابیر نہایت ہوشیاری سے کی گئی تھیں اور یہ زیادہ تر اتحادیوں کی اعانت اور وعدوں کی بدولت عمل میں آئی۔ آغاز جنگ ہی سے عرب قوم پرست جو سلطنت عثمانیہ سے ناراض تھے مصر کی برطانوی حکام سے ربط رکھتے تھے۔ ان کا نہایت گرم خیر مقدم کیا گیا تھا اور اُن کی تجزیہ کی تجاویز کی ہمت افزائی کی گئی تھی کیونکہ یہ ظاہر تھا کہ عربوں کی بغاوت سے برطانیہ کو ترکی علاقہ میں پیش قدمی کرنے کے علاوہ مصر اور نہر سویز کی حفاظت میں بڑی مدد ملنے والی تھی۔

مگر عربوں نے نہ صرف مادّی مدد مانگی بلکہ یہ وعدے بھی لیے کہ اُن کی بغاوت کے صلہ میں ایک عرب سلطنت بنا دی جائے جس میں عثمانی سلطنت کے سب عربی صوبجات شامل ہوں۔ یہ عرب قوم پرستوں کی توقعات کی بدقسمتی تھی کہ برطانوی اور فرانسیسی حکومتوں نے ترکی کے عرب صوبجات کی بابت اپنے منصوبے باندھ رکھے تھے۔ عرصہ دراز سے ان ممالک میں انگلستان اور فرانس کے "دائرہ ہائے اثر تھے"۔ انگریزی حلقہ جنوبی عراق میں خلیج فارس کے کنارے پر تھا اور فرانسیسی حلقہ لبنان میں تھا۔ یہ شمالی شام میں کوہستانی ضلع ہے جو بحیرہ روم کے ساحل پر واقع ہے اور اس میں موارین آباد ہیں یہ قوم رومن کیتھولک عقائد کی پابند ہے اور ان پر فرانس نے اپنی سیاسی حفاظت عرصہ دراز سے قایم کر رکھی ہے بلاشبہ یہ دونوں صوبے قانوناً بلاد ترکی میں شامل تھے اور دونوں کا رقبہ بھی تھوڑا تھا۔ لیکن "دائرہ ہائے اثر" ربڑ کے لوچدار حلقے ہوتے ہیں کہ جب مناسب مواقع ہوں تو یہ دفعتاً غیر معمولی طور پر بڑھ جاتے ہیں۔ جنگ عظیم ایک ایسا ہی مناسب موقع تھی لہذا برطانوی اور فرانسیسی دفاتر خارجیہ نے مشورہ کرکے ۵ مارچ ۱۹۱۵ء کو ایک ایسے خفیہ عہدنامے کی تکمیل کی جس کی رو سے فرانس کو شام میں اور برطانیہ کو عراق میں "امتیازی حیثیت" دی گئی تھی۔ اس وقت کوئی خاص حدود مقرر نہ ہوئے تھے۔ لیکن ارادہ یہ تھا کہ ایسے دعوے کیے جائینگے جن کی رو سے ترکی کی عربی صوبجات انگلستان اور فرانس میں تقسیم ہو جائیں۔

اس خفیہ عہدنامے کی موجودگی سے مصر کی برطانوی حکام کو عربوں سے گفتگو کرنے میں پریشانیاں پیدا ہوئیں مگر عربی بغاوت ایک ایسا گرانقدر موقع تھی کہ اس کو کھونا خلاف عقل تھا۔ بالآخر برطانوی وکلا نے ایک ایسا اصول نکالا جس سے عرب سردار مطمئن ہوگئے۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو سر ہنری میکموہان گورنر جنرل

مصر نے شریف مکہ کے نمائندہ مقیم قاہرہ کو ایک تحریر دی جس کی رو سے برطانیہ نے یہ مشروط ذمہ داری لی کہ اگر عرب سلطان سے بغاوت کرینگے تو سلطنت عثمانی کے عربوں کی آزادی تسلیم کی جاوے گی۔ لیکن اس آزادی سے عراق کا جنوبی علاقہ جہاں کہ برطانوی مفاد مخصوص حاکمانہ اقتدار کے مقتضی ہیں اور نیز وہ رقبے جسے "فرانس کو نقصان پہنچائے بغیر برطانیہ کسی کو دے نہیں سکتا" مستثنے رہیں گے۔ یہ آخری فقرہ بلاشبہ انگریزی تاش کا "جوکر"[ل] تھا۔ مگر اس سے مقصد حاصل ہوگیا۔ عرب چونکہ خفیہ معاہدے سے ناواقف تھے اُنھوں نے یہ تصور کیا کہ یہ مستثنا لبنان کے محدود ضلع سے تعلق رکھتا ہو۔ وہ خوش خوش بغاوت کی تیاری کے لیے گھر واپس آئے اور دوسرے سال بغاوت ہوگئی۔

نومبر ۱۹۱۶ء میں بغاوت شروع ہوئی۔ اگر عربوں کو یہ معلوم ہوتا کہ گزشتہ مئی میں کیا طے ہوچکا ہو تو شاید یہ بغاوت کبھی بھی شروع نہ ہوتی۔ اُس مہینے میں انگلستان اور فرانس نے ایک دوسرے خفیہ معاہدے پر دستخط کیے جو معاہدہ سائکس۔ پیکو کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدے کی رو سے ترکی عرب صوبجات کی باقاعدہ تقسیم اون تجاویز کے مطابق ہوگئی جو سال ماقبل کے اصلی عہد نامہ مورخہ ۵ر مارچ ۱۹۱۵ء میں قرار پائی تھیں۔ سائکس۔ پیکو عہد نامے کی رو سے عراق کا بہت بڑا حصہ برطانیہ کے قبضہ میں اور ساحل شام صور سے لیکر اسکندریہ

ل کھیلنے کے تاش میں باون پتوں کے سوا ایک تصویر ہوتی ہو جو عموماً ایک مسخرہ کی ہوتی ہو اُس کو جوکر کہتے ہیں اور تاش کے دو کھیلوں میں مستعمل ہوتا ہو اول "یوکر" جو اسٹریلیا میں رائج ہو اس میں جوکر سب سے بڑا ٹرپ ہوتا ہے دوسرا ڈرنگ فلش جس کو عام طور پر رنگ فلاس کہتے ہیں اس کھیل میں بھی جوکر ہر پتہ کا کام دیتا ہو۔ مترجم

کوچک تک معہ ارمینیا اور ایشیائے کوچک کے وسیع شمالی قطعات کے فرانس کے قبضے میں آیا فلسطین بین الاقوامی رہا۔ البتہ اُس کا خاص بندرگاہ حیفہ برطانیہ کو ملا۔ اس میں یہ مفاہمت بھی تھی کہ فلسطین برطانوی حلقہ میں رہے گا اور بڑا اندرونی حصہ جو عراق اور شام کے درمیان واقع ہو۔ برطانوی اور فرانسیسی دائرہ ہائے اثر کی ماتحتی میں آزاد ہوگا۔ فرانسیسی حلقہ میں باقی کل شام حلب سے لیکر دمشق تک اور انگریزی حلقہ میں عراق کا کل باقی حصّہ یعنی وہ ملک جو موصل سے ملحق ہو شامل ہوگا بالفاظ دیگر وہ آزادی جس کا وعدہ سر ہنری میکموہان نے عربوں سے کیا تھا ہباءً منثوراً ہو گئی۔

اس پس پردہ کارروائی کی اطلاع عربوں کو کیوں دی جاتی؟ برعکس اس کے انگریزوں نے عرب قوم پرستوں کی توقعات کو مشتعل کرنے کے لیے ہر امکانی کوشش کی کیونکہ ترکوں کے خلاف اُن کے جنگی جوش سے کام لینے کیلئے یہی سب سے اچھا طریقہ تھا۔ گورنمنٹ برطانیہ نے عربوں کو محکمۂ علم و اطلاعات کے بہت سے منتخب افسر دیئے جن میں خاص شخص ایک کرنیل لارنس تھا۔ یہ غیر معمولی نوجوان تھا اور اس نے عرب شیوخ پر بے انتہا اثر بہت جلد پیدا کرلیا اور وہ عربی انقلاب کی روح کہلایا جانے لگا[1]۔ ان افسروں کو جو عربوں کے متعلق واقفیت اور اُن سے ہمدردی رکھنے کی بنا پر منتخب ہوئے تھے۔ ان خفیہ عہدناموں کا حال نہیں بتایا گیا تھا تاکہ عربی جوش کی جو ہمت افزائی کر رہے تھے اُس میں عدم صداقت کی وجہ سے کمی نہ آجائے۔ اسی طور پر برطانوی جنرلوں نے اپنے اعلانات میں نہایت فیاضی

---

[1] لارنس اور اُس کی کارگزاریوں کی تفاصیل کے لیئے ملاحظہ ہو ایل۔ ٹامس کا سلسلہ مضامین جو بعنوان "لارنس یعنی عربی انقلاب کی روحِ رواں"، جو اپریل مئی۔ جون۔ جولائی ۱۹۱۹ء کے رسالہ ایشیا میں شایع ہوا۔ مصنفؒ

اور فراخ دلی سے وعدوں پر وعدے[1] کیے۔ اِس مذاق کی انتہا اختتام جنگ پر ہوئی جبکہ فرانسیسی اور انگریزی حکومتوں نے ذیل کا مشترکہ اعلان تمام عرب صوبوں میں شایع کیا۔

"برطانیہ اور فرانس کی غرض مشرق میں اس جنگ سے جسے جرمنی کی حرص نے دنیا پر نازل کیا ہو یہ ہے کہ اُن تمام اقوام کی نجات کو مکمل اور متیقن کر دیا جاوے جو عرصہ دراز سے ترکی شکنجہ ظلم میں مبتلا ہیں اور اُن میں ایسی قومی حکومتیں اور نظامات قایم کیے جاویں جن کے اختیارات اونھیں کی آزاد خواہش اور قوت ارادی سے ماخوذ ہوں"۔

اِس پُرفریب کارروائی کے عروج ہی کے بعد مآل کار ظاہر ہوا۔ جنگ ختم ہوئی دشمن کو شکست ہوئی۔ تماشہ ختم ہوا اور پردہ گرا دیا گیا۔ اس پردہ پر عربوں کو اصل حقیقت نظر آئی جس سے اُن کی آنکھیں کُھل گئیں۔ فرانسیسی افواج سواحل شام پر دخل کرنے کو آئیں۔ خفیہ عہدناموں کا راز فاش ہوا۔ اور عربوں کو معلوم ہوگیا کہ اون کو کیسا دھوکا دیا گیا ہو۔ اُن کو سخت پیچ و تاب تھا۔ اگر عربوں کی دانشمند سردار آڑے نہ آتے تو غالباً فوراً ہی طوفان بپا ہو جاتا۔ اِن شیوخ میں خاص طور پر قابل الذکر امیر فیصل، شریف مکہ کا لڑکا ہو۔ دوران جنگ میں اوس نے اپنے آپ کو انسانوں کا حقیقی سردار ثابت کیا اور اب مسلمہ اقتداری حیثیت حاصل کرلی تھی۔ فیصل اتحادیوں کی فوجی قوت سے آگاہ تھا اور یہ محسوس کرتا تھا کہ لڑائی یا تخدو اوس زمانے میں کیسی خطرناک ثابت ہوگی۔ عربوں کے دعاوی کی اخلاقی قوت کا احساس کرکے اُس نے اپنے ہم وطنوں سے یہ درخواست کی کہ وہ اُس کو آنے والی

---

[1] جنرل ماڈ نے مارچ ۱۹۱۷ء میں جو جزیرۃ العرب کے عربوں سے اعلان کیا اس کی بہترین مثال ہو۔ مصنف

صلح کانفرنس میں عربستان کی وکالت کا موقع دیں۔ لوگوں نے اوس کی بات مان لی عرب میں سکوت رہا اگرچہ یہ تشویش کا سکوت تھا۔

امیر فیصل نے اپنے معاملہ کی وکالت صلح کانفرنس کے روبرو نہایت فصاحت اور شان کے ساتھ کی لیکن ناکامیابی ہوئی۔ اس سے کیا ہوتا ہے کہ مجلس اقوام کی تجویز میں ایسا فیاضانہ بیان شامل ہو کہ "بعض اقوام نے جو سابق میں سلطنت ترکی کے ماتحت تھیں اُن مدارج ترقی کو طے کر لیا ہے جن کی رو سے اُن کی ہستی بطور آزاد قوم کے اس شرط پر تسلیم کی جا سکتی ہے کہ ایک حکم بردار اُن کو حکمرانی میں مشورہ اور مدد اُس وقت تک دے جب تک اون میں اپنے پیروں کھڑے ہونے کی قابلیت پیدا ہو جائے"[1] لیکن عرب تو اس سے واقف تھے کہ حکم برداری کا کیا منشا ہے۔ لارڈ جارج ایسے خوش کن فقرے کہا کریں "عربی افواج نے جو وعدے برطانیہ عظمے سے کیے تھے اُن کو وفا کر دیا۔ اب ہم کو اپنے وعدے پورے کرنے چاہئیں"[2] عربوں نے خفیہ عہدناموں کو پڑھ لیا۔ شکاری کی نظر کے سامنے جال بچھانا بیکار ہے۔ اب یہ چال کام نہیں آئی۔ عربوں کو معلوم ہو گیا کہ تدبر ہو یا قتال اون کو اپنی ہی قوت پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

فیصل نے اب بھی صلح کا مشورہ دیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اوس کو مسلح مقابلے کے خطرات کے علاوہ یہ بھی خیال تھا کہ اتحادی آپس میں لڑ رہے تھے۔ یہ نزاعات کل مشرق قریب کی بابت تھے لیکن سب سے زیادہ سخت نزاع انگلستان اور فرانس کے درمیان عرب غنایم کی بابت تھا۔ اس نزاع کا آغاز خفیہ عہدناموں پر

---

[1] دفعہ ۲۲ ۔ مصنف

[2] ۱۹ ستمبر ۱۹۱۹ع کی تقریر سے منقول ہے ۔ مصنف

فرانسیسی بے اطمینانی سے ہوا۔ سائکس پیکو معاہدے کے شایع ہوتے ہی فرانس کے اہل الرائے کا بڑا اور با اثر حصہ شور مچانے لگا کہ اُن کو فریب دیا گیا۔ پشتہا پشت سے فرانسیسی حامیان شہنشاہیت کی نظر شام[1] پر لگی ہوئی تھی اور آغاز جنگ ہی سے شہنشاہیت کے حامی اخباروں میں کل مشرق ادنے کے الحاق کی تبلیغ کرتے رہے تھے۔ اُن کی مراد شام کا پورا ملک" تھی اور اس "پورے" میں صرف وہ ساحلی حصہ نہ تھا جو فرانس کو سائکس پیکو معاہدے کی رو سے ملا تھا بلکہ فلسطین اور حلب و دمشق کا وسیع اندرونی حصہ بھی شامل تھا جو راست موصل کے زرخیز تیل کے چشموں تک پہونچتا ہے۔ اس کل حصے کے لیے جس کو وسعت پسند فرانسیسی حلقوں میں اکثر "دولیوانٹ کا فرانس" کہتے ہیں۔ حامیان شہنشاہیت یہ کہتے تھے کہ اس حصہ ملک پر فرانس کو ناقابل تنسیخ تاریخی حقوق حاصل ہیں جن کی ابتدا حروب صلیبی بلکہ شارلمین کے زمانے سے ہوتی ہے۔ شام "دوسرا السیس" ہے جو اپنا ہاتھ فرانس کی طرف بڑھا رہا ہے اور اُس سے دست بردار نہیں کہا جا سکتا۔ اور یہ فرانس والوں کی عالمگیر حکمت عملی کا لازمی رکن تھا۔ شہنشاہیت پسندوں کی ان توقعات کی بڑی

---

[1] قبل از جنگ کی شہنشاہیت کی تبلیغ کی مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو جی۔ پوانیاں کا مضمون "شام میں فرانس کا مفاد" جو یکم لغایت ۱۵ مارچ کے رسالہ کیستیاں ڈپلومٹیک اے کلونیل میں شایع ہوا۔ دیگر دلچسپ واقعات میں مصنف نے وزیراعظم پوانکارے کے اس اعلان کو نقل کیا ہے جو ۲۱ دسمبر ۱۹۱۲ء کو دار المبعوثین میں کیا گیا۔ "مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم کو لبنان اور بالخصوص شام میں ہماری قدیمی اغراض ہیں اور ہم اُن کے احترام کرانے کے لیے مستعد ہیں" نیز ملاحظہ ہو جے۔ اتلا کا مضمون "مسئلہ شام کے تین حل" جو ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء کے رسالہ کیستیاں ڈپلومٹیک اے کولونیل میں شایع ہوا۔ ایل بی فری کی کتاب "مشرقی کیتھولک مسیحیوں پر فرانس کی سیاست" مطبوعہ پیرس ۱۹۱۴ء۔ مصنف

معاونت کاری حلقوں میں کی جاتی تھی۔ بہ سبیل تمثیل ۱۹۱۵ء کے اوائل میں موسیو فینر دی نے مجلس مبعوثین میں کہا تھا "فرانس کی حکمت عملی کا مجوزہ بحیرۂ روم میں ہو جس کا ایک سرا مغرب میں الجزایر و ٹیونس اور مراکش ہے اور دوسرا سرا مشرق میں شام و لبنان اور فلسطین ہونا چاہیے۔"[1]

ایسی رفیع توقعات کے بعد معاہدۂ سائکس پیکو کا جو اثر فرانسیسی حامیان شہنشاہیت پر ہوا ہوگا اوس کا اندازہ ہو سکتا ہو قدرتی طور پر اونھوں نے اپنا غصہ انگریزوں پر اوتارا۔ اون کو گول گول الفاظ میں مجرم ٹھہرایا اور مشرق کے ہر واقعہ کا الزام اُن کے سر رکھا۔ عرب قوم پرستوں کی آرزومندیاں محض برطانوی تبلیغ کے نام سے مطعون کی گئی۔ ایک فرانسیسی مصنف نے لکھا "کسی طبیب امراض دماغی کو برطانیہ کے ان ناظمان مستعمرات و پرستان شہنشاہیت اور مجنونوں کی دماغی حالت پر تبصرہ لکھنا چاہیے۔ کیونکہ یہ شب و روز اپنے ملک کے نفع کے لیے لندن سے مشورہ کیے بغیر کام کرتے ہیں اور اُن کو برابر اس کی فکر ہو کہ فرانس کی فوقیت کو شام سے ایسا ہی معدوم کر دیں جیسا کہ ایک بار مصر میں کر چکے ہیں"[2]۔ ایسے الزامات کے جواب میں انگریز مصنفین

---

[1] منقول از مضمون "شام اور فلسطین میں ہمارے حقوق" نوشتہ سینیٹر فلینڈرن جو ۵ جون ۱۹۱۵ء کے ریویو ہبدومدیر میں شایع ہوا۔ فرانسیسی تبلیغ شہنشاہیت کی دیگر امثلہ کے لیے مندرجہ بالا مضمون کے علاوہ ملاحظہ ہو بسی جی بسیم کی کتاب "مسئلہ لبنان" مطبوعہ پیرس ۱۹۱۵ء رایع بودوان کا مضمون "شام یعنی سیاسی میدان جنگ" جو یکم لغایت ۱۶ فروری کے ریویو موندیال میں شایع ہوا۔ کاونٹ کریسیاٹی کی کتاب "فرانسیسی شام" مطبوعہ پیرس ۱۹۱۶ء۔ ایف۔ یوڈے کا مضمون "لیوانٹ کا فرانس" جو یکم مارچ ۱۹۱۹ء ہفتہ وار ریویو میں شایع ہوا۔ مصنف

[2] بودوان مذکور الصدر۔ انگریزوں کے خلاف مخاصمت کے لیے ملاحظہ ہو بسی مذکور الصدر کا مضمون مصنف

فرانسیسی "حرص" اور "حماقت" کا طعنہ دیا اور کہا کہ اس کی بدولت انگلستان کی ساکھ پر اثر پڑتا ہے اور کل مشرق میں آگ لگ جانے کا خوف ہے[۱]۔ مختصر یہ ہے کہ ان دو قوموں کے درمیان جو ایک سال قبل والی "مقدس اتحاد" کا وعدہ کرتی تھیں خوب ہی تفضیح و تفضیح ہوئی جس پر عرب اور دیگر مشرقی اقوام نے بھی خوب بغلیں بجائیں۔

زیادہ تر اس گفت و شنید کی بدولت ۱۹۱۹ء میں مشرق ادنیٰ میں کارروائیاں معرض التوا میں رہیں۔ لیکن ۱۹۲۰ء کی بہار میں اتحادیوں میں ایک حد تک مفاہمت ہو گئی۔ سان ریمو میں اتحادی وزرا کی ملاقات کے دوران میں اس عہدنامے کے شرائط طے ہو گئے جو ترکی سے طے کرائے جائیں اور جس کی رو سے ایشیائے کوچک جلب منفعت اور اثرات کے دائروں میں تقسیم کیے گئے۔ اور صوبجات عرب حسب عہدنامہ سائکس پیکو انگلستان اور فرانس کو تفویض کیے گئے اور اس کی تلبیس کر کے مجلس اقوام کی حکم برداری سے موسوم کیا گیا۔ انگلستان و فرانس اور ان کی پرستار، یونان نے عملی کارروائی کی۔ مزید برطانوی افواج فلسطین اور عراق کو اور فرانسیسی افواج شام کو بھیجی گئیں۔ ایک یونانی، انگریزی اور فرانسیسی متحدہ فوج قسطنطنیہ پر دخل کے لیے تیار کی گئی۔ اور وزیر اعظم وینیزیلاس نے ایشیائے کوچک کی ضروریات کے لیے فوج دینے کا وعدہ کیا۔ اس زمانہ میں تا شکستہ صرف اطالیہ ہی تھا۔ اوس نے

---

[۱] شام میں فرانسیسی طرز عمل پر انگریزوں کی جلی کٹی تنقیدات کے لیے ملاحظہ ہو ہیکلیس لسن کا مضمون "ہماری حیرت انگیز مہم شام" جو ستمبر ۱۹۲۰ء میں نیشنل ریویو میں شایع ہوا۔ ڈبلیو ایس میوڈ کا مضمون "عرب کا مقدمہ" جو ستمبر ۱۹۲۰ء میں بلقان ریویو میں شایع ہوا۔ یہ دونوں مضمون نگار عرب مکسمہ میں برطانوی افسر تھے۔ نیز ملاحظہ ہو مضمون نوشتہ "دوشیرا" جو اگست و اکتوبر ۱۹۲۰ء کے بلقان ریویو میں شایع ہوا۔ مصنف

آنے والی مشکلات کو پہلے سے تاڑ لیا اور اُن میں مبتلا نہ ہونے کا تہیہ کر لیا۔ سپن ریمو کی
کانفرنس کے بعد وزیر اعظم نٹی نے ایک انگریز اخبار نویس سے کہا "تم کو ایشیائے کوچک
میں جنگ کرنی ہوگی اور حکومت اطالیہ نہ تو ایک سپاہی دے گی اور نہ ایک پیسہ۔ تم نے
ترکوں کا مقدس شہر اڈریانوپل لے لیا اور ان کی دارالسلطنت پر اغیار کا تسلط کر دیا۔
تم نے اُن کا ہر بندرگاہ اور ملک کا بڑا حصہ لے لیا۔ اور پانچ ترکی نمائندے
جو تم خود منتخب کروگے وہ اُس عہد نامے پر دستخط کر دیں گے جس کو نہ ترکی قوم منظور
کرے گی اور نہ ترکی پارلیمنٹ"

وزیر اعظم کی پیشینگوئی صحیح ثابت ہوئی۔ گزشتہ چند ماہ سے ترکی
قوم پرست جو واقف تھے کہ اونھیں کیا پیش آنے والا ہے اندرونی ایشیائے کوچک
میں اپنا مرکز مقاومت تیار کر رہے تھے۔ یہ سچ ہے کہ انور پاشا جیسے قوم پرست لیڈر
عرصہ ہوا کہ دور دراز مقامات مثل ماورائے قفقاز یا بالشویک روس میں پناہ گزین
ہوگئے تھے مگر جدید قائدین پیدا ہو گئے جن میں خصوصیت کے ساتھ ایک نمایاں قابلیت
کا نوجوان افسر مصطفےٰ کمال نامی افسر ہے مصطفےٰ کمال نے نہایت سرگرمی سے ایک
در اصل قابل تعریف فوج بنائی اور اپنے دار السلطنت یعنی شہر انگورہ سے جو
وسط ایشیائے کوچک میں ہے اُس نے اتحادیوں کا مقابلہ کرنا شروع کیا اور اپنی
خود سری کا زور دکھانے کو اوس نے سلیشیا میں جو شام کے شمال میں ایک ساحلی ضلع
ہے فرانسیسی قلعہ بند افواج پر حملہ کر کے شدید نقصانات پہونچائے۔

عرب بھی تیاری عمل کر رہے تھے۔ مارچ میں ایک "مجلس شامی" دمشق
میں منعقد ہوئی جس میں بالاتفاق شام کی آزادی کا اعلان کر کے فیصل کو بادشاہ
منتخب کیا گیا۔ اس اعلان سے کل عرب صوبوں میں برقی رو دوڑ گئی۔ ساحلی علاقہ
میں جس پر فرانسیسی قابض تھے فرانسیسیوں کے خلاف بلوے شروع ہوگئے فلسطین

ہیں یہودیوں کے خلاف جنھیں مسلمان اور عیسائی عرب دونوں اُن کے صیہونی تجاویز کی وجہ سے نفرت کرتے تھے ہنگامے شروع ہوئے اور عراق میں قبائل کی منتشر لڑائیاں شروع ہوئیں۔

ان نامبارک واقعات کے پیش آنے سے ”حکم برداران“ نے فوجی جوابی تدابیر اختیار کیں۔ فرانس نے خاص طور پر سخت کارروائی کی۔ شام اور سلیشیا میں تقریباً ایک لاکھ فرانسیسی فوج بہ ماتحتی جنرل گورو موجود تھیں جسے بہت سی مستعمرات کی لڑائیوں کا تجربہ تھا اور ”زبردست تدابیر“ کا اعتقاد تھا۔ ۱۵ر جولائی کو گورو نے امیر فیصل کو اعلان جنگ بھیج کر کامل اطاعت کا مطالبہ کیا۔ فیصل نے آخر وقت تک سیاست عملی سے کام لیا اور تجاویز کو تسلیم کر لیا لیکن گورو نے اس تسلیم کرنے کو بھی ایک لفظی نزاع پر نظر انداز کیا اور ساٹھ ہزار فوج سے دمشق پر حملہ کر دیا۔ فیصل نے حقیقتاً مقابلہ کی کوشش نہ کی اور محض پسپائی کے حملے کیے اور ریگستان کی طرف ہٹنا شروع کیا۔ ۲۵ر جولائی کو فرانسیسی دمشق میں داخل ہوئے اور فیصل کو معزول کر کے کامل فرانسیسی حکومت قایم کر دی۔ مخالفوں کو بڑی سخت سزائیں دی گئیں۔ جس طرح جرمنوں نے بلجیم میں کیا تھا اُسی طرح دمشق سے ایک کروڑ فرانک کا تاوان وصول کیا گیا۔ بہت سے قوم پرست لیڈروں کو قید یا قتل کیا گیا۔ اور جنرل

---

[1] صیہون (Zion) عبرانی لفظ جس کے معنی قلعہ کوہ کے ہیں۔ بیت المقدس کا قلعہ اس نام سے موسوم تھا پھر کل بیت المقدس پر اطلاق ہونے لگا۔ صیہونی تحریک کا یہ منشا ہے کہ یہودی فلسطین میں واپس آکر ایک قومی سلطنت یہودیوں کی قایم کریں۔ سنہ ۱۹۲۰ع کی کانفرنس میں یہ طے ہوا تھا کہ فلسطین میں یہودیوں کی نو آبادیاں قایم کی جائیں اور یہودیوں کے لانے کا انتظام کیا جاوے اور ڈھائی کروڑ پونڈ چندہ اس کام کے لیے کیا جاوے۔

گوروؔ نے یہ اعلان کیا کہ "ایک فرانسیسی یا ایک عیسائی کے قتل پر" ہوائی جہازوں سے بمب کے گولے گرا کے "نہایت سخت عام بدلہ لیا جاوے گا"

اِس نپولینی "برق صاعقہ" کے سامنے اوس وقت تو بظاہر خوفزدہ ہوکر شام نے سرِ تسلیم خم کردیا۔ عراق میں انگریز ایسے خوش قسمت نہ ثابت ہوئے چند ماہ سے جو مصائب کا طوفان کھلم کھلا جمع ہو رہا تھا اور مارچ میں برطانوی کمانڈر نے اپنی رائے کا یوں اظہار کیا کہ "وہ میں ملک کی آتش فشاں امکانات سے بہت متحیر ہوں" جولائی میں کل جزیرۃ العرب میں آتش بغاوت بھڑک اٹھی اور اگرچہ ایک لاکھ برطانوی فوج موجود تھی لیکن اون کو بغاوت کے فرو کرنے میں بہت مشکل پیش آئی۔

اِسی اثنا میں اِتحادیوں نے عہد نامہ صلح کے مسودہ کو منظور کرانے کے لیے قسطنطنیہ پر قبضہ کرلیا تھا۔ چونکہ قسطنطنیہ بالکل اتحادی بیڑوں کی زد میں تھا لہذا قدرتی طور پر کوئی مقابلہ نہ ہوا۔ افواج کی آمد پر تماشائیوں کے ہجوم کی خاموشی دیکھ کر بعض مبصرین میں اضطراب پیدا ہوا۔ ایک فرانسیسی اخبار نویس نے لکھا "مجمع کی خاموشی بلند احتجاجات سے زیادہ اثر آفریں تھی۔ اُن کی آنکھوں سے غضبناک نفرت کے شعلے نکل رہے تھے۔ اس خاموش۔ پامال شدہ اور مایوس قوم کے مجمع میں ہوشیار اور چالاک جاسیس گھوم رہے تھے جو اس درد بھرے قصے کو اسلام کے دور و دراز حصص میں سنائینگے۔ چند گھنٹوں میں وہ اناطولیہ پہونچ جائیں گے اور دو دن بعد یہ خبر قونیہ۔ انگورہ اور سیواس میں پھیل جائے گی۔ تھوڑے عرصہ بعد یہ خبر بالشیویکوں کے زیر اثر ممالک میں جو قفقاز تک اور اُس کے پرے ہیں

لہ فرانسیسی جبر و تشدد کے حالات کے لیے ملاحظہ ہوں مذکورہ بالا مضامین۔ مصنف

مشتہر کی جائے گی۔ چند ہفتوں بعد ان سب شورشوں کے مراکز میں جوابی حملے کی تیاری ہوگی۔ ایشیا اور افریقہ اپنے اتحاد ایمان کو پھر مستحکم کریں گے۔ زیرک و کلا ہماری غلط کاریوں کی تاریخ کو نا خواندہ اقوام کے قوی حافظہ میں منقش کر دیں گے۔ لباد ونت اور مذہبی جنون کے ان مبلغین میں ہر نسل ہر معاشرتی طبقہ کے لوگ شامل ہیں۔ مہذب اور تعلیم یافتہ اشخاص فقیروں اور آوارہ گردوں کے بھیس میں خبروں کو تیزی سے پہونچانے اور سخت عیوض لینے کو تیار کرنے کے لیئے پھرتے ہیں[۱]"۔

ترکی میں واقعات بالکل اوسی طرح رونما ہوئے جیسے کہ سنیٹی وزیر اعظم اطالیہ نے پیشگوئی کی تھی۔ اتحادی مالکان قسطنطنیہ نے سلطان کو ایک "خیر طلب" وزارت مقرر کرنے پر مجبور کیا۔ اس وزارت نے مصطفےٰ کمال اور اُن کے رفقاء کو برملا "باغی" قرار دیا اور اپنے انتخاب سے ایک وفد فرانس کو بمقام سیورے بھیجا۔ اُنھوں نے نہایت اطاعت شعاری سے اتحادیوں کے تیار کردہ عہد نامہ کی "نقطہ وار لکیر" پر دستخط کر دیئے۔ اس طور پر اتحادیوں نے اپنا منشاء پورا کرالیا۔ "مگر کاغذ ہی پر!" کیونکہ ہر سمجھدار شخص یہ جانتا تھا کہ کل کارروائی شدت سے مضحکہ انگیز تھی۔ اور یہ بھی جانتا تھا کہ یہ "خیر اندیش" حکومت سلطان سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے محرر تک ایسے ہی قوم پرست تھے جیسے کہ مصطفےٰ کمال پاشا۔ اور یہ بھی جانتا تھا کہ اصل ترکی دار السلطنت قسطنطنیہ نہیں ہے بلکہ انگورہ ہے اور اتحادیوں کی قوت کا اندازہ اُن کی توپوں کی زد سے ہے۔ رہا مصطفےٰ کمال پاشا کی بابت اور اس نے عہد نامہ سیورے کی بابت یہ کہا "میں دنیا کے

---

[۱] بی۔ جی۔ گولیسمن کا مضمون ۲۴ر اپریل ۱۹۲۰ء لوپنیاں میں شائع ہوا۔ منقول

سے کے خاتمہ تک لڑونگا۔"

اس طرح اتحادی فی الحقیقت نہایت مشکلات میں پھنسے تھے خاصکر اس وجہ سے کہ اب "اتحادیوں" سے صرف انگلستان اور فرانس مراد تھا۔ اطالیہ علحدہ ہو چکا تھا چنانچہ نیٹی نے سان ریمو میں جتا دیا تھا کہ "اطالیہ نہ ایک سپاہی دے گا اور نہ ایک پیسہ" ڈیڑھ لاکھ سپاہی تو محض عربوں کو روکے ہوئے تھے اور دیگر مقامات پر بھی بہت کچھ فتنے اُٹھ رہے تھے لہٰذا فرانس اور انگلستان کے پاس اتنی فوج نہ تھی کہ مصطفےٰ کمال کو شکست دیں۔ اس کام کے لیے فرانسیسی اسٹاف نے تین لاکھ فوج کا تخمینہ کیا تھا۔ اب اُن کے پاس ایک ہی آلہ رہ گیا تھا اور وہ "یونان" تھا۔ چنانچہ یونان کے وزیر اعظم وینزیلاس نے یہ شرط پیش کی کہ اگر یونان کو کثیر رقبۂ ملک دیا جاوے تو وہ ترکوں کی عقل ٹھیک کر دے گا۔ اوس کی شرط قبول کی گئی اور ایک لاکھ یونانی افواج سمرنا میں اُتریں۔ لیکن یونانی مہم کامیاب نہ ہوئی۔ ایک لاکھ فوج بھی ایشیائے کوچک کے وسیع حدب میں پھیل کر کم ثابت ہوئی۔ مصطفےٰ کمال نے فیصلہ کن جنگ سے احتراز کیا اور یونانی افواج کو چھوٹے دستوں کے حملوں سے ویسا ہی تنگ کرنا شروع کیا جیسا کہ وہ محاذ کے دوسرے کنارے پر سلیشیا میں فرانسیسیوں کو کر رہا تھا۔ یونانی فوج "خندقوں میں" پڑ رہی اور ایسا سکوت شروع ہوا جس کے غیر معین عرصہ تک رہنے کا خوف تھا۔ اس سے جدید پیچیدگی پیدا ہوئی۔ وینزیلاس تو اتحادیوں کے نائب حکم بردار کی حیثیت سے جنگ کو طول دینے پر راضی ہو سکتا تھا لیکن یونانی فوج راضی نہ تھی۔ چونکہ ۱۹۱۲ء سے فوج کو جنگی قوت پر رکھا گیا تھا۔ یونانیوں نے نافرمانی کی۔ نومبر کے انتخابات میں اُنھوں نے وینزیلاس کو ۹۹۰۰۰ سے بمقابلہ دس ہزار رائے کے خارج کر کے شاہ قسطنطین کو جس کو

اتحادیوں نے تین سال ہوئے معزول کیا تھا پھر بلایا۔ اس کا منشاء یہ تھا کہ اطالیہ کی طرح یونان بھی الگ ہو گیا۔ اِس میں شک نہیں کہ شاہ قسطنطین نے ترکوں سے مخالفت فوراً بطور خود شروع کر دی۔ لیکن یہ کارروائی وینیزیلاس کی حکومت کے طرز عمل سے جداگانہ نہ تھی۔ اسی طرح اتحادیوں کا ہتھیار اُن کے ہی ہاتھ میں ٹوٹ گیا۔

اِس عرصہ میں مصطفےٰ کمال اپنی قوت نہ صرف ایشیائے کوچک ہی میں مستحکم کر رہے تھے بلکہ اپنے حلیف بھی پیدا کر رہے تھے۔ پہلی بات تو اُنھوں نے یہ کی کہ عربوں سے تعلقات اچھے کر لیے۔ بادی النظر میں ایسے سخت دشمنوں کا دوست ہو جانا تعجب انگیز معلوم ہوتا لیکن انگریزی اور فرانسیسی تدبر نے اس اعجاز کو بھی پورا کر دیا۔ کرنل لارنس نے جس کا حال ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ اُسے عربی انقلاب کی روح رواں کا خطاب مل چکا تھا ان وجوہات کی تصریح کی ہے۔ یہ کرنل پھر غیر مصافی زندگی میں آگیا تھا لہذا وہ معاملات مشرق پر آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کر سکتا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ اُس نے اظہار رائے نہایت صفائی سے کیا۔ اوس نے برطانوی اخبارات میں جو متعدد مضامین شایع کیے اُن میں سے ایک میں وہ لکھتا ہے ”دوران جنگ میں عربوں نے ترکوں کے خلاف جو بغاوت کی اُس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ترکی حکومت میں کوئی خاص قابل ذکر خرابی تھی بلکہ محض اس لیے کہ عرب آزادی کے خواہاں تھے۔ اُنھوں نے میدان جنگ میں اپنی جانوں کو خطرہ میں اس لیئے نہیں ڈالا تھا کہ وہ آقاؤں کا تبادلہ کریں اور بجائے ترکی رعایا ہونے کے انگریزی رعایا یا فرانسیسی شہری بنیں بلکہ خود اپنی سلطنت قایم کرنا چاہتے تھے“۔ ایک عرب قوم پرست لیڈر نے ایک فرانسیسی جمہوری اخبار کے صفحات میں جو شامی

مہم کے خلاف تھا نہایت وضاحت سے بیان کیا ہی۔ یہ لیڈر کہتا ہے :۔
"انگریزوں اور فرانسیسیوں دونوں کو بخوبی معلوم ہونا چاہیے کہ عرب مشترکہ مذہب کی وجہ سے ترکوں سے متحد ہیں اور سیاسی طور پر صدیوں سے اُن کے شریک حال رہے ہیں۔ لہذا وہ اپنے برادران مذہب اور رفقاء مصائب سے علحدگی اس لیے نہیں چاہتے ہیں کہ وہ کسی یوروپی قوم کے زیر اقتدار ہوں اس کی کچھ پرواہ نہیں کہ اون کی حکمرانی کی کیا صورت ہوگی۔۔۔۔موسو میلران کا یہ کہنا فضول ہے دہم کو ان اقوام کی آزادی پر مداخلت کرنیکا کبھی خیال بھی نہ آیا۔ اس قسم کے بیانات سے کوئی فریب میں نہیں آسکتا۔ التوار جنگ کے دستخط مسٹر ولسن کے اعلان کردہ شرائط پر ہوئے تھے لیکن جب جرمنی اور اوس کے حلیف لاچار ہوگئے تو التوار جنگ کے شرائط اور بیز چودہ امور پامال کردیئے گئے کامل آزادی کے وعدے جو عربوں سے متعدد موقعوں پر بکثرت کیے گئے تھے انکی عہد شکنی کا یہ نتیجہ ہوا ہی کہ عرب اور ترک ہمیشہ سے زیادہ متحد ہوگئے ہیں۔ یہ اتحاد صرف چند ماہ میں قایم ہوگیا۔۔۔۔۔ یہ اغلب ہی کہ فرانس ڈیڑھ لاکھ فوج رکھکر اور اربوں روپیہ خرچ کرکے شام کے عربوں کو محکوم بنالے گا لیکن اس سے کام ختم نہیں ہونا۔ اس ملک کا اندرونی حصہ ایک وسیع ریگستان اور اون ممالک کی سرحد پر ہے جن میں عرب و کرد و ترک آباد ہیں۔ چالیس لاکھ شامیوں سے جنگ کرکے فرانس لیوانٹ کے ڈیڑھ کروڑ عربوں کو جن میں اکثر مسلح قبائل ہیں اپنا دشمن بنائے گا۔ اس تعداد میں وہ دیگر مسلمان اقوام شامل نہیں ہیں جو اتحادیوں کے خدمات کی بدولت نہایت تیزی سے استحکام اور تنظیم حاصل کررہی ہیں۔ اگر تم کو یہ خیال ہے کہ میں مبالغہ سے کام لے رہا ہوں تو تم خود واقعات کی تحقیقات کرلو۔ لیکن اس سے کیا فائدہ ہوگا کہ

حق کی تصدیق اوس وقت کرو جبکہ وقت نکل جائے اور خون کی ندیاں بہہ جائیں"۔

فی الواقع ترکی و عرب اشتراک عمل کے آثار ہر جگہ نمایاں ہو گئے یقینی امر یہ ہے کہ اس اتحاد عمل کو نہ تو مصطفےٰ کمال پاشا نے علانیہ تسلیم کیا اور نہ معزول شاہ فیصل نے جو اطالیہ کو فرار ہو کر اپنی سیاسی چالوں میں مشغول رہا لیکن یہ ناقابل انکار واقعات ہیں کہ سلیشیا میں فرانسیسیوں کے خلاف عرب کیوں کے حملے، [illegible] ترک و کرد شامی عربوں کے متواتر خروج [illegible] حالیہ بلوے اور عراق میں برطانیہ کے خلاف جو بغاوت ہوئی ان میں بھی کمال کا ہاتھ کھلا نظر آتا تھا۔

مصطفےٰ کمال کی بیرونی حکمت عملی کا کارنامہ اس عربی ائتلاف پر ختم نہیں ہوتا وہ شمال و مشرق کی طرف ماوراے قفقاز کے تاتاریوں اور ایرانی آذربائیجان کے ترکمانوں کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ اس زمانہ میں قفقاز مسلمان تاتاریوں اور ترکمانوں اور عیسائی آرمینیوں اور گرجستانیوں اور مختلف روسی جماعتوں کے مابین نزاعات کا جولانگاہ بن گیا تھا۔ اور اس بدقسمت ملک میں نہایت تیزی سے بےنظمی پھیل رہی تھی۔ تاتاری ترکمانوں میں مصطفےٰ کمال کو بہت سرگرم مقلد ملگئے کیونکہ بین الطورانی تبلیغ کا کافی اثر ہو چکا تھا۔ اُن کی مساعی کو امداد تیسرے حلیف یعنی بالشویک روس سے ملی۔ جیسا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ بالشویک حکمت عملی یہ تھی کہ کل مشرق میں دول مغرب کے خلاف فتنہ انگیزی کی کوشش کی جاوے۔ بالشویک نے

---

۲۰ فروری سنہ ۱۹۲۶ع کا (دی پاؤنیر) مصنف

کمال کے خروج کو بڑے اطمینان سے دیکھا تھا۔ ابتدا میں بالشیوک ترکی قوم پرستوں کو بہت کم مدد دے سکتے تھے کیونکہ اون کے درمیان کوئی براہ راست سلسلہ اتصال نہ تھا۔ لیکن نومبر ۱۹۲۰ء میں جب ریگل کی سفید فوج ،، تباہ ہوئی اور زاں بعد کل جنوبی ایشیا پر سُرخ افواج نے تاخت کی تو ماسکو سے براہ قفقاز انگورہ تک سیدھا راستہ کھُل گیا۔ اس وقت سے مصطفےٰ کمال کو روپیہ۔ اسلحہ اور چند آدمی بھی دیئے گئے۔

مزید براں کمال اور بالشوک نے ایران میں فتنے شروع کر دیئے اس ملک کی حالت نہایت قابل افسوس ہے۔ دوران جنگ میں ایران باوجود اپنی اصطلاحی غیر جانبداری کے اچھا خاصہ میدان جنگ بن گیا تھا جس میں ایک فریق انگریز روس اور دوسرا فریق ترک و جرمن تھے ۱۹۱۸ء میں روس کی تباہی کی وجہ سے روسی افواج ایران سے واپس بلائی گئیں انگلستان نے موقع سے فائدہ اُٹھا کر اور اپنے تفوق کا سکہ جما کر اگست ۱۹۱۹ء میں شاہ کی حکومت سے مشہور معاہدہ ،، کا تصفیہ ،، کرکے اپنی حیثیت کو جانبر بنا لیا۔ اس عہدنامہ پر اگرچہ اس کی تکمیل جائز طور پر ہوئی تھی ایرانی قوم نے نہایت اظہار غم وغصہ کیا۔ بالشیوک تبلیغ کو اچھا موقع مل گیا۔ لہذا بالشویک گورنمنٹ نے تمام اون حقوق کو جو زار کی حکومت نے ایران میں حاصل کیے تھے چھوڑ کر اپنے آپ کو مغربی شہنشاہیت کے خلاف ایرانیوں کا دوست ظاہر کیا۔ قدرتی طور پر یہ چال کارگر ہوئی۔ اور ایران جنگجویانہ شورش میں مبتلا ہو گیا۔ ۱۹۲۰ء کے شروع

---

[1] ان واقعات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مصنف کا مضمون درباره ایران جو جنوری ۱۹۲۰ء کے اخبار دی سنچری میں شایع ہوا۔ مصنف

گرمیوں میں ایک بالشویکی فوج بحیرۂ خزر کو عبور کر کے ایرانی ساحل پر اُتری یہ فوج اندرون ملک میں داخل نہ ہوئی۔ اس کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ ملک اس طرح مشتعل ہو گیا کہ انگریزوں کی حالت روز بروز ناقابل برداشت ہوتی گئی۔ چند مہینوں تک اضطرابی حالت رہی۔ فی الواقع اس تحریر کے وقت بھی مطلع غبار آلود ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایران میں برطانوی قبضہ نہایت متزلزل ہو گیا ہے اور اُسے بہت جلد باستثنار جنوبی حصے کے باقی ملک چھوڑنا پڑے گا۔[۱]

سنہ ۱۹۲۰ء کی موسم خزاں کی حالت دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشرق ادنےٰ میں انگلستان اور فرانس کی حالت اچھی نہ تھی اطالیہ اور یونان نے ترک رفاقت کیا۔ ترک مقابلہ کے لیے تیار تھے۔ عرب لوٹ مار کر رہے تھے۔ مصری اور ایرانی تنگ کر رہے تھے اور ہر جگہ بالشویک خفیہ کارروائیوں کا ڈر تھا۔ لہذا یہ حالت خوش کن نہ تھی سلطنت کا بار بہت گراں ثابت ہو رہا تھا۔ صرف عراق میں دس کروڑ پونڈ کا صرف تھا۔ اور

---

[۱] مصنف کی یہ پیشینگوئی بالکل صحیح ہوئی سلطنت برطانیہ کو قرضہ کا معاہدہ بھی منسوخ کرنا پڑا اور کل افواج بھی ایران سے ہٹانی پڑیں جس ایرانی چندہ کا برطانوی افیسر دلما نے دوران جنگ میں نظام قایم کیا تھا اُس سے بھی بیشتر برطانوی علحدہ ہو گئے۔ افسوس ہے کہ ایرانی قوم کو برطانیہ سے ایسا اشتباہ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ ہر بات پر انگریزوں کے خلاف مظاہرہ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ مجتہدین کا عراق سے اخراج ہوا اور ایران میں برطانیہ کے خلاف مظاہرے ہوئے ہیں۔

(مترجم)

نجات کی کوئی صورت نظر آتی تھی۔

اِن حالات کو دیکھ کر تعجب انگیز نہیں معلوم ہوتا کہ انگلستان اور فرانس دونوں ملکوں میں مشرق ادنےٰ کی پالیسیوں پر سخت نکتہ چینی کی گئی۔ انگلستان میں بالخصوص یہ طوفان بہت شد و مد سے اُٹھا۔ عراق کی پیچیدگیوں کو جرم اور غلط کاری قرار دیا گیا۔ مثلاً کرنیل لارنس نے بیان کیا "ہم مصائب سے آج بھی دور نہیں ہیں۔ ہماری حکومت سابق ترکی نظام سے بھی بدتر ہے۔ وہ مقامی جبر یہ بھرتی کے چودہ ہزار سپاہی رکھتے تھے اور قیام امن کے لیے اوسطاً دو سو عربوں کو قتل کرتے تھے۔ ہم نوے ہزار فوج معہ ہوائی جہازوں مسلح گاڑیوں گن بوٹوں اور مسلح ریل گاڑیوں کے رکھتے ہیں۔ اس موسم گرما میں ہم نے تقریباً دس ہزار عرب مارے ہے[1]،، ان نکتہ چینیوں اور واقعات کی عام روش سے متاثر ہو کر برٹش گورنمنٹ نے اپنے طرز عمل کو بدلا اور سر پرسی کاکس کو عربوں سے معاملہ طے کرنے کے لیے بھیجا۔ سر پرسی کاکس ملنر کی قسم کے تھے اور حقایق سے خوب واقف تھے اور مشرقی معاملات کا کافی تجربہ رکھتے تھے۔ چونکہ ان کو بڑی مراعات پر بحث کرنے کا اختیار مل گیا تھا لہذا انھوں نے قوم پرست لیڈروں سے آزادی کے ساتھ ملاقات کی اور اچھا اثر ڈالا۔ اس تحریر کے وقت تک معاملات پوری طور پر طے نہیں ہوئے ہیں لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان یہ تجویز کرتا ہے کہ براہ راست تسلط کو عراق کے انتہائی جنوب میں خلیج فارس کے کنارے تک محدود کرے اور یہی ۱۹۱۴ء سے قبل کا قدیم حلقۂ اثر ہے[2]۔

---

[1] یہ بیان اخبارات میں اگست ۱۹۲۰ء میں شایع ہوا۔ مصنف

اس اثناء میں فرانس کو اس وقت تک شام میں زبردست تدابیر سے نسبتاً امن قایم رکھنے میں کامیابی ہوئی تھی۔ لیکن یہ حالت بہت غیر مستقل ہے آبادی کے سب طبقے حتےٰ کہ کیتھولک مارونی فرقہ نے بھی جو قدیم سے فرانس کے ہوا خواہوں میں ہے شورش شروع کردی ہے۔ جنرل گورو نے لیڈر دل گو کو رسیکا بھیجکر شورش کو فوراً دبا دیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ فرانس کے سچّے دوست بھی شام میں غیر مطمئن ہیں۔ ابتک ان اُمور سے فرانس کے طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی

بقیہ نوٹ صفحہ مقابل :- برطانیہ کے درمیان ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو ایک معاہدہ ہوا۔ شرائط حسب ذیل ہیں :-

(۱) اس معاہدہ کی مدت نفاذ ۲۰ سال ہوگی۔

(۲) شاہ عراق اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ مدت نفاذ معاہدہ ہذا میں تمام اُن اہم مسایل میں جن کا تعلق فوجی اور مالی ذمہ داریوں یا برطانوی مفاد سے ہوگا انگریزی گشنر اعلیٰ کے مشورہ پر عمل کریں گے۔

(۳) برطانیہ وعدہ کرتا ہے کہ جونہی حدود عراق کا تصفیہ ہوکر ملک میں مستقل حکومت قایم ہو جائے گی وہ عراق کو مجلس اقوام میں شریک کیے جانے کے لیے اپنی خدمات سے حسب قرارداد عہدنامہ ہذا کام دے گا بشرطیکہ شرائط معاہدہ پر عملدرآمد ہوتا رہے۔

(۴) برطانیہ امیر فیصل کی مسلح افواج سے مدد کرے گا۔ اگر ضرورت پڑی اور فریقین میں معاہدہ ہوگیا تو عراق کی مالی امداد بھی کرے گا۔

(۵) حکومت عراق اس مالی قرضہ کو رفتہ رفتہ ادا کرسکیں گے۔

(۶) مسیحی مبلغین کے کاروبار میں عراق کے اندر روڑے نہیں اٹکائے جائنگے۔

بعد میں اس مدت بست سال کو معاہدہ ترکی سے چار سال کی مدت کردی گئی ہو۔

(ماخوذ از ہمدم مورخہ ۱۱ اکتوبر و ۸ نومبر ۱۹۲۲ء) مترجم

کچھ عرصہ ہوا کہ سابق وزیر اعظم موسیو پیئر دی نے شام کے متلق کہا "فرانس کُل شام پر قابض رہے گا اور ہمیشہ رہے گا"۔ ابھی حال میں جنرل گوروستے کہا "فرانس کو سیاسی اور اقتصادی وجوہات سے شام میں رہنا لازمی ہے اگر ہم اس ملک کو چھوڑ دیں تو سیاسی نتائج بہت ہولناک ہونگے۔ لیوانٹ اور بحیرۂ روم میں ہمارا اقتدار اور اثر غارت ہو جائے گا۔ فرانس کے اقتصادی مفاد ہم کو شام میں رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ شام اور سلیشیا پوری ترقی کرنے کے بعد اقتصادی حیثیت سے مصر کی برابر گرانقدر ہونگی۔

لیکن فرانسیسی حکومت کے استقلال کے باوجود "شام کی مہم" پر عام نکتہ چینیاں بڑھ رہی ہیں۔ یہ نکتہ چینیاں شہنشاہیت کے مخالف آزاد خیال ہی تنہا نہیں کر رہے ہیں بلکہ مسلمہ قدامت پسند حلقہ جات سے بھی ہو رہی ہیں۔ چنانچہ ایک قدامت پسند فرانسیسی سیاسی رسالہ کے اڈیٹر نے بیان کیا ہے "عرب قوم اپنی خود مختاری کی حفاظت کے لیے فکرمند ہیں۔ اور وہ یہ نہیں چاہتے کہ عثمانی جوئے سے خلاصی پانے کے بعد ایک جدید ملک غیر کے زیر اقتدار رہیں۔ یہ کہنا کہ شام ہماری حفاظت کا طالب ہے بالکل جھوٹ ہے۔ شام بالکل آزاد ہونا چاہیئے[1]"۔ حال میں سینیٹر وکٹر برارڈ نے جو مشرقی معاملات کا مسلمہ فرانسیسی ماہر ہے سینیٹ میں ایک تقریر کی جس میں اُس نے گورنمنٹ کی شامی پالیسی پر شروع ہی سے نکتہ چینی کی۔ اور کہا کہ "آزاد شام مفاد اور عزت کا مسئلہ ہے"۔

---

[1] ہنری دی شانبون جو لا ریو لو پارلیمنیتر کا اڈیٹر ہے۔ اس کو ہکلیس ولسن نے اپنے مضمون "ہماری

بلا شبہ حکومت فرانس نے جو عربوں کے لیے اس وقت تک ایسی سخت ہے ترکوں کے حق میں اپنے طرزِ عمل کو بدل دیا ہے۔ معاہدہ سیورے سے علٰحدہ ہو کر اس نے عارضی طور پر ترکی قوم پرستوں سے شرائط صلح طے کر لیے اور سلیشیا[۱] کو خالی کر دینے کا در اصل اقرار کر لیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فرانس اور انگلستان دونوں یہ جانتے ہیں کہ معاہدہ سیورے ناقابلِ عمل ہے اور کل ایشیائے کوچک کو ترکی مقبوضہ تسلیم کرنا پڑے گا۔

مصطفٰی کمال پاشا سے گفت و شنید کرنے میں فرانس کو یہ امید ہے کہ وہ عربوں کا ساتھ چھوڑنے پر راضی ہو جائیں گے۔ لیکن یہ بات قیاس میں نہیں آتی۔ واقعات کی رفتار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغربی سیاسی تسلط کے خلاف مشرق ادنیٰ کی اقوام کا اتحاد روز بروز بڑھتا جائے گا۔ اس کی سب سے معروف علامت وہ اتحاد بین الاسلامی کانفرنس ہے جو ۱۹۲۱ء کے شروع میں بمقام سیورس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس نے یہ مطالبہ کیا کہ ایک مقررہ اسکیم اس غرض کے لیے تیار کی جاوے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں اتر پذیر اشتراکِ عمل پیدا ہو جائے اور اس میں صرف راسخ الاعتقاد مسلمان علماء ہی شریک نہ ہوئے بلکہ مختلف العقائد شیوخ بھی تھے۔ مثلاً کربلا کا شیعی امیر۔ امام یحیٰی۔ اور فرقہ زیدی کا امیر یمن۔ یہ لوگ ان مختلف العقائد فرقوں کے سردار ہیں جن کی اور راسخ الاعتقاد سنیوں کے درمیان پہلے اشتراکِ عمل ناممکن تھا۔ سب سے زیادہ تعجب انگیز یہ امر ہے کہ اخبار کی یہ رپورٹ ہے کہ اس کانفرنس کا صدر سنوسی جیسی عظیم ہستی تھی۔ بہ بند

---

[۱] چنانچہ سلیشیا ترکی قبضے میں آگیا اور فرانس نے اپنا قبضہ ہٹا لیا۔

ممکن ہے کہ ایسا ہوا ہو کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سنوسی کس طریقہ سے مغربی اقتدار کے خلاف کل اسلام کے اتحاد کلی کے کوشاں رہے ہیں۔

یہ ہے حالت مشرق ادنیٰ کی۔ یہ حالت بہت سخت اور پُرناز مصائب رہی ہے۔ سب سے زیادہ امید افزا علامت یہ ہے کہ سلطنت برطانیہ موجودہ روزافزوں خطرات سے بظاہر بیدار ہو کر اپنی روش میں ترمیم کر رہی ہے۔ لارڈ ملنر اور سر پرسی کاکس جیسے اشخاص کے مساعی میں کورانہ اثرات سے کتنی ہی رکاوٹیں کیوں نہ پیدا ہو جائیں لیکن کلیتاً بلانتیجہ نہ ہونگی۔ ایسے آدمی چیٹہیم[1] اور ڈرہم[2] کے سیاسی فرزند ہیں۔ یہ اون بڑی سیاسی روایات

---

[1] ولیم پٹ ارل آف چیٹہیم ۱۷۰۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۷۸ء میں مرا۔ اولاً فوج میں داخل ہوا۔ لین ۱۷۳۵ء میں پارلیمنٹ کا ممبر منتخب ہوا۔ دارالعوام میں والپول کی مخالفت کی۔ کچھ عرصہ تک آئرلینڈ کا نائب خزانچی اور زاں پے ماسٹر جنرل رہا ۱۷۵۶ء میں سکریٹری آف اسٹیٹ اور پارلیمنٹ کا سرگروہ ہوگیا ۱۷۶۱ء میں برخاست ۱۷۶۶ء پھر سردار حکومت مقرر ہوا۔ اس نے ہفت سالہ جنگ میں فریڈرک اعظم کی اعانت کی۔ اپنے مرنے سے قبل اوس نے گورنمنٹ کی سخت مخالفت امریکہ کے متعلق کی۔ امور خارجی میں اس نے برطانیہ کی عظمت کو پھر زندہ کر دیا اور وہ اصل یہی پہلا حامی شہنشاہیت ہے۔ مترجم

[2] جان جارج لیمبٹن بعدہ ارل آف ڈرہم ۱۷۹۲ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۴۰ء میں مرا انگریز مدبر ہے۔ اولاً سخت آزاد خیال تھا ۱۸۳۰ء میں گرے کی وزارت میں لارڈ پرائیوی سیل مقرر ہوا۔ ریفارم بل میں بڑا حصہ لیا ۱۸۳۰ء میں روس گیا دوبارہ ۱۸۳۵ء میں گیا۔

کے ارکان ہیں جن کی بدولت سلطنت برطانیہ ان خطرات سے صاف نکل گئی جو مایوس کن معلوم ہوتے تھے۔

برخلاف اس کے مشرق ادنیٰ میں بدترین علامت فرانس کی مسلسل سیاسی غلط کاریاں ہیں۔ اپنی قدیم روایات میں مستغرق ہو کر فرانس کی حکمت عملی حقایق کا سامنا کرنے سے انکار کرتی ہے۔ اگر کوئی طوفان اٹھے جس کا اٹھنا لازمی ہے تاآنکہ فرانس اپنی روش نہ بدلے۔ اگر کسی مصیبت کے دن تیس یا چالیس فرانسیسی بٹالین عربوں کے غصہ کی بادسموم میں جو ریگستان سے آ رہی ہو پھنس جائیں اور ایک جدید عدوا[1] میں نیست و نابود ہو جائیں تو مشرقی مسایل کے اکثر ماہرین کا یہ

بقیہ نوٹ صفحہ قبل پھر ۱۸۳۸ء میں ارل بنایا گیا۔ ۱۸۳۸ء میں کناڈا کا گورنر جنرل ہو کر گیا اور بوجہ مخالفت دسمبر میں واپس آیا۔ واپسی پر برطانوی شمالی امریکہ کے حالات پر مفصل رپورٹ لکھی جو حکومت مستعمرات کا سنگ بنیاد ہوئی اور بالآخر اسی بنیاد پر حکومت انتظامی واضعان قانون کے ماتحت ہوئے۔ مترجم

[1] عدوا۔ ملک حبش کے صوبہ تیگرے کا خاص شہر ہے۔ مارچ ۱۸۹۶ء میں اس مقام پر اطالوی فوج نے جس کی تعداد تیرہ ہزار تھی فلک شاہ حبشہ پر حملہ کیا اور شکست فاش اٹھائی۔ تین ہزار مقتول اور دو ہزار زخمی میدان میں چھوڑے۔ شاہ حبشہ کے نقصانات تین ہزار بتائے گئے تھے اس فتح سے دول یورپ کو شاہ حبشہ کی طرف توجہ ہوئی اور متعدد سفارتیں مختلف ممالک سے آئیں۔ عدوا کی آبادی تقریباً تین ہزار ہے۔

(مصنف)

افسوس ناک فتوے ہوگا کہ فرانس کی حکمت عملی اسی کی مستحق تھی"۔

مشرق ادنیٰ کے مسئلہ کو اس نازک موقع پر مستقبل کے غیر معلوم حل کے لیے چھوڑ کر ہم کو مشرق وسطےٰ کے بڑے سیاسی مسئلہ یعنی ہندوستان میں قوم پرستی کی تحریک کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

بنائے کہنہ برانگندہ شد دور دگر آمد
حیات تازہ می بار دبر آثار خرابی ہا

فصل ششم

ہندوستان میں حمایت قومی

ہندوستان سرزمین عجایب ہی۔ باوجودیکہ جغرافی اعتبار سے سارا ملک ہندستان اصلاً ایک ہی لیکن اسے کبھی بھی حقیقی سیاسی اتحاد نصیب نہ ہوا۔ بجز اوس خارجی اتحاد کے جو حال میں برطانوی "راج" نے قایم کیا۔ باوجودیکہ ہندوستان بہت سی جنگجو قوموں کا مسکن ہی وہ اپنے حملہ آوروں کو روک نہ سکا۔ اس میں بہت سی نسلیں آباد ہیں لیکن یہ نسلیں اصلاً آپس میں کبھی جذب و ضم نہ ہوئیں۔ بلکہ ہمیشہ ایک دوسرے کی دشمن اور خون و زبان و تمدن و عقاید کے امتیازات سے علحدہ علحدہ رہیں۔ نتیجہ یہ ہی کہ اگرچہ ہندوستان کی آبادی و وسعت چین یا یورپ کی برابر ہی اس میں نہ تو چین جیسی عام قومی یگانگت اور نہ یورپ جیسی خاص قومی تفریق قایم ہو سکی بلکہ وہ ڈانواڈول اور غیر متیقن رہا جس میں قومی یگانگت اور قومی تفریق دونوں رجحانات موجود ہیں لیکن یہ میلانات کبھی اپنے درجہ تکمیل تک نہ پہونچے۔

ہندوستان کی تاریخ پر زیادہ ترتین بڑے حملوں کا اثر پڑا۔ اوّل آریوں کا حملہ جو سنہ ۱۵۰۰ ق م سے شروع ہوا۔ دویم مسلمانوں کا حملہ جو سنہ ۱۰۰۰ء لغایت سنہ ۱۷۰۰ء تک ہوا۔ اور تیسرا انگریزوں کا حملہ جو سنہ ۱۷۵۰ء سے شروع ہو کر ایک صدی بعد کامل

فتح پر منتج ہوا۔ اور اس وقت تک قایم ہے۔

آریہ گورے رنگ کے ہیں اور مسلمہ طور پر اسی نسل سے ہیں جس سے کہ ہم خود ہیں۔ آریہ وسط ایشیا سے شمال و مغرب کے ان دروں کے راستے آئے کیونکہ ہندوستان کو ان دروں سے ہی خشکی کا راستہ ہے۔ دیگر مقامات پر ہمالیہ کی دیوار مستحکم طور پر حفاظت کرتی ہے۔ آریوں نے کالے رنگ کے دراودی نسل کے اصلی باشندوں کو فتح کر کے مالکوں کی حیثیت سے یہاں قیام کیا۔ لیکن یہ فتح ظاہری اور غیر مکمل تھی۔ آریوں کا بڑا حصہ شمالی و مغرب میں ہی رہ گیا۔ البتہ زیادہ بہادر اشخاص اس بڑے جزیرہ نما کے باقی حصے میں جابجا منتشر ہو گئے۔ شمال میں بھی کوہستانی اور جنگل کے بڑے قطعات اصلی باشندوں کے تنہا قبضے میں رہے۔ جنوبی حصے میں تو بہت کم آریہ نسل کے اشخاص داخل ہوئے۔ لہذا ہندوستان کے بڑے حصہ میں آریہ محض حکمران طبقہ تھے جو کثیر التعداد محکوم آبادی پر مسلط ہو گئے۔ دراودی قوم کے سمندر میں معدوم ہو جانے کے خوف سے آریوں نے اپنی سیاسی فوقیت اور اپنی نسلی بے لوثی قایم رکھنے کے لیے "ذاتیں" قایم کیں۔ جو اس وقت سے ابتک ہندوستان کی معاشرتی زندگی کی بنیاد ہے۔ ابتدا میں ذات محض رنگ کے امتیاز پر مبنی تھی لیکن اس کا نفاذ کسی قانون کی رو سے اس قدر نہیں ہوا جیسا کہ مذہب کے ذریعہ سے۔ جماعت ذاتوں میں منقسم تھی۔ برہمن یعنی پوجاری۔ چھتری یعنی جنگجو۔ اور شودر یعنی مزدور پیشہ۔ آریوں نے پہلے دو طبقوں کو اپنے لیے مخصوص کر لیا۔ اور دراودی محکوم آبادی شودر ہوئی۔ یہ ذاتیں سخت مذہبی امتناعات سے منفصل رہیں۔ باہمی ازدواج اور خورد و نوش حتے کہ جسمانی قربت سے بھی ایسی نجاست پیدا ہوتی تھی جو بعض وقت رفع نہ ہو سکتی تھی۔ ان امتناعات کی خلاف ورزی کی سزا ذات سے نکالے جانے کی سخت تعزیر تھی جس کی رو سے مجرم نہ صرف ذات کے مقدس نظام میں ادنے درجہ میں گر جاتا تھا بلکہ شودروں سے بھی

زیادہ ذلیل ہو کر پھر یہ "یعنی" کو ثابت ہو جاتا تھا جس سے نہایت ذلیل اور ناپسندیدہ کام لیے جاتے تھے۔ اور جسے ایسا حق بھی نہ رہتا تھا جن کا احترام شودروں تک پر واجب تھا۔ اس طور پر ہندوستان کی معاشرت ملکی قانون کے تابع نہ تھی بلکہ اس پر بھی مذہبی قانون حاوی تھا۔ برعکس اس کے ہندوستان کے نوزائیدہ مذہب (مذہب براہمہ) نے اخلاقی کے بجائے معاشرتی خصائص اختیار کیے۔

ان امور سے نہایت اہم نتیجے پیدا ہوئے۔ ذات کا عمل باعتبار "امتیاز رنگ" نہایت ناممکل رہا۔ باوجود ان موانع کے برہمنوں میں بھی کم و بیش دراوڑی خون مخلوط ہو گیا۔ لیکن معاشرتی نظام کی حیثیت سے ذات اپنے مخصوص طریقوں پر عمل کرتی رہی۔ اصلی تین ذاتیں رفتہ رفتہ تقسیم ہو کر سیکڑوں کیا ہزاروں قسم کی ماتحت ذاتوں میں منقسم ہو گئیں۔ ان ماتحت ذاتوں میں اصل النسل کی اہمیت بالکل باقی نہ رہی اور یہ بھی ایسی ہی ہنگڑ رہیں جیسی کہ ابتدائی تین ذاتیں تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی جماعت پارہ پارہ ہو کر غیر مبدل معاشرتی افراد کی بد نظمی میں منقسم ہو گئی۔ جن میں اشتراک عمل جیسے کہ مفاہمت بھی ناممکن ہو گئی۔ تاریخ ہند پر اس کا جو اثر پڑا وہ ظاہر ہے۔ ایک بڑا لکھا کہتا ہے "انسانی اقسام کی اس مستقل قیام کا ثمرہ یہ ہے کہ آبادی انتہا درجہ کی مختلف الاقسام ہے یہ امیر و غریب، شہری و دیہاتی، یا مخدوم و خادم کا سوال نہیں ہے۔ بلکہ اختلافات اس سے

ٹ بعض مورخین کی رائے ہے کہ یہ اختلاط نسل تقریباً فوراً ہی ہو گیا۔ نظریہ یہ ہے کہ آریہ فاتحین جو شمالی و مغربی ممالک کے باہر تھے اُن کے ساتھ اُن کی ہم قوم عورتیں بہت کم تھیں لہٰذا انھوں نے دراوڑی نسل کی عورتوں سے شادی کی یا اُن کو بطور آشنا رکھا اور اپنی مخلوط النسل اولاد کو جائز قرار دیا۔ فاتحین کی اولاد خواہ خالص نسل کی ہوں یا مخلوط النسل کسی خاص ذات میں مل گئیں اس طور پر مزید دراوڑی خون کا اختلاط بند ہو گیا لیکن آریوں کی نسلی [illegible] کا خاتمہ ہو گیا۔ مصنف

زیادہ گہرے ہیں۔ ایک ضلع یا قصبہ کی آبادی مختلف اقوام بلکہ مختلف انواع کا مجمع ہے۔ جو ایک دوسرے سے نہ شادی بیاہ کرتے ہیں نہ خور و نوش رکھتے ہیں۔ اور جو زندگی کے اہم تر معاملات میں اپنی جماعتوں کے تابع فرمان ہیں۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ ذات کے تفرقہ سے ہندوستان کے باشندے دو ہزار سے زیادہ انواع میں منقسم ہیں۔ جن کی زندگی کے اندرونی جسمانی ربط میں اسی قدر کم اشتراک ہے جتنا کہ چڑیا خانوں کے جانوروں میں''

ظاہر ہے کہ ایک ایسا ملک جو معاشرت میں ایسا منفرد اور سیاسی طور پر متعدد ریاستوں میں منقسم ہو اُس کو پہلے طاقتور حملہ آور کے سامنے مغلوب ہونا لازمی تھا۔ یہ حملہ آور اسلام تھا۔ مسلمانوں نے فتح ایران ہی کے بعد فوراً ہندوستان پر حملہ کیا لیکن ابتدائی حملے محض سرحدی تاخت کی حیثیت رکھتے تھے۔ اُن میں کوئی دیرپا اہمیت نہ تھی۔ پہلا اصلی اسلامی حملہ محمود غزنوی سلطان افغانستان نے سنہ ۱۰۰۱ء میں کیا۔ محمود نے اسی راستہ سے آکر جس سے قرنوں پہلے آریہ آئے تھے ہندوستان کے شمالی و مغربی حصہ کو جو پنجاب کہلاتا ہے فتح کیا۔ اس طرح اسلام کو ہندوستان میں مستحکم مستقر

لے سر ہمفیلڈ فلڈ کی کتاب ''ہندوستانی زندگی اور حیات کا مطالعہ'' صفحہ ۴ مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۱ء۔ ذات اور اس کے اثرات کی تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو ڈبلیو ار جیمز کی کتاب ''ہندوستان اور اس کا مستقبل'' مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۰ء۔ سر ولنٹائن چرول کی کتاب ''ہندوستانی شورش'' مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۱ء۔ ریورینڈ جے ایلیسن کی کتاب ''ہندوستان میں جدید خیالات یعنی معاشرتی سیاسی۔ مذہبی تحریکوں کا تبصرہ'' مطبوعہ ایڈنبرا سنہ ۱۹۰۶ء۔ سر ایچ رسلے کی کتاب ''ہندوستان کی رعایا'' مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۰۸ء۔ نیز ملاحظہ ہو ڈاکٹر نائر گروہ ناسودر کی تحریرات۔ اور ایس نہال سنگھ کا مضمون ''ہندوستان کے اچھوت'' جو مارچ سنہ ۱۹۱۳ء کے کنٹمپرری ریویو میں شائع ہوا۔ مصنف

ل گیا۔ اور بعد کے مسلمان سرداروں نے مشرق کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ شمالی ہند کا بڑا حصہ مسلمانوں کی حکومت میں آگیا۔ ان فاتحین کو "نمایاں تفوق حاصل تھے۔ یہ ذلیل بت پرستوں" کے خلاف مذہباً متحارب تھے اور انھوں نے بہت سے اہل ملک کو مسلمان بنا لیا تھا۔ چونکہ اسلام مذہب براہمہ کے بالکل ہی متضاد تھا۔ اور اس میں "کل مومن اخوۃ" کا اصول موجود تھا لہذا اون بہت سے نیچ ذات اور کو ذات اشخاص کے قلوب اس کی طرف لازمی طور پر مائل ہوئے جو اس تبدیل مذہب کی وجہ سے فاتح کی حیثیت حاصل کر سکتے تھے۔ آج ہندوستان میں مسلمانوں کی "کروڑ یعنی آبادی کے پانچویں حصہ سے زیادہ مردم شماری ہونے کی بڑی وجہ یہی ہے۔ یہ ہندوستانی مسلمان صرف افغان، ترک، عرب اور ایرانی حملہ آوروں کی اولاد نہیں ہیں بلکہ ان الکھوں ہندوؤں کی بھی اولاد ہیں جنھوں نے مذہب اسلام قبول کیا۔

عرصہ دراز تک مسلمانوں کا ہندوستان پر تسلط صرف شمال ہی تک محدود تھا۔ تاں بعد سولھویں صدی کے آغاز میں بڑے ترکی مغل سردار بابر نے ہندوستان میں داخل ہو کر سلطنت مغلیہ" کی بنیاد ڈالی۔ بابر اور اس کے جانشینوں نے جنوب میں بھی حملے کیے اور کل ہندوستان کو سیاسی طور پر ایسا متحد کر دیا کہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ لیکن یہ فتح بھی سطحی تھی۔ برہمنوں نے اپنی تباہی کے خوف سے ہندو احیاء کی تلقین کی۔ مغلیہ خاندان کمزور ہو گیا۔ اٹھارھویں صدی کے آغاز میں مغلیہ سلطنت تباہ ہو گئی اور ہندوستان جنگجو ریاستوں کا میدان مصاف بن گیا۔ اور مسلمان و ہنود مذہب یا سیاسیات یا محض غارت گری کے لیے باہم دگر لڑنے لگے۔

اس بدنظمی کے دور میں دولت انگلشیہ با اقتدار ہو گئی۔ شروع میں انگریز بھی ان دیگر یورپی یعنی پرتگالی ڈچ اور فرانسیسی اقوام کی طرح تھے۔ جنھوں نے ساحل ہند پر چھوٹی چھوٹی آبادیاں قایم کی تھیں۔ جب تک مغلیہ سلطنت قایم رہی یورپیوں کو فتح

ہندوستان کا خیال بھی نہ آیا۔ فی الواقع ہندوستان سے برطانوی روابط خالص تجارتی کاروبار ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں شروع ہوئے لیکن جب ہندوستان میں طوائف الملوکی پھیل گئی تو یورپیوں کو مجبوراً اپنے "کاروبار" کی حفاظت کے لیے مقامی اختیارات حاصل کرنا پڑے۔ اور بعد میں چھوٹے حکمرانوں کی ناقابلیت کی وجہ سے حریصانہ تجاویز کی نوبت ہوئی۔ انگریزوں نے اپنے یورپی رقیبوں کو بتدریج خارج کر کے ہندوستان میں مستحکم سیاسی بنیاد قائم کی۔ اس طوفان خیز طوائف الملوکی میں ایک ہی پائیدار عنصر تھا۔ وہ انگریز تھے۔ جنھوں نے لازمی طور پر اپنی حکومت کو وسعت دی۔ یہ عمل انھوں نے پہلے بادل ناخواستہ کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی عرصہ تک اصلاً تجارتی کاروبار رہی جس کا منشاء ملک گیری کے مقابلہ میں تجارتی نفع اٹھانا تھا مگر بعد میں یہ ایک حقیقی حکومت کی صورت میں ترقی کر گئی اور اس نے بڑی حریصانہ الحاقی پالیسی اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے بہت سے ہندوستانی خالف ہونے لگے اور بالآخر ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہو گیا۔ ہنگامہ فرو ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ٹوٹ گئی ہندوستان براہ راست برطانوی راج کے ماتحت ہو گیا۔ اور بعد میں ملکہ وکٹوریہ کا خطاب قیصرۂ ہند اعلان کیا گیا۔ ان واقعات سے نہ صرف برطانوی سیاسی اقتدار کو استحکام ہوا بلکہ ہر قسم کے مغربی اثرات روز بروز سرایت کرنے لگے ٹریں ریلیں اور نہریں جاری ہوئیں اور ان سے ہندوستان ایسا متحد ہوا کہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ نہر سویز کی تعمیر نے یورپ سے آمد و رفت میں آسانی پیدا کر دی۔ اور یورپی طرز کی تعلیم نے مغربی خیالات کی اشاعت کی۔

اس سریع الانقلاب ہندوستان پر برطانوی راج قائم تھا۔ جو تاریخ عالم میں عدیم المثال طرز حکومت ہے یہ صرف کئی سو ایسے نفوس کی حکومت تھی جنھیں امور انتظامی میں نہایت قابلیت و بصیرت تھی جن کی معاونت ایک چھوٹی سی پیشہ ور فوج

کرتی تھی۔ یہ مختصر جماعت ملک کے کثیر التعداد رعایا پر حکمران ہوئی۔ یہ کھلی ہوئی "مائی باپ" حکومت تھی جو اپنی مرضی کے مطابق انتظام کرتی تھی۔ اور اپنے پیشرو مطلق العنان ایشیائی حکومتوں سے زیادہ رعایا کو جوابدہ نہ تھی لیکن یہ حکومت اچھی تھی۔ قابلیت، دیانت اور بجا آوری خدمات کے اعتبار سے گورنمنٹ ہند غالباً دنیا میں نیک نیت مطلق العنانی کی بہترین مثال ہے۔ اس نے ہندوستان میں کامل امن قایم کر دیا۔ اس نے کسی کی جانبداری نہ کی اور رقیب نسلوں، مذاہب اور ذاتوں میں توازن قایم رکھا۔ آخر بات یہ ہے کہ اس نے ہندوستان کو حقیقی سیاسی ہستی بنا دیا۔ یہ وہ بات ہے جو ہندوستان کو پہلے کبھی حاصل نہ ہوئی تھی۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ ہندوستان مستحکم طور پر ایک حکومت کے تحت میں متحد ہوا۔ اور یہ پُرامن برطانیہ کی حکومت تھی۔

لیکن انگریزوں کی خوبیوں نے ہی آئندہ کے فتنوں کا بیج بویا۔ ایسی نسلیں پیدا ہوئیں جو عدیم المثال طور پر ایک دوسرے سے واقف ہو کر امن وصلح کے ساتھ متحد ہو گئیں اور اپنی گزشتہ خرابیوں کو فراموش کر کے صرف یورپی لغزشوں کو دیکھنے لگیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ سیلف گورنمنٹ آزادی اور قومیت کے مغربی مفہوم کو سمجھنے لگیں۔ مشرق کے دیگر حصص کی طرح ہندوستان میں بھی مغربی حکومت کے خلاف روز افزوں بے چینی و تحریک کا ہونا ضروری تھا یہ نئی ایسی مختلف الخیال تھی کہ بہ تفاوت حالات تدریجی خود مختاری کے معتدل مطالبات سے لیکر فوری آزادی کے انتہائی مطالبہ پر مشتمل تھی۔

اونیسویں صدی کے ربع آخر تک برطانوی راج کے خلاف سیاسی شورش کا وجود نظم و انضباط کے ساتھ نہ تھا۔ جابجا ایک دو اشخاص نے دبی زبان سے احتجاجات کیے لیکن یہ صدائیں عوام میں مقبول نہ ہوئیں۔ ہندوستانی رعایا نے جو کسب معاش کی دائمی فکر میں مبتلا رہتی ہے ایسی گورنمنٹ کو نہایت خوشی سے منظور کر لیا جو اپنے

پیش رو سے زیادہ مطلق العنان نہ تھی اور نہ بے حد اچھی تھی۔ خود شناس ہندوستانی حمایت قومی جیسی چیز کا درحقیقت کوئی وجود ہی نہ تھا۔

باقاعدہ شورش کی پہلی علامت ۱۸۸۵ء میں "انڈین نیشنل کانگریس" کی تنظیم تھی۔ اس کے نام ہی نے ظاہر کر دیا کہ برطانوی راج جو کل ہندوستان پر حاوی تھا خود ہی ہندوستان کے مختلف عناصر میں ایک خاص مشترکہ نقطۂ خیال اور تمنا پیدا کر رہا تھا۔ مگر ابتدائی کانگریسیں عام مفہوم اصطلاح کے مطابق ہندوستانی رائے عامہ کی نمائندگی کرنے سے بہت دور تھیں۔ برخلاف اس کے یہ جیسے اہل حرفہ، اخبار نویس، اور اہل سیاست کے چھوٹے طبقے کی نمائندگی کرتے تھے جو سب مغربی خیالات کے تعلیم یافتہ تھے۔ یورپی طریقۂ تعلیم نے جس کو برطانیہ نے جاری کیا تھا ایک ہندوستانی روشن خیال طبقہ پیدا کر دیا تھا جو انگریزی زبان سے واقف اور مغربی تہذیب میں خوب ڈوبا ہوا۔

یہ جدید روشن خیال طبقہ چونکہ مغربی مطامح نظر اور نتائج کی قدر و قیمت بخوبی سمجھتا تھا لہذا وہ ہندوستانی زندگی کی بعض صورتوں سے لازمی طور پر مطمئن نہ رہا۔ فی الواقع اس کے ابتدائی مساعی سیاسیات سے اس قدر تعلق نہ رکھتے تھے جیسا کہ معاشرتی اور اقتصادی اصلاحات سے مثلاً کم سنی کی شادیوں کا انسداد، عقد بیوگان اور اشاعت تعلیم۔ لیکن امتداد زمانہ کے ہم عنان سیاسی اصلاح کے معاملات بتدریج پیش پیش نظر آنے لگے۔ چونکہ یہ طبقہ انگریزی تاریخ اور سیاسی فلسفہ میں ڈوبا ہوا تھا ہندوستانی اہل بصیرت "سیلف گورنمنٹ" کے فقدان کلی کو روز بروز بہت زیادہ محسوس کرنے لگے اور یہ آرزو کرنے لگے کہ ہندوستان کو آزادی کی اُن نعمتوں سے مالامال کریں جو اُن کے انگریز حکمرانوں کو نہایت عزیز ہیں بہت جلد زوردار دیسی مطبع پیدا ہو گیا جس نے نئی تلقین کر کے روشن خیالوں کو خود شناس اتحاد میں منسلک کرنا اور حقیقی رائے عامہ کا پیدا کرنا شروع کر دیا۔

اُنیسویں صدی کے ختم پر ہندوستانی روشن خیال طبقہ ایسے سیاسی اختراعات کے لیے کھلم کھلا شورش کرنے لگا مثلاً مجلس مبعوثین، محصولات اور انتظامی معاملات پر مزید تسلط اور پبلک ملازمتوں کے انتہائی درجہ تک ہندوستانیوں کا داخلہ۔

جیسا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اُنیسویں صدی کے آخری سنین تک ہندوستانی بے چینی کم و بیش یورپی رنگ میں ڈوبے ہوئے روشن خیالوں کی جماعت قلیل تک محدود تھی۔ جو باوجود اپنے خود اختیار کردہ خطاب کے اس لفظ کے عام مفہوم کے مطابق مشکل سے قوم پرست کہی جا سکتی تھی۔ چند اشخاص کو چھوڑ کر اُن کا نصب العین نہ کامل آزادی تھا اور نہ زبردست برطانوی نگرانی کا دور کرنا۔ بلکہ ہندوستانی زندگی کی مغربی طریق پر اصلاح کرنا تھا جس میں حکومت برطانیہ کی ماتحتی میں "سیلف گورنمنٹ" کا ترقی کن درجہ بھی شامل تھا۔

لیکن اونیسویں صدی کے ختم پر اس حالت میں تبدیلی واقع ہوئی۔ دیگر بلاد مشرقی کی طرح ہندوستان میں بھی نسلی اور سیاسی خود شناسی کی جدید روح پیدا ہو رہی تھی حقیقی قوم پرستوں کے آثار رونما ہونے لگے۔ ہندوستانی فضلاء نے اپنی گرد آلود تاریخوں اور مقدس کتابوں کا عمیق مطالعہ کر کے ہندوستان کی تاریخی ماضی کی عظمت کا اعلان کیا۔ آریہ سماج جیسے اصلاح شدہ ہندو فرقوں نے مذہبی اجازت عطا کی۔ متفرق روشن خیال جماعت قلیل میں دوسرے عناصر بھی شامل ہو گئے۔ جو مغربی نمونہ پر جزوی اصلاحات کو پیش نظر نہیں رکھتے تھے بلکہ ایک جدید ہندوستان کا منصوبہ باندھتے تھے جو خود اپنی قوت حیات سے جوان ہو کر اپنی قسمت کو اپنے طور پر پورا کرنے کے سبب آزاد ہو۔ اب قوم پرستوں کی صفوف سے میانہ طلب صدا اور ہندستے مانرم" (ای مادر زمین اُٹھ) پیدا ہونے لگی۔[1]

---

[1] تحریکات قوم پرستی کے لیے ملاحظہ ہوں ارچر و چرول و ماریسن مذکور الصدر کی تصانیف۔

اس ابتدائی ہندوستانی قوم پرستی کی نمایاں صورت یہ تھی کہ یہ بالکل ہندو تحریک تھی۔ مسلمان اس کو شبہ اور مخالفت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس کے اسباب بھی تھے۔ نئے قوم پرستوں کا نصب العین آریوں کا ہندوستان یعنی "عہد زریں" کا ہندوستان تھا۔ قوم پرستوں کی صدا ویدوں کی رجعت تھی جس میں ماضی کی حرمت اور جارحانہ مذہب براہمہ کی نشاۃ مضمر تھی۔ روشن خیال طبقہ میں غیر معمولی انقلاب پیدا ہوا۔ چند سال قبل جو لوگ مغربی خیالات کی فوقیت کا اعلان کرتے تھے اور بت پرستی جیسے "توہم" کا علانیہ مذاق بناتے تھے اب مغربی شے کو برا کہنے لگے۔ اور ہندو دیوتاؤں کو نہایت عقیدت کے ساتھ بھینٹ چڑھانے لگے ہندوستان کی "مقدس زمین" اجانب سے پاک کرنا چاہیے۔ ان اجانب میں قوم پرستوں کے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱) نیز ایچ۔ جے۔ ایس کاٹن کی کتاب "ہندوستان حالت نقل و حرکت میں" مطبوعہ لندن ۱۹۱۱ء۔ جے۔ این۔ فارکیوہر کی کتاب "ہندوستان میں جدید تحریکات مذہبی" مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۵ء۔ سر ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر کی کتاب "ملکہ کے عہد کا ہندوستان اور دیگر مضامین" مطبوعہ لندن ۱۹۰۳ء۔ ڈبلیو۔ ایس۔ للی کی کتاب "ہندوستان اور اس کے مسائل" مطبوعہ لندن ۱۹۰۲ء۔ سر ادانی لویٹ کی کتاب "ہندوستانی تحریک قوم پرستی کی تاریخ" مطبوعہ لندن ۱۹۲۰ء۔ جے ریمزی میکڈانلڈ کی کتاب "حکومت ہند" مطبوعہ لندن ۱۹۲۰ء۔ سر تھیوڈور ماریسن کی کتاب "ہندوستان میں حکومت شہنشاہی" مطبوعہ لندن ۱۸۹۹ء۔ جے۔ ڈی۔ ریس کی کتاب "اصل ہندوستان" مطبوعہ لندن ۱۹۰۸ء۔ سر جان اسٹریچی کی کتاب "ہندوستان۔ اس کی حکومت اور ترقی" چوتھی ایڈیشن مطبوعہ لندن ۱۹۱۱ء۔ کے ویاس راؤ کی کتاب "ہندوستان کی آئندہ حکومت" مطبوعہ لندن ۱۹۱۸ء۔[۲] مصنف

لے فصل سوئم میں "عہد زریں" کے میلانات پر بحث ہو چکی ہے۔ ہندوستانی انتہا پسندوں کی نقاط نظر کے لیے ملاحظہ ہو اسے۔ کمارسوامی کی کتاب "شیو جی کا رقص" مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۸ء ایچ مترا کی کتاب "مذہب ہنود

اور اک کے بموجب صرف انگریز ہی نہ تھے بلکہ مسلمان بھی تھے۔ اس کے یہ معنی تھے کہ
ہمنی کو بڑی شدّومد سے زندہ کیا جائے صدیوں سے ہندو مسلمان کی بڑی تفریق
ہندوستان بھر میں ایک غار کے طور پر رہی ہے یہ غار کبھی نہیں پٹا۔ گو اوس پر راج
برطانیہ کی غیر جانبدار حکمرانی سے کچھ پردہ پڑ گیا تھا اب یہ پردہ بھی پارہ پارہ ہو گیا۔ اور مسلمانوں
نے یہ دیکھا کہ ان کو اس قسم کے جنگجو یانہ احیاء ہندو کا خوف درپیش ہے جس نے کہ
دو سو سال پہلے شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ کو پاش پاش
کر دیا تھا۔ مسلمان صرف خوفزدہ ہی نہ ہوئے بلکہ اُن کی آتش غضب مشتعل ہو گئی
جس طرح ہندو آریہ ورت ہندوستان کی عظمت کو یاد کرتے تھے مسلمانوں کو بھی سلطنت
مغلیہ کی عظمت یاد آنے لگی۔ وہ اپنے کو ملک کا جائز مالک سمجھتے تھے۔ اور ذلیل ''بت
پرستوں'' کا محکوم ہونا نہیں چاہتے تھے۔ مسلمانوں کو گورنمنٹ برطانیہ سے کوئی محبت
نہ تھی لیکن ہندوؤں سے نفرت تھی۔ انھوں نے یہ دیکھا کہ ان کے معدودے چند دشمنوں کے
قوی خطرہ کے مقابلہ میں جو کثرت تعداد میں ہیچ گونہ تھے راج برطانیہ ہی ان کا حصن
حصین ہے لہٰذا مسلمانوں نے ہندو قوم پرستی کو بُرا کہنا اور راج سے اعلان وفاداری
شروع کیا۔ بلاشبہ ہندوستان کے مسلمان بھی اس شورش کے اُس عام روح
سے متاثر تھے جو مشرق میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بھی خودشناسی کے نوزائیدہ احساس
کا ادراک کرتے تھے لیکن چونکہ ہندوستان میں وہ جماعت اقل تھے اُن کے
خیالات قومی حب وطن کی صورت میں متشکل نہ ہوئے۔ بلکہ اتحاد بین الاسلامی

بقیہ نوٹ صفحہ :- یعنی عالمگیر نصب العین'' مطبوعہ لندن ۱۹۰۶ء بپن چندر پال کا مضمون ''ہندوستانی
شورش کے اسباب'' جو فروری ۱۹۱۰ء کے کنٹمپرری ریویو میں شائع ہوا۔ نیز لاجپت رائے کے مختلف
مضامین بالخصوص ''آریہ سماج'' مطبوعہ لندن ۱۹۱۵ء اور ''نوجوان ہندوستان'' مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۶ء مصنف

اور بین الاسلامی قوم پرستی کے وسیع خیالات کی صورت میں ظاہر ہوئے جن پر ہم بحث کر چکے ہیں۔

ابتدائی ہندوستانی حمایت قومی محض ہندو خصایص کی نہ تھی بلکہ نمایاں طور پر "برہمنی" بھی تھی۔ روز بروز برہمن اس تحریک کے روح رواں بنتے گئے اور اس کے متلاشی تھے کہ مستقبل کے ہندوستان میں وہ اپنی فوقیت کو ایسا ہی قائم کرلیں جیسا کہ ماضی کے ہندوستان میں تھی لیکن اس سے ہندو جماعت کے بعض فرقوں میں خوف پیدا ہوا۔ بہت سے نیچ ذات اور پھر یا کو یہ ڈر ہوا کہ آزاد یا خود مختار ہندوستان میں بھی ظالم برہمنوں کی جماعت منتخب حکومت کرے گی۔ اور یہ جماعت اون کو اون فوائد سے بھی محروم کردے گی جو حکومت برطانیہ کے تحت میں حاصل[۲] ہیں۔ اکثر ہندو راجاؤں نے مذہبی حکومت کے خیال کو ناپسند کیا۔ کیونکہ اس حکومت میں ان کی ہستی موہوم رہ جاتی[۳]۔ اس طور پر قوم پرستی کی تحریک برہمنوں

---

[۱] ہندوستانی مسلمانوں کے نقاط نظر کے لیے جو زیادہ تر ہنود کے مخالف ہیں ملاحظہ ہو ہز ہائی نس دی آغا خاں کی کتاب "ہندوستان تبدیلی کی حالت میں" مطبوعہ لندن ۱۹۱۸ء۔ صلاح الدین خدابخش کے "مضامین ہندی واسلامی" مطبوعہ لندن ۱۹۱۲ء + سر سید احمد خاں کی کتاب "ہندوستانی سیاسیات کی موجودہ حالت" مطبوعہ الہ آباد ۱۸۸۸ء۔ سردار علی خاں کی کتاب "ہندوستان میں شورش" مطبوعہ بمبئی ۱۹۱۸ء نیز ان کی کتاب "موجودہ ہندوستان" مطبوعہ بمبئی ۱۹۰۸ء مصنف

[۲] "پست طبقات" کا طرز عمل بالخصوص اُس کا اظہار جس طرح سے "ناسود جماعت" سے ہوا فصل سوئم میں بیان کیا جا چکا ہے اور اس فصل میں بھی بعد کو بیان کیا جائے گا۔ مصنف

[۳] دیسی والیان ریاست کے لیے ملاحظہ ہو

اور مغربی تعلیم یافتہ روشن خیالوں کے درمیان ایک معاہدہ اتحاد ہو گئی۔ آخر الذکر فرقہ نے اپنے حوصلوں کو اس نظامِ عمل پر منحصر کر دیا تھا کہ وہ بالاشتراک ہندوستان میں حکومت کرینگے۔

قوم پرستی کی تحریک میں اس رفیع تمنا سے سرعت اور مذہبی جوش سے اشتعال پیدا ہو کر بہت جلد حالت دیوانگی پیدا ہو گئی۔ جس کی خصوصیت ہر مغربی شے سے باطنی نفرت اور سب یورپیوں سے وحشیانہ عداوت تھی۔ جنگ روس و جاپان سے اس جذبہ کو سخت اشتعال پیدا ہو گیا۔ اور سال مابعد یعنی ۱۹۰۵ء ہی میں گورنمنٹ ہند کے ایک قانون سے اس طوفان محیط میں سرعت پیدا ہو گئی۔ یہ قانون مشہور "تقسیم بنگالہ تھا"، یہ تقسیم محض ایک انتظامی کارروائی تھی اور اس میں کوئی سیاسی غرض نہ تھی۔ لیکن قوم پرستوں نے اس کو ایک "امر اہم" بنا دیا۔ اور اس شکایت کی بابت انھوں نے سخت تبلیغ شروع کر دی جس سے ہندوستان میں بہت جلد مغویانہ بے چینی پھیل گئی۔ اس شورش کے روح رواں مسٹر بال گنگا دھر تلک تھے جن کو "ہندوستانی بے چینی کا باپ" کہا جاتا ہے۔ تلک نے قوم پرستی کی تحریک کو سانچے میں ڈھال دیا۔ وہ نہایت اچھے مغربی تعلیم یافتہ برہمن اور انگریزی حکومت اور مغربی تمدن کے جانی دشمن تھے۔ چونکہ وہ نہایت عمدہ مبلغ بھی تھے لہذا اُن کے لیکچروں سے سامعین کا جوش جنوں کے درجہ پر پہونچ جاتا تھا۔ اور اُن کا

بقیہ نوٹ صفحہ :-

بوبیلی کی کتاب "ہندوستانی امراء کی اصلاح" مطبوعہ مدراس ۱۹۰۵ء۔ مسٹر ڈی بار اور مسٹر ایلبٹ ینگ ہسبینڈ کے "سلطنت اور صدی"، ان مضامین مطبوعہ لندن ۱۹۰۵ء

اخبار "یوگنتار"[۱] جو کلکتہ سے نکلتا تھا نفرت، خونریزی اور بغاوت کے دور کی تلقین کرتا تھا "تلک" کے اشتعالی مساعی میں بہت جلد صریح نتائج پیدا ہوئے، اور متعدد ڈاکے ڈکیتیاں اور انگریزوں کے قتل واقع ہوئے۔ بیشک قوم پرستوں کے اُن کثیر التعداد اخبارات میں جو کچھ دیسی اور کچھ انگریزی زبان میں شایع ہوئے تھے ایک یوگنتر بھی تھا۔ یہ اخبارات مغویانہ تحریرات میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔

قوم پرست اخبارات کی شدت کا اندازہ ان کے چند اقتباسات سے ہو سکتا ہے۔ یوگنتار کہتا ہے "انقلاب ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے غلامانہ جماعت خلاصی پا سکتی ہے۔ اگر تم زندگی میں اپنے آپ کو مرد ثابت نہیں کر سکتے تو مرنے میں تو مردانگی دکھاؤ۔ اجنبیوں نے باہر سے آکر یہ فیصلہ کیا کہ تم کس طرح جیو۔ لیکن اس کا انحصار قطعاً تم پر ہے کہ تم کس طرح مرو۔" "ہر گھر میں ایک عام انقلاب کی تیاریاں ہونی چاہئیں مٹھی بھر پولیس اور فوج انقلاب کے اس سمندر کا مقابلہ نہ کر سکے گی بغاوت کرنے والے قید ہو جائیں، مر جائیں لیکن اُن کی بجائے ہزاروں اور پیدا ہو جائینگے تم خوف نہ کھاؤ! ہندوستان کی سرزمین بہادروں کے خون سے ہمیشہ شاداب رہی ہے۔ ہمت نہ ہارو۔ نہ بہادروں کی کمی ہے نہ روپیہ کی عظمت تمہاری منتظر ہے۔ تمہاری ایک ہی ٹیڑھی نظر (چند بم کے گولے) نے دشمن کے دل میں ڈر بٹھا دیا ہے۔ بم دلی کے شور سے فضائے آسمانی

---

[۱] یوگنتر جو کلکتہ سے نکلتا تھا وہ بنگالی زبان کا پرچہ تھا اُس کی ایڈیٹران مختلف اوقات میں مسٹر سین و مسٹر گھوش وغیرہ رہے مسٹر تلک کو اس سے کوئی تعلق نہ تھا اُن کا اخبار تو کیسری تھا۔ مصنف کا یوگنتر کو مسٹر تلک کا اخبار بتانا غلطی ہے یہ ممکن ہے کہ تلک کا کوئی مضمون کیسری سے اس میں نقل کر دیا گیا ہو (

معمور ہے۔ خونریزی کے سمندر میں مزید سرگرمی سے شناوری کرو!" خونریزی کا راگ بڑے زور سے الاپا گیا تھا۔ شیام کرشن ورما "انڈین سوشیالوجسٹ" میں کہتا ہے "سیاسی خونریزی قتل نہیں ہے اور جسمانی قوت کا استعمال اس حالت میں جائز سمجھا جائیگا جبکہ جارحانہ قوت کے مقابلہ میں مدافعانہ قوت استعمال ہو"۔ یوگنتار نے لکھا "جس چندے کی ضرورت ہو وہ صرف یہ ہے کہ ہر قاری ایک یورپی کا سر لائے"۔ اس خونی تبلیغ میں بچوں اور عورتوں تک پر بھی رحم نہ کھایا گیا۔ ایک انگریزی خاتون اور اس کی لڑکی کے قتل کا تذکرہ کرتے ہوئے "یوگنتار" نہایت مسرت سے چیخ اُٹھا "رفتہ رفتہ بہت سی دیونیوں کو مارنا پڑیگا تاکہ اسوروں[1] کی نسل صفحہ زمین سے ختم کر دی جائے"۔ ان آدمیوں کے جنون کا اندازہ جو اس قتل و خون کے مرتکب ہوتے تھے اس بیان سے ہو سکتا ہے جو ایک بڑے انگریزی افسر "سر کرزن ولی" کے قاتل[2] نے اپنے پھانسی پر چڑھنے

---

[1] ہندو قصص میں تین مافوق الفطرت وجود مانے گئے ہیں یعنی دیوتا، دیت اور دانو۔ دانو تو وہ ہیں جو عرف عام میں دیو کہلاتے ہیں اور دیوتا وہ مقدس ہستیاں ہیں جنکی پرستش کی جاتی ہے دیت کو اسورا بھی کہتے ہیں ان کو اپنی جسمانی قوت کی وجہ سے تفوق حاصل تھا۔ اہل ہنود کے دیوتاؤں کو اپنی عظمت و جبروت کے لیے اسوروں سے لڑنا پڑا تھا۔ اسور کی اناث اس پرایا پسیاں کہلاتی ہیں لیکن اندر دیوتا کی بڑے دشمن اسوروں میں "ورترا" اور "اہی" ہیں چنانچہ مہابھارت کی لڑائی بھی اسی جنگ کا تتمہ خیال کی جاتی ہے۔ پانڈو ولی میں دیوتا اوتار لیکر دنیا میں آئے تھے اور کورو لشکر میں اسوروں کی نسل نے جنم لیا۔ (مترجم)

[2] اس قاتل کا نام مدن لعل دھینگرا تھا۔ اس کا شیخ علی الغایتی مصری نے مرثیہ لکھا تھا اور اپنی کتاب "وطنیتی" میں شائع کیا تھا۔ اسی کتاب کی تقریظ لکھنے پر فرید بے اور شیخ شاد شی کو سزا ہوئی تھی۔

(مترجم)

پہلے کیا تھا: "میرا یقین ہے کہ وہ قوم جو غیر ملک والوں کی سنگینوں سے محکوم بنائی جاتی ہے ہمیشہ حالت جنگ میں ہے۔ چونکہ ایک غیر مسلح نسل کے لیے کھلم کھلا جنگ کرنا ناممکن کر دیا گیا ہے۔ میں نے اچانک حملہ کیا چونکہ مجھ کو بندوق رکھنے کی ممانعت تھی۔ میں نے پستول نکالا اور فیر کیا۔ ایک ہندو کی حیثیت سے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میرے ملک کی ذلت میرے دیوتاؤں کی ذلت ہے۔ ملک کا معاملہ "میری رام" کا معاملہ ہے۔ ملک کی خدمت "میری کشن" کی خدمت ہے۔ مجھ جیسا غریب اور کم عقل فرزند مادر وطن کو اپنے خون کے سوا اور کیا نذر دے سکتا ہے۔ لہذا میں نے مادر وطن کی قربان گاہ پر اپنے خون کی بھینٹ چڑھائی ہے۔ ہندوستان میں فی الحال جس سبق کی تعلیم کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ لوگ کس طرح مریں اور اس کی تعلیم دینے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ "ہم خود جان دیں"۔ لہذا میں جان دیتا ہوں۔ اور اپنی شہادت پر نازاں ہوں۔ انگلستان اور ہندوستان کے موجودہ غیر فطری تعلقات اگر ختم نہ ہوئے تو یہ لڑائی اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ ہندی اور انگریزی نسلیں باقی رہینگی"۔

بلاشبہ اس قتل و بغاوت کے دور کا جواب گورنمنٹ نے سخت تشدد سے دیا۔ دیسی اخبارات کی دہاں بندی کی گئی۔ فتنہ انگیزوں کو قید یں پھانسیاں ہوئیں اور حکام کے ہاتھوں کو تعزیری قوانین سے مضبوط کر دیا گیا۔ فی الواقع قوم پرستوں کے قتل و مظالم سے یورپی جماعت ایسی خشمناک ہوئی کہ اکثر انگریزوں نے موجودہ

۵۔ چرول کی تصنیف مذکور الصدر میں انتہا پسندوں کی تنقید کا اچھا خلاصہ دیا ہوا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو سجے۔ ڈی۔ ریس کی کتاب "اصلی ہندوستان"، مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۰۸ء و سلسلہ مضامین جو انتہا پسندوں نے مارچ ۱۹۱۰ء میں دی ادین کورٹ منشایع کیے۔ انتہا پسندوں کے ادبیات کا اچھا نمونہ مشہور رسالہ "ہندوستان کی انگلستان سے وفاداری"، مطبوعہ ۱۹۱۵ء

سیاسی حقوق کی واپسی، مغربی تعلیم کے انسداد اور نہایت جابرانہ حکومت کے قیام پر زور دیا تھا۔ ان غضبناک مشوروں سے قوم پرستوں کے مزاج اور برہم ہوئے جس کا نتیجہ تازہ مظالم کا ارتکاب ہوا۔ اور ان کے جواب میں مزید سزائیں اور نئی دھمکیاں دی گئیں اس طور پر فریقین کے انتہا پسندوں نے ایک دوسرے کی آتش خشم کو مشتعل کر کے حالات کو بدتر کر دیا۔ چند سال تک ہندوستان میں بے چینی کی ایسی ہوا چلی جسے قیدیں، پھانسیاں اور جلاوطنی کی سزائیں روک نہ سکیں۔

مگر تھوڑے ہی دنوں بعد حالت میں کم از کم عارضی تبدیلی بہتری کی طرف ہوئی۔ انتہا پسند تو بالآخر نہایت قلیل التعداد تھے اور ٹھنڈے دماغ والے انگریز اور ہندوستانی دونوں اس مخمصہ میں مخلصی ڈھونڈ رہے تھے۔ گوکھلے جیسے اعتدال پسند لیڈروں نے اس تخریبی دور کی ملامت کی۔ اور اپنے ہم وطنوں سے پر زور اپیل کی کہ وہ پُرامن طریقوں سے حصول توقعات کی کوشش کریں۔ دوسری طرف آزاد خیال انگریزوں نے گو خوفزدہ ہونے سے انکار کیا لیکن مصالحت کا نظام عمل تلاش کیا۔ اس زمانہ میں ہندوستان کے معاملات کی عنان انتظام مشہور لبرل مدبر جان مارلے کے ہاتھ میں تھی اور اس کے مساعی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۹۰۹ء کا قانون مجالس ہند" پاس ہوا۔ یہ قانون اس غیر محدود مطلق العنانی میں ایک بین تبدیلی تھی جس پر ہندوستان میں برطانوی حکومت کا اب تک عملدرآمد تھا۔ اس کی رو سے ہندوستان کی مجلس مخالفت[1] کو مشورہ نکتہ چینی اور بحث کے بہت زیادہ موقعے مل گئے۔ اور اس نے جو مجالس اضعاف قانون قایم کیں تھیں اُن کیلئے محدود انتخاب کی ابتدا ہوئی۔ ان مراعات کا

---

[1] مجلس مخالف یعنی اپوزیشن پارٹی وہ پارٹی جو وزرا یا حکمراں جماعت کی مخالفت و نکتہ چینی کرے۔

اچھا اثر بہت جلد ظاہر ہوا۔ اعتدال پسند قوم پرستوں کا گروہ گو اس سے کلیتاً مطمئن نہیں ہوا۔ لیکن اس نے اس قانون کو مراعات مابعد کا بیعانہ اور برطانوی نیک نیتی کے ثبوت کے طور پر قبول کر لیا۔ انتہا پسندوں کی منصوبانہ سازشیں اور تخریبی حرکات اگرچہ کلیتاً نہ مٹیں۔ لیکن وہ رک کر زیر زمین دب گئیں۔ ۱۹۱۱ء میں شاہ جارج کی سیاحت ہند نے وفادارانہ جوش کی لہر پیدا کر دی جو کل جزیرہ نما میں پھیل گئی۔ اور مستقبل کے لیے فال نیک معلوم ہوتی تھی۔

۱۹۰۸ء لغایۃ ۱۹۰۹ء کے طوفانات کے بعد جو امن کا دور آیا اس کا بہترین زمانہ ۱۹۱۱ء تھا۔ ۱۹۱۱ء کے بعد جب کونسل ایکٹ کے پہلے اثرات ہٹے اور غیر ایفا شدہ توقعات کے احساس نے مزید خواہشات کو تیز کیا تو رفتہ رفتہ بے چینی پیدا ہونے لگی۔ فی الواقع ان سنین میں ہندوستانی قوم پرستی اپنی بنیادوں کو بتدریج وسیع کر رہی تھی۔ ایک طور پر اس سے استحکام پیدا ہو گیا کیونکہ قوم پرستی کی تحریک محض انتہا پسندوں کی جماعت اقل نہ رہی بلکہ مسٹر گوکھلے جیسے اعتدال پسند لیڈروں کے زیر اثر ہو گئی جو مقاصد بعیدہ کے حصول کے لیے ارتقائی طریقوں پر کام کرنا چاہتے تھے۔ مگر اس کا منشا یہ نکلا کہ اختیارات کو اور زیادہ منتقل کرنے کے لیے گورنمنٹ پر مزید بار ڈالا گیا۔ قوم پرستی کی ترقی کی سب سے زیادہ قابل الذکر علامت یہ تھی کہ مسلمانوں کا ایک حصہ قوم پرستوں سے آملا۔ اس زمانہ میں مسلمانوں نے اپنی ایک جماعت یعنی آل انڈیا مسلم لیگ، قایم کر لی تھی یہ لیگ اپنے رنگ میں قوم پرستی کے بالکل متضاد تھی کیونکہ ابتداءً یہ اس غرض سے قایم کی گئی تھی کہ ہندوؤں کی امکانی فوقیت کے مقابلہ میں مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کی جائے۔ مگر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا بعض مسلمان ہندو اعتدال پسندوں کے مساعیہ اور محبانہ طرز عمل سے متاثر ہو کر لیگ کے اس طرز عمل کو جو ہندوؤں کے مخالف تھا ترک کر کے اعتدال پسند

قوم پرستوں میں جا ملے۔ لیکن منویانہ شورش سے الگ رہے۔ فی الحقیقت قوم پرست دو جماعتوں یعنی اعتدال پسند اور انتہا پسندوں میں منقسم ہو گئے۔ انتہا پسندوں نے جنھیں اُن کے ہم وطن لعن طعن کرتے تھے غیر مسلسل دور اشتداد جاری رکھا۔ جس کی رہنمائی زیادہ تر وہ جلا وطن لیڈر کرتے تھے جو ممالک غیر میں پناہ گزیں تھے۔ اور اپنے مقلدین مقیم ہند کو منویانہ شورش اور جبر و اشتداد کی ترغیب دیتے تھے۔

یہ تھی حالت ہندوستان میں جب "جنگ عظیم شروع ہوئی۔ یہ حالت کسی نہج پر مشکلات سے خالی نہ تھی۔ لیکن اس حالت سے بہت کم پر شور تھی جو اب سے چند سال قبل رہ چکی تھی۔ بلاشبہ لڑائی سے نئے چینی اور تخویف میں زیادتی ہو گئی لیکن فی الجملہ ہندوستان پرسکون رہا۔ دوران جنگ میں ہندوستان نے شہنشاہی اغراض کے لیے روپیہ اور سپاہی بلے چون و چرا دیئے۔ اور ہندوستانی افواج یورپی ایشیائی اور افریقی میدانہائے جنگ میں بکثرت موجود تھی۔

اگرچہ جنگ کے زمانہ میں کسی انقلابی اشتداد کا اظہار نہ ہوا مگر یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ مزید سیلف گورنمنٹ کے مطالبہ کی کثیر الاشاعت تحریک بجھ یا دب گئی تھی۔ برخلاف اس کے جنگ سے اس میں تقویت ہو گئی۔ اب صرف اچھی گورنمنٹ ہی کا مطالبہ نہ تھا بلکہ ایسی گورنمنٹ کے لیئے شور مچنے لگا جو ہندوستانیوں کو جوابدہ ہونے کی وجہ سے محبان وطن کے قابل قبول ہو۔ یہ امر کہ ہندوستان نے سلطنت سے اپنی وفاداری ثابت کر دی اور اپنا خون اور خزانہ نہایت فیاضی سے کار سلطنت میں صرف کیا، بہت سی جاہدانہ لیلیں تھیں جو حکومت خود اختیاری کے مزید طریقوں کے عطیہ کے لیے پیش کی جاتی تھیں۔ ہندوستانی رائے عامہ کے مختلف فرقوں نے برطانوی حکام کے سامنے بہت سی یادداشتیں پیش کیں۔ ان

یادداشتوں میں ہندوستانی قوم پرستی کے مختلف تصورات کا صحیح عکس تھا۔ سب کا نصب العین برطانوی اتالیقی سے خلاصی تھا۔ لیکن آپس میں اس پر بڑا اختلاف تھا کہ یہ خلاصی کب اور کیوں کر حاصل ہو۔ شدید قدامت پسند طبقہ نے اس پر قناعت کی کہ زیر نگرانی برطانیہ ترمیم شدہ سیلف گورنمنٹ عطا ہو۔ زیادہ باحوصلہ اشخاص نے یہ مطالبہ کیا کہ شہنشاہی برطانیہ کے شمول میں آسٹریلیا اور کینیڈا کی طرح کامل آزاد حکومت دی جائے۔ قدرتی طور پر انقلابی عنصر علیحدہ رہا۔ کیونکہ وہ یہ جانتے تھے کہ صرف اشتداد ہی سے ان کا مقصد یعنی فوری اور غیر مشروط آزادی حاصل ہوسکتی ہے۔

بلاشبہ زیادہ اعتدال پسند قوم پرستوں کے مطالبات میں بھی موجودہ طرز حکومت میں بڑی تبدیلیاں اور برطانوی تسلط کی ایسی کمی مضمر تھی جس کی منظوری کے لئے گورنمنٹ ہند فی الحال تیار نہ تھی۔ مگر گورنمنٹ ہند نے ان مطالبات کی بابت صلح کن طرز عمل اختیار کیا جس سے مستقبل قریب میں مزید مراعات کی توقع ہوتی تھی۔ ۱۹۱۶ء میں وائسرائے لارڈ ہارڈنگ نے کہا "میں یہ نہیں چاہتا کہ ہندوستان کے لئے سیلف گورنمنٹ سے قومی نصب العین کی حیثیت سے ایک لمحہ کے لئے بھی اعراض کروں یہ بالکل جائز تمنا ہے اور سب اعتدال پسندوں کو اس سے ہمدردی ہے۔ لیکن ہندوستان کی موجودہ حالت میں نظریات کی نہیں بلکہ عملی سیاسیات کی ضرورت ہے ہم کو واقعات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ فضول امیدیں باندھنے اور ناقابل حصول مطالبات کی حوصلہ افزائی کرنے سے تاخیر ہی ہوسکتی ہے۔ اور سیاسی ترقی میں تعجیل نہ ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ عاقل اور صاحب ادراک ہندوستانیوں کا یہی خیال ہے۔ مجھ سے زیادہ کوئی اس کا متمنی نہیں ہے کہ ہندوستان کی جائز تمنائیں جلد بر آئیں۔ لیکن مجھ کو اس کی بھی فکر ہے کہ

رد عمل کے تمام خطرات سے احتراز کیا جائے جو اُن نظامات کے قایم ہونے سے پیدا ہو سکتی ہیں جن کو تجربہ قبل از وقت ثابت کرے۔

فی الواقع ۱۹۱۷ء کے اختتام پر مسٹر مانٹیگو انگلستان سے اس لئے روانہ ہوئے کہ دستوری اصلاحات کے مسئلہ پر ہندوستانی عام رائے کو پوری طور پر جانچیں۔ مہینوں تک اس مسئلہ پر نہایت غور کیا گیا۔ اور ہر نسل اور ہر مذہب کے نمائندوں سے گفتگو کی گئی۔ ان تحقیقاتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک قابل یادگار رپورٹ مسٹر مانٹیگو اور وایسرائے لارڈ چیمسفورڈ کے دستخطوں سے مرتب ہوئی جو جولائی ۱۹۱۸ء میں شایع کی گئی۔

اس رپورٹ میں ایسے مراعات کی سفارش کی گئی تھی جو اس وقت تک برطانیہ عظمیٰ نے کبھی عطا نہ کئے تھے۔ اس نے کھلم کھلا ہندوستان کو حکومت خود اختیاری ”جس قدر جلد ممکن ہو“ دیا جانا تسلیم کیا۔ یہ بھی بیان کیا کہ یہ نعمت ہندوستانی شورش کی وجہ سے نہیں دی جا رہی ہے بلکہ ”ہم پر اعتماد رکھنے“ کی بدولت دی جاتی ہے اس کے بعد حسب ذیل قابل یادگار الفاظ ہیں۔

”...... ہم کو پورا یقین ہے کہ وہ وقت آگیا ہے کہ جو ماموں زندگی ہم نے ہندوستان کو دی ہے وہ اس کی قومی زندگی کو ضرر پہنچائے بغیر دیر تک قایم نہیں رکھی جا سکتی اس وقت تک ہم نے جو نعمتیں اس ملک کے باشندگان کو عطا کی ہیں اس سے زیادہ بیش بہا عطیہ ہندوستانی باشندوں کے لئے ہمارے پاس ہے۔ یہ کہ سلطنت کے اندر قومیت اُن تمام چیزوں سے برتر ہے جو ہندوستان کو اس وقت تک حاصل ہوئی ہیں یہ کہ عوام کی جہالت اور قابل افسوس قناعت ایسی زمین نہیں ہے جس سے ایسی ہندوستانیت کا بیج نشو و نما پا سکے اور یہ

کہ ہم اس کو دیدہ و دانستہ مضطرب کر کے اس کے بہترین نفع کا کام کر رہے ہیں۔

رپورٹ کا لب لباب یہ تھا اس میں دو عملی حکومت کی سفارش کی گئی تھی۔ یعنی حکومت کی ذمہ داریوں کو برطانوی منتظمین کے نامزد کردہ مشیران اور واضعان قانون کی جماعت مبعوثین کے منتخب شدہ وزراء میں تقسیم کیا جائے یہ دو عملی حکومت کا اصول مرکزی اور صوبہ جات دونوں کی حکومتوں میں قایم کیا گیا تھا۔ مجالس قانون ساز کے انتخاب کے لیے پیشتر سے بہت زیادہ وسیع حق انتخاب دیا گیا اور ان جماعتوں کو بہت زیادہ اختیارات بھی دیے گئے۔ قبل ازیں اُن کی حیثیت محض مجلس شورے کی تھی۔ اب جماعت واضعان قانون کی حیثیت مغربی مفہوم کے مطابق ہو گئی۔ اگرچہ ان کے اختیارات اب بھی محدود رہے۔ بہت سے اختیارات، بالخصوص مالیات کے متعلق ہنوز منتظم حکام کے لیے محفوظ رکھے گئے۔ اس طور پر برطانوی حکومت منتظمہ کو آخری تسلط اور قول فیصل کا اختیار تھا۔ اس طور پر کوئی صحیح "توازن اختیار" قایم نہ رکھا گیا تھا بلکہ برٹش راج کا پلہ بالاعلان بھاری تھا۔ لیکن رپورٹ میں یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ اس نظام حکومت کو مستقل کرنے کا قصد نہیں ہے۔ بلکہ یہ بین طور پر ہنگامی کارروائی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ ایک مدرسہ ہے جس میں ہندوستانیوں کو اپنی طالب علمی کا زمانہ گزارنا چاہیے اور یہ کہ جب سیلف گورنمنٹ کے یہ سبق یاد ہو جائیں گے تو ہندوستان کو کامل حکومت مبعوثین دی جائے گی جن کو نہ صرف وضع قانون اور آغاز کا اختیار ہوگا بلکہ منتظم حکام پر بھی تسلط حاصل ہوگا۔

اس مانٹیگو چیمسفورڈ کی رپورٹ پر انگلستان اور ہندوستان دونوں جگہ کامل بحث ہوئی اور ان آزاد مباحثات سے ہندوستانی مسئلہ اور اس کی تمام ہی

پیچیدگیوں کا خوب اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس مسئلہ میں قوم پرستوں کے مابین سخت اختلاف ہے۔ اعتدال پسند طبقہ نے رپورٹ کا خیر مقدم کرکے اس امر پر رضامندی ظاہر کی کہ گورنمنٹ کی مجوزہ اسکیم سے وفادارانہ اشتراک عمل کیا جائے۔ اور انتہا پسندوں نے ان تجاویز کو محض دام فریب اور تلبیس تصور کرکے رد کیا۔ اعتدال پسندوں کا طرز عمل اس اعلان میں بیان کیا گیا تھا جس پر اُن کے لیڈران نے بسرکردگی سر ڈنشا واچا ماہر اقتصادیات دستخط کیے۔ یہ بیان حسب ذیل ہے:۔

"مجوزہ اسکیم کی ساخت بہت پیچیدہ ہے۔ اور بعض تفاصیل میں ترقی کی ضرورت ہے بالخصوص بالائی حصے میں۔ لیکن بہر نوع یہ ایک ترقی کن تدبیر ہے۔ اصلاحات میں یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ ہندوستان کے صوبجات کامل ذمہ دار گورنمنٹ کے درجہ تک پہونچ جائیں۔ فی الجملہ یہ تجاویز نہایت دوراندیشی پر مبنی ہیں۔ اور اُن میں ہندوستان کی سیاسی توقعات سے اصلی ہمدردی کی روح پائی جاتی ہے جس پر نامور مصنفین ملک کے شکریہ کے مستحق ہیں" انتہا پسندوں کی ناپسندیدگی کا اظہار مسٹر تلک جیسے لیڈروں نے کیا۔ جو اس پر مصر تھے کہ "انڈین نیشنل کانگریس کے نصب العین پر قایم رہنا چاہیے" مسٹر بپن چندر پال کا ادعا ہے "یہ میری پختہ رائے ہے کہ اگر یہ تجویز مقبول ہوگئی، تو گورنمنٹ آج سے بھی زیادہ با اقتدار اور خودسر ہو جائے گی"

قوم پرستوں کی مخالف جماعتوں بالخصوص مسلمانوں اور نیچ ذات ہندوؤں نے جو احتجاجات کیے وہ نہایت ہی دلچسپ تھے۔ کیونکہ یہ ایسا امر ہے جس سے ہندوستانی مسئلہ کی اس پیچیدگی کا اظہار ہوتا ہے کہ لاکھوں ہندوستانی قوم پرستی کی تحریک سے خائف ہیں۔ اور راج برطانیہ کی خودسری کو قوم پرستوں کے ظلم اور جانبداری کے مقابلہ میں ڈھال سمجھتے ہیں۔ ہندوستان کی سیلف گورنمنٹ کے مسئلہ پر خود مسلمانان ہند میں سخت اختلاف ہے۔ مسلمانوں کی جماعت کثیر حمایت قومی کی تحریک سے

اوس کے ہندوانہ خصایص کی وجہ سے متنفر اور خایف ہی - مگر جیسا ہم اوپر بیان کرچکے ہیں ایک جماعت اقل قوم پرستوں کے شریک حال ہوگئی ہی - اس جماعت اقل کی تعداد دوران جنگ میں بڑہتی گئی اور روز افزوں ہو دت کی بنا رسیلف گورمنٹ کی تمنا ہی نہیں بلکہ حکمت عملی پر غصہ بھی ہی جو اتحادیوں نے سلطنت عثمانیہ کے تجزیہ اور نیز مشرق ادنی و وسطی کے متعلق[1] اختیار کی - ہندو قوم پرستوں نے مسلمانوں سے ان خارجی امور میں اظہار ہمدردی کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں فرقوں میں عدیم المثال اتحاد قایم ہوگیا -

قوم پرستی کی تحریک میں اونچ ذات برہمنوں کی کثرت ہی نیچ ذات ہندوؤں کی ہوم رول سے مخالفت کی وجہ ظاہر کرتی ہی - نیچ ذات والوں کو طاقتور راج کے تحفظ سے محروم ہوجانے اور اونچ ذات برہمنوں کی محکومت کے بوجھ میں دب جانے کا اس قدر خوف ہی کہ انھوں نے حال میں ایک جماعت الموسوم بہ دو نماسار رہا قایم کی ہے جس کے سرگروہ ڈاکٹر نائر[2] جیسے معروف اشخاص ہیں - موجودہ سیاسی زندگی میں جو برہمنوں کا دباؤ پڑتا ہے نماسدر اوس کو نقل کرکے یہ بتاتی ہے کہ آیندہ کیا ہوگا - مثلاً متعدد انتخابات میں برہمنوں نے نیچ ذات رائے دہندوں کے دل میں دھمکی دے کر یہ ڈر پیدا کردیا ہی کہ جو برہمن کو رائے نہ دینگے وہ ذات باہر کئے جائیں گے - اور بھیڑیا یعنی ایسے اچھوت ہوجائیں گے جن کو ہندو معاشرت میں کوئی حق حاصل نہ ہوگا[3] -

---

[1] مفصل بحث فصل ماسبق میں ہوچکی ہی (مصنف)

[2] فصل چہارم میں بیان کیا گیا ہی - (مصنف)

ہندوستانی آبادی کے بڑے فرقوں کی طرف سے ہوم رول کی خلاف ایسے احتجاجات پیدا ہونے پر اُن انگریزوں کو بھی پس وپیش ہوا جو اس مسئلہ سے واقفیت اور ہوم رول کی اصولی ضرورت کا یقین رکھتے تھے بلاشبہ ان احتجاجات نے بہت سے انگریزوں بالخصوص اُن اینگلو انڈین کے دلائل کو مضبوط کر دیا جن کا یہ دعوےٰ تھا کہ ہندوستان ہنوز سیلف گورنمنٹ کے لیئے موزوں نہیں ہے۔ ان معترضین میں سے ایک نے راونڈ ٹیبل میں کہا "عوام سیاسیات کی ذرہ برابر پرواہ نہیں کرتے۔ وہ سمجھتے ہی نہیں کہ ہوم رول ہے کیا چیز۔ وہ انگریز حاکم ضلع کو پسند کرتے ہیں اور دائمی وہیمی سکوت میں رہنے کے طالب ہیں۔ ان کو انگریزوں پر اس لیے اعتماد ہے کہ وہ ہمیشہ سے غریب پرور ہیں۔ اور وہ نہ ہندو ہیں نہ مسلمان اور ایمانداری کے لیے مشہور ہیں"۔ لارڈ سڈن ہم نے مانٹیگو چیمسفورڈ کی تجاویز پر مفصل نکتہ چینی کرتے ہوئے بیان کیا "ہماری گورنمنٹ ہند

بقیہ نوٹ صفحہ ۱۔ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے اور لفظ ہندو کی عجیب و غریب تعریف ہو رہی ہے اتحاد بین الہنود کی تحریک میں نہ صرف اہل ہند بلکہ چین اور جاپان کے باشندے بھی شامل کیے جا رہے ہیں۔ اس حامی تحریک میں اُن سب اقوام کو منسلک کرنا منصور ہے جو ایسے مذہب کے پابند ہوں جس کا آغاز ہندوستان سے ہوا ہو۔ اس تحریک کا ہنوز آغاز ہے اور اس کی اصولی نظریات کی تطبیق وتنسیق میں ابھی عرصہ لگے گا۔ موجودہ نظام نہ اشتراک خیال یا مذہب پر مبنی ہے اور نہ نسلی یا سیاسی بنا پر۔ اگر مذہبی نقطۂ خیال کو لیا جاوے تو اہل ہنود اور تبت کے مذہب لاما بالکل متضاد ہیں اوّل الذکر خدا کے ماننے والے ہیں اور آخر الذکر منکرین میں ہیں۔ بودھ مت والے خود الوہیت کے منکر ہیں۔ اہل ہنود زیادہ تر آریہ نسل اور دراوڑی نسل کے ہیں اور اہل چین و تبت و جاپان و برھما زرد رنگ یا منگولی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان ممالک کا تمدن بھی مشترک نہیں (مترجم)

کے موجودہ نظام میں بہت سے عیب ہیں۔ اصلاحات کی شدید ضرورت ہے لیکن یہ اصلاحات ہندوستانی عوام کی بہبودی کے لحاظ سے ہونا چاہئیں۔ اگر عوام کے سکوت کو دیدہ و دانستہ توڑنے کی پالیسی پر حسب اعلان وائسرائے و وزیر ہند عمل کیا گیا، اگر مشرق میں یہ خبر کہیں پھیل گئی کہ وہ اقتدار جو امن و امان قایم رکھتا تھا اور ہندوستانی قوم کی تدریجی تعمیر کا محافظ تھا کمزور ہو رہا ہے اور اگر موجودہ تجاویز کے بموجب پبلک سروس کے اختیارات سلب کر لیے گئے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ قدیم ملکی تباہ کن دشمنیاں از سر نو پیدا ہو جائیں گی جو برہمنوں کی استبدادی قوتوں سے معاونت حاصل کر کے چند سال میں اس بڑے سے بڑے کام کو کالعدم کر دینگی جو برطانوی قوم نے اپنی ہستی کے زمانہ میں پایہ تکمیل کو پہونچایا ہے۔"[1]

لیکن ہندوستانی معاملات کے دیگر انگریز ماہرین نے یہ دعوے کیا کہ مانٹیگو چیمسفورڈ تجاویز صحیح ہیں۔ اور اگر سخت ترین خطرات کو رفع کرنا مقصود ہے تو اس کو قانون بنانا چاہیے یہ رائے "لیونل کرٹس"[2] اور "سر ولن ٹائن چرول" جیسے اشخاص کی تھی۔ آخر الذکر کہتے ہیں "سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ غیر ضروری تاخیر نہ ہونا چاہیے۔ تعویق کے خطرات کا ہم کو کافی سبق مل چکا ہے اور دیگر مقامات کی طرح ہندوستان میں بھی وقت فتنہ انگیزوں کا معاون ہے۔ ہم ہندوستانی انتہا پسندوں کو

۱؎ لارڈ سڈنہم کا مضمون "ہندوستان"، جو نومبر ۱۹۱۸ء کے کنٹمپریری ریویو میں شایع ہوا۔ مانٹیگو چیمسفورڈ کی تجاویز پر اس قسم کی نکتہ چینیوں کے لیے ملاحظہ ہو۔ جی۔ ایم چیسنی کی کتاب "ہندوستان زیر آزمایش" مطبوعہ لندن ۱۹۱۸ء اور ۲۰ دسمبر ۱۹۱۸ء کے اسپیکٹیٹر میں مضمون بعنوان "ہندوستانی طوائف الملوکی کی منزل اول" مصنف

۲؎ لیونل کرٹس کے خطوط بنام باشندگان ہند در بارہ ذمہ دار حکومت جو فصل چہارم کے ختم

رضی کرنے کی اُمید نہیں کر سکتے" ہم کو جس امر کی اُمید ہے وہ یہ ہے کہ مفید کارروائی کا نتیجہ ترمیدان پیدا کرکے ہندوستانی آبادی کا جو بہترین حصہ ہے اُس کو انتہا پسندوں کے مضر اثر سے آزاد کریں[1]"

امر واقعہ یہ ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ نے مانٹیگو چیمسفورڈ کی رپورٹ کو مباحثہ کے لیے منظور کر لیا اور سنہ ۱۹۱۹ء میں اس کی سفارشات نے قانون کا جامہ پہنا۔ بدقسمتی سے ان اٹھارہ مہینوں کے دوران میں جو رپورٹ کی اشاعت اور اُس کی قانونی صورت اختیار کرنے کے درمیان میں گزری ہندوستان میں حالت تاریک تر ہو گئی تھی۔ مبارزانہ شورش نے پھر سر اُٹھایا۔ اور ہندوستان ایسا پُرفتن ہو گیا کہ سنہ ۱۹۰۸ء کے بعد کبھی نہ ہوا تھا۔

اس کے چند وجوہ تھے۔ اولاً تو ان سب قوم پرست عناصر نے جو رپورٹ سے غیر مطمئن تھے انقلابی مخالفین سے سازو باز شروع کرکے اُن کو جدید تخویفی عمل کی ہمت دلائی۔ غالباً اُن کو یہ اُمید تھی کہ برطانوی پارلیمنٹ خائف ہو کر رپورٹ میں سفارش کردہ مراعات سے زیادہ کچھ عطا کرے گی۔ لیکن دیگر عام قسم کے متعدد وجوہات بھی تھے سنہ ۱۹۱۸ء ہندوستان کے لیے بہت نازک تھا۔ انفلوانیزا کی وبا جو تمام دنیا میں پھیلی تھی اس نے ہندوستان میں بہت نقصان پہنچایا۔ اور اس مرض مہلک سے تقریباً ستر لاکھ اموات واقع ہوئیں۔ مزید براں ہندوستان میں خشک سالی ہوئی۔ فصلیں خراب ہوئیں اور قحط کا دیو مہیب ملک پر چھا گیا۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں اس سے بدتر خشک سالی ہوئی اور ایسا قحط پڑا کہ غالباً اس سے پیشتر کبھی نہ ہوا تھا۔ موسم گرما کے آخر میں یہ تخمینہ کیا گیا

---

[1] مسٹر لی ٹانن جرنل کا مضمون "ہندوستان کی حالت در دور نو" جو جولائی سنہ ۱۹۱۸ء کے ایڈنبرا ریویو میں شائع ہوا۔ (مستشفہ)

کہ فاقہ کشی سے تین کروڑ دس لاکھ اشخاص مر گئے اور پندرہ کروڑ جاں بلب تھے۔ ان سب پر طرہ یہ ہوا کہ جنگ افغانستان چھڑ گئی جس سے شمالی اور مغربی سرحد پر شورش ہوگئی اور مسلمان عنصر جو ہنوز بے چین تھا اور بھی زیادہ پُر شور ہو گیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ شورش کی لہر بلوے تخویفی عمل اور مغویانہ سرگرمیوں کی وبا کی صورت میں رونما ہوئی جس سے برطانوی حکام کو سخت تشویش پیدا ہوئی۔ یہ حالت ایسی نازک معلوم ہوئی کہ تحقیقات کے لیئے ایک خاص کمیشن مقرر کیا گیا۔ اور اس کے صدر جسٹس رولٹ نے اپنی رپورٹ میں انقلابی شورش کی نہایت مایوس کن تصویر کھینچی اس رپورٹ میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ صرف طبقۂ اعلیٰ کے نوجوان تعلیم یافتوں کی تعداد کثیر ہی بدظمانہ تحریک کی ترقی میں شریک نہیں ہو بلکہ ان میں دیگر معاشرتی طبقات کے لوگ بشمول فوج والوں کے شریک ہیں۔ اور اس کی بیّن شہادت موجود ہو کہ دیسی افواج کی وفاداری پر نہایت کامیابی سے مضر اثر ڈالا گیا ہو۔ اس روز افزوں عدم موانست کے مقابلہ کے لیئے ولٹ کمیٹی نے مزید انسدادی قانون بنانے کی سفارش کی کمیٹی کی رپورٹ کی نازک حالت سے متاثر ہو کر گورنمنٹ آف انڈیا نے ایک قانون کا مسودہ تیار کیا جو سرکاری طور پر نے چینی اور انقلابی جرایم کا ایکٹ کہلاتا ہو۔ اگرچہ عام طور سے اس کو رولٹ بل کہتے ہیں۔ اس قانون کی رو سے حکام کو بہت زیادہ اختیارات حاصل ہوگئے۔ مثلاً بلا کسی خاص شہادت کے محض مغویانہ کارروائی کے شبہ پر ان کو خانہ تلاشی اور گرفتاری کا حق حاصل ہو گیا۔

رولٹ بل پر قوم پرستوں نے نہایت مخالفت کی۔ انتہا پسندوں کے علاوہ بہت سے اعتدال پسندوں نے بھی اس کو رجعت قہقری اور جدید مصائب کا باعث سمجھ کر نامناسب قرار دیا۔ جب یہ بل ہندوستانی جماعت واضعان قانون یعنی امپیریل لیجسلیٹو کاونسل میں مباحثہ کے لیئے پیش ہوا۔ تو کل دیسی ممبروں نے باستثنائے شخص واحد اس کی مخالفت کی۔ اور یہ بل آخر کار صرف نسلی اصول پر مقرر شدہ انگریزوں کی کثرت رائے سے

پاس ہو گیا۔ مگر گورنمنٹ نے اس بل کو قیام امن کے لیے نہایت ضروری حفظ ماتقدم سمجھا۔ اور ۱۹۱۹ء کے موسم بہار میں یہ قانون بن گیا۔

اس سے معاملات انتہا کو پہونچ گئے۔ قوم پرستوں نے رولٹ بل کا نام کالا سانپ والا ایکٹ رکھ کر اس پر نہایت لعنت ملامت کی۔ انتہا پسندوں نے ایک جنگ جویانہ احتجاج کا دور اختراع کیا۔ اور یہ حکم لگایا کہ بل کے پاس ہونے کی تاریخ یعنی ۶ اپریل ۱۹۱۹ء قومی تحقیر کا دن منایا جاوے۔ اس تاریخ پر بڑے بڑے جلسے ہوئے جس میں قوم پرست فصحاء نے اپنی مغویانہ تقریروں سے عوام کے جذبات کو مشتعل کر دیا۔ درحقیقت ۱۸۵۷ء کے بعد سے ستیہ گرہ کا دن نئے بے چینی کی بدترین لہر کا آغاز تھا۔ اس کے بعد تین ماہ تک بلووں اور استبداد کی وبا ہندوستان میں بالخصوص شمالی صوبجات میں پھیلی رہی۔ حکام کو قتل کیا گیا۔ انگریز سویلین مارے گئے۔ اور بلا امتیاز جائداد تباہ کی گئی۔ بعض وقت تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان انقلاب اور بدنظمی کے کنارہ آ لگا۔

لیکن گورنمنٹ نے استقلال سے کام لیا۔ سرکشی کی اینٹ کا جواب شدّاد کے پتھر سے دیا گیا۔ بلوائی جماعتوں کو رائفل اور مشین گن کی باڑھوں سے بچھا دیا یا نیچے اُڑتے ہوائی جہازوں سے بم گرا کے منتشر کر دیا گیا۔ ان واقعات میں سب سے زیادہ مشہور وہ واقعہ ہے جو امرتسر کا قتل عام کہلاتا ہے۔ جہاں برطانوی افواج نے مغویانہ جلسہ عام میں فیر کر کے پانسو کو مارا اور پندرہ سو کو زخمی کیا۔ بالآخر گورنمنٹ نے پورا قابو حاصل کر کے امن قایم کر دیا۔ مغویانہ لیڈر جیل بھیجدیئے گئے۔ اور انقلابی شورش پھر زیر زمین دبگئی۔ مانٹیگو چیمسفورڈ کے اصلاحی بل سے جس کو برطانوی پارلیمنٹ نے اختتام سال پر قانون بنا دیا تھا بہت کچھ کشاکش اور بیچینی میں کمی ہوگئی۔ اگرچہ ہندوستان کی حالت ہنوز حالت اعتدال سے بہت دور تھی اوائل ۱۹۱۹ء کے اندوہناک واقعات نے ایسی دشمنیاں پیدا کر دی تھیں جو کسی طرح رفع نہ ہوئیں۔ انقلابی عنصر دب کر اور زیادہ سخت اور پہلے سے زیادہ

غیر مصالحانہ ہوگیا۔ اور ہوم رول کے مخالفین کی رائے مستحکم ہوگئی کہ ہندوستان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ اور تسلط کی گرفت ڈھیلی ہونے پر طوائف الملوکی کا دورہ لازمی ہوگا۔

عام خیالات میں ہیجان کی وجہ سے یہ وقت مانٹیگو چیمسفورڈ کی ترمیم شدہ اصلاحات کی ترویج کے لیے مناسب اور موزوں نہ تھا فی الواقع انتہا پسند اس پر تلے ہوئے تھے کہ ان کو مناسب آزمائش کا موقع نہ دیا جائے۔ کیونکہ وہ ان اصلاحات کو دام فریب سمجھتے تھے۔ جس سے بہر طور احتراز لازمی تھا۔ انتہا پسندوں نے یہ دیکھ کر کم از کم فی الحال مسلح بغاوت ناممکن ہے ایک جدید خیال پیدا کیا جس کا نام نان کوآپریشن رکھا گیا۔ یہ دراصل ہر انگریزی چیز کا بڑے پیمانہ پر مقاطعہ تھا۔ جدید رائے دہندوں کو ہی انتخاب میں شریک ہونے اور مجوزہ مجلس قانون ساز کے لیے کسی ممبر کو انتخاب کرنے کی ممانعت نہ تھی بلکہ یہ طے ہوا کہ وکلا اور فریقین مقدمہ بھی عدالتوں میں نہ جائیں۔ ٹیکس دینے والے محاصل نہ ادا کریں مزدور ہڑتال کریں اور دکاندار انگریزی مال کی خرید و فروخت بند کریں اور طلبہ مدرسے اور کالج کو چھوڑ دیں۔ ہر انگریزی چیز کو اس طرح کلیتاً "اچھوت" کر دینے سے خود انگریز ہندوستان میں ایک نئی قسم کے پیریا یعنی اچھوت ہو جاویں گے۔ ہندوستان میں برطانوی جماعت بالکل الگ رہ جائے گی۔ اور راج ناقابل عمل ہو جائے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسی انتہا پسندوں کے مطالبہ سیلف گورنمنٹ کو ماننا پڑے گا۔

یہ تھا نان کوآپریشن کا خیال۔ اور اس خیال کو نہایت قابل حامی مل گیا۔ یہ حامی موہن داس کرم چند گاندھی تھے۔ جو ذاتی تقدس کے لیے عرصہ دراز سے مشہور تھے۔ لہذا ہندو عوام میں وہ خاص مذہبی جوش پیدا ہوا جو بعض قسم کے ہندوستانی سنیاسی ہمیشہ پیدا کر سکتے ہیں۔ گاندھی جی تبلیغ کا اندازہ ان کے ایک لیکچر کے حسب ذیل اقتباس سے ہو سکتا ہے:

"ایک لاکھ گوروں کا کتیس کروڑ پچاس لاکھ ہندوستانیوں پر حکمراں ہونا جس قدر

تحریبا انگریز ہم پر بلا شبہ حکمرانی کچھ تو زور کی بدولت کرتے ہیں نہیں زیادہ وہ ہزار ہا طریقوں پر ہم سے اشتراک عمل کرکے حکمراں ہیں۔ اور ہم کو روز بروز زیادہ نا چار اور تابع بناتے جاتے ہیں ہم کو اصلاح شدہ مجالس شورے و عدالتوں و نیز کونسلوں کو حقیقی آزادی یا اقتدار نہ سمجھنا چاہیے۔ یہ نامرد بنانے کی بڑی گہری چالیں ہیں۔ برطانیہ محض جبر سے ہم پر حکومت نہیں کر سکتی۔ اس لیے وہ اپنا ہندوستان پر قبضہ قایم رکھنے کے لیے ہر جائز اور ناجائز طریقہ سے کام لیتی ہے۔ وہ اپنی شہنشاہی حرص کے لیے ہندوستان کی دولت و افواج کی طالب ہے۔ اگر ہم اس کو روپیہ اور آدمی دینا بند کردیں تو ہمارا مقصد یعنی سوراج، مساوات، مردانگی حاصل ہو جاوے گی۔''

نان کوآپریشن کی انتہائی تمنائیں پوری نہ ہوئیں۔ مانٹیگو چیمسفورڈ کی اصلاحات نفاذ پذیر اور ان اصلاحات کی رو سے پہلے انتخابات ۱۹۲۰ء میں ہوئے لیکن مطلع ہنوز صاف نہیں ہوا ہے۔ انتخابات میں جو نہایت ہی کم رائیں ڈالی گئیں اُن سے اور نیز دیگر بے شمار طریقوں سے جن میں کارخانوں سے لیکر مدرسوں تک کی ہڑتالیں شامل ہیں نان کوآپریشن کے اثرات ظاہر ہوئے۔ ہندوستان آج شورش کے طوفان میں گرفتار ہے۔ یہ شورش محض سیاسی نہیں بلکہ معاشرتی بھی ہے۔ گزشتہ نصف صدی سے جو عظیم اقتصادی انقلابات ہندوستان میں عمل پذیر ہیں اِس نے ہندوستانی جماعت کو بالکل غیر منتظم کر دیا ہے۔ ان انقلابات پر فصول مابعد میں بحث کی جائے گی۔ جو بات اس موقع پر نوٹ کرنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ انتہا پسند لیڈر معاشرتی بے چینی سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ اور بلا شک و شبہ اُنھوں نے بالشویک روس سے ساز باز کر لیا۔ اس دوران میں شورش کے قدیم اجزا مفقود نہیں ہوئے ہیں حال میں راسخ الاعتقاد و متعصب سکھوں نے جو مختلف الرائے سکھ زائرین کا قتل عام کیا اور اسی زمانہ میں جنوبی ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں اور دیسی عیسائیوں پر

بلوے ہوئے اُن سے مذہبی اور نسلی تعصب کی اس دبی ہوئی آگ کا اظہار ہوتا ہو جو ہندوستانی زندگی کی تہ میں سلگ رہی ہے۔

حقیقت معاملہ یہ ہو کہ آج ہندوستان ارتقائی اور انقلابی تبدیلی کی قوتوں کی رزمگاہ ہو۔ یہ پُرشور و شر زمانہ ہو۔ پرانا نظام بالبداہتہ گزر رہا ہو اور نیا نظام ہنوز نظر نہیں آتا۔ اس وقت اچھائی اور خرابی دونوں کے بڑے امکانات ہیں۔ اور نتیجہ کے لیے کوئی شخص یقینی طور پر پیشین گوئی نہیں کر سکتا۔

فصل ہفتم

اقتصادی انقلاب

موجودہ تاریخ عالم کا سب سے زیادہ دلچسپ واقعہ وہ دوہری فتح ہی جو مغرب نے مشرق پر حاصل کی ہی۔ لفظ "فتح" عموماً ایک سیاسی مفہوم میں مستعمل ہوتا ہی اور اُن افواج کی صفوفِ جنگ کا منظر پیش نظر کرتا ہی جو ممالک غیر کو سر کر کے دور دراز کی اقوام کو مطیع بناتی ہیں۔ بلاشبہ اس قسم کی بھی سیاسی فتوحات مشرق میں واقع ہوتی ہیں اور ہم یہہ دیکھ چکے ہیں کہ گزشتہ صدی میں مشرق ادنیٰ اور وسطے کی بے دست و پا سلطنتیں کیونکر دولِ یورپ کی مسلح طاقت کا سہل شکار بن گئیں۔

لیکن جس امر کا ایسا عام طور سے احساس نہیں ہوتا ہی وہ یہ ہی کہ اس سیاسی فتح کی متوازی ایک اقتصادی فتح بھی تھی جو غالباً زیادہ مکمل تھی اور جس کی قسمت میں غالباً یہہ لکھا تھا کہ اس سے بھی زیادہ عمیق اور دیرپا قسم کی تبدیلیاں پیدا کرے۔

اس اقتصادی فتح کی اصلی وجہ حرفتی انقلاب تھا جس طرح سے کولمبس اور "ڈیگاما" کے بحری سفروں سے یورپ کو سمندر میں حربی فوقیت اور اُسی کی بدولت دنیا میں سیاسی فوقیت حاصل ہوگئی اُسی طرح سے اواخر اٹھارویں صدی کی صنعتی اختراعات

کی وجہ سے جس کی بدولت حرفتی انقلاب شروع ہوا۔ یوروپ نے دنیا پر اقتصادی غلبہ حاصل کر لیا۔ فی الحقیقت صنعت و حرفت کی ترقی سے دنیا نے علوم و فنون میں ایک جدید عہد ایجادات و اختراعات کا آغاز ہوا۔ اس کے نتائج تین صدی پیشتر کے جغرافی معلومات کے عہد سے بھی زیادہ وقیع و اہم تھے ان سے ہماری نسل کو قدرت کے خزائن پر ایسا مزید قابو ہو گیا کہ اقتصادی زندگی کی آیندہ تبدیلی نے تمام چیزوں کی صورت کو کلیتاً بدل دیا۔

فی الحقیقت یہ تبدیلی تاریخ عالم میں عدیم المثال تھی۔ اس وقت تک انسانی مادی ترقی بند ہیج تھی۔ باروت کے سوا انسان نے نہایت قدیم زمانہ سے مادی قوت کے جدید مخرج کو نہیں کھولا تھا۔ ہمارے پردادا کے زمانہ کی گھوڑا گاڑی مصر کے گھوڑے والے رتھوں کی ترقی یافتہ شکل تھی۔ بادبانی جہازات اپنا سلسلہ جنگ ٹکرائے سے قبل والے یولیس کی کو نے بادبان والی کشتی تک پہونچاتے تھے اور صناعی ہنوز انسان اور حیوان کے دست و بازو یا ہوا اور پانی کے سادہ عمل پر منحصر تھی۔ دفعتاً یہ سب حالت بدل گئی۔ دخان۔ بجلی۔ پٹرول اور ہرٹزی لہر نے قدرت کے مخفی قوتوں کو قابو میں کر کے مسافت پر فتح پائی اور کرۂ ارض سکڑ کر محض ایک بالشت کا رہ گیا انسان ایک جدید مادی دنیا میں داخل ہوا جو سلف کی دنیا سے کمیت کے علاوہ کیفیات میں بھی مختلف تھی۔

جب میں لفظ "انسان" استعمال کرتا ہوں تو اس سے جہاں انیسویں صدی کا تعلق ہے یوروپ کا گورا آدمی اور اس کی نسلی آبادیاں ماورالبحر مقصود ہیں یہ باتیں گورے انسان کے دماغ ہی نے پیدا کیں اور لہذا ان ایجادات کے منافع سے گورے انسان متمتع ہوئے۔ جدید نظام کی دو نمایاں خصوصیتیں تھیں۔ اولاً کلوں کے کارخانوں کا رواج اور اسی کے ساتھ قلیل زمانہ میں کثیر المقدار پیداوار۔ دوئم

ارزاں اور تیز نقل وحرکت میں اُسی نسبت سے ترقی۔ ان دونوں اجزاء سے یوروپ
کی اقتصادی اور مالی حالت میں عظیم ترقی ہوئی کیونکہ یورپ کل دنیا کا دار الصنع بن گیا۔
نفس الامر یہ ہے کہ اُنیسویں صدی میں یوروپ کا نیم دہقانی براعظم کارخانوں کا گنجان چھتہ
اور اسباب وسرمایہ اور آدمیوں سے لبریز ہوکر اپنے سامان کو دنیا کے بعید ترین گوشوں میں بھیجنے
اور وہاں سے نئی ساخت اور تبادلہ کے لیے خام پیداوار کے تازہ ذخائر کھینچنے لگا۔

لہٰذا وہ مغرب جس میں اسطرح کا انقلاب صنعت وحرفت ہوچکا تھا اُس مشرق کا
مدمقابل ہوا جو اقتصادیات میں بھی سیاسیات اور حیات کی طرح پستی اور جمود کی حالت میں
تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مشرق میں کارخانہ یا کاروبار اِس مفہوم کے مطابق جیسا ان الفاظ
سے آج ہم سمجھتے ہیں فی الحقیقت معدوم تھے۔ اقتصادی اعتبار سے مشرق کاشتکارانہ
بنیاد پر تھا اور اقتصادی جزو وہ نیم منفرد مواضعات تھے جو اپنی ضروریات کو خود پورا کر لیتے
تھے مشرقی صنعت وحرفت محض ہاتھ کے ذریعہ سے ہوتی تھی اور کاریگروں کی قلیل تعداد
عموماً بطورِ خود اور اپنے ہی نفع کے لیے کام کرتی تھی۔ اُن کی بنائی ہوئی چیزیں اگرچہ اکثر
نہایت اعلیٰ قسم کی ہوتی تھیں اور زیادہ تر سامانِ عیش تھیں لیکن وہ ایسے سست اور
پُرانے طریقوں سے بنائی جاتی تھیں کہ اُن کی مقدار محدود اور اُن کی قیمت بازاری نسبتاً
گراں ہوتی تھی۔ باوجودیکہ شرح مزدوری بہت کم تھی۔ لیکن مذکورۂ بالا وجوہات سے ایشیا
کی مصنوعات صرف دنیا کے بازاروں میں ہی یوروپ اور امریکی مشین کی بنائی ہوئی اشیاء
کے ذخائر سے مقابلہ نہ کرسکیں۔ بلکہ خود اپنے مقامی بازاروں میں بھی اُن کو بہت کثیر
نقصان پہونچا۔

مغربی صنعت وحرفت کے ساتھ اہل مشرق مقابلہ میں جو ناکامیاب رہے اُس کے
اسباب طریقۂ ساخت کے علاوہ اور بھی تھے مثلاً کاریگروں کی دماغی حالت اور سرمایہ کی
کمی کل مشرق ادنیٰ اور وسطیٰ میں اقتصادی زندگی جمعیت کے اصول پر مبنی تھی بمقابلے

اور مسابقت کے مغربی اقتصادی اصول سے اُنھیں قطعی ناواقفیت تھی۔ کاشتکار اور دستکار اپنے اجداد کے نقش پا کی کورانہ تقلید کرتے تھے۔ نہ مقابلہ نہ شوق ترقی۔ رواجی اجرت میں کوئی تبدیلی تھی نہ بہتر اور مزید آرام دہ معاشرت کی خواہش۔ کارخانے سب پُرانے ڈھچر کے تھے۔ شاگرد محض اپنے اُستاد کی نقل کرتا تھا اور اُس کو مشکل ہی سے یہ خیال ہوتا تھا کہ نئے اوزار کی دستکاری کے نئے طریقے جاری کرے۔ فائدے اور ترقی کے لیے کام کرنے کی بجائے موروثی "پیشہ" کو جس میں عموماً مذہبی خصوصیت کی برکت ہوتی تھی اختیار کیئے جاتے تھے یہ پیشے نسلاً بعد نسلاً باپ سے بیٹے تک پہونچتے تھے اور ہر پیشے کا مخصوص مستقل نصب العین تھا اور اُس کی صنعت کے راز نہایت سرگرمی سے مخفی رکھّے جاتے تھے۔

بعض دلیر اور مبارک جو طبائع ان رسوم اور روایات کی فولادی قیود کو توڑنے کی ہمت کرتی مگر وہ قلت سرمایہ کی وجہ سے لاچار تھے۔ سرمایہ کاروان استعمال جو بہ آسانی فراہم ہو کر کسی ایسے کام میں لگایا جا سکے جس کا فائدہ اور نفع بیّن ہو گیا"۔ معدوم تھا۔ مشرقیوں کے خیال میں خواہ وہ شاہزادہ ہو یا کاشتکار روپیہ مزید نفع کا ذریعہ یا تبادلہ کا وسیلہ نہ تھا۔ بلکہ یہ گراں قدر خزانہ تھا جو کبھی "ابر و باد" کے دن کام آئیگا۔ مشرق ہمیشہ سے قیمتی دھاتوں کی قبر مشہور رہی۔ صرف ہندوستان میں اُس سونے چاندی اور جواہرات کی قیمت کھربوں ہوگی جو صندوق میں بند یا زمین میں دفن یا عورتوں کے گلے میں آویزاں ہی۔ ہندوستان کے معاملات پر ایک حال کا لکھنے والا کہتا ہی۔ "مجھے ایک بڑے متمول مہاراجہ کے خزانوں میں داخل ہونیکا موقعہ ملا۔ چاندی کے بڑے بڑے صندوقوں میں جواہرات۔ یاقوت۔ زمرد اور لعل بھرے ہوئے تھے جس میں میرا ہاتھ کندھے تک چلا جاتا تھا۔ دیواروں میں کھونٹیاں لگے ہوئے تھے اور ہر کھونٹی کے جوڑے پر سونے کی سلاخیں رکھی ہوئی تھیں جو تین سے لیکر چار فٹ تک لانبی اور دو انچ موٹی تھیں۔ میں ایک بڑے جواہرات کے صندوق کے پاس کھڑا ہوا

اور میں نے مٹھی بھر اُٹھا کر اُن کو آہستہ آہستہ گرانا شروع کیا۔ وہ ایسے چمکتے تھے جیسے دھوپ میں شبنم کے قطرے۔ تقریباً سات سو دیسی ریاستیں ہیں اور ہر رئیس کا خزانہ کم و بیش اعلیٰ پیمانہ پر ہی۔ علاوہ بریں ہر زمیندار اور ہر ہندوستانی خواہ چھوٹا ہو یا بڑا جو کچھ بھی بچا سکتا ہی اُس کو وہ اپنے پاس دھات کی صورت میں رکھتا چاہتا ہی۔ نو ساختہ کاغذ کے نوٹ جن کے رواج کی کوشش کی جاتی ہی شبہہ کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ بعض وقت وہ سکوں کو گلا کر اپنی بی بی کی چوڑیاں بنواتا ہی۔ اور بعض اوقات وہ اپنا روپیہ کسی اینٹ کو کھسکا کر اُس کے پیچھے چھپا دیتا ہی یا چولھے کی راکھ میں پتھر کے نیچے دبا دیتا ہی یا کہیں باہر گڈھا کھود کر دفن کر آتا ہی۔[1]

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ موجودہ ہندوستان کی حالت ہی جس پر ایک صدی سے زائد برطانوی حکومت رہ چکی ہی اور مغربی خیالات کے سرایت کر جانے سے دیسی نقطۂ نظر میں نہایت اہم ترمیمات پیدا ہو گئی ہیں جن کا ذکر ہم بہت جلد کرینگے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہ دولت جمع کرنے کا میلان صرف ہندوستان کی خصوصیات میں نہیں ہی بلکہ کل مشرق میں عام ہی۔ تب ہم یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ ایک صدی قبل مشرق میں کاروبار میں لگانے کی اغراض کے لیے سرمایہ کیسا معدوم تھا۔ بالخصوص جب ہم یہ پیش نظر رکھیں کہ مُلک کی امن کی مخدوش حالت اور سود کی مذہبی ممانعت اُن دور اندیش اشخاص کے سدراہ تھی جو اپنی جمع کردہ دولت کو تجارتی اغراض میں لگانا چاہتے تھے۔ مالی کاروبار کا فی الحقیقت ایک ہی راستہ یعنی سودخواری تھا اور قدیم مشرق کا کل قلیل رواں سرمایہ فی الحقیقت اسی کام میں لگایا جاتا تھا۔ لیکن یہ

---

[1] ایف۔ بی۔ فشر کی کتاب "ہندوستان کا خاموش انقلاب"، صفحہ مطبوعہ نیویارک ۱۹۲۰ء۔ مصنف

سرمایہ کسی نفع کے کام کے لیے قرض نہیں دیا جاتا تھا۔ بلکہ عیاشی۔ آسائش تن اور ناعاقبت کے اغراض میں خرچ ہوتا تھا۔ لہذا بجائے اس کے کہ اس سے کوئی نفع ہو یہ تباہ کن ہوتا تھا اور اسی سے ہر قسم کے سرمایہ کے خلاف بدگمانی بڑھتی گئی۔

سو سال قبل مشرق کی اقتصادی زندگی یہ تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ متروک نظام کسی طور پر بھی اس مغرب کے عظیم مقابلہ سے عہدہ برآ نہو سکتا تھا۔ جس میں کارخانہ جات سب سے پیش پیش تھے۔ ہر جگہ پر مغربی مشین کے بنے ہوئے مال کے انبار مشرقی بازوں میں آنے لگے اور دیسی سامان کو اپنے مقابلہ سے نیست و نابود کرنے لگے۔ جس طور پر قدیم مشرقی دست کاری۔ مثلاً ہندوستانی پارچہ بافی کی صنعت لنکاشائر کے سوتی کارخانوں کے تباہ کن مقابلہ سے بالکل نیست و نابود ہوگئی اسی قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔

بالیقین بعض مشرقی مصنفین یہ حجت پیش کرتے ہیں کہ مغربی صنعت کی کامیابی اقتصادی وجوہات کے مقابلہ میں سیاسی وجوہات سے ہوئی اور ہندوستانی قوم پرست مندرجۂ بالا لنکاشائر کے سوتی کارخانہ جات کی موافقت میں حکومت برطانیہ کی جدوجہد کو ہندوستانی پارچہ بافی کی دست کاری کی تباہی کا تنہا باعث بتاتے ہیں۔ لیکن یہ دلائل غلط معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکام کی جدوجہد سے برطانوی صنعت کی کامیابی سریع ہوگئی ہو۔ لیکن فی الجملہ یہ کامیابی لازمی تھی اس کا سب سے اچھا ثبوت یہ ہے کہ آزاد مشرقی ممالک مثلاً ترکی اور ایران میں بھی پارچہ بافی کی دست کاری مغربی مقابلہ سے اسی طرح تباہ ہوئی۔

مزید ثبوت یہ مسلمہ امر ہے کہ مشرقی اقوام نے مجموعی طور پر اپنے یہاں کے ہاتھ سے بنے ہوئے مال کے مقابلہ میں مشرقی مشین کے بنے ہوئے مال کو ترجیح دیکر خریدا۔ اکثر مغربیوں کے لیے یہ ایک معما لاینحل ہے۔ اننا شناس کی سمجھ میں یہ

نہیں آتا کہ مشرقیوں نے نہایت خوب صورت[1] اور برتر دیسی مال کے مقابلہ میں کیوں مغرب کا ارزاں اور نِکمّا مال جو مشرقی بازاروں کے لیے بالخصوص بنایا گیا تھا پسند کیا مگر اس کا جواب یہ ہے کہ عام مشرقی دست کاری کا دلدادہ نہیں ہے بلکہ ایسا غریب آدمی ہے جو فاقہ کشی کے غار کے عین کنارے کھڑا خطرناک زندگی بسر کرتا ہے وہ سستی چیزیں خریدنے کا خواہاں ہی نہیں بلکہ مجبور ہے۔ اور قیمتوں کا بڑا فرق فیصلہ کن جزو ہے بلاشبہ اس میں جدّت کا عنصر بھی شامل ہے۔ اُن چیزوں کے علاوہ جو روزانہ کی استعمالی چیزوں کے بجائے رائج ہوئیں۔ مغرب نے بہت سی نئی اشیاء جن کا فائدہ یا خوب صورتی نہایت دلکش ہے رائج کر دیں۔ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ سینے کی مشینیں اور مٹی کے تیل کے لیمپ بلاد مشرقی کے ہر گوشہ میں کیونکر رائج ہوگئے۔ اسی نہج کی دیگر مثالیں بھی ہیں۔ فی الحقیقت مغربی صنعت کے نفاذ نے مشرقی اقتصادی زندگی کی ہر شکل کو بدل دیا ہے۔ جدید ضروریات معیشت پیدا کی گئی ہیں جیسا کہ معاشرت بلند اور قواعد مذاق تبدیل ہو گئے ہیں۔ ایک امریکی جو عصر حاضر کے عالم اسلامی مشرق کا واقف کار ہے کہتا ہے۔ "اختراعات حاضرہ اور دیگر اغذیہ اور اشیائے [illegible] نئی ضروریات پیدا کر دی ہیں۔

---

[1] اگست ۱۹۲۳ء کے رسالہ "[illegible] ڈائری" میں جو امپائر کی [illegible] کی تشویق اور ترویج کے لیے کلکتہ سے سرکاری رسالہ نکلتا ہے۔ اس پارچہ بافی کی خوبصورتی اور نفاست کا حال حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:-

ململ کا ایک باریک تھان جو ۱۵ گز لمبا اور گز بھر عرض کا تھا اُس کا وزن صرف نو سو گرین یعنی تقریباً ایک چھٹانک تھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے اپنی لڑکی کو اس امر پر سرزنش کی کہ اُس کا لباس کافی ستر پوش نہ تھا باوجودیکہ شہزادی نے کئی تہ [illegible]

چین کا کسان پھلی کا روغن جلانے پر قناعت نہیں کرتا بلکہ مٹی کے تیل کا طالب ہی ایشیائیوں کو ممالک غیر کے لیمپوں کی خریداری کا جو شوق ہی اُس کی برابری ممالک غیر کی گھڑیوں کی خواہش ہی کر سکتی ہی- شوقین شامی اپنے اجداد کی کچی چھتوں کو نظر حقارت سے دیکھتا ہی اور فرانس سے آئی ہوئی سرخ کھپریل ہی سے خوش رہ سکتا ہی- ہر جگہ بدیسی بنائی ہوئی اشیا کی مانگ ہی- ..... علم سے ضروریات بڑھتی ہیں اور مشرقی علم حاصل کر رہا ہی- آج وہ اُن صدہا چیزوں کا طلبگار ہی جن کا اُس کے اجداد نے نام بھی نہ سنا تھا۔

ہر جگہ ایک ہی قصہ ہی- ایک ہندوستانی مصنف اقتصادیات جو مغربی صناعی کا سخت دشمن ہی- اس امر پر اظہار رنج وغم کرتا ہی کہ" کاریگر اپنے پیشہ کو چھوڑ کر کشاورزی کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں- باکو یا نیویارک کے ارزاں مٹی کے تیل نے تیلی کی ہستی کو خطرہ میں ڈال دیا ہی- مسی و برنجی ظروف کو جو لامعلوم زمانہ سے مستعمل ہیں یوروپ سے آئے ہوئے ارزاں قلعی دار چینی کے برتنوں سے خطرہ ہی...... اس کے ساتھ ہی خریداروں کے مذاق میں تبدیلی ہو رہی تھی- گُڑ چھوڑ کر صاف شکر استعمال کی جاتی ہی- خانہ ساز کپڑوں کو اُن کے بھدا پن کی وجہ سے ترک کر کے کلوں کے بنائے ہوئے کپڑے پہنے جاتے ہیں- ہر ملکی صنعت وحرفت پر حملہ ہی اور اکثر تباہ ہو گئے ہیں- وہ مواضعات جو صدیوں سے رسمیات پر عمل گزیں تھے دفعتاً دنیا کے بازار سے اتصال پاتے ہیں- کیونکہ دخانی جہاز اور ریلیں جن سے سلسلۂ اتصال قائم ہوا ہی

ہیں ململ کی سات تہ پہنی ہوئی ہوں (مترجم)

سے ریورینڈ اے نجے- براؤن کا مضمون" ایشیا میں اقتصادی انقلابات" جو مارچ ۱۹۰۴ء کے رسالہ دی سینچری میں شائع ہوا- مصنف

ایسے کم عرصہ میں تعمیر پاتے ہیں کہ اُن مواضعات کو دم مارنے کی مہلت نہیں ملتی جو صدیوں سے رسوم کی قیود میں محو خواب تھے۔ لہٰذا اُن اقتصادی احادیں مقابلہ کے دفعتاً پیدا ہونے سے بڑا انقلاب ہوگیا ہی۔ جو لامعلوم زمانہ سے رُسُوم کے پابند تھے[1]

یہ انقلاب عظیم محض مغربی اسباب کے آمد کی وجہ سے تھا۔ بلکہ مغربی سرمایہ کی ویسی ہی اہم آمد کی بدولت بھی نہ تھا۔ نفع بخش طور پر روپیہ لگانے کے مواقع اس قدر زیادہ تھے کہ مغربی سرمایہ مشرقی ممالک میں بہنے لگا۔ چونکہ مشرق میں خود سرمایہ رواں مفقود تھا لہٰذا موجودہ مفہوم کے مطابق ہر اقتصادی کارروائی کی ابتدا کے لیے مغربی سرمایہ لگانا پڑا۔ ریلیں کانیں اور باغات کی قسم کی بڑے پیمانہ پر کاشتکاری اور بہت سے دیگر کام اس طور پر عالمِ وجود میں آئے۔ سب سے زیادہ قابلِ ذکر یہ بات ہی کہ شمالی افریقہ سے لیکر چین تک متعدد کارخانہ جات قائم کیے گیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے اصلی صنعتی شہر عالمِ وجود میں آئے جن کی مشینوں کا شور اور بلند چمنیوں کا دھواں اس کا اعلان کرنے لگا کہ مشرق بھی مغربی کارخانہ جات کی زندگی اختیار کر رہا ہی۔

مشرق کے اس صنعتی جد وجہد کے اہم معاشرتی نتائج پر فصلِ مابعد میں بحث کی جائے گی۔ اس فصل میں ہم اس کی اقتصادی پہلو پر غور کرنے پر اکتفا کریں گے۔ مزید براں چونکہ یہ کتاب مشرقِ ادنیٰ اور وسطیٰ سے متعلق ہی۔ لہٰذا اس میں چین اور جاپان کی صنعتی ترقی پر بحث نہ کی جاویگی مگر ناظرین کو مشرق اقصیٰ کی ترقیوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے کیونکہ یہ بھی زیادہ تر اُسی نوع کی ہیں جن پر ہم بحث کریں گے

---

[1] آر مکرجی کی کتاب "اقتصادیات ہند کی بنیادیں" صفحہ ۵ مطبوعہ لندن ۱۹۱۶ء مصنف

ان صنعتی اختراعات کی ابتدائی حالت یہ تھی کہ گویا مشرقی زمین میں خالص مغربی پودا نصب کیا گیا۔ چونکہ اس کی ابتدا مغربی سرمایہ سے ہوئی تھی لہذا اُس کا انتظام اور بندوبست بھی بالکل مغربی دماغ کر رہے تھے۔ چونکہ مشرقیوں میں موجودہ کاروبار کی روح معدوم تھی اور وہ استحصال بالجبر اور اقربا نوازی کے عادی اور فوری فائدہ کے خواہاں اور متواتر مشترکہ عمل کے ناقابل تھے۔ لہذا مغربی سرمایہ اُن کے سپرد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ مغربی کاروبار کی کامیابی نے مشرقیوں پر ایسا اثر پیدا کیا کہ اُن میں سے دور اندیش اشخاص اپنا روپیہ لگانے اور کامیابی کے لیے جو امور ضروری تھے اُن کو حاصل کرنے کو تیار ہو گئے۔ فصل دوم کے خاتمہ پر میں نے اسلامی دنیا میں موجودہ قسم کے کاروبار کی ترقی کا جو حال بیان کیا ہے وہ ہندوستان کی غیر مسلم آبادی پر بھی صادق آتا ہے۔ ہندوستان میں متعدد عناصر مثلاً پارسی اور ہندو بنیا یعنی لین دین کرنے والے ایسے موجود تھے کہ جن کی پہلی تجارتی سرگرمیاں اور سود خواری نے اُن کو موجودہ مفہوم کے مطابق مالی اور کاروباری سرگرمیوں کی طرف مائل کر دیا۔ انھیں میں سے ہندوستان کی موجودہ دیسی کاروباری جماعتیں پیدا ہوئی ہیں۔ جن کی مثال کلکتہ اور بمبئی کے جوٹ اور پارچہ بافی کے کارخانہ جات اور بنگال کا ٹاٹا کا بڑا لوہے کا کارخانہ موجود ہیں۔ یہ کاروبار بالکل دیسی سرمایہ سے دیسی انتظام میں چل رہے ہیں۔ بلاشبہ ان کامیابیوں کے علاوہ بہت سی افسوسناک ناکامیاں بھی ہوئیں ہیں۔ بایں ہمہ یہ امر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ مغربی کارخانوں کی زندگی اب محض خارجی شے نہیں ہے بلکہ مشرقی زمین میں مستحکم طور پر جڑ پکڑ رہی ہے۔[1]

---

[1] ان امور کے لیے ملاحظہ ہو فشر کی تصنیف مذکور الصدر۔ سر تھیوڈور ماریسن کی کتاب "ہندوستان میں اقتصادی نقل و حرکت" مطبوعہ لندن ۱۹۱۱ء۔ مصنف

مغربی اور مشرقی سرگرمیوں کا متحدہ نتیجہ جیسا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں یہ ہوا کہ مشرق میں مختلف مقامات پر بڑے کارخانوں کے مرکز پیدا ہو گئے۔ مصر کے متعلق ایک فرانسیسی مصنف لکھتا ہے "دریائے نیل کے دونوں کناروں پر صنعتی اور شکر سازی اور پارچہ بافی کے کارخانہ بنے ہوئے ہیں اُن کی دخان بار چمنیاں فلاحین کے کچے مکانات سے اونچی نظر آتی ہیں"۔ سر تھیوڈر ماریسن ہندوستان کی بابت لکھتے ہیں "بمبئی میں صنعتی انقلاب تکمیل پا چکا ہے۔ بمبئی موجودہ صنعتی شہر ہے جس میں موجودہ کارخانوں کی زندگی کے عیوب اور خوبیاں دونوں بخوبی نظر آتی ہیں۔ بمبئی میں غریبوں کے علاقے محلے ہیں جن میں آبادی کی کثرت ایسی ہی خراب ہے جیسے کہ کسی یوروپی شہر میں۔ اس میں ایسے مزدور پیشہ طبقے بھی ہیں جو مشینوں کے شور و شغب میں بہت دیر تک کام کرتے ہیں۔ اس میں کروڑپتی بھی ہیں جن کے گراں قدر عطایا نے خوب صورت عمارات سے اس کی سڑکوں کو مرصع کر دیا ہے دولت کی فراوانی اور میں یہ بھی کہوں گا کہ تہذیب اور مذاق کے علامات جو بمبئی میں پائے جاتے ہیں اُسے دیکھ کر اندرون

سر ولنٹائن چرول کی کتاب "ہندوستانی شورش" مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۰ء۔
ڈی ایچ ڈوڈویل کا مضمون "ہندوستان میں اقتصادی نقل و حرکت" جو دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء کے رسالہ ایکونامک جرنل میں شائع ہوا۔ جے۔ پی۔ جونس کا مضمون "ہندوستان کی موجودہ حالت" جو جولائی سنہ ۱۹۱۰ء کے رسالہ جرنل آف ریس ڈویلپمنٹ میں شائع ہوا۔ مصنف
لہ ایل برتراند کی کتاب "مشرقی سراب" صفحات (۲۰) و (۲۱) مطبوعہ پیرس سنہ ۱۹۱۰ء۔ مصنف

ملک کے رہنے والے سیاح حیرت میں آجاتے ہیں۔ بھورے رنگ کے مواضعات اور کھیتوں کا لاانتہا ہی سلسلہ جن کے دیکھنے کی اُس کی آنکھیں عادی تھیں۔ اُس ہندوستان کی تصویریں ہیں جو رخت سفر باندھ چکا ہے۔ بمبئی آنے والے ہندوستان کا پیش خیمہ ہے۔

بڑے قدرتی ذرائع کے قریب اور ارزاں مزدوری کی لاانتہا موجودگی نے مشرقی دماغوں میں بہت ہی بڑی اُمیدیں پیدا کر دی ہیں۔ بعض مشرقی اس کے متمنی ہیں کہ مغربی سرمایہ اور مشرقی مزدوری متحد ہو جائے گی۔ چنانچہ ایک ہندوستانی اقتصادیات کے مصنف نے اس کا پورا اظہار کیا ہے "انگریزی سرمایہ اور ہندوستانی مزدور یہ دونوں دنیا میں سب سے زیادہ ارزاں ہیں"[۱]

بعض زیادہ دلیر طبائع یہ خواب دیکھتے ہیں کہ مشرق میں کارخانہ جات محض دیسی مساعی سے قائم کریں۔ اس سے مغرب کا اخراج ہی نہیں بلکہ اُس کا استیصال بھی مدنظر ہے۔ چند سال ہوئے کہ ایک ہندو نے اس رائے کا اظہار ایک مشہور ہندوستانی رسالہ[۲] میں کیا تھا "ایک اعتبار سے مشرق مغرب کو فی الحقیقت دھمکی دے رہا ہے اور ایشیا اس امر میں ایسا سچا صاف باطن ہے کہ کوئی عذر و معذرت کی ضرورت نہیں۔ مشرق نے صنعت میں صنعتی جنگ کا پیام دیدیا اور اس وقت سے ایشیا کی قسمت میں ایسی تجارتی جنگ کا مشاہدہ کرنا لکھا ہے جو بتدریج شدید ہوتی جائے گی۔ مغرب والے تو مشرقی بازاروں میں اپنا قبضہ قائم رکھنے کے ساعی ہوں گے اور مشرقی یہ کوشش کریں گے کہ مغربیوں کو اُس جنگ میں شکست دیں

---

[۱] سرٹی مارلین کی کتاب "ہندوستان میں اقتصادی نقل و حرکت" صفحہ ۱۸۱۔ مصنّف

[۲] منقول از مضمون نوشتہ جونس مذکور الصدر مصنّف

[۳] سوی انڈین ریویو (مدراس) ۱۹۱۰ء مصنّف

جس میں آخر الذکر اب تک بہت آسانی سے فتحیاب ہوتے رہے ہیں........

مغربی تجارت سے مقابلہ کرنے میں مشرق کو اس امر کا کامل احساس ہوگیا ہے کہ موجودہ طریقوں اور کلوں کے مقابلہ میں غیر ترقی یافتہ مشینوں اور طریقوں کو استعمال کرنا فضول ہے۔ اپنے پُرانے دلجمعی کے خیال کو چھوڑ کر وہ اُن علوم و فنون کو حاصل کر رہا ہے جن سے مغرب کو مادی خوش حالی حاصل ہوئے۔ وہ اپنی تحقیقات کے نتائج سے عملی فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے۔ اور عموماً مغربی طریقوں کو اپنی مختص ضروریات کے مطابق بنا کر بعض وقت اُن میں ترقی بھی کرتا ہے۔“

مشرق کی اس صنعتی روح کی بیداری کو اکثر گورے مبصرین نے بھی تسلیم کیا ہے جس زمانہ میں مذکورہ بالا مضمون لکھا گیا تھا ایک امریکی مصنف اقتصادیات دریافت حال کے لیے مشرق میں دورہ کر رہا تھا اور اُس نے یہ رپورٹ کی ”ایشیا کے افلاس کے دو اصلی وجوہ ہیں۔ اولاً ایشیائی حکومتیں اپنی رعایا کو تربیت نہیں دیتیں۔ اور رعایائے ملک مشینوں کو استعمال کر کے اپنی پیداوار کی قابلیت کو نہیں بڑھاتیں۔ ایشیا کے افلاس کی ذمہ دار جہالت اور مشینوں کی عدم موجودگی اور امریکہ کے تمول کے ذمہ دار علم اور آلات جدید ہیں“۔ یہ مصنف آگے لکھتا ہے کہ ہم کو دیکھتے رہنا چاہیے۔ ایشیا کو ان واقعات کا اب احساس ہوگیا ہے اور اُن کے علاج کے لیے کوشاں ہے۔ لہذا ہم کو ان بیدار شدہ اقوام کی روز افزوں رقابت سے مقابلہ کرنا چاہیے جو افلاس اور مصائب میں جد و جہد کر کے طاقتور ہوگئے ہیں اور جو تجارتی فوقیت اور نسلی درستی کے لیے ہمارے رازوں کو معلوم کر کے اُن کو استعمال کرنے کے لیے کوشاں ہیں[۱]“ ایشیا کی اقتصادی

---

[۱] کلیرنس پو کا مضمون ”مشرق ہم کو کیا تعلیم دے سکتا ہے“ جو جولائی سنہ ۱۹۱۱ع کی رسالہ ورلڈس ورک میں شائع ہوا۔ مصنف

حالات کا ایک دوسرا امریکی مبصر لکھتا ہے "کل ایشیا میں جدید کاروبار اور موجودہ کلوں کی ترقی کی روح سرایت کر گئی"[1] ہندوستان کے اقتصادی مستقبل کے لیے سر تھیوڈر ماریسن اس نتیجے پر پہونچے ہیں "ہندوستان کے صنعتی انقلاب کا زمانہ قریب ہے؟ طریقہائے صنعت و حرفت کے اختیار کرنے میں جو امور سدراہ تھے وہ دور ہو گئے کل ملک میں آمد و رفت کے وسائل پھیل گئے اور مشینوں کی خرید اور کارخانہ جات کی تعمیر کے لیے سرمایہ سہل شرائط پر مل سکتا ہے۔ یوروپ سے ماہرین مشین انجینیر اور کاروباری مینیجر ہندوستانی کارخانہ جات کے آیندہ منتظمین کی تربیت کے لیے نوکر رکھے جا سکتے ہیں انگریزی ایسی مشترک زبان مل گئی جس میں ہندوستان کے ہر صوبہ اور مغربی دنیا کے بڑے حصہ سے مراسلت ہو سکتی ہے۔ غیر کے حملوں اور اندرونی شورش سے بیخطری بڑے کاموں کی ابتدا کا یقین دلاتی ہے۔ صنعت و حرفت کی عظیم تنظیم کے لیے سب باتیں موافق ہیں اور جب یہ تنظیم مکمل ہو جائے گی تو ہندوستانی دولت کی سالانہ پیداوار میں ایسی افراط ہو جائے گی کہ جو اس سے پہلے خواب و خیال میں بھی نہ تھی۔[2]

مشرق کی صنعت و حرفت میں ناتجربہ کاری اور غیر مشاقی کا بدل جو چیز سمجھی جاتی ہے وہ اسکی ارزاں مزدوری ہے۔ مشرق کی ارزاں مزدوری اور زیادہ وقت کام کرنا مغربی ناظرین کو حیرت میں ڈالتے ہیں۔ مشرق ادنی اور وسطی کے صنعتی حالات کے متعلق مصر اور ہندوستان کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں حالات مصر لکھتے ہوئے۔ ایچ - این بریلیسفورڈ انگریزی ماہر اقتصادیات لکھتا ہے "مصر میں اس وقت کوئی فیکٹری۔ ایکٹ نہیں تھا۔ کل ملک میں روئی کے پنچ ہیں۔ جن میں سال میں چار پانچ مہینے کے لیے عارضی مزدور لگائے جاتے ہیں تاکہ کپاس کو ممالک غیر میں بھیجنے کے لیے تیار کیا جاوے

[1] سی۔ ایس۔ کوپر کی کتاب "مشرق کی تجدید" صفحہ ۵ مطبوعہ نیویارک سنہ ۱۹۱۴ء مصنف

[2] ماریسن مذکور الصدر صفحہ ۲۴۴۔

مزدوری بہت ارزاں تھی یعنی مردوں کو ساڑھے سات پنس سے لیکر دس پنس تک اور بچّوں کو چھ پنس یومیہ ملتا ہے۔ بچّے اور جوان بعض اوقات بارہ گھنٹے اور معمولاً پندرہ اور کبھی سولہ یا اٹھارہ گھنٹے یومیہ کام کرتے تھے۔ جب کام کی زیادتی ہوتی تھی تو بچے بھی رات کی باری میں بارہ گھنٹہ تک کام کرتے ہیں"[۱]

ہندوستان میں بھی یہی حالت تقریباً یکساں ہے۔ ہندوستانی کارخانوں کی مکمل تحقیقات اولاً ۱۹۰۶ء میں ایک کمیشن نے کی جو کارخانہ کے مزدوروں کی حالت دریافت کرنے کو مقرر ہوا تھا۔ اُس کی رپورٹ میں جو نتائج شائع ہوئے اُن میں سے بعض حسب ذیل ہیں:۔

بمبئی کے سوتی کارخانوں میں باقاعدہ کام کرنے کے گھنٹوں کی تعداد تیرہ سے چودہ تک ہے۔

کلکتہ کے جوٹ کے پنچوں میں مزدور عموماً پندرہ گھنٹے کام کرتے ہیں۔ روئی کے پنچوں کے کارخانوں میں ملازمین سترہ اٹھارہ گھنٹہ یومیہ کام کرتے ہیں۔ چاول اور آٹے کے پنچوں میں بیس یا بائیس گھنٹہ کام کرتے ہیں۔

ایک چھاپہ خانہ میں انتہائی مثال ملی جس میں سات دن متواتر ملازمین کو بائیس گھنٹہ یومیہ کام کرنا پڑا۔ شرح مزدوری یہ ہے کہ جوان جو تیرہ سے پندرہ گھنٹہ یومیہ کام کرتا ہے پندرہ سے تیس روپیہ ماہوار تک پاتا ہے۔ بچوں کی مزدوری کا بہت رواج ہے۔ اور چھ اور سات سال کے بچے نصف وقت کام کرتے جو بسا اوقات آٹھ گھنٹے روزانہ ہوتا ہے۔

اس رپورٹ کا یہ نتیجہ ہوا کہ گورنمنٹ ہند نے ایک قانون بنایا جس سے مزدوری کی

---

[۱] ایگرتا ... صفحہ ... کتاب "جنگ عدید و مذہب" صفحہ ۱۱۴ مطبوعہ لندن ۱۹۱۶ء ...

بالخصوص بچوں اور عورتوں کی حالت بہتر ہوئی۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں فرانسیسی ماہر اقتصادیات البرٹ میتن نے کامل تحقیقات کے بعد یہ رپورٹ کی کہ کارخانہ کی حالت زیادہ نہیں بدلی۔ فیکٹری کے قانون کو باقاعدہ طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ وقت بہت زیادہ اور مزدوری بہت کم ہے۔ بمبئی میں مردوں سے بیس سینٹ یومیہ تک پاتے ہیں اور سب سے زیادہ مزدوری تیس سینٹ ہے۔ عورتوں اور بچوں کی زیادہ سے زیادہ دس سینٹ مزدوری ہے۔[۱]

ایسی غیر معمولی کم شرح اور زیادہ وقت ہونے سے نظر اوّل میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر مشرق کو کافی سرمایہ اور جدید ترین کلیں مل جائیں تو وہ مغربی پیداوار کو مشرقی بازاروں سے ہی نہ نکال دیگا بلکہ مغربی بازاروں پر بھی حملہ کریگا۔ فی الحقیقت بہت سے مغربی مصنفین کو اسی کا خوف رہا ہے۔ تقریباً پچھتر سال ہوئے کہ گوبنیو نے یہ پیشگوئی کی کہ ایشیا سے یورپ پر صنعتی حملہ ہوگا۔[۲] حال میں ماہرین اقتصادیات۔ مثلاً۔ ایچ این۔ برلیسفولڈ نے تنبہ کیا ہے کہ مشرقی ممالک میں کارخانوں کے دلفریب حالات سے مغربی سرمایہ منتقل ہوجانے کا خوف ہے۔[۳] لیکن جہاں تک مشرقِ ادنیٰ اور وسطیٰ کا تعلق ہے ایسا کوئی امر عالم شہود میں نہ آیا۔ بالیقین مغرب کو کچھ ناگوار استعجابات کا تجربہ چین سے اُٹھانا پڑے۔[۴] لیکن اسلامی دنیا اور ہندوستان نے فیکٹری کے ایسے مزدور

---

[۱] موسیو ۔ میتن کی کتاب "موجودہ ہند اور معاشرتی مطالعہ" صفحہ ۳۳۶ مطبوعہ پیرس ۱۹۱۸ء مصنف

[۲] اپنی کتاب موسومہ "فارس میں سہ سالہ قیام" مطبوعہ پیرس ۱۸۵۸ء میں لکھا ہے۔ مصنف

[۳] برلیسفولڈ کی ... صفحہ ۸۳ و ۱۱۴ و ۱۱۵۔ مصنف

[۴] چینی حالات کی بابت ... بالخصوص اہل چین کی غیر معمولی باضابطگی اور قابلیت کام کے لیے ... مصنف کی کتاب ... عالمگیر اقتدار کے خلاف رنگ کا اٹھتا ہوا طوفان"

پیدا نہیں کیے جن کی مشاقی اور محنت اور جفاکشی ایسی ہو جو یورپ اور امریکہ کے کارخانوں کے مزدوروں کو نقصان پہنچا سکے۔ مثلاً ہندوستان میں اگرچہ فلاکت زدہ اور کثیر التعداد آبادی ہے لیکن کارخانوں کو کافی یا قابلِ اعتماد مزدور نہیں ملتے۔ موسیو مینلن کہتا ہے اتنی دیر تک کام کرنے اور ایسی سستی مزدوری ہونے کی وجہ سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ ہندوستانی صنعت و حرفت مغربی صنعت و حرفت کے لیے خطرناک رقیب ثابت ہو گی لیکن اس کی کچھ اصلیت نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کام یہاں کیا جاتا ہے وہ خراب قسم کا ہے۔ کم مزدوری والے قلی ایسا خراب کھانا کھاتے ہیں اور کم زور ہوتے ہیں کہ ایک یورپی کی برابر کم از کم تین آدمی کام کرتے ہیں۔ علاوہ بریں ہندوستانی مزدوروں میں صرف قوت ہی کی کمی نہیں ہے بلکہ وہ اپنے کام میں نہ تو مشاق ہیں نہ جی لگاتے ہیں اور نہ اس کو پسند کرتے ہیں۔ دنیا بھر میں ہندوستانی ہی ایسا آدمی ہے جو چاہے بھوکا مر جائے مگر کارخانہ میں کام نہیں کرنا چاہتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ کارخانہ میں ردّی مزدور آتے ہیں۔ کارخانوں اور کھانوں میں مزدور بدرجہ مجبوری آتے ہیں اور جوں ہی کہ وہ اپنے پہلے پیشے یا زیادہ نفع بخش کام کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو وہ کارخانوں کو چھوڑ دیتے ہیں لہٰذا کارخانوں کو اس کا یقین نہیں کہ اُن کو مزدور متواتر ملتے رہیں گے۔ سوال یہ ہے کہ کیا مزدوری میں اضافہ ہونے سے یہ شکایت رفع ہو جائے گی؟ اکثر مالکان یہ کہتے ہیں کہ نہیں جب مزدور کچھ ترقی کرتے ہیں تو وہ یا تو عارضی طور پر اُس وقت تک کے لیے جب تک کہ اُن کا روپیہ صرف ہو جائے یا مستقلاً کسی زیادہ پسندیدہ کام کرنے کے لیے چھوڑ بھاگتے ہیں۔[1] ایک ہندوستانی مصنف اقتصادیات بھی ان

صفحات ۲۰۸ لغایتہ ۲۳۰ و ۲۴۴ لغایتہ ۲۵۱

[1] مینلن مذکور الصدر صفحہ ۳۲۷۔

بیانات کی پوری تصدیق کرتا ہے وہ کہتا ہے "ہندوستان میں بڑے کارخانے قائم کرنے میں سب سے بڑی دقت مزدوروں کی کم یابی اور ناقابلیت ہے۔ سستی مزدوری جب اُس میں جسمانی قوت اور دماغی تربیت اور مشاقی نہ ہو تو بالآخر گراں ثابت ہوتی ہے۔ ہندوستانی مزدور زیادہ تر غیر تعلیم یافتہ ہیں وہ اپنے مالک یا اپنے کام سے کوئی ربط نہیں رکھتے۔ قصبات میں مزدوروں کی آبادی غیر مستقل اور غیر پیشہ ور ہے"[1]

اس طور پر ہندوستانی صنعت وحرفت اگرچہ بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ لیکن وہ ابتدائی توقعات کو پورا نہ کر سکی۔ چنانچہ سرکاری سالانہ کتاب صاف صاف بیان کرتی ہے۔ "المختصر ہندوستان ایسا ملک ہے جس میں خام پیداوار اور صنعتی امکانات بہت کچھ ہیں۔ لیکن صناعی کی تکمیل بہت کم ہوئی ہے"[2] فی الحقیقت بعض مبصرین کو ہندوستان کا صنعتی مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ چنانچہ ہندوستانی حالات کے ایک اہل الرائے انگریز ماہر نے حال میں لکھا ہے۔ "چند سال ہوئے یہ ممکن معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان مغربی علم اور صنعتی مشاقی جلد حاصل کر کے جدید صنعت و حرفت کے طریقے حسب حال اختیار کر لے گا اور اس طور پر قریب قریب اقتصادی سطح پر پہنچ جائیگا۔ بعض لوگ مغربی دنیا کو اب بھی اس خیال سے ڈراتے ہیں کہ چین اور ہندوستان کی بڑی آبادیاں مشاق نظامات اور وسیع ذرائع اور مقابلتاً ارزاں مزدوری کی بدولت ترقی کر کے مغرب کو مفلس کر دیں گے۔ میری رائے میں یہ محض وہم

---

[1] عبداللہ یوسف علی کی کتاب "ہندوستانی زندگی اور مزدوری" صفحہ ۱۸۳ مطبوعہ لندن ۱۹۰۷ء مصنف

[2] "۱۹۱۰ء لغایت ۱۹۱۸ء میں ہندوستان کی حالت" سرکاری طور پر کلکتہ سے شائع ہوئی

ہی اصل خطرہ اور ہی ہی۔ ہیں قربت کے بجائے روز افزوں بعد کا مشاہدہ کرتا ہوں
وجہ یہ ہی کہ جب ہندوستان صنعتی قابلیت کے حصول کے لیے ایک قدم بڑھاتا
ہی تو مغرب دو قدم چلتا ہی۔ جب ہندوستان بائیسکل اور موٹر کا بنانا نہیں بلکہ
ان کا استعمال شروع کرتا ہی تو مغرب ہوائی جہاز مکمل کر لیتا ہی۔ یہ صرف استعارہ ہی
ہم کو معلوم ہی کہ جنگ نے کلوں کی ایجادات کو سریع کر دیا ہی اور کاریگروں کی
آبادی پیدا کر دی ہی لیکن ہندوستان مقابلتاً ساکت و صامت ہی۔ اب تک
کامل طور پر ازمنہ متوسطہ ہی کا ہندوستان ہی جس میں پرانی خانگی صنعت اور
دستکاری ہی جاری ہی۔ سیدھی سیدھی کلیں بھی اُس کی خاص صنعت و حرفت
یعنی کاشتکاری میں ہنوز مستعمل نہیں ہوئیں۔ لیکن عمر بھر کی تنہائی کا زمانہ ختم
ہو گیا اور ہندوستان اُس کی طرف کبھی بھی رجعت نہیں کر سکتا با ایں ہمہ مشرق و
مغرب کا درمیانی غار بڑھ رہا ہی۔ سوال یہ ہی کہ اُس کی تیس کرور آبادی کے لیے
اس تفرقہ کا کیا نتیجہ ہو گا۔ مشرق میں یہ خطرہ ہی کہ ہم تجارت کی بدترین خرابیوں کا
نہایت وسیع پیمانہ پر مشاہدہ کریں گے اور ہندوستان کی بڑی آبادی ان کا شکار
ہو گی یعنی مشرق دنیا کا غریب حصہ بن جائیگا"[1]

خواہ یہ مایوس کن اندازہ صحیح ہو یا غلط لیکن یہ یقینی ہی کہ نہ صرف ہندوستان
بلکہ کل مشرق ایک عظیم تبدیلی کی منزل طی کر رہا ہی اور تبدیلی کا زمانہ ہمیشہ تکلیف دہ
ہوتا ہی۔ ہم اس وقت تک قصبات کے نئی صنعتی مزدوروں کا ذکر کر رہے تھے۔
لیکن قدیم تر معاشرتی طبقات پر بھی اسی قسم کا اثر ہی۔ پرانی قسم کے کاریگروں اور
چھوٹے سوداگروں کو بھی ظاہراً جدید صنعت اور کاروبار کے طریقوں سے خوف
ہی اور کسان کچھ ہی بہتر حالت میں ہیں اس میں صرف طریقۂ کار ہی تبدیل

[1] ینگ اور فربس کی کتاب "ہندوستانی کشمکش" صفحات ۱۵ لغایتہ ۱۶ مطبوعہ لندن ۱۹۳۱ء

نہیں ہوتا۔ بلکہ زندگی کی کل مطمح نظر کی تبدیلی متضمن ہے۔ قدیم مشرق کی زندگی اگرچہ اُس میں افلاس اور مصائب تھے۔ لیکن نہایت تن آسانی کی زندگی تھی۔ جس میں وقت وقابلیت و پیداوار اور فروخت کا خفیفتاً کوئی خیال نہ تھا۔ بساطی اپنی دوکانوں میں پالتی مارے اپنے قلیل سامان کے بیچ میں بیٹھا ہوا نہایت خاموشی سے کاروبار کا انتظار کرتا تھا اور اپنے گاہکوں سے برابر حجت و تکرار کرتا تھا اور اگر بہت سے خریدار آجاتے تھے تو خوش ہونے کی بجائے بیزار ہوتا تھا۔ کاریگر عموماً تنہا اور بطور خود کام کرتے تھے۔ وہ اپنی حسب مرضی کام کرتا تھا۔ اور جب جی چاہتا تھا تو چھوڑ دیتے تھے۔ کسان علی الصباح اُٹھتے تھے لیکن دوپہر کو وہ خود اور اُن کے مویشیان آرام کرتے تھے اور سہ پہر کو ٹھنڈا ہونے تک سوتے تھے۔ زاں بعد ذرا لوٹ پوٹ کر نہایت آرام اور لاپروائی کے ساتھ پھر کام پر چلے جاتے تھے۔

ایسے آدمیوں کو ہماری اقتصادی زندگی کی جلدبازی و باقاعدگی اور باضابطگی تکلیف دہ اور خلاف مزاج ہے اور نہایت آہستگی اور سخت ترین ضرورت کی حالت ہی میں ان عادات کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ فی الحال یہ اُن اشخاص کے مقابلے کی وجہ سے نقصان اُٹھا رہے ہیں جو اقتصادی جنگ میں برتر سامان سے آراستہ ہیں۔ سر ولیم ریمزے نے نہایت دلکش مرقع اس امر کا کھینچ دیا ہے کہ گزشتہ نصف صدی میں علاوہ اہل مغرب کے اُن دیسی عیسائی یعنی آرمینیوں اور یونانیوں کے اقتصادی دباؤ سے جن میں مغربی کاروباری خیالات اور طریقے کلیتاً نافذ نہیں ہو سکتے ہیں ایشیائے کوچک کی ترکی آبادی زمیندار اور تاجر سے لیکر کسان تک کس درجہ رو بہ انحطاط ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قدیم حالات میں ایشیائے کوچک میں نہ کوئی اقتصادی ترقی تھی اور نہ تجارتی۔ سال بہ سال پورانی حالت قائم تھی۔ سیدھا کاروبار جو کچھ بھی ہوتا تھا وہ ترقی یافتہ مغربی طریقۂ کاروبار اور مغربی تمدن کے خلاف تھا۔ لیکن یہ عوام کو

تکلیف دہ نہ تھا نہ بڑی دولت موجود تھی نہ اُس کے پیدا کرنے کے مواقع حاصل تھے۔ یہہ ناممکن تھا کہ ایک فرد واحد ایک بڑے گروہ کے بہت سے دماغوں اور ہاتھوں سے خدمت لیکر منفعت کثیر حاصل کرے۔ ایک بڑا انتظام قائم کرے اور اُس سے چھوٹے آدمیوں کی تعداد کثیر قلیل پیمانہ پر کاروبار کرتی تھی[1]" اس کے بعد سر ولیم ریمزیہ بیان کرتا ہے کہ موجودہ طریقہ ہائے کاروبار سے یہ دقیانوسی اقتصادی زندگی پارہ پارہ ہوگئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی کی ناقابل ترقی آبادی کے کل طبقات میں افلاس پھیل گیا۔

ہندوستان کی موجودہ تاریخ سے یہ بخوبی ثابت ہے کہ کاشتکاری پیشہ طبقات یعنی کاشتکار اور زمیندار دونوں یکساں طور پر تبدیل شدہ اقتصادی حالات سے کس درجہ نقصان اُٹھا رہے ہیں۔ فرانسیسی مصنف شیلے جو ہندوستانی مسائل کا مستند ماہر ہے کہتا ہے گزشتہ نصف صدی سے کاشتکاری پیشہ طبقات کے بہت سے افراد اپنی اراضیوں سے یا تو قطعاً محروم ہوجاتے ہیں یا اُن کی کاشتیں کم ہوکر بہت چھوٹی رہتی جاتی ہیں برخلاف اس کے جدید طبقات پیدا ہوکر اُن کی جگہ لے رہے ہیں۔ اس میں رعیت اور زمیندار دونوں مبتلا ہیں۔ پرانی قسم کے امرا زمانہ کے قدم بہ قدم نہ چل سکے وہ کاہل اور فضول خرچ ہیں۔ اور وہ زمیندار بھی جو کاشتکاری پیشہ میں صدیوں کی روایات کی وجہ سے ویسے ہی کوتاہ اندیش اور جاہل ہیں۔ برخلاف اس کے برٹش انڈیا کی اقتصادی حالات نئے قسم کے سرمایہ دار پیدا کر رہے ہیں جو اپنی دولت کو کسی کام میں لگانے کے متلاشی ہیں۔ ان سرمایہ داروں اور پرانے زمینداروں میں تصادم لازمی تھا اور نتیجہ ناگزیر تھا۔ دولت ہوشیار ترین کے پاس جاتی ہے۔ لہذا اراضی کا نئے مالکان کے پاس جانا ضروری ہوگیا۔ اس پہ زراعتی طبقات بہت ناراض ہیں اور ان میں سے بعض تو محض

[1] سر ولیم ریمز کا مضمون "اناطولیہ کے ترکی کاشتکار" جو جنوری ۱۹۱۸ء کے کوارٹرلی ریویو میں شائع ہوا۔ مصنف

کاشتکاری کے مزدور رہ جائیں گے۔[۱]

ہندو ماہر اقتصادیات مسٹر مکرجی ہندوستانی گانوںکی تنزل اور تجزیہ کی تصویر یوں کھینچتا ہے "دیہاتیوں کے دماغوں میں جدید اقتصادی خیالات اثر پیدا کر رہے ہیں بعض تو غیر ملکی مقابلہ کی وجہ سے اپنے پیشے چھوڑنے پر مجبور ہوئے لیکن زیادہ تر اپنے موروثی پیشے کو خود ہی ترک کر رہے ہیں۔ شہروں میں جاکر سرکاری ملازمت یا کسی پیشے کی تلاش کرتے ہیں متوسط طبقے کے لوگ بھی مواضعات کو چھوڑ کر کل ملک میں کسب معاش کے لیے پھیلتے جاتے ہیں۔ کسان اپنی موروثی زمین کو چھوڑ کر ایسے زراعتی مزدوروں کا طبقہ قائم کرتے جاتے ہیں۔ جس کے پاس کوئی اراضی نہیں ہے۔ مواضعات اپنے بہترین خون کے نکل جانے کی وجہ سے پژمردہ و مردہ ہوگئے۔ دیہات سے شہروں کی طرف جو نقل وحرکت ہو رہی ہے اُس سے ہم لوگوں کی عادات اور مطامح نظر ہی میں انقلاب کلی نہیں پیدا ہو رہا ہے۔ بلکہ اُس کے اقتصادی نتائج اُس سے کہیں زیادہ نازک ہیں جو عموماً خیال کی جاتی ہیں اس نے ہمارے اوسط طبقے کو نوکری و چاکری کا غلام بنالیا ہے اور ہمارے زمینداروں کی آزادی کا خاتمہ کر دیا ہے اس نے ہمارے سامان خوراک کی فراہمی کو ضغطہ میں ڈالدیا ہے۔ اور اس سے ہماری دستکاری کے علاوہ ہمارے قومی صنعت وحرفت یعنی زراعت بھی معرض خطر میں ہے۔[۲]

خوش قسمتی سے یہ آثار نمایاں ہیں کہ کم از کم ہندوستانی زراعت میں نقل وحرکت کا زمانہ تکمیل پاکر ختم ہو رہا ہے اور یہ امید ہے کہ حالت بہت جلد رو بہ اصلاح ہو جاویگی

---

[۱] جے۔ شیلی کی کتاب "برٹش انڈیا کی مسائل حکمرانی" صفحہ ۲۳۹۔ (انگریزی ترجمہ مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۰ع) مصنف

[۲] مکرجی مذکور الصدر۔ مصنف

گورنمنٹ برطانیہ اور دیسی فرمانرواؤں دونوں نے ایک دوسرے سے بڑھ کر یہ کوشش کی ہی کہ مغربی زراعتی خیالات اور طریقہ جاری کیے جاویں اور چونکہ ہندوستانی دشکاروں کے مقابلہ میں ہندوستانی کسان زیادہ صلاحیت والے ثابت ہوئے ہیں۔ لہذا کسانوں کا ہوشیار تر نمونہ پیدا ہو رہا ہی۔ جو زمانہ کے قدم بہ قدم چل سکیگا۔[له] اس کی اچھی مثال دیہاتی

[له] میری رائے میں مصنف نے کاشتکاروں کی بابت غلط رائے قائم کی ہی۔ ہندوستان میں نہ جدید طریقۂ کاشت نے کوئی اثر پیدا کیا ہی اور نہ اس طرف کوئی کوشش ہوئی بلاشبہ گورنمنٹ نے متعدد فارم قائم اور افسران متعین کر دیے ہیں جو ہر قسم کی امداد کاشتکاران کو دے سکتے ہیں لیکن سب سے اہم مسئلہ تو کاشت کی یکجائیت کا ہی جس کی طرف نہ کوئی توجہ ہوئی ہی اور نہ نتیجہ کی جلد امید ہی۔ غالباً مصنف کو یہ غلط فہمی کواپریٹو کریڈیٹ سوسائٹی کے قیام سے ہوئی ہی۔ بلاشبہ ان جماعتوں نے شرح سود میں کمی کر دی لیکن واقعہ یہ ہی کہ ان جماعتوں سے بھی ۹۰ فی صدی قرضہ محض خانگی ضروریات کے لیے دیا جاتا ہی۔ اگرچہ ان کا مصرف امور کاشت دکھایا جاتا ہی۔ صنعت و حرفت میں جو کچھ ترقی ہی وہ صحیح ترقی ہی اور اُس کی مزید توسیع کی امید بھی ہی کیونکہ اُس کا تعلق تعلیمیافتہ طبقے سے ہی۔ کاشتکاری کا تعلق بالکل جاہل اور عیش پسند طبقے سے ہی۔ کاشتکار خود جہالت میں غرق ہی اور اُس کا زمیندار عیش پسندی میں مبتلا۔ کاشتکار کو ایسی مقدرت نہیں کہ وہ خود اپنی بہبودی کا راستہ نکالے اور زمیندار کو اپنی لغویات سے فرصت نہیں۔ اگر کہیں یہ باتیں معدوم بھی ہیں تو قطعات کاشت کے اجتماع اور استحکام میں موجودہ قوانین جو ملکی رسوم پر مبنی ہیں سدراہ ہیں۔ ہر مہتمم بندوبست کو اپنی رپورٹ میں اس کا مرثیہ لکھنا پڑتا ہی کہ قطعات اراضی نہایت حقیر اجزا میں منقسم ہو رہی ہیں اور اوسط کاشت کم ہوتا جاتا ہی۔ اگرچہ اس کا علاج اب قطعاً اہالیان ملک کے ہاتھ میں ہی لیکن کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ اب مجالس واضعان قوانین میں ہندوستانیوں کی کثرت ہی اور اُن کا فرض ہی کہ وہ اس طرف توجہ کرکے ان عیوب کو مٹائیں۔ اب وہ کسی قانون کی خرابی کا گورنمنٹ کو ذمہ دار نہیں بنا سکتے۔ کیا

کوآپریٹو کریڈیٹ سوسائٹی کی ترقی ہی۔ گورنمنٹ برطانیہ نے اولاً اس کو ۱۹۰۴ء میں شروع کیا اور ۱۹۱۵ء میں سترہ ہزار سے اونچی ایسی جماعتیں قائم ہو گئیں جن کے ممبران کی تعداد آٹھ لاکھ پچیس ہزار اور سرمایہ تین کرور ڈالر تھا۔ یہ زراعتی جماعتیں کاشتکاری کے آلات چارہ بیج کھاد کی فراہمی۔ کنوؤں کی تیاری۔ مغربی زراعتی کلوں کی خریداری اور اشد ضرورت کی حالت میں ذاتی اخراجات کے لیے قرض دیتی ہیں جن اضلاع میں یہ جماعتیں قائم ہو گئی ہیں سود خواری کا طاعون جو بنیے پھیلاتے تھے کم ہو گیا ہی اور شرح سود جو پہلے تباہ کن تھی یعنی بیس سے لیکر پچھتر فی صدی تک تھی کم ہو کر نو لغایت ۱۸ فی صدی رہ گئی ہی۔ بلاشبہ اس وقت تک ایسی صورتیں بڑے خوفناک قاعدے کے محض استثنا ہیں مگر یہ سب روشن مستقبل کا پتہ دیتے ہیں[1]۔

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ) یہ مسئلہ جو ہندوستان کی حیات کا مسئلہ ہی آزادی مطابع سے کم اہم ہی اس سے ممبران کونسل کی لاپروائی اینگلو انڈین اخبارات کے اعتراضات کو حق بہ جانب ثابت کرتے ہیں کہ اہلِ ہند سیاسیات کو محض حصول اقتدار و اختیار کا وسیلہ سمجھتے ہیں اور اپنی ذمہ داری کا کافی احساس نہیں کرتے (مترجم)

[1] ہندوستان میں کوآپریٹو تحریک کی بابت ملاحظہ ہو فشر کی کتاب "ہندوستان میں خاموش انقلاب" صفحات ۴۶ لغایت ۵۸۔ آر۔ ای۔ یونگ کا مضمون "ہندوستان کی کوآپریٹو تحریک" جو اپریل ۱۹۱۶ء کے رسالہ کوارٹرلی ریویو میں شائع ہوا ہندوستان کی زراعتی اور صنعتی دونوں قسم کے اقتصادی مسائل کو کثیر التعداد ہندوستانی ماہرین اقتصادیات نے نہایت غور سے مطالعہ کیا ہی ان میں سے بعض کی تصانیف نہایت دلچسپ ہیں۔ مکرجی اور یوسف علی وغیرہ کی تصانیف کے سب سے زیادہ قابل الذکر کتابیں حسب ذیل ہیں: دادا بھائی نوروجی کی کتاب "ہندوستان میں افلاس اور برطانوی روایات کے خلاف حکومت" مطبوعہ لندن ۱۹۰۱ء۔ آر سی دت کی کتاب "عہد

لیکن یہ روشن زراعتی مستقبل ہنوز دور ہے اور صنعت و حرفت میں تو اور بھی دور ہے۔
فی الحال انقلابی مشرق مصائب اور شورش سے لبریز ہے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اکثر مشرقی اپنے مصائب کو اقتصادی تبدیلی کے عمل سے منسوب نہیں کرتے بلکہ اُس کی وجہ یورپی حکومتوں کے سیاسی تسلط اور مغربی سرمایہ کے اقتصادی جلب منفعت بتاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مغربی اقتصادی اور سیاسی تسلط سے خلاصی کے لیے شورش پیدا ہوتی ہے۔ فصل دوئم کے خاتمہ پر ہم نے اس تحریک کا ذکر کیا ہے جو مسلمان اقوام میں "اقتصادی بین الاسلامی تحریک" کہلاتی ہے۔ ہندوستان کے ہندوؤں میں بھی اس قسم کی تحریک پیدا ہوئی ہے جو سودیشی تحریک کہلاتی ہے۔ حامیان سودیشی کا دعویٰ ہے کہ ہندوستان کی اقتصادی خرابیاں محض اس وجہ سے ہیں کہ ہندوستان کی دولت انگلستان اور دیگر بلاد مغربی کو کھنچی چلی جا رہی ہے لہذا وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انگریزی مال کو بائی کاٹ کیا جاوے۔ حتیٰ کہ برطانیہ ہندوستان کو سیلف گورنمنٹ عطا کرے۔ "سیلف گورنمنٹ" مل جانے پر ان کی تجویز ہے کہ ہندوستانی پیداوار کے لیے حفاظتی محصول لگائے جائیں۔ برطانوی سرمایہ کی سرگرمیوں کو روکا جاوے اور بڑے مشاہرے پانے والے برطانوی حکام کے بجائے دیسی مقرر کیے جاویں تاکہ ملک ہندوستان کی دولت گھر کی گھر میں رہے[1]

(بسلسلہ گزشتہ) وکٹوریہ کے ہندوستانی اقتصادی تاریخ مطبوعہ لندن ۱۹۰۶ء۔ ایچ ایچ گھوش کی کتاب "صنعت و حرفت کی ترقی" مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۹۱۰ء۔ پی سی رائے کی کتاب ہندوستانی فلاکت کا مسئلہ مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۸۹۵ء۔ ایم جی رانڈے کی کتاب "ہندوستانی اقتصادیات پر مضامین" مطبوعہ مدراس سنہ ۱۹۰۶ء۔ جادو ناتھ سرکار کی کتاب "برٹش انڈیا کی اقتصادیات" مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۹۱۱ء۔ مصنف

[1] حامیان سودیشی کے خیالات کا بہترین اقتباس اُس کتاب میں ہے جس میں کل سودیشی لیڈران کی تقریریں جمع ہیں کتاب تحریک سودیشی یعنی نقل مجلس کہلاتی ہے جو سنہ ۱۹۰۹ء میں مدراس میں طبع ہوئی مندرجہ بالا ماہرین اقتصادیات یعنی گھوش و مکرجی ورائے و سرکار اور نیز قوم پرست شورش انگیز لالہ لاجپت کی مختلف تصانیف ملاحظہ ہوں۔ موسیو گاڈ نر کے مضمون "ہندوستان میں سودیشی تحریک" میں جو جولائی سنہ ۱۹۱۱ء کے رسالہ ریویو دو موندمیں شائع ہوا ہے عمدہ اور مختصر تفسیر ملتی ہے۔ مصنف

گراں حامیان سودیشی کے دلائل کے جانچنے سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ ہندوستان کی خرابیوں کے یہ کافی وجوہات نہیں ہیں یہ خرابیاں زیادہ تر زمانہ کے عام اقتصادی رفتار کی بدولت ہیں۔ اور برطانوی تعلق کے کسی خرابی کی بدولت نہیں ہیں۔ برطانوی حکومت اور برطانوی سرمایہ کی قیمت تو ضرور زیادہ ہی۔ قیام امن اور تحفظ اور ترویج ترقی کے لیے برطانیہ کی مسلمہ قابلیت کو دیکھتے ہوئے دیسی حکومت اور دیسی سرمایہ کی ارزانی کے مقابلہ میں کچھ گراں نہیں۔ چنانچہ سرٹی مارسین نے اس کو خوب بیان کیا ہی "برطانوی بحری قوت اور برطانوی ساکھ سے جو ہندوستان کو فائدے ہیں وہ اُن اخراجات کا کافی بدل ہیں جو انگریز ملازمین کی پنشنوں اور انعاموں میں صرف ہوتے ہیں ہندوستان برطانوی سلطنت کے سلسلے سے مالی نفع اُٹھاتا ہی لہذا میں اس سوال کا کہ ہندوستان ممالک غیر میں صرف کرنے سے کیا اقتصادی نفع اُٹھاتا ہی یہ جواب دونگا کہ ہندوستان جدید صنعت و حرفت کا سامان پاتا ہی اور اس کو ایسی حکومت ملتی ہی جو اقتصادی ترقی کے لیے موزوں ہی اور اس سے سستی ہی جو وہ خود قائم کرسکتا ہی"[1] اگرچہ جاپان کے بڑے مدافعتی بجٹ اور کمتر ساکھ اور پبلک اور پرائیویٹ قرضہ جات کے بڑی شرح سود سے مقابلہ کیا جاوے تو یہ امر روز روشن کی طرح ظاہر ہوجاتا ہی۔

فی الحقیقت بعض ہندوستانی خود ہی سودیشی دلائل کی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ چنانچہ اُن میں سے ایک لکھتا ہی "نام نہاد اقتصادی "نقصان" بے اصل مہمل ہیں زمانہ حال کی اکثر مصائب گرانی معیشت کی بدولت ہیں اور یہ صورت کل دنیا میں ہی" اس کے ثبوت میں دیگر مشرقی ممالک بالخصوص جاپان[2] کی حالت کو نقل کیا ہی۔ برطانوی لیبر لیڈر ریمزے میکڈانلڈ نے جو ہندوستان کا بڑا دوست ہی یہ لکھا ہی "ایک بات بالکل ظاہر ہی کہ درآمد پر محصول لگانے سے نہ ہندوستان کی قدیم دستی صنعت اور نہ دیہات کی دستکاری دوبارہ زندہ ہوگی۔ خود ہندوستان کے

---

[1] سرٹی مارسین کی کتاب "ہندوستان کا اقتصادی وقفہ" صفحہ ۲۴۰-۲۴۱- نیز ملاحظہ ہو سر ویلنٹائن چرول کی کتاب "شورش ہند" صفحات ۲۵۵ لغایتہ ۲۷۹- ولیم ارچر کی کتاب "ہندوستان اور مستقبل" صفحہ ۱۳۱ لغایتہ ۱۵۷ [2] سید سردار علی خاں کی کتاب "موجودہ ہندوستان" صفحہ ۱۹ مطبوعہ بمبئی ۱۹۰۸ء

اندر قائم شدہ کارخانوں اور کلوں کی پیداوار دستی صنعت کا اُسی شدت سے گلا دبا دیگی جیسا کہ زمانۂ گزشتہ میں لنکا شائر اور برمنگہم کی پیداوار نے دبایا۔[ل]

پرمتھاناتھ بوس ہندو مصنف[ل] نے جو نکتہ چینیاں کی ہیں وہ اس سے بھی زیادہ بیخ کن ہیں۔ مسٹر بوس کہتے ہیں کہ "نقصان" ہندوستان کو تباہ کرتا ہے لیکن کیا ہوم رول کا وہ پروگرام جس کو اکثر صاحبان تحریک سودیشی نے بنایا ہے۔ ہندوستان کی اقتصادی خرابی کو دور کریگا۔ یہ لوگ ہوم رول میں حسب ذیل امور کریں گے۔

(۱) حکومت میں انگریزوں کی بجائے ہندوستانیوں کو متقرر کرنا۔

(۲) ہندوستانی پیداوار پر خانلتی محصول لگانا

(۳) ہندوستانی صنعت کی ترویج کے لیے سلطنت کی طرف سے ہمت افزائی کرنا

(۴) صنعتی تعلیم کی اشاعت کرنا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان امور کا کیا عمل ہوگا۔ برطانوی افسران کے بجائے ہندوستانیوں کے تقرر سے صرف میں ایسی کمی نہ ہوگی جیسا کہ حامیان ہوم رول خیال کرتے ہیں۔ ہندوستانی حکام اعلیٰ نے جو اس وقت موجود ہیں یوروپی طرز معاشرت کو اختیار کر لیا ہے لہذا نئے افسران کی جماعت پر بھی تقریباً اُسی قدر صرفہ ہوگا جتنا کہ سابق میں ہوتا تھا۔ نیز مرفہ الحال ہندوستانی حکام جو مثال قائم کرینگے اُس کا اثر ہندوستانی سوسائٹی میں اب سے زیادہ پیدا ہوگا اور مغربی اشیا کا مطالبہ نسبتاً بڑھ جائیگا۔ لہذا اجانب کی تجارتی منفعت صرف اُسی طرح سے جاری نہ رہیگی جیسا کہ یورپینوں کی موجودگی میں تھی بلکہ عجیب نہیں کہ بڑھ بھی جائے۔ رہا خانلتی ٹیکس اگر یہ ہوا تو یوروپی سرمایہ ہندوستان میں آجائیگا۔ فردودر)

[ل] جے ریمزے میکڈانلڈ کی کتاب "گورنمنٹ ہند" صفحہ ۱۳۳ مطبوعہ لندن ۱۹۱۹ء۔ مصنف

[ل] ۱۹۱۷ء مقام کلکتہ رسالہ ہندوستانی ریویو میں شائع ہوا۔ مصنف

جلب منفعت کرکے منافع کو بٹور لے جائیگا۔ ہندوستان نے دیسی صنعت وحرفت کی ترقی میں مقابلتاً کسی قابلیت کا اظہار نہیں کیا ہے۔ بلاشبہ ارزاں مزدوری کی بدولت بہت سے ہندوستانی نفع اُٹھائینگے۔ لیکن یہ نفع اُٹھانے والے اُن کروڑوں کا دسواں حصّہ بھی نہ ہوں گے جو فاقہ کشی کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس صنعتی ترقی سے بہت سے جدید معاشرتی خرابیاں پیدا ہونگی۔ سلطنت کی جانب سے صنعت وحرفت کی ہمت افزائی کی بابت یہ ہے کہ یہ حفاظتی ٹیکس سے بھی زیادہ مغربی سرمایہ کو یہاں کھینچ لائیگا۔ نتیجہ وہی ہوگا جو اوپر لکھا جا چکا ہے۔ رہا صنعت وحرفت کی تعلیم یہ ضرور نہایت اچھا خیال ہے۔ مگر مسٹر بوس کہتے ہیں "لیکن ڈر یہ ہے کہ اس تحریک میں بہت تاخیر ہو گئی۔ گزشتہ ۳۰ سال میں مغربی اور جاپانی صنعت وحرفت میں ہم سے اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ اب اُن سے مقابلہ کرنا ہر سال مشکل تر ہو جاتا ہے"۔

اصل میں مسٹر بوس مغربی تعلیم کے اُس پورے نظام پر نکتہ چینی کرتا ہے جو ملک ہندوستان میں رائج ہے۔ نہ تو اعلیٰ اور ادنیٰ تعلیم اکسیر ثابت ہوئی ہے۔ "اعلیٰ تعلیم سے ہماری جماعت کے قلیل حصے کو فائدہ پہونچا ہے۔ جس میں چند ہزار مرفہ الحال وکلا۔ ڈاکٹر۔ اور ملازمان سرکاری ہیں۔ لیکن اُن کے پیشے کم وبیش بے ثمر یا مضر قسم کے ہیں لہذا اُن کی مرفہ الحالی سے کل ہندوستان کی ترقی کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے چونکہ اُن کی مرفہ الحالی کے تناسب سے بدیسی اشیا کے متعلق اُن کا مذاق بلند ہوتا جاتا ہے۔ لہذا وہ ملک کے اقتصادی نقصان کو گھٹانے کی بجائے بڑھا رہے ہیں جو ہمارے افلاس کے خاص اسباب میں سے ایک سبب ہے"۔ اور نہ ابتدائی تعلیم نے فی الجملہ عوام کی خوش حالی میں زیادتی کی اس سے کاشتکاران میں یہ قابلیت نہ پیدا ہوئی کہ ایک بالی کے بجائے دو پیدا کرتے برخلاف اس کے اس تعلیم نے خواندہ مزدوروں میں جو اپنے طبقے کے سرمایہ ناز تھے اُن کی موروثی طرز معاشرت اور ہمیشہ سے بدشوقی وہ فضولیات اور تماشی تکلفات

اور کم و بیش تباہ کن پیشوں کا شوق پیدا کر کے اُن کی قابلیت کو گھٹا دیا۔ اون لوگوں نے دیسی صنعت و حرفت کو براہ راست یا دیگر طور پر ترقی دینے کی بجائے اُس کے انحطاط کو تیز کر دیا اور اس طرح اپنے اور اپنے ملک کی اقتصادی دقتوں کو اور بڑھا دیا۔ جس چیز کی اُنھیں سب سے زیادہ ضرورت ہی وہ غذا ہی اور جدید ہندوستان چاہتا ہی کہ اُن بھوکوں کو اُس چیز کے دینے میں گورنمنٹ سے بھی آگے بڑھ جائے جسے تعلیم کہتے ہیں۔ لیکن اس تعلیم سے اُن کی کسب معاش کی قابلیت میں اضافہ نہیں ہوتا ہی بلکہ اُن میں وہ شوق اور عادتیں پیدا ہوتی ہیں جن کی بدولت وہ دیسی مصنوعات کی تحقیر کرتے ہیں اور اجنبی چال باز سرمایہ داروں کے تمتع کا شکار بن جاتے ہیں۔ دیسی صنعت و حرفت محض سیاسی اور اقتصادی وجوہات سے معدوم نہ ہوتی۔ اگر اُن کو اُس تبدیلِ مذاق سے مدد نہ ملتی جو مغربی ماحول نے پیدا کیا اور اس ماحول کا زبردست عنصر یہ نام نہاد تعلیم ہی

اس سبب سے مسٹر بوس اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ جن اصلاحات کے ہوم رول والے حمایت کرتے ہیں اُن سے ہندوستان کے مرض کا علاج نہ ہوگا۔ فی الواقع اس کا بھی امکان ہی کہ ہندوستان مغربی تمدن کے جال میں ایسا پھنس جائے کہ کبھی نکل ہی نہ سکے اور اُس کو کوئی ایسا نفع بھی نہ پہونچے جو کافی بدل ہو اور مغرب کی گرفت اُس پر ایسی مضبوط ہو جائے کہ آخر کار اُس کا فشار نہ ہو جائے۔ لہذا مسٹر بوس کی رائے میں ہندوستان کو صرف یہ کرنا چاہیے کہ ہر مغربی شے سے انحراف اور قدیم ماضی کی طرف رجعت کامل کرے۔ چنانچہ اس کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں:-

"ہندوستان کی نجات سیاسیات کے دائرہ کے اندر نہیں بلکہ اُس کے باہر ہی۔ اُس کی مکتی اُس میں نہیں ہی کہ وہ عہد حاضرہ کی

بڑی اقوام میں ہونے کی تمنا کرے بلکہ اُس کو اپنی منکسرانہ حالت کے طرف عود کرنا چاہیئے۔ یہ میرے خیال میں تنہائی کی پر عظمت حالت ہے اُس کی بہتری اس میں نہیں ہے کہ وہ مغربی عدل کی راہ پر چلے بلکہ جہاں تک ہو سکے اُس سے دور رہے اور نہ اُس میں ہے کہ مغربی تمدن کے ایک بنے ہوئے پھندوں میں روز بروز پھنستا جائے۔ بلکہ جہاں تک ممکن ہو اُس سے بچے۔

مسٹر بوس کے زبردست نتائج یہ ہیں۔ ان ہی نتائج پر دیگر ہندوستانی حامیان نظریات مثلاً رابندرا ناتھ ٹیگور ایک حد تک پہونچے ہیں۔ لیکن اصلیت یہ ہے کہ یہ منصوبے نظری طور پر کتنے ہی دلفریب کیوں نہ ہوں محض خواب وخیال ہیں۔ اُن کنارہ کش افراد کی طرح جو سوسائٹی سے ترک علائق کر کے جوگیوں کی طرح جنگل میں رہتے ہیں کوئی کُل کی کُل قوم بلا وجہ دنیا سے قطع تعلق نہیں کر سکتی "عزلت نشین" اقوام کا دور ختم ہو گیا۔ یہ حالت ہندوستان اب ایسے بڑے ملک کے لیے بالکل ناممکن ہے جو مشرق کے چوراہے اور سمندر کے کنارہ پر واقع ہے اور جس میں مغربی خیالات کامل طور پر سرایت کر گئے ہیں۔

ہندوستانی طبائع میں عزلت گزینی کے جو میلانات قوی موجود ہیں اُن پر ایسی تنقیدات سے بڑا اثر ہوا۔

یہ لوگ اگرچہ نتائج میں اتفاق رائے نہیں کرتے۔ لیکن یہ کوشش ضرور کرتے ہیں کہ ایک طریقہ کار نکالیں جس کی رو سے قدیم نظام کی ہر پسندیدہ شے کو قائم رکھ کر مغربی مخصوص اطوار سے ہیں اور اسی غرض سے ان لوگوں نے "جدید نظام" ـــ گـ

بڑے بڑے پروگرام بنلائے ہیں۔ جن میں ہند و تصوف و ذات اور مغربی صنعت و حرفت اور اشتراکیت کی آمیزش ہے[1]۔ یہ تجاویز پر لطف تو بہت ہیں مگر معقول نہیں ہیں۔ ان کے مصنفین کو یہ پرانا مقولہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ نا ممکن ہے کہ تم اپنی مٹھائی کھا بھی لو اور بچا بھی لو۔ جب ہم قدیم مشرق اور جدید مغرب کے اقتصادی نظام کے عظیم اور بے پایاں فرق کو محسوس کرتے ہیں، تو یہ کوشش کرنا کہ ان دونوں کے پسندیدہ باتوں کو متحد اور اُن کی خرابیوں کو ترک کریں ایسا ہی ہے جیسے کہ قطبین کو ملانا یا دائرہ کا مربع بنانا۔ چنانچہ لوز ڈکنسن عاقلانہ نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ "تمدن ایک شئے کامل ہے اُس کے فنون اُس کا مذہب اُس کی طرز معاشرت سب چیزیں اُسکی اقتصادی اور صنعتی ترقی سے وابستہ ہیں۔ مجھے شک ہے کہ کوئی قوم ایسا کرسکتی ہے کہ ان میں سے کچھ چن لے اور کچھ چھوڑ دے۔ مثال کے طور پر آیا مشرق یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم مغرب کے جنگی جہازوں اور کارخانوں اور طب کو تو لینگے لیکن ہم اُس کی معاشرتی پریشانی۔ اُس کی جلدبازی خستگی۔ بدصورتی اور زاید از ضرورت سرگرمی عمل کو نہ لیں گے ...... مجھے امید ہے کہ مشرق خواہ مخواہ ان کل افراط و تفریط میں ہماری تقلید کرے گا اور تمدن کے اعلیٰ حصول کے لیے اُس کو بھی وہ ہی سب مراتب

---

[1] ٹکرجی و لاجپت رائے مذکور الصدر کی تصانیف میں اس کی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ مصنف

براہ راست طے کرنا پڑیں گے جو ہم کو طے کرنا پڑے تھے"[1]

یہ بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ بشرط شہادت کی بنا پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشرق اپنے اس عہد کے انقلابی عمل میں مغرب کی تقلید کریگا۔ غالباً ہماری بعض بیّن غلطیوں سے احتراز کریگا۔ لیکن فی الجملہ انھیں طریقوں کو اختیار کریگا۔ اور جیسا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں یہ تبدیلی مشرقی زندگی کے ہر صنف کو ترمیم کر رہی ہے ہم نے اُس عمل کا ذکر کر دیا ہے جو مذہبی سیاسی اور اقتصادی اصناف میں بر سر کار ہے اب ہم کو معاشرتی پہلو کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔

---

[1] جی. لو. ڈکنسن کی کتاب "ہند و چین و جاپان کے تمدنوں پر ایک مضمون" صفحات ۸۵ و ۸۶ مطبوعہ لندن ۱۹۱۴ء۔ مصنّف

فصل ہشتم

(معاشرتی انقلاب)

فی زمانہ مشرق کی جو قلب ماہیت ہو رہی ہے اس کی نوعیت کی اس سے بہتر کہیں بھی تصدیق نہیں ہوتی جیسی کہ اُن انقلابات سے جو اُس کی اقوام کی معاشرت میں پیدا ہوگئے ہیں۔ مغرب کا وہ قوی اثر جو دستور ہائے حکومت، سیاسی ادراکات، مذہبی عقائد اور اقتصادی اعمال کو برہم کر رہا ہے، امور معاشرتی کی صف میں بھی ویسا ہی زبردست ثابت ہو رہا ہے۔ اس کتاب کی تیسری فصل میں ہم نے یہ کوشش کی تھی کہ مذکورۂ بالا اصناف میں مغربی اثرات کا عام تذکرہ کریں۔ موجودہ فصل میں ہم ان معاشرتی انقلابات پہ مفصل غور کرنے کی کوشش کریں گے جو آج پیش آ رہے ہیں۔

یہ معاشرتی انقلابات نہایت عظیم ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض ایسے نمایاں نہیں ہیں جیسے کہ دیگر اصناف کے انقلابات۔ مشرق میں رسم و روایت کا افراد، خاندان اور اجتماعی حیات پر ایسا گہرا ہے کہ مشرق کے سطحی ناظرین یہ دعویٰ کرنے کی طرف مائل ہیں کہ ان امور میں کوئی بڑی تبدیلی ہی نہیں ہوئی ہے۔ باوجودیکہ بیرونی و مادی پہلو میں یہ تبدیلیاں صاف ہویدا ہیں۔ لیکن مشرق کے بڑے واقف کار اس سے مختلف ہیں۔ اور خود مشرقیوں کی یہ رائے بڑے شد و مد سے نہیں ہے۔ یہ عموماً ان عظیم معاشرتی انقلابات ہی پر زور دیتے ہیں جو واقع ہو رہے ہیں۔ اور انھیں لوگوں کی رائیں زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہیں یہ کہنا کہ مشرق

مادی طور پر "تو ترقی کر رہا ہے۔ لیکن معاشرت میں "بالکل ساکن ہے" یہ معنی رکھتا ہے
کہ آپ اس ابتدائی اصول کو نظر انداز کرتے ہیں کہ معاشرتی نظامات میں مادی چیزوں سے
ویسا ہی فرق پڑتا ہے جیسا کہ محض خیالات سے۔ جس شخص نے اندرونی حالت کا معائنہ
کیا ہے وہ ریلوں، ڈاکخانوں اور تاروں کی معاشرتی، اخلاقی اور تمدنی قوت کا کیسے
انکار کرسکتا ہے۔ کیا معاشرتی اور نیز مادی طور پر یہ کوئی وقعت نہیں رکھتا کہ مشرق مغرب
کے بڑے اور چھوٹے، اہم اور لغو، مفید اور مضر ہزاروں ایجادوں کو اختیار کر رہا
ہے۔ کیا یہ معاشرتی اور نیز مادی طور پر دقیق نہیں کہ مدینہ منورہ روضہ نبوی میں بجلی
کی روشنی ہوتی ہے۔ اور مکہ معظمہ میں کعبہ شریف کے باہر تصویروں کے پوسٹ کارڈ
فروخت ہوتے ہیں۔ یہ محض قابل تماشہ مذاق معلوم ہوتا ہے کہ موذن مسجد کو ٹریم کار میں
سوار ہو کر جاتا ہے اور مسلمان تاجر اپنے حرم سے نکلکر صبح کا اخبار پڑھتے ہیں اور موٹر
میں سوار ہو کر اپنے دفتر کو جاتے ہیں جہاں جا نماز بھی موجود ہے اور عبادت سے
فارغ ہو کر ڈکٹا فون اور ٹیلیفون پر کام کرتا ہے تاہم یہ کیوں مان لیا جاتا ہے کہ اس
کی زندگی پر مسجد و حرم اور جا نماز کا تو اثر ہے اور اس کے ساتھ ہی اس امر سے انکار
کیا جائے کہ مغربی اسباب کا اس کی معاشرتی ہستی کی تشکیل میں کوئی قابل اعتنا حصہ
نہیں ہے۔ ان نمایاں اختراعات میں غیر نمایاں نئی چیزوں یعنی باقاعدہ تعلیم
و مغربی تفریحات اور مشورات کی جزو اخلاصی کا اضافہ کرنے کے بعد ہم کو اس کا صحیح اندازہ
ہو سکتا ہے کہ معاشرتی قلب ماہیت جو عمل پیرا ہے وہ کسقدر عمیق اور وسیع ہے
مشرق کے ان حصص میں جنمیں مغربی اثرات کا زیادہ موقعہ ہے اس معاشرتی
قلب ماہیت نے ایک پشت قبل سے قابل لحاظ تناسب حاصل کر لیا ہے۔
ہنگری کا مستشرق وامبری جب چالیس سال کی غیر حاضری کے بعد ۱۸۹۶ء میں قسطنطنیہ
کو واپس ہوا تو وہ ان انقلابات کو جو ہو چکے تھے دیکھکر حیران ہو گیا

باوجودیکہ اس زمانہ میں قسطنطنیہ حمیدی حکومت کے بدترین استبداد میں مبتلا تھا۔ وہ لکھتا ہے "میں بار بار اپنے دل میں یہ سوال کرتا تھا کیا یہ ممکن ہے کہ یہ وہی ۱۸۵۶ء کے ترک ہیں۔ اور یہ تمام انقلابات کیونکر ہو گئے۔ میں شہر کی صورت دیکھکر حیران رہگیا۔ قدیم لکڑی کے مکانوں کی بجائے پتھر کی عمارتیں بنگئی تھیں۔ میں سڑکوں کی چہل پہل دیکھکر حیران ہو گیا۔ اُن سڑکوں پر بکثرت گاڑیاں اور ٹریم کاریں چل رہی تھیں۔ جہاں چالیس سال قبل صرف زین سواری کے جانور مستعمل تھے۔ اور جب انجنوں کی کرخت آواز منارہ پر موذن کی غمناک اذان سے ملی تو جو کچھ میں نے دیکھا اور سُنا وہ مجھے قدیم مقولہ لا تجدید فی الاسلام کے خلاف جیتا جاگتا احتجاج معلوم ہوتا تھا۔ جب میں نے مکانوں کے اندر داخل ہو کر لوگوں کی حالت کا اندازہ ان کے ظاہری اسباب کے علاوہ انکے طرز خیال سے بھی کیا تو میری حیرت اور بھی بڑھ گئی۔ قسطنطنیہ کے افندی[۱] طبقہ کو میں نے اُس کی روش و خیالات اور اجانب سے برتاؤ میں بالکل بدلا ہوا دیکھا[۲]!!

وامبیری نے ترکی تعلیم یافتہ طبقہ کے اندرونی اور نیز ظاہری ارتقا پر بڑا زور دیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے "آج کل کا ترک نہ صرف اپنے بیرونی حالات میں بلکہ اپنی خانگی زندگی کے ایسے مختلف امور میں مغربی اطوار و عادات کی طرف بڑا میلان ظاہر کرتا ہے جیسے سامان آسائش، کھانے کے آداب، مرد و عورت کے تعلقات وغیرہ یہ بہت ہی اہم بات ہے۔ کیونکہ ایک قوم دینی میدان میں

---

۱ یعنی تعلیم یافتہ طبقہ اعلیٰ۔ مصنف

۲ وامبیری کی کتاب "موجودہ اور چالیس سال قبل کی ترکی"، صفحہ ۱۳۔ مصنف

ممالک غیر کے اثرات کو ضرور قبول کر سکتی ہے اگر اس کو ان کے کارآمد و مفید ہونیکا یقین ہو جائے لیکن رسوم و عادات کو بہت دقّت سے ترک کرتی ہے جو اسکے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکے ہیں۔ ترکوں نے اس بارے میں باوجود ہر بات کے بے شمار قربانیاں کی ہیں۔ اس میں کسی مبالغہ کو دخل نہیں ہیں دیکھتا ہوں کہ کل کی جماعت حتےٰ کہ ملاؤں میں بھی، مغربی تمدن سے اتحاد کی ضرورت سرایت کر گئی ہے۔ طریقہ قبول کی بابت اختلاف رائے ہو سکتا ہے یعنی بعض تو یہہ چاہتے ہیں کہ تمدن غیر پر قومی خصایص کا اثر ڈالیں برخلاف اسکے بعض ہماری دماغی شایستگی کے مجسمہ حامی ہیں اور اسمیں کسی قسم کی ترمیم کو ناجائز تصور کرتے ہیں[۵۱]"

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ واہبیری نے حرم کی عزلت نشین مستورات کو بھی جو "جہالت کا حصار" تھیں بہت بدلا ہوا پایا۔ "ہاں میں اس کو پھر کہتا ہوں کہ مجکو ترکی میں مستورات کی زندگی گزشتہ چالیس سال کے مقابلہ میں بالکل بدلی ہوئی نظر آئی اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ تبدیلی ولی یقین اور بیرونی اثر کی وجہہ سے پیدا ہوئی"۔ تعلیم نسواں کی اشاعت اور اصلاحی تحریکات میں عورتوں کی روز افزوں شرکت دیکھکر واہبیری کہتا ہے "یہ بہت ہی اہم بات ہے کیونکہ جب عورتیں گھر میں ہی جو ترقی کے عنصر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کرینگی تو معاشرت اور نیز سلطنت میں حقیقی اصلاحات لامحالہ رونما ہوں گی[۵۲]"

ہندوستان کی معاشرتی زندگی میں بھی اسی قسم کے مغربی تمدن کا نفوذ مسلمان لبرل صلاح الدین خدا بخش نے بیان کیا ہے اگرچہ خدا بخش نے

---

[۵۱] واہبیری کی کتاب "موجودہ اور چالیس سال قبل کی ترکی" ص ۱۳ مصنّف

[۵۲] واہبیری کی کتاب "موجودہ اور چالیس سال کی ترکی" ص ۱۵ مصنّف

صاحب البیت[۱] ہونے کی وجہ سے اُن دردناک اشکال پر بہت زور دیا ہے جو قدیم سے جدید کی طرف دوران انتقال میں ناگزیر ہیں لیکن وہ ضرورت سے زیادہ مایوس نہیں ہے۔ کیونکہ وہ یہ جانتا ہے کہ تبدیلی کا زمانہ ایک حد تک ضرور اخلاقی کمزوری، مذہبی بے پروائی اور نمایشی تہذیب و فضول ہرزہ سرائی کا زمانہ ہوتا ہے۔ یہ عارضی خرابیاں ہیں جن کو زمانہ خود درست کردیگا۔" باایںہمہ وہ موجودہ حالات کی نزاکت کو کم نہیں کرتا۔ جس میں قدیم معاشرتی نظام کی شکست وریخت بالیقین متضمن ہے۔ وہ کہتا ہے "یورپی خیالات کے حملوں سے ہماری خانگی زندگی اور معاشرتی رسوم کے قدیم نظام کی شکست وریخت کا سب سے زیادہ واضح اور نمایاں نتیجہ ہمارے مذہبی عقاید اور معاشرتی زندگی میں ملیگا۔ قدیم نظام میں باوجود اس کی خرابیوں کی بہت سی خوبیاں بھی تھیں۔ آج اس قدیم اور تنگ خیال مگر خداترس دستور کی جگہ عجیب آزادی عمل اور خیال نے لی ہے۔ بوڑھوں کا پاس، بڑوں کا ادب، اور دوسروں کی رائے کا لحاظ جلد معدوم ہو رہا ہے۔ قدیم دستور میں پیشوائے خاندان اس کے ممبران کا تنہا راہنما اور دوست تھا۔ اسکی بات قانون کا حکم رکھتی تھی یا یوں کہیئے کہ وہ خاندانی قدرومنزلت کا محافظ تھا۔ اس عالی مرتبے سے وہ معزول کردیا گیا اور سب سے کم عمر ممبر اس سے مساوات کا مطالبہ کرتا ہے۔"[۲]

یورپی رسوم اور طرز معاشرت کو کلیتاً اختیار کرنے سے جو مصارف میں زیادتی ہوئی ہے اس پر مسٹر بخش اظہار تاسف کرتے ہیں وہ سوال کرتے ہیں "یہاں ہندوستان میں کیا ہوا؟ ہم نے یورپی ملبوس، یورپی طرز معاشرت یعنی یورپی عیوب، شراب خواری اور

---

[۱] صاحب البیت جیسا کہ عربی مقولہ صاحب البیت ادری بما فیہ ہے (مترجم)

[۲] بخش کے مضامین متعلقہ اسلام و ہندوستان ص ۲۲۱ تا غایت ۲۲۶۔ مصنف

فمارپانی تو سیکھ لیں لیکن انکی خوبیوں کو نظر انداز کر دیا۔ اس کا علاج ہونا چاہیئے۔ ہمکو یورپ کے قدموں میں تعلیم حاصل کرنا چاہیئے لیکن مشرقی امتیاز کو قربان نہیں کرنا چاہیئے یہی وہ بات ہے جو ہم نہیں کر رہے ہیں۔ تھوڑی سی انگریزی اور یورپی تاریخ پڑھکر ہم اپنے مذہب اپنے ادب اپنی تاریخ اور اپنی روایات کو ذلیل سمجھنے لگے۔ ہم نے اپنی تاریخ اور اپنی تمدن کے سبق کو بھلا دیا اور اس کی بجائے ہم نے کوئی ایسی مستحکم اور پختہ شئے حاصل نہیں کی جو ہماری معاشرت کو بے پایاں انقلاب میں قایم رکھے" مختصر یہ کہ تخریب نے اپنا کام کیا ہے اور تعمیر کا کام ہنوز شروع نہیں ہوا ہے۔[۱]

وامبیری کی طرح بخش بھی عورتوں کی روز افزوں آزادی پر زور دیتے ہیں۔ ہندوستان میں مسلمان خواتین جو اب تک محض "بچہ کشی کی مشین" تعین سمجھی جاتی ہیں۔ روز بروز تعلیم پاکر اپنے حقوق کے لئے دعوی کرتی ہیں۔ اگرچہ رسم پردہ ہنوز رائج ہے لیکن وہ پچاس سال قبل کے سخت، شدید عزلت نشینی نسواں نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ یہ کم ہو رہا ہے اور خواتین وہ حقوق و آزادی حاصل کر رہی ہیں جو امتداد زمانہ کے بعد مشرقی خواتین کی کامل نجات و آزادی پر منتج ہونگے، چالیس سال قبل کی مستورات اپنے شوہروں کی غفلت و بے پرواہی اور نیز بدسلوکی کو صبر سے برداشت کرتی تھیں لیکن اب یہ حالت باقی نہیں ہے۔"[۲]

مشرق ادنے و وسطے کے معاشرتی حالات کے ان دو بیانوں سے متذکرہ انقلابی عمل کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے البتہ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر دو مصنفین اصلاً بڑے مقامات کے تعلیم یافتہ طبقہ اعلیٰ کا ذکر کرتے ہیں مگر یہ مادہ بتدریج نیچے کی طرف

۱؎ بخشی کے مضامین متذکرہ اسلام و ہندوستان ص ۴۰ تا ۴۲ ۔ مصنف

۲؎ بخشی کے مضامین مذکورہ بالا ص ۲۵ لغایت ۳۲ ۔ مصنف

بھی اپنا عمل کر رہا ہے اور ہر قرن میں دیسی آبادی کے وسیع تر حلقوں میں اثر پیدا کر رہا ہے۔

مشرق میں جو مغربی تعلیم کی اشاعت گزشتہ چند قرنوں میں ہوئی وہ حقیقتاً حیرت انگیز ہے کیونکہ وہ مشرقی نصاب تعلیم سے بالکل متضاد ہے مراکش سے لے کر چین تک کل مشرق کی قدیم "تعلیم" محض یہ تھی کہ کتب مقدسہ اور مذہبی طریقہ عبادات کو حفظ کر لیا جائے۔ مسلمان اور ہندو طلباء سالہاسال تک اپنے اساتذہ کو کتب مقدسہ کے حصص سنایا کرتے تھے جو عربی یا سنسکرت میں لکھے ہوتے تھے۔ اور جنکو طلبا بالکل نہ سمجھتے تھے ذہانت کا اس سے زیادہ تباہ کن نصاب اور نہیں بنایا جاسکتا تھا دماغ کا ہر حصہ باستثنائے قوت حافظہ بیکار ہو جاتا تھا۔ اور جو کچھ اوراکی جدت اور اصلی تخیل کبھی کبھی ظاہر ہوئے وہ باعث تعجب ہے۔

آج بھی پرانا قاعدہ موجود ہے اور لکھوکھا مشرقی نوجوان اس دماغ کو خراب کرنے والے نصاب میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ لیکن اس قدیم نصاب کے ساتھ ہی ساتھ ایک جدید نصاب بھی پیدا ہو گیا ہے جس میں کل تعلیمی امور ابتی کنڈرگارٹن سے لے کر یونیورسٹی تک قایم کئے گئے ہیں۔ اس میں مشرقی اطفال کو مغربی طریقہ پر تعلیم دیجاتی ہے۔ یہ نئی قسم کی تعلیم گاہیں ہر قسم کی ہیں۔ مدارس اور دار العلوم کے علاوہ کہ جہاں آزاد خیالی کی تعلیم دی جاتی ہے اور طلباء کو ملازمت سرکاری یا کسی پیشہ کے لئے تیار کیا جاتا ہے، ایسے بھی بہت سے صنعت و حرفت کے مدرسے ہیں جنمیں ماہر فن زراعت اور انجینئر پیدا ہوتے ہیں اور اپنے مدارس المعلمین اس لئے بنائے گئے ہیں تاکہ آیندہ نسلوں کے لئے عام مدرسین کافی تعداد میں بہم آسکیں مشرق میں پبلک اور پرائیویٹ کوششوں سے مغربی تعلیم کو پھیلایا جاتا ہے تمام یورپی حکومتوں نے اپنے زیر تسلط ممالک بالخصوص برطانیہ نے کہ مصر و ہندوستان میں مغربی تعلیم کی

خود حمایت کی ہے - علاوہ ازیں مختلف عیسائی تبلیغی جماعتوں نے مشرق میں مدرسوں و کالجوں کا جال بچھا دیا - اکثر مشرقی حکومتوں مثلاً ترکی اور ہندوستان کی دیسی ریاستوں نے اپنی رعایا میں مغربی تعلیم کے رواج کے لئے بھی کوششیں کی ہیں - [۱]

جیسی ہر نئی ترقی کی ابتدائی حالت ہوتی ہے بلاشبہہ اس کے بھی نتایج حاصل شدہ ہنوز غیر مکمل ہیں ماضی کی ناقص روایتیں موجودہ مساعی کو نقصان پہونچاتی یا جزواً رد کرتی ہیں - مشرقی طلباء اپنے ذہانت صرف کرنے کی بجائے اپنے حافظہ کو استعمال کرنے کی طرف مائل ہیں - اور اس کے متلاشی ہیں کہ رٹ رٹ کر جلد ہی سے امتحانات پاس کر کے عہدے پا جائیں - اُن کو اس کا خیال نہیں ہے کہ علم حاصل کر کے آیندہ زندگی کے لئے اپنے کو قابل بنائیں نتیجہ یہ ہے کہ فیل ہونے والوں کی تعداد زیادہ ہے اور یہ بدبخت جو نیم تعلیم یافتہ اور کسی قسم کے مفید پیشہ کرنے کے ناقابل ہیں - بیکاری و فلاکت میں عمر گزارتے ہیں - لہذا وہ اس مغربی تمدن سے نفرت کرنے لگتے ہیں جس کو وہ نہیں سمجھتے ہیں اور رید نظمانہ انقلابی شورش میں شریک ہو جاتے ہیں - سر ایلفرڈ لائل نے جو کچھ ہندوستان کی بابت لکھا ہے اس سے مشرق میں مغربی تعلیم کے تاریک پہلو کی خوب توضیح ہوتی ہے " مسلمہ امر ہے کہ جہالت بے شمار برائیوں کی جڑ ہے - اور یہ امر قدرتی تھا کہ گزشتہ صدی میں بعض حکماء نے یہ خیال کیا کہ انسانی غلط کاریوں کا یقینی علاج تعلیم ہے - اور یہ کہ مکالے جیسے مدبر نے یہ اعلان کیا کہ تعلیم

---

[۱] مشرقیوں نے جو ترقی مغربی تعلیم یورپی اور دیسی سائنہ عاطفت میں حاصل کی ہے اسکے لئے ملاحظہ ہو ایل برٹراند کی کتاب "کشترقی سراب" ص ۲۹۱ و ۲۹۲ اور سی ایس کوبک کی کتاب مشرق کی تجدید " صفحات ۳ لغایت ۱۳ و ۴۴ لغایتہ ۹۴ - مصنف

سیاسی شورش اور قانون شکنی کا بہترین اور یقینی علاج ہو ہر نوع گورنمنٹ برطانیہ کے لیے یہ قطعی ضروری تھا کہ وہ ہندوستان کے ذہنی خلاصی کی کوشش کرے تاکہ برطانوی حکومت کی ضرورت کا بہترین ثبوت ہو۔ تاں بعد ہم کو تجربہ سے معلوم ہوا کہ اگرچہ تعلیم بہت سی خرابیوں کے لیے اکسیر کا کام کرتی ہے اور صحیح ترقی کے لئے بالیقین لازمی ہے لیکن اس زبردست دوا کا سطحی یا بلا سوچے سمجھے استعمال کرنا دیگر قسم کی خرابیاں پیدا کر سکتا ہے۔ یہ دقیانوسی معاشرت کے شیرازہ پر زبردست تحلیل کا عمل کرتا ہے۔ کمزور دماغوں کو جوش دے کر غیر دانشمندانہ اُمنگیں اور ایسی خلاف قیاس توقعات پیدا کر سکتا ہے جن میں ناکامی سخت اشتعال کا باعث ہوتی ہے۔[۱]

بلاشبہ مشرق کے بعض مبصرین بالخصوص نوآبادیات کے عمّال ان سیاسی و معاشرتی خطرات سے اس قدر خائف و متاثر ہیں جو نیم تعلیم یافتہ ناکامیابوں کی "اس" خواندہ طبقہ ادنے کی موجودگی سے پیدا ہو رہی ہے کہ وہ مشرق میں مغربی تعلیم کی اشاعت ہی کو غلطی بتاتے ہیں۔ مثلاً لارڈ کرومر مغربی تعلیم یافتہ مصریوں کی قابلیت سے بالیقین بد اعتقاد تھا[۲] اور ایک سربرآوردہ اینگلو انڈین افسر، ہندوستانی شورش

---

[۱] سر ویلنٹائن کی کتاب "شورش ہند" کا جو مقدمہ لکھا ہے اس میں تحریر ہے (مصنف)

[۲] کرومر کی کتاب "موجودہ ہند" جلد دوم ص ۲۲۰ تا ۲۴۳ (مصنف)

کی خاص وجہ اس نصاب تعلیم کو ٹھہراتا ہے جو ہم نے خود جاری کیا۔ یہ اجرا جہاں تک اس کے جاری کرنے والوں کی تنگ نظر پہونچتی تھی صلاح نیک تھی اور لازمی نتائج کے لحاظ سے کورانہ حرکت تھی"
لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان ہمت شکن خیالات
میں اس کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے کہ ہر تبدیلی کی حالت میں کچھ خرابیاں ہوتی ہیں جن سے مفر نہیں۔ مشرق کے دیگر مبصرین نے اس جزو کا کافی خیال رکھا ہے۔ مثلاً دامبیری برطانوی اور فرانسیسی شمالی افریقہ کی غیر مصافی ملازمت میں ایماندار اور قابل دیسی حکام کے بڑے تناسب کے لحاظ سے جن میں غالب تعداد مغربی تعلیم یافتوں کی ہے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ "سخت قلبامت پسند مشرقی اور متعصب المزاج یورپی یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری تہذیب کے داخل ہونے سے ایشیائیوں کی ابتدائی خوبیاں مٹ گئیں اور یہ کہ غیر تہذیب یافتہ مشرقی اُن ایشیائیوں کے مقابلہ میں زیادہ وفادار، دیانت دار اور قابل اعتبار تھا جو مغربی اصول پر تعلیم پائے ہوئے ہیں، یہ سخت غلطی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ نیم تعلیم یافتہ اشخاص پر صادق آئے لیکن اُن ایشیائیوں پر صادق نہیں آتا ہے جن کا دماغی ارتقاء مکمل اور باقاعدہ تعلیم کی مستحکم بنیاد پر

لہ جے۔ ڈی۔ ریس کی کتاب "حقیقی ہندوستانی" مطبوعہ لندن ص ۱۶۲ (مصنف)

ہمیں؎ ہے۔"

مشرق میں اشاعت تعلیم مغربی سے کچھ ہی خرابیاں کیوں نہ پیدا ہوں سوال یہ ہے کہ کیا کوئی واحد قابل عمل طریقہ نہیں ہے؟ مشرق پر مغربی تمدن کا ایسا عالمگیر اثر ہے کہ محض کتابوں ہی تک محدود نہیں۔ اگر استدلال کے لئے یہ مان بھی لیا جائے کہ نوآبادیات کی حکومتیں مغربی تعلیم کو رسمی مفہوم کے مطابق نہ روک دیں تو کیا مشرقی دوسرے طریقوں سے مغربی تعلیم کو حاصل نہ کرتے؟ لہذا بجائے اس کے کہ مشرقی اس تعلیم کو معکوس اور خطرناک طریقوں سے بدقت سیکھیں یہ بدرجہا بہتر ہے کہ وہ مستند اساتذہ کے زیر نظر اچھی کتابوں سے تعلیم حاصل کریں۔

مشرق میں مغربی تعلیم کی اہمیت کا اس سے بہتر کوئی ثبوت نہیں ہے کہ اس نے طبقۂ اناث کی ترقی میں کامیاب نتائج پیدا کیے ہیں۔ مشرق میں عورتوں کی پست حالت ایسی معروف ہے کہ کسی توضیح کی ضرورت نہیں گرچہ اسلامی ممالک میں بھی عورتوں کی حالت کافی خراب ہے لیکن غالباً ہندوستان کے ہندوؤں میں بدترین ہے۔ جہاں کم سنی میں شادیاں بیواؤں کی مبتذل اور

؎ وامبیری کی کتاب "مشرقی بلاد میں مغربی تمدن" ص ۲۰۳ و ۲۰۴ (مصنف)

غلامانہ زندگی جو انگریزی قانون کی ممانعت سے پہلے زندہ جلائی جاتی تھیں اور بلادِ اسلامی کے حرموں سے بھی زیادہ سخت پردہ داری رائج ہے۔ چنانچہ ایک انگریز مصنف نے اس کو خوب بیان کیا ہے۔ مغرب میں ہم کہتے ہیں "پیشتر خواتین" مشرق کا مقولہ ہے "عورتیں بعد میں" دونوں تمدنوں کے خانگی خیالات میں جو فرق ہے اس کا مکمل خلاصہ یہ شعر ہے۔[1]

اِس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اِن گوشہ نشین ذوی الارواح تک مغرب کی ہوا ابھی نہ پہونچی ہوگی۔ لیکن نفس الامر یہ ہے کہ مغربی اثرات نے طبقات اعلے کی خواتین میں بڑا اثر پیدا کیا ہے اور تعلیم نسوان اگرچہ مردوں سے کم ہے تاہم اس میں بہت کچھ ترقی ہو گئی ہے۔ مشرق کے زیادہ ترقی یافتہ حصص مثلاً قسطنطنیہ، قاہرہ اور ہندوستان کے شہروں میں نئی قسم کی خواتین یعنی خوددار، خود متکفل اور محترم خواتین نمایاں طور پر نظر آنے لگی ہیں۔ خاص طور سے مدرسوں کی معلمہ عالم شہود میں آئی ہیں۔

---

[1] ایچ۔ ای۔ کاپٹس کی کتاب "ہندوستان کے شہروں اور دیہات کی زندگی"، مطبوعہ لندن ص ۹۳

(مصنف)

عورتوں کی حالت میں اس ترقی کے معاشرتی نتائج خود عورتوں ہی کے لیے نہیں بلکہ کل جماعت کے لیے بہت اہم ہیں۔ جیسا وامبیری نے بیان کیا ہے۔ مشرق میں حرم "جہالت کا حصن[1] ہے"۔ چونکہ حرم کی عورتیں جاہل و متعصب ہوتی ہیں لہذا وہ اپنی جہالت اور تعصب کا نقش اپنی اولاد کے دلوں پر مرتسم کر دیتی ہیں۔ مشرقی ذہانت کے لیئے اس سے شدید اور کیا نقصان ہو سکتا ہے کہ اس کے لڑکپن کا زمانہ "پس پردہ" صرف ہوتا ہے۔ یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ روشن خیال مشرقی باپ اس بات کے عادی ہیں کہ اپنے لڑکوں کو جلد سے جلد مدرسے بھیجدیتے ہیں تاکہ وہ جلد سے جلد حرم کی زندگی کے تباہ کن اثرات سے نجات پاجائیں۔ مگر یہ علاج بھی محض مسکن ہی ثابت ہوا۔ بچپن کے اثرات ہمیشہ زیادہ دیرپا ہوتے ہیں اور جب تک مشرق کا نصف حصہ ترقی کے اثرات سے جدا رہا تو ہر آنے والی نسل کے لیئے مشرقی ترقی از سر نو شروع کرنی پڑی۔

روشن خیال مشرقی عورتوں کی تعداد بڑھنے سے اس مہلک مرض کا علاج ہو رہا ہے۔ چنانچہ ایک مغربی مصنف نے خوب لکھا ہے "ماؤں کے تعلیم دینے سے کل حالت بدل جاتی ہے وہ لڑکیاں جو قرآن شریف کے

---

[1] وامبیری کی کتاب "موجودہ اور چالیس سال قبل کی ترکی" صفحہ ۳۰۳
(مصنف)

فقرات کے سوا جن کے معنی وہ خود نہ سمجھتی تھیں، دیگر امور کی تعلیم پا رہی ہیں وہ یقینا اپنے خاندانوں میں لڑکیوں، بہنوں اور ماؤں کی حیثیت سے اِن علوم کو رائج کرینگی۔ وہ عورتیں جو امورِ خانہ داری جدید کھانا پکانے کے طریقے، سینا پرونا اور حفظانِ صحت خانگی کفایت شعاری مدرسوں میں سیکھ رہی ہیں تو گھر واپس آنے پر ایک متمدن قوم کی فضا کو اپنے گھروں میں بالضرور پیدا کرینگی مشرقی خواتین کی قدیم الایام تصویر یعنی مسند پر پڑے پڑے وقت گزارنا مٹھائیاں کھانا اور ملازمین یا اپنی مثل دیگر جاہل عورتوں سے گپ مارنا، یہ سب بدل جائے گا۔ جدید عورت اپنے شوہر کی کنیز یا کھلونا ہونے کے بجائے رفیق ہوگی۔ شادیاں ذلیل جسمانی تجارت سے ترقی کر کے حقیقی اتحاد پیدا کرینگی جس کی بدولت لڑکے اور باپ دونوں عورتوں کا احترام کریں گے۔ اور عورت خود تعلقات کے جدید افتخار میں بڑھا ہو گی۔[۱]

جدید تر مشرق کے اِن مردوں اور عورتوں کی تبدیل شدہ خیالات کا پرتو ان کے معیار معیشت کی تبدیلی سے ظاہر ہوگا۔ اگرچہ یہ شہروں کے متمول طبقات میں سب سے زیادہ نمایاں ہے لیکن اس کی جھلک آبادی کے سب طبقات

---

[۱] کوپر کی کتاب "مشرق کی تجدید" ص ۴۸ لغایت ۴۹

(مصنف)

میں نظر آتی ہے۔ مشرق کا امیر و غریب، شہری و دیہاتی اپنی طرزِ معیشت کو مغربی معیار میں تبدیل کر رہے ہیں۔ اور اِس میں بڑی دور رس تبدیلیاں متصور ہیں۔ کیونکہ قدیم مشرق اور موجودہ مغربی دنیا کے مروجہ معیشتی حالات سے زیادہ کسی چیز میں تضاد نہیں ہے۔ یہ اصلی اختلاف دولت کے لحاظ سے نہیں بلکہ آسایش کی نسبت سے ہے۔ جبکہ اس لفظ کا وسیع تر مفہوم مراد ہو (مشرق میں بھی مغرب کی طرح بڑی دولت اور بڑا افلاس ہے) قدیم خیالات کے متمول مشرقی اپنا روپیہ زیادہ تر مشرقی تعیش مثلاً نفیس پوشاک، زیورات عورتوں، گھوڑوں اور کثیر التعداد خدمتگاروں پر صرف کرتے ہیں اور جو کچھ بچتا ہے اس کو جمع کرتے ہیں لیکن مغربی اعتبار سے وہ "آسایش" کے مفہوم سے بالکل نابلد ہیں۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ وہ ایسی خانگی زندگی بسر کرتے ہیں جس کو مغرب کا مزدور بھی نظرِ حقارت سے دیکھتا ہے[1]۔

مگر آج مشرق بھی "آسایش" سے واقف ہوتا جاتا ہے اور بڑا چھوٹا اس کو خوب پسند کرتا ہے۔ وہ

---

[1] آسایش اور تعیش کے مقابلہ کے لیے ملاحظہ ہو سر بفیلڈ فسلر کا مضمون "مشرق و مغرب اختلافات کا مطالعہ"، جو نومبر ۱۹ء میں "انیسویں صدی اور مابعد" میں شائع ہوا (مصنف)

سبے شمار اشیا، جن کی بدولت ہماری زندگی سہل اور خوشگوار معلوم ہوتی ہے یعنی لمپ، بجلی کی روشنی، سینے کی مشین، گھڑیاں، شراب[1]، چھتریاں، حفظان صحت کی کلیں اور ہزارہا دیگر اشیا جو کم و بیش ہماری زندگی کے روزمرہ میں ہیں مشرقیوں کے لئے خوش کن ایجادات ہیں جو نہایت دلکش ہیں۔ وہ ان کو طلب کرتا ہے اور روز افزوں تعداد میں خریدتا ہے. لیکن اِس سے بعض نہایت اہم پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی خانگی کفایت شعاری ابتر ہو جاتی ہے۔ ان تمام اشیاء کی جدید ضروریات کے آغاز سے معیار معیشت بہت بلند ہو جائیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس صرف کے لیے

---

[1] مغربی تمدن میں شراب فی الحقیقت سامان معیشت میں شمار کی جاتی ہے باایں ہمہ اس کے نقائص اور عیوب کے متعلق اور عام طور پر یورپی اقوام میں خود بہت بڑی تحریک جاری ہے اور امریکہ نے شراب فروشی کی ممانعت کر دی ہے الحمد للہ کہ ترکوں نے بھی اس ام الخبائث کے متعلق سختی سے ممانعت قایم کر دی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے ابتدا ہی سے اس کی بابت سخت نواہی جاری کیے اور یہی ایک ایسا مذہب ہے کہ جو شراب خواری کے دور کرنے میں سب سے زیادہ کامیاب رہا۔ افسوس ہے اُن مسلمانوں پر جو اپنے مذہب کی سچی اور نفع بخش تعلیم سے انحراف کرکے مغربی تمدن کے

روپیہ کہاں سے آئے۔ اگر وہ غریب ہے تو اس کو اپنی ضروریات زندگی میں کمی کرنا پڑتی ہے اگر وہ متمول ہو تو اپنے موروثی تعیش کو ترک کرنا پسند نہیں کرتا نتیجہ یہ ہے کہ مصارف بالعموم بڑھتے جاتے ہیں ۔

بقیہ نوٹ صفحہ ماقبل | اتباع میں اس ذلیل شے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ (مترجم)

ان مصارف بیجا کا یہی نتیجہ ہے کہ آج ہم بے سرو سامانی اور پریشانی میں مبتلا ہیں اور ہر قسم کے اعمال قبیحہ کی طرف متوجہ ہیں اگر در اصل دیکھا جائے تو اسراف ہی کی بدولت ہندوستان میں رشوت ستانی کا یہ زور شور ہے۔ کم درجہ کے اہلکاروں اور منصب داروں نے تو اس کو شیر مادر سمجھ کر حق کے نام سے موسوم کیا ہے۔ علاوہ بریں وہ عہدہ داران جو ذی مرتبت ہیں محض مصارف کی بدولت اس فعل شنیعہ کے مرتکب ہوئے ہیں قیامت ہے کہ یہ عہدہ داران اپنے سے کم حیثیت اشخاص سے ایسی رقمیں وصول کر لیتے ہیں جس کی ادائگی ان پر نہایت شاق گزرتی ہے۔ ان لوگوں کو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ یہ بیچارہ کاشتکار یا کم حیثیت زمیندار یا اہل معاملہ جو ہم سے بھی کم ذرائع آمدنی رکھتا ہے کس طرح سے ایسی رقوم ادا کرتا ہے۔ جب ہماری بیش قرار تنخواہیں ہمارے مصارف کو کافی نہیں ہوتیں تو یہ بے بضاعت شخص ہم کو کہاں سے دے سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ان اشخاص کو چواس حرام خواری کے عادی ہو گئے ہیں یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ ہم اپنے ہی

ان سب باتوں پر طرّہ یہ ہے کہ کل دُنیا کی طرح مشرق میں بھی ضروریات زندگی یعنی خورو نوش، ملبوسات، ہیزم سوختنی، رہایش کا صرف گزشتہ دو قرن میں بہت بڑھ گیا ہے۔ ہم اس کو محسوس کر سکتے ہیں کہ مشرق معیار معیشت کے گراں ہو جانے میں کیا کیا مشکلات متضمن ہیں۔[1]

امر یقینی یہ ہے کہ تنازع للبقار اور اسی نسبت سے ہمہ گیر افلاس کا دباؤ روز بروز سخت تر ہو رہا ہے۔ ضروریات زندگی کے گراں ہو جانے اور بہت سے اون اشیار کی ضروریات زندگی میں داخل ہو جانے سے جو قبل ازیں سامان عیش سمجھی جاتی تھیں یا ایک پشت قبل نامعلوم تھیں مشرقی کاشتکار

بقیہ نوٹ صفحہ قبل | بھائیوں پر ظلم کر کے مبتلائے بلا اور ملک کی فلاکت کو المضاعف کر رہے ہیں۔ میرا مقصد ہرگز اس سے یہ نہیں ہے کہ کل عمال و منصب دار اس مرض میں مبتلا ہیں بلکہ محض اُن حضرات سے روئے سخن ہے جو اس بد اعمالی میں مبتلا ہیں۔ (مترجم)

[1] مشرق میں گرانی صرف معیشت کے لیے ملاحظہ ہو چہ ول کی کتاب ہندوستانی شورش، ص ا و ۳ فشر کی کتاب "ہندوستان کا خاموش انقلاب" ص ۴۶ لغایت ۶۰ ٹی ٹرویمس کا مضمون "ہندوستان میں گرانی قیمت کی تحقیقات۔ جو دسمبر ۱۸۶۵ء کے اکنامک جنرل میں شایع ہوا۔

یا شہری مزدور کو بسر اوقات یوماً فیوماً مشکل ہوتی جاتی ہے چنانچہ ایک مصنف نے اس کو خوب بیان کیا ہے "ان تبدیل شدہ اقتصادی حالات سے اِس وقت تک تکمیل حوائج کی قابلیت پیدا نہیں ہوئی مصارف معیشت، ذرائع آمدنی کے مقابلہ میں زیادہ سرعت سے بڑھ رہے ہیں"[1]

جن اقتصادی اور معاشرتی مصائب سے آج مشرق گزر رہا ہے ان کے بڑے وجوہ میں سے ایک وجہ زیادتی آبادی کا مسئلہ ہے گو یہ وجہ کافی طور پر تسلیم نہیں کی جاتی ہے۔ مشرقی اقوام کی افزائش

---

[1] ملاحظہ ہوا یل بر تران کی کتاب مذکور الصدر صفحات ۱۴۵ لغایت ۱۴۷ + جے شیلی کی کتاب برٹش انڈیا کے مسائل حکومت صفحات ۱۳۸ و ۱۳۹۔ مغربی مصنوعات پر مزید اخراجات کے لیے ملاحظہ ہو اے جے براؤن کا مضمون "ایشیا میں اقتصادی تبدیلیاں" جو مارچ ۱۹۰۲ء کے رسالہ دی سنچوری میں شایع ہوا + جے پی جونس کا مضمون "ہندوستان کی موجودہ حالت" جو جولائی ۱۹۱۰ء کے رسالہ جنرل آف ریس ڈویلپمنٹ میں شایع ہوا + آر۔ مکرجی کی کتاب "ہندوستانی اقتصادیات کی بنیادیں" صفحہ ۵ (مصنف)

نسل کی تیزی ہمیشہ سے ضرب المثل ہے۔ اور
یہ محض خواہش نفسانی کی زیادتی پر مبنی نہیں ہے
بلکہ اقتصادی وجوہ کے باعث ہے۔ مثلاً عورتوں
اور بچوں سے سخت نفع اوٹھانا اور غالباً اس کے
سب سے بڑے باعث وہ مذہبی اوامر ہیں جو کم
سنی کی شادیاں اور بہت سے لڑکوں کے پیدا
ہونے کا حکم دیتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ مشرق کی
آبادی ہمیشہ ایسی رہی ہے جو معاش کے حدود
میں بہ مشکل سما سکتی ہے۔ مگر ماضی میں یہ زیادتی
خود بخود ایسے اجزا سے کم ہو جاتی تھی جیسے جنگ
بدنظمی، وبا اور قحط۔ جن کی وجہ سے اس قدر کثیر التعداد
اشخاص کم ہو جاتے تھے کہ شرح پیدایش کی زیادتی
کے باوجود آبادی ہمیشہ ایک ہی سطح پر رہتی تھی۔ مشرقی
زندگی کے دیگر مناظر کی طرح یہاں بھی مغربی
اثرات نے حالت کو بالکل بدل دیا ہے۔ بلاد مشرقی
میں یورپی سیاسی تسلط کی وسعت نے اندرونی
فسادات کو مسدود کر دیا حکومتی خرابیاں
بیماریاں اور قحط کے آثار کم ہو گئے۔ یا یوں کہنا
چاہیئے کہ وہ قدرتی موانع جو پہلے آبادی کو بڑھنے
نہ دیتے تھے اب معدوم یا کم ہو گئے ہیں۔ حفاظتِ
جان کی مغربی سرگرمیوں کی بدولت

بڑی شرح اموات بھی جو مشرقی آبادیوں کو زائد از ضرورت تضعیف سے مانع تھی، گھٹکر ایسا تناسب حاصل کر رہی ہے جو مغربی اقوام کے اوسط اموات کے مقابلہ کی ہے۔ لیکن مشرق کی زائد از ضرورت شرح پیدائیش کو کم کرنا چیز دیگر ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ شرح پیدائیش بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرق کے اون حصص میں جو مغربی سیاسی تسلط میں ہیں آبادی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ فی الواقع ان مشرقی ممالک نے بھی، جو اس وقت تک خود مختار ہیں مغربی حفاظت جان کی تدابیر کو اختیار کرلیا ہے۔ اور وہاں بھی آبادی میں تیزی سے کم و بیش اضافہ ہو رہا ہے۔

زائد از ضرورت آبادی کا مسئلہ ہندوستان میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ ایک صدی سے ہندوستان کا بڑا حصہ برطانوی تسلط میں ہے۔ ایک صدی قبل بھی ہندوستان کی آبادی گنجان تھی لیکن ان سو سال میں آبادی بڑھ کر دوچند یا سہ چند ہو گئی ہے[۵]۔ بلاشبہ ایسے عناصر جیسے ترقی یافتہ کاشت، آبپاشی، ریلیں اور جدید صنعت و حرفت کے اجرا نے ہندوستان کو اس قابل کر دیا کہ وہ برطانوی فتح کے وقت جس قدر آبادی کی پرورش کرسکتا تھا اس سے بہت زیادہ اشخاص کی پرورش کرسکے۔ لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ آبادی میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اس مسئلہ کے تقریباً کل واقف کار اس امر پر متفق ہیں۔ چالیس سال ہوئے ڈیوک آف آرگایل

---

[۵] اونیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستانی آبادی کا تخمینہ غالباً دس کروڑ کیا جاتا تھا اور ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے بموجب آبادی اکتیس کروڑ پچاس لاکھ ہے۔ مصنف

نے بیان کیا تھا وہ جہاں نہ کوئی ذخیرہ ہے نہ سامان ہے، نہ دولت، جہاں کے لوگ سال بہ سال کم خوراک پر بمشکل بسر کرتے ہیں اور جہاں باوجود ان تمام مصائب کے ایسی تیزی سے افزائش نسل ہو کر المضاعف ہو جاتے ہیں۔ وہاں ہم اس امر کا کم از کم مشاہدہ کرتے ہیں کہ افزائش کی یہ قوت و طاقت آسائش تو درکنار حفاظت کی بھی شاہد نہیں، گزشتہ صدی کے ختم پر سر ولیم ہنٹر نے آبادی کو ہندوستان کا "اصلی مسئلہ" قرار دے کر یہ بیان کیا کہ "ہندوستان میں مہذب حکومت کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ملک کے غذا پیدا کرنے کی طاقت پر ایسا بار پڑا ہے کہ سابق میں کبھی نہ پڑا تھا۔ ہندوستانی اعداد و شمار سے یہ امر بدیہی ہو گیا ہے کہ ایشیائی ممالک میں آبادی کے قدیم ظالمانہ موانع کا رفع ہونا ایشیائی اقوام کے لیے کسی نہج پر خالص نعمت ہی نعمت نہیں ہے[1]۔"

ہندوستان کے افلاس کی بابت لارڈ کرومر لکھتے ہیں "وہ محض رفاہ عام کے کاموں سے دور نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ امر یقیناً قطعی ہے کہ رفاہ عام کے کام خرابی کو بڑھا رہے ہیں۔ اگرچہ ایسا کہنا بے رحمی اور بعید از عقل معلوم ہوتا ہے اکبر اور شاہجہاں کے زمانے میں ہیضہ، قحط اور اندرونی فسادات آبادی کو بڑھنے سے روک دیتے تھے۔ صرف قابل ترین اشخاص ہی زندہ رہتے تھے اب خانہ جنگیاں ممنوع ہیں۔ اور فلاح خلائق کے طالبان بیچ میں پڑ کر یہ کہتے ہیں کہ اگر علوم، مغربی مہارت اور استعداد بچا سکتی ہے تو ایک

---

[1] مسٹر ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر کی کتاب "دو ملکہ کے عہد کا ہندوستان اور دیگر مضامین" مطبوعہ لندن ۱۹۰۳ء ص ۲۲۔ مصنف

جان بھی ضایع نہ جائے گی۔ نتیجہ یہ کہ آبادی نہایت گنجان ہو گئی ہے۔ اور اس میں سے بے شمار اشخاص محض قوت لایموت پر بسر کرتے ہیں۔ اس واقعہ کا کامل احساس ضروری ہے کہ مشرق کے مطیع عوام پر حکومت کرنے کی سب سے بڑی مشکلات اچھی اور ہمدرد حکومت کی بدولت پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن اس احساس سے اکثر تجاہل برتا جاتا ہے[۵۱]"

اس سوال کے جواب میں کہ ترقی یافتہ خارجی حالات سے ہندوستان میں خوش حالی کیوں نہ پیدا ہوئی؟ ولیم آرچر نے اس معاملہ کو خوب بیان کیا ہے "میری رائے میں اس کی وجہ بالکل صاف ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اچھی حکومت کے نفعے کم از کم جزواً بیکار ہو جاتے ہیں۔ جبکہ اشخاص اچھی حکومت سے نفع اُٹھا کر نہ تو دولت جمع کرتے ہیں اور نہ اپنے معیارِ معیشت کو بلند کرتے ہیں۔ بلکہ افزایش نسل کو اس حد تک پہونچاتے ہیں کہ آمدنی خرچ کو بمشکل کافی ہوتی ہے۔ ہنری جارج کہا کرتا تھا جو مُنہ پیدا ہوا وہ اپنے ساتھ دو ہاتھ بھی لایا ہے۔ اگرچہ یہ علم ترکیب اجسام حیوانی کا مسئلہ مسلمہ ہے لیکن اس سے جو اقتصادی نتیجہ منتصور ہے وہ اس وقت تک صحیح ثابت نہ ہوگا جب تک کہ ان دونوں ہاتھوں کو کسی نفع بخش کام میں استعمال کرنے کا موقع بھی نہ موجود ہو۔ اگر غذا کے مقابلہ میں کھانے والوں میں اضافہ زیادہ ہو تو زیادہ افلاس پھیلے گا[۵۲]"

---

[۵۱] کرومر کا مضمون "یوروپ اور ایشیا میں حکومتوں کے بعض مسایل" جو مئی ۱۹۱۳ء "دی نائن ٹینتھ سینچوری اینڈ آفٹر" (انیسویں صدی اور مابعد) میں شایع ہوا۔ مصنف

[۵۲] آرچر کی کتاب "ہندوستان اور اس کا مستقبل" مطبوعہ لندن ص ۱۵۷ و ۱۶۲۔ مصنف

اس حالت کا سب سے بڑا پہلو یہ ہے کہ بدقسمتی سے بہت کم مشرقی اصحاب فکر اس کو محسوس کرتے ہیں کہ مشرق کے افلاس کا بڑا باعث آبادی کی زیادتی ہے۔ بلااستثنیٰ اس سب کا الزام سیاسی عناصر بالخصوص مغربی سیاسی تسلط کے ذمہ لگایا جاتا ہے۔ فی الواقع میرے علم میں ایک ہی مثال ہے کہ جس میں کسی مشرقی بافکر نے اس مسئلہ کی نہایت دلیری سے وضاحت اور انسداد نسل کی وکالت کی ہے۔ یہ کتاب جس کا نام "مسئلہ آبادی ہندوستان" ہے پانچ سال ہوئے۔ پی۔ کے واٹل۔ نے شائع کی جو ہندوستانی محکمہ مالیات میں ایک دیسی افسر ہیں اور ان کی یہ کتاب جو اپنی نوعیت کی پہلی ہے اس قابلیت سے لکھی گئی ہے کہ اس پر خاص توجہ کی جائے۔ اور اس لحاظ سے کہ اس سے مشرقیوں کی زیادہ بیداری کی روشس کا اظہار ہوتا ہے نمایاں اہمیت رکھتی ہے۔

اس کتاب کے آغاز میں مسٹر واٹل اپنے ابناء وطن سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس مسئلہ پر بغیر تعصب کے عقلاً غور کریں۔ وہ کہتے ہیں "اس مضمون کو یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ یہ ہمارے ملک کی روحانی تہذیب پر حملہ یا مغربی مادیت کی دیگر طور پر مدح سرائی ہے میرا منشا اس سے یہ ہے کہ ہم اس خاص مسئلہ حیات یعنی اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے نفس معاملہ پر غور کریں۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ ہم غریب قوم ہیں۔ ہمارا افلاس غالباً بہت سے وجوہات کی بدولت

لہ پی۔ کے۔ واٹل ہندوستان کے محکمہ مالیات میں اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل (مددگار صدر محاسب) ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۱۶ء میں بمقام بمبئی طبع ہوئی۔ مصنف

ہے۔لیکن ہم میں سے ہر شخص سے میرا یہ سوال ہے کہ آیا اس کو اپنی زندگی کے کسی اہم ترین موقعہ پر ایک بڑے خاندان کی پرورش ہی حارج نہیں آئی ہے۔ اور آیا اس کفالت کی بدولت ترقی کے ان مواقع پر جو ابتدائی استعداد و اہلیت اور غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے حاصل تھے اثر نہ پڑا ہو۔ اس سوال پر فی نفسہ غور کرنا چاہیے۔ یہ ایک جسمانی واقعہ ہے اور اس کو سیاسی ماحول اور مذہبی حلت و حرمت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر ہم کو اس غلطی سے نقصان پہونچا ہو تو کیا یہ ہمارا فرض نہیں ہے کہ اس کی خرابیوں کو حتی الامکان رفع کیا جائے۔ افلاس سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں ہے۔ یہ بات میں روحانیت کا اپنے دل میں پورا احترام رکھ کر کہتا ہوں۔ متاہل زندگی میں احتیاط کی بابت جو زور اِن صفحات میں دیا گیا ہے، وہ سرزنش کے خیال سے نہیں ہے۔ کثیر عیال داری سے جو مصائب پیدا ہوتے ہیں اس کو محسوس کرکے اور اس ملک میں کثیر التعداد شرفار کی مشکلات سے متاثر ہو کر میں نے یہ جراءت کی ہے کہ اس سانحہ کو صاف صاف بیان کر دوں جو ہر نوجوان پر گزرتا ہے لیکن اس کو اس طور پر بیان کرنے کی پرواہ نہیں کرتا کہ اس خرابی کا سدباب ہو جائے[1]،،

مسٹر واٹل اپنے قارئین سے عقل کو کام میں لانے

---

[1] واٹل ص ۱ لغایۃ ۳ ۔ مصنّف

کی درخواست کے بعد اپنے اصل بحث کی توضیح کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں زیادتی آبادی کی پہلی وجہ کمسنی کی شادیاں ہیں۔ برخلاف مغربی ممالک کے جہاں آبادی کو دانشمندانہ شادیوں اور انسداد پیدایش سے کم کیا جاتا ہے۔

"ہنود کے لیے شادی ایک مقدس فرض ہے جس کا ادا کرنا بلا اس لحاظ کے ضروری ہے کہ آیا فریقین ازدواجی زندگی کی ذمہ داریاں برداشت کرنے کے قابل ہیں یا نہیں۔ ہر ہندو مرد کو شادی کرنا اور اولاد یا یوں کہو لڑکے پیدا کرنا لازمی ہے تاکہ وہ اوس کی کریہ کرم کریں ورنہ اس کی آتما دنیا کے ویرانوں میں ماری ماری پھرے گی۔ لڑکے کے لفظ یعنی "پتر" کے معنے یہ ہیں کہ وہ جو اپنے باپ کی آتما کو اس دوزخ سے جس کا نام "پت" ہے۔ بچائے۔ ایک ہندو دوشیزہ جو سن بلوغ کے وقت بن بیاہی ہو اپنے خاندان کی بدنامی اور اپنے اجداد کے عذاب کا باعث ہے۔ مسلمانوں میں بھی (اگرچہ وہ ایسے سزا و جزا کے احکام سے مقید نہیں) ازدواجی حالت کچھ تو ہنود کے اختلاط تمدن اور کچھ ابتدائی معاشرت کے عام حالات کی وجہ سے جہاں کہ بیوی خانہ داری کی دیکھ بھال اور کاشتکاری میں امداد کے لحاظ سے لازمی ہے، اسی قدر عام ہے"[۱]

---

[۱] واٹل ص ۲ مصنّف

اس معاملہ کی بدترین صورت یہ ہے کہ مصلحین کی ساعی کے برخلاف کم سنی کی شادیوں میں زیادتی ہو رہی ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری سے معلوم ہوا کہ سنہ ۱۹۰۱ء لغایت سنہ ۱۹۱۰ء کے عرصہ میں بیاہی عورتوں کی تعداد فی ہزار پانچ سال کی عمر تک ۱۳ سے ۱۴ ہو گئی اور پانچ لغایت دس سال کی عمر والیوں کی تعداد (۱۰۲) سے (۱۰۵) اور (۱۰) لغایت (۱۵) سال والیوں کی ۲۲۳ سے ۳۰ - ۴۳ - اور ۱۵ لغایت ۲۰ سال والیوں کی ۷۷۰ سے ۸۰۰ ہو گئی یا یوں کہنا چاہیئے کہ سنہ ۱۹۱۱ء میں ہر ہزار ہندوستانی عورتوں میں سے ½ کی شادی دس سال کی عمر سے پہلے ہو گئی۔ پندرہ سال کی عمر سے پہلے ½ کی اور بیس سال سے پہلے ⅘ کی[1]۔

اس سب کا یہ نتیجہ ہے کہ شرح پیدائش میں عظیم افزایش ہے لیکن یہ کوئی امر قابل مبارکباد نہیں ہے۔ ہم نے اپنے شرح اموات میں زیادتی اور اور اس کے انسداد کی تدابیر کی بابت اکثر ذکر سنا ہے لیکن کیا اس کا یقین واثق ہو سکتا ہے کہ

---

[1] مذکورہ بالا ص ۱۴ - مصنّف

اگر ہماری شرح اموات انگلستان یا اسکاٹلینڈ کی برابر ہو جائے تو ہم موجودہ شرح پیدایش یعنی ۳۰ فی ہزار کو اِسی طرح قایم رکھ سکتے ہیں۔ ہم اس سے زیادہ اشخاص کو عالم وجود میں لاتے ہیں جن کی بخوبی پرورش ہوسکتی ہے۔ اور اسی کا خمیازہ ہم بھگت رہے ہیں۔ لہٰذا اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس ملک میں شرح اموات کم ہو جائے تو ہم کو شرح پیدایش بھی ان ممالک کی طرح کم کرنا چاہیے جہاں شرح اموات کم ہیں لہٰذا ہماری شرح پیدایش کی زیادتی ہی معاشرتی خطرہ ہے۔ اور شرح اموات کی زیادتی اگرچہ افسوسناک ہے لیکن ہماری شرح پیدایش کی زیادتی کا لوازمہ ہے[1]"

مسٹر واٹل اس کے بعد ہندوستان کی شرح اموات کے افسوسناک مدات کو بیان کرتے ہیں۔ یعنی عورتوں کی موتیں جو زیادہ تر کم عمری میں بچہ ہونے کی وجہ سے ہوتی ہیں اور سب سے زیادہ خطرناک بچوں کی موتیں جن میں سے ۵۰ فی صدی قبل از وقت پیدائش یا پیدائشی کمزوری کی وجہ سے مرتے ہیں۔ یہ کم سنی اور ہر کس و ناکس کی شادی کے لازمی نتائج ہیں کیونکہ ہندوستان میں "ہر کس و ناکس شادی کرتا ہے اور کم سے کم عمر میں جبکہ فطرت اس کی اجازت دیتی ہے صاحب اولاد ہو جاتا ہے" یہ عمل نہایت ہی مضر صحت ہے۔ یہ نسلی صفات کو کمتر اور قوت کو زایل کر رہا ہے۔ یہ آبادی کی پست عنصر ہے یعنی

---

[1] مذکورہ صدر صفحہ ۱۴ - مصنف

کالے رنگ کے اصلی باشندوں کے قبائل اور پسماندہ یعنی کو ذات ہی ہیں۔ جن کی تعداد بہت زیادہ ہو رہی ہے۔ کل آبادی کی قوت حیات میں بھی تنزل معلوم ہوتا ہے۔ مردم شماری کے اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ بوڑھوں کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ اور اوسط عمر بھی جس کی امید پر دیے اعداد ہو سکتی ہے کم ہو رہا ہے۔ رنیز اس نسل کو زندگی کے آغاز کرنے میں سخت دقتیں ہیں۔ اور عمر دراز تک زندہ رہنے کے مواقع پیشتر یعنی ۳۰ یا ۴۰ سال قبل کے مقابلہ میں بہت کم ہیں۔ کیا ہم نے کبھی اس پر غور کیا ہے۔ کہ اس کا کل قوم کی حیات پر اثر پڑنے سے ہمارا کیا حال ہوگا؟ اس کا منشا یہ ہے کہ وہ اشخاص جو اپنے تجربہ اور دانشمندی کی وجہ سے ملک کی مختلف پبلک جدوجہد میں سردار ہونے کے قابل تھے۔ ان کو موت ہم سے چھین لیتی ہے۔ اور یہ کہ سرداری اور رہنمائی جو ممالک مغربی میں معمر اور تجربہ کار اشخاص کا حصّہ ہے۔ ہندوستان میں نوعمر اور ایسے لوگوں کو ملتی ہے جو کم قابل اعتبار ہوں[1]؟

اپنے ہموطنوں کو اس سے متنبہ کرنے کے بعدکہ نہ تو زراعت کے ترقی یافتہ طریقے نہ صنعت وحرفت کی افزونی نہ ترک وطن فی الحقیقت آبادی کے اُس روزافزوں بار کو کم کر سکتے ہیں جو وسائل معیشت پر پڑ رہا ہے۔ وہ چند مبہد افزا آثار کا ذکر کرتے ہیں یعنی مذہب و رسوم کے اثر کے باوجود نزاکت موقع کا احساس ہونے

---

[1] مذکورہ صدر ص ۱۹ لغایتہ ۲۱ مصنفؔ

لگا ہے اور ہندوستان کے بعض حصص میں پیدائش کو کم کرنے کے آثار پائے جاتے ہیں۔ مثلاً سنہ ۱۹۱۰ء کی مردم شماری کی رپورٹ میں بنگال کی شرح پیدائش میں جو خفیف کمی ہوئی تھی اس کی سرکاری طور پر جو وجہ بیان کی گئی ہے اس کو نقل کیا ہے:
"شادی کی عمر کو تبدیل کرنا ہی تنہا وجہ اس کمی شرح پیدائش کی نہیں ہو سکتی۔ دیدہ دانستہ تولید و تناسل کو روکنا بھی اس کا جزو اگر ذمہ دار ہے۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ آسام کے باغات چائے کے قلی ایسے ذرائع استعمال کرتے ہیں جن سے استقرار حمل نہ ہو اور اگر ہو تو اسقاط ہو جائے۔ اور آسام کے کمشنر حفظان صحت کی سنہ ۱۹۱۳ء کی رپورٹ میں بیان کیا گیا ہے کہ ناقص شرح پیدائش کا اہم سبب دیدہ و دانستہ پیدائش کو روکنا معلوم ہوتا ہے[1]"

مگر شرح پیدائش میں روک تھام کی یہ شروعات بالکل مقامی اور جزوی ہیں اور ان سے ہندوستان کی روز افزوں آبادی کی کثرت میں کوئی فوری فائدہ نہیں ہو سکتا ہے۔ نزاکت موقع کے مزید احساس اور فوری عمل کی ضرورت ہے۔ نتیجہ ناگزیر ہے۔ ہم اس وبا سے جو ہماری معاشرت میں پھیلی ہوئی ہے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ بیل گاڑی کے ملک میں موٹریں چل رہی ہیں۔ اب مغرب کی زیادہ ترقی یافتہ اقوام سے مقابلہ ہے

---

[1] ڈاٹل کی کتاب مذکورہ ص ۲۸ مصنف

اور جس طرح دیو جانس نے اسکندر سے کہا تھا کہ "میری دھوپ چھوڑ کر کھڑے ہو"، ہم ان سے نہیں کہہ سکتے۔ اس عظیم معاملہ عالم کے بعد بعد آبادی کے نظریات پر نظر ثانی کی جائیگی اور ممکن ہے کہ کمسنی کی شادیوں اور کثیر العیالی کو مستحسن سمجھا جائے۔ لیکن اس سے

اولاً ہمارے خاص مسئلہ آبادی حل نہ ہوگا

دویم یہ کہ ردعمل صرف عارضی ہوگا

قانون آبادی کے عمل میں روک تھام ہو سکتی ہے لیکن اس عمل سے کوئی مفر نہیں ہے[1]

یہ عجیب و غریب رسالہ اس طور پر ختم ہوتا ہے مزید براں ہم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ خواہ زیادتی آبادی سے ہندوستان سخت ترین مصائب میں مبتلا ہو لیکن حالات کل مشرق میں اصلاً یکساں ہیں۔ ہر جگہ دانشمندانہ قیود اور پیدائش میں معقول روک تھام بالکل ہی مفقود ہیں۔ اس بات کو پیش نظر رکھکے کہ زیادتی آبادی کے علاوہ دیگر اقتصادی و معاشرتی خرابیاں ہیں جن پر بحث پہلے ہو چکی ہے تو ہمیں یہ دیکھکر تعجب نہیں ہوتا کہ کل مشرقی ممالک سخت افلاس اور معاشرتی ذلت کا شکار ہیں۔[2]

---

[1] واٹل مذکور الصدر صفحہ ۷۸ مصنفؔ۔

[2] مشرق ادنےٰ کی حالت کے لئے ملاحظہ ہو برتراند کی کتاب ۱۱۰ و ۱۲۴ و ۱۲۵ لغایتہ ۱۲۸ مصنفؔ

دیہاتی اور شہری عوام دونوں قوت لایموت پر گذر کرتے ہیں۔ مصری فلاحین کی حالت برطانوی ماہر سیاسیات بریلیسفورڈ یوں بیان کرتا ہے "مواضعات میں ایسا افلاس نمایاں تھا جو میں نے پرنظم مقدونیہ کے پہاڑوں اور ڈونیگل[1] کے دلدلوں میں بھی کبھی نہ دیکھا تھا...... مواضعات کچھے جھونپڑوں کے گندے محلے ہیں جن میں نہ کوئی درخت ہے نہ پھول۔ نہ باغ۔ ان جھونپڑوں میں نہ تو کوئی کھڑکی نہ مسطح فرش۔ یہ بجنتہ مٹی کے چھوٹے چھوٹے زندان ہیں۔ ان میں معمولاً دو کمرے ہوتے ہیں جن میں نہ کوئی سفیدی ہوتی ہے اور نہ فرش۔ جن جھونپڑیوں میں داخل ہوا ان میں کوئی سامان نظر نہ آیا۔ محض کھانا پکانے کے چند برتن اور سونے کی ایک چٹائی اور ایک مٹی کی کوٹھی تھی جس میں خاص غذا یعنی جوار رکھی ہوئی تھی[2]"۔ ایک برطانوی افسر حفظان صحت غریب ترہندوستانی کسانوں کی طرز معاشرت کی یوں تصویر کھینچتا ہے "ضرورت یہ ہے کہ ان گھروں کی اندرونی حالت بھی اصلاً دیکھی جاوے جن میں ایک خاندان ایک ہی کوٹھری میں مجبوراً رہتا ہے جس کی دیواریں اور فرش دونوں کچے

---

[1] ڈونیگل۔ ائرلینڈ میں السٹر کی ایک کاونٹی ہے۔ اس کا ساحل بالکل ویران اور کوہستانی ہے اکثر سمندر کا پانی بڑے حصہ پر سے گذر جاتا ہے۔ مترجم

[2] انیچ۔ این بریلسفورڈ کی کتاب "طلا و آہن کی جنگ" صفحات ۱۱۲ و ۱۱۳۔ نیز ملاخطہ ہو ٹی۔ ر انعکاس کی کتاب "تباہی مصر" صفحات ۹۰ و ۱۰۵ مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۰ع مسٹر ڈبلیو۔ ڈبلیو رمیز ہے کا مضمون "اناطولیہ کے ترکی کاشتکار" جو جنوری سنہ ۱۹۱۸ع کے کوارٹرلی ریویو میں شایع ہوا۔ مصنف

ہیں۔ان کے صحن بھی تنگ ہیں جو کوڑے سے پٹے ہوتے ہیں اور جن میں اکثر مویشی بندھے ہوتے ہیں۔ ان کے چاہات میں ایسی غلیظ سطح کا پانی سرایت کرتا ہے۔اور یہ خاندان بے ترتیب گھروں میں ٹھسے رہتے ہیں اور ان گھروں کے مجموعہ کا نام قصبہ یا شہر رکھ لیا جاتا ہے

شہروں میں دیہات سے بھی بدتر حالت ہے اور مشرق کے غلیظ محلے مغرب کے غلیظ محلوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ فرانسیسی ماہر سیاسیات لوئی بر تراند لیوانٹ کے بڑے شہروں مثلاً قسطنطنیہ و قاہرہ وبیت المقدس کے غربا کے محلوں کی کریہہ تصویر کھینچتا ہے ہم اس کے تکلیف دہ تفاصیل کو چھوڑ کر قاہرہ کے مکانات کا بیان ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

"مصر کے دیگر حصص کی طرح قاہرہ میں بھی غربا کے محلوں کی تباہی اور گندگی غالباً مشرق کے دیگر ممالک سے بھی بڑھکر اندوہناک ہے عموماً تین تاریک اور بند کمروں کے سامنے ایک دالان ہوتا ہے جو خود بھی تاریک ہوتا ہے چھت اور دیواروں کے کرم خوردہ دھنیوں سے چونہ چھوٹ چھوٹکر برابر غلیظ فرش پر گرتا ہے۔ بوریا اور بستر جوؤں سے پٹا ہوتا ہے"[۲]

ہندوستان کی بھی وہی حالت ہے۔ فشر کہتے ہیں۔ "کارخانوں کی ترقی شروع ہونیسے قبل ہی ہندوستان کے شہروں میں قلت مکانات کا مایوس کن مسئلہ پیش ہوگیا۔ یہ بڑے صنعتی کارخانے اپنے ہزاروں مزدوروں کو ایک مشرقی شہر کی

---

[۱] ڈاکٹر ڈاس۔ راس کا مضمون "سیاسی شورش کا باعث فلاکت ہے" جو ۱۰ فروری ۱۹۱۱ء کے دی ہیرو سے میں شایع ہوا۔ مصنف

[۲] بر تراند مذکور الصدر ص ۱۱۱ و ۱۱۲ مصنف

پیچیدہ ارگلیوں اور مضر صحت آب وہوا کے شور وشغب میں ٹھونس رہے ہیں۔ صبح تڑکے سے اندھیرا ہونیکے بعد تک کام کرنے کے بعد مرد وعورت ایسے تھک جاتے ہیں کہ حتی المقدور تو وہ سونے کے لئے اپنے کارخانے سے دور جانا پسند نہیں کرتے جب قریب کے مکانات ایسے بھر جاتے ہیں کہ دم خفا ہونے لگتا ہو تو وہ سڑکوں پر رہنا اور سونا شروع کر دیتے ہیں۔ بیس سال ہوئے کلکتہ کے ان حصص میں جہاں مکانات بہت گنجان ہیں زمین کی قیمت دو لاکھ ڈالر فی ایکڑ ہوگئی تھی[1]" ایک مغربی اہل قلم کا بیان ہے کہ "کلکتہ تو مشرق کے لئے بھی باعث شرم ہے پیچوں کے مزدور اور جہازوں کے قلی غریب محلوں میں رہتے گویا ہیں سوروں کی طرح بند ہوتے ہیں۔ مکانات مضر صحت تنفس سے گھٹجاتے ہیں۔ نالیاں اور صحن غلاظت سے بھر جاتے ہیں۔ چھپے سڑے ہوئے کوڑے کو سڑکوں میں کوٹ دیتے ہیں۔ گائیں ان جاہات کا پانی پیتی ہیں جن میں نالیوں کی گندگی جذب ہوتی ہے اور مطبخ کے فرش بھی ایسے ہی گندگی سے دھوئے جاتے ہیں[2]" ہندوستان کے دیگر صنعتی مراکز میں بھی عملاً حالت یکساں ہے۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں جو رپورٹ مرتب ہوئی اس میں بمبئی کے ایک دیسی افسر حفظان صحت نے کرایہ پر اٹھنے والے حصہ کی بابت لکھا تھا "ان مکانات میں جن میں بیماریوں کے جراثیم اور کیڑے پیدا ہوتے ہیں اور امراض۔ افلاس۔ خرابی اور جرائم کے مرکز ہیں ہر قسم کے اشخاص یعنی مریض اوباش، شرابی، نادار، بلا امتیاز ٹھونس دیئے گئے

---

(۱) یعنی سنہ ۱۹۱۱ء مصنفؔ

(۲) فنشر کی کتاب "ہندوستان کا خاموش انقلاب" ص ۵۱ مصنفؔ

ہیں اور ایک دوسرے سے بالکل ملے جلے رہنے کے لئے تھے۔ اکثر میں یکجا بند کر دیئے گئے ہیں ؎۱"

طرہ یہ ہے کہ شہر کے حالات بجائے بہتر ہونے کے بدتر ہوتے جاتے ہیں مکانات میں باشندوں کی زیادتی کا مسئلہ خصوصیت کے ساتھ نہایت مشکل ہوتا جاتا ہے۔ موجودہ صدی کے ابتدائی سنین میں ہندوستان کے صنعتی مراکز مثلاً کانپور۔ بمبئی۔ لکھنؤ کے مکانات میں باشندوں کی زیادتی لندن سے دگنی یا چوگنی تھی۔ جنگ گزشتہ نے مکانات کی مشکلات کو اور بھی دشوار کر دیا ہے۔ مغرب کی طرح مشرق میں بھی جنگ کی وجہ سے شہروں کی آبادی بڑھنے لگی اور صرفہ تعمیر کی بیجا گرانی کے سبب سے تعمیر کا کام بند ہو گیا۔ لہٰذا کرایہ مکانات بہت بڑھ گیا اور مالکان مکانات میں بے طرح نفع اٹھانے کی وبا پھیل گئی۔ فشر کہتا ہے کرایہ مکانات بیدخلیاں کرا کرا کے تگنے کئے گئے۔ بمبئی میں اس کے خلاف ایک عام جلسہ ہوا اور گورنمنٹ کو دخل دینے کی ضرورت پڑی اور ایسے مکانات کا جن میں دستکار اور مزدور رہتے تھے انتہائی کرایہ معین کر دیا گیا۔ مگر انتہائی کرایہ معین کر دینے سے بھی جگہ بڑھ تو نہیں جاتی"؎

مگر یہ فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ کرایہ میں زیادتی تو صرف معیشت کی اس عام گرانی کا ایک پہلو ہے جو ایک پشت سے مشرق میں عمل پیرا ہے اور ۱۹۱۴ء سے خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہو گئی ہے۔ ایک فرق

؎۱ ڈاکٹر بالچندر کرشنا ص کو عبداللہ یوسف علی نے اپنی کتاب "ہندوستان کی معاشرت اور مزدوری" میں صفحہ ۵۴ مطبوعہ لندن ۱۹۰۷ء

سے زیادہ عرصہ ہوا کہ مشرق ادنے کے متعلق برتراند نے لکھا تیو انٹ کے ایک کنارے سے دوسرے کنارہ تک قسطنطنیہ وسمرنا دمشق و بیروت اور قاہرہ میں صرفہ معیشت کی گرانی کی شکایت ایک ہی سنی اور یہ شکایت یوروپی و نیز دیسی دونوں کو ہے۔" آج اس سے بھی زیادہ مشکل درپیش ہے۔ جنگ کے آغاز سے مصر کی حالت کی بابتہ سرویلینٹائن چرول کہتے ہیں۔ اگرچہ شرح مزدوری میں بہت زیادتی ہوگئی لیکن پھر بھی ضروریات زندگی کی بے اندازہ گرانی کے قدم بقدم نہ چل سکی۔ یہ خاص طور پر شہر دیپر صادق آتا ہے۔ کیونکہ یہاں طبقات ادنے یعنی کثیر التعداد مزدور ٹھیلے والے گاڑی والے۔ دوکاندار اور دیگر قسم کے ملازمین کے لئے ایسا سخت وقت آگیا ہے کہ ان کو گزر کرنا دشوار ہے۔[۱] ان تمام پریشان حالیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ معاشرتی تنزل کے مختلف صور مثلاً شراب خواری بداعمالی اور جرائم بہت عام ہو رہے ہیں[۲]۔ آخری بات گو اہمیت کے لحاظ سے کسی سے کم نہیں یہ ہے کہ معاشرتی بے چینی اور انقلابی شورش کے آثار بڑھتے جارہے ہیں۔ اور ان پر ہم فصل مابعد میں تبصرہ کرینگے

---

[۱] سرولنٹائن چرول کا مضمون "مصر میں انگلستان کا خطرہ" جو ۱۹۱۹ء کے لنڈن ٹائمس سے ماخوذ ہے مصنف

[۲] ملاحظہ ہو برتراند او دفشر کی مذکورالصدر تصانیف مصنف

فصل نہم

(معاشرتی بے چینی اور بالشویزم)

ہر انقلاب بالخصوص فوری انقلاب اور عدم سکون کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ماضی سے ہر انقطاع میں خواہ وہ انقطاع کیسا ہی طبیعی اور لازمی کیوں نہ ہو تغیر یافتہ حالات سے موانست پیدا کرنے کی ضرورت متضمن ہوا کرتی ہے۔ جس سے موانست مطلوبہ کے پیدا ہونے تک سخت کشمکش کا عارضی احساس لازمی ہے۔ بے چینی کوئی واقعہ نادرہ نہیں ہے۔ یہ ہر انسانی جماعت میں جو کامل سکون میں مبتلا نہ ہو مضمر ہے۔ قدرے قلیل بے چینی کو آثار مرض کی بجائے صحیح و سالم نشو ونما کی علامت سمجھنا چاہیے۔ نفس الامر یہ ہے کہ بے چینی کے اقل مدارج اس نام سے ہی موسوم نہیں ہوتے۔ بلکہ طبیعی ترقی کے لوازم شمار کیے جاتے ہیں۔ فی الحقیقت معمولی حالات میں معاشرتی نظام جسم انسانی کے نظام کی طرح اپنا عمل کرتا ہے۔ اور تبدیل ہونے والے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ ہی وہ بھی برابر فنا اور پیدا ہوتا رہتا ہے۔ بعض اوقات یہ تبدیلیاں بہت بڑی ہوتی ہیں۔ لیکن ایسی تدریجی ہوتی ہیں کہ ان کا احساس تقریباً ہوتا ہی نہیں۔ ایک صحیح نظام میں جو اپنے ماحول کے کلیتاً ہم رنگ ہو قبول نقش کی صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ گردوپیش کے تغیر کو طبعاً

محسوس کرکے اس تیزی سے ان کی متابعت کرتا ہے کہ عدم مطابقت کے مضر نتائج سے محفوظ رہتا ہے۔

نئے چینی کے شدید تر اظہارات ہی مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ یہ انقلابات عظیم ماضی سے فوری انقطاع اور اُن عمیق عدم موانست کے یقینی علامات ہیں جو فوراً درست نہیں ہوتے۔ بالفاظ دیگر شدید نئے چینی معاشرتی بیماری کو ظاہر کرتی ہے اور اس سخت معارک کے امکان کا جو "انقلاب" کہلاتے ہیں، پتہ دیتی ہے۔

اسلامی مشرق کی تاریخ اس مندرجہ بالا استقرار کی بہترین مثال ہے عربی تہذیب کے تعمیری عہد کی خصوصیت تغیرات کی سرعت اور تخئیلی ہیجان کی شدت تھی "معتزلی" تحریک میں نہایت مختلف الخیال اشخاص شامل تھے۔ اور اس تحریک کے جمہوریت پسند متبعین ایسے مذہبی سیاسی اور معاشرتی اصول کے معتقد تھے جو سخت انقلابی قسم کے تھے۔ یہ انقلابی زمانہ سطحی اور مختصر تھا۔ عرب ذو رمندی اور اسلامی روح اس کے ناقابل ثابت ہوئی کہ قدیم مشرق کی عظیم مجہولیت کو مستقلاً متحرک کردے بہت جلد قدیم روایات کا پھر دور شروع ہو گیا (بالیقین یہ کچھ ترمیم ہو گئی تھیں لیکن اصلاً وہی تھیں) عربی تمدن غیر مبدل اور متحجر ہو گیا اور اس تجربت کے ساتھ ہی تغیر آفرین بےچینی فنا ہو گئی۔ کہیں کہیں جمہوری روایات محفوظ رہیں۔ اور خفیہ طور پر اندرون عرب کے خوارج اور بکتاش[1] درویشوں جیسے چند گمنام فرقوں میں منتقل ہوتی رہی ہیں۔ یہ محض سربستہ راز تھے

---

[1] اس فرقہ کے بانی اول حاجی بکتاش بتائے جاتے ہیں۔ جن کی نسبت عام خیال ہے کہ ایک ولی اللہ تھے۔ جاں نثاری فوج کا نام "ینی چری" انھیں کے فرمانے سے پڑا۔ اصلاً یہ فرقہ اول سلسلہ مشائخ میں تھا جس کا آغاز خلیفہ اول سے ہوتا ہے۔ لیکن اس فرقہ کے اصلی بانی "بلیم بابا" تھے جو ۹۲۲ھ میں فوت ہوئے۔ اس فرقہ کے عقائد میں اکثر ملحدانہ بُت پرستوں اور مشرکوں کی باتیں داخل ہو گئی ہیں

جنھیں اہمیت نہیں دی جاتی۔

مگر انیسویں صدی کے آغاز پر اسلامی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ معاشرتی بے چینی کے آثار پھر نمایاں ہونے لگے۔ وہابیت محض مذہبی خرابیوں کو مٹانا نہیں چاہتی تھی بلکہ اس زمانہ کی جماعت اسلامی کی پستی کے خلاف بھی ایک عام احتجاج تھی۔ متعدد بار یہ تحریک حکومت قائم شدہ کے خلاف بغاوت کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ اسی زمانہ میں ایسی ہی بابی تحریک جو ایران میں رونما ہوئی اس پر بھی یہی صادق آتا ہے۔[1]

بلاشبہ ان نوزائیدہ تحریکات بیداری کو بہت کچھ امداد مغربی خیالات اور اسالیب کے سیلابات سے ملی جو انیسویں صدی کے امتداد کے ساتھ روز افزوں طور پر مشرق میں نفوذ کرنے لگے۔ بلاشبہ مشرق کی تبدیلی جو منتج ہو رہی تھی اس سے زیادہ اور کیا چیز ہر قسم کی نئی بے چینی کا باعث ہو سکتی تھی۔ یہ تبدیلی ایسی فوری، اس قدر شدید اور اس حد تک مسلسل عمل متابعت کی محتاج تھی کہ ارتقائی ہونے کی بجائے اصلاً انقلابی تھی۔ ان عمیق تبدیلیوں کی تفاصیل پر جو سیاسی، مذہبی، اقتصادی اور معاشرتی تھیں ہم بحث کر چکے ہیں اور ہم اس عمیق اضطراب و تحیر اور مصائب کا بھی ذکر کر چکے ہیں جس میں اس عظیم تبدیلی کے زمانہ میں سب ہی طبقے مبتلا تھے۔

اس تبدیلی کے دور کی اصلی انقلابی نوعیت کو جس کی مثال ہندوستان میں اچھی ملتی ہے، ایک برطانوی ماہر اقتصادیات نے خوب

کہنے کو سب سنی مسلمان ہیں لیکن عام عقائد میں رجحان شیعوں نیز مسیحیوں کی طرف بھی ہے۔ (مترجم)

[1] بے چینی کے ان ابتدائی صورتوں کے لیے ملاحظہ ہو سی۔ بی۔ نتالی ایر کی کتاب "انیسویں صدی کا اسلام" صفحات ۱۶۷ تا ۲۴۴ مطبوعہ پیرس ۱۸۹۷ء (مصنف)

بیان کیا[1] ہی۔ وہ سوال کرتا ہی کہ ہندوستان کے دیہات اور شہروں میں جو تقابل ہی اوس سے زیادہ اور کیا شی مختلف الحیثیت ہو سکتی ہی؟ "ہندوستان کے دیہات ابتدائی یا ازمنہ متوسط کی حالت میں ہیں۔ ہندوستان کے شہر بالکل جدید ہیں" ہندوستان کے شہروں میں مغربی زندگی کے سب آثار یعنی بنکوں اور کارخانوں سے لیکر اشتہار شایع کرنے والے اشخاص تک جو ہم نے لندن کی نالیوں میں چھوڑے تھے ملتے ہیں۔ یہ سب دیہاتی ہندوستان کے ساتھ ساتھ موجود ہیں "اور اقتصادیات کی تاریخ میں یہ ایک عجیب واقعہ ہی کہ یہ دونوں اس طور پر پہلو بہ پہلو موجود ہوں۔ ہندوستان کی موجودہ حالت کی نظیر یوروپی اقتصادی تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتی" اگر عہد حاضرہ اور ازمنہ متوسط کے اشخاص جو بالکل ہی مختلف الخیال ہیں۔ یورپ میں یکجا کر دیئے جائیں، تو تم سمجھ سکتے ہو کہ اس کا اثر کیا ہوگا؟ یوروپ میں یہ اس وجہ سے نہیں ہوا کیونکہ "اقتصادی دنیا میں یوروپی ترقی ارتقائی ہے" یعنی یہ عمل صدیوں میں تکمیل کو پہنچا۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں یہ اقتصادی تبدیلی اپنی نوعیت کے لحاظ سے انقلابی ہی۔

دیہاتی ہندوستان کی حالت سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ ہندوستان کی اقتصادی تبدیلی کس قدر غیر ارتقائی ہی۔

"دیہاتی ہندوستان اگرچہ اپنے خصایص کے لحاظ سے زیادہ تر ابتدائی رسوم کا پابند ہی لیکن اس میں ایسے خیالات داخل ہو گئے ہیں جو قدیم

---

[1] ڈی۔ ایچ۔ ڈاڈویل کا مضمون "ہندوستان میں اقتصادی نقل و حرکت" جو دسمبر ۱۹۱۰ء کے

حالات کے سخت مخالف ہیں۔ یہ ابتدائی حالت ہیں تو ہو لیکن ایسا ہر امر میں نہیں ہے۔ رواجی مزدوری کے ساتھ ساتھ ایسی مزدوری بھی دی جاتی ہے جو مقابلہ سے معین ہوتی ہے۔ بعض وقت قیمتیں رواج کے بموجب مقرر ہوتی ہیں لیکن بعض وقت آزاد اقتصادی وجوہات سے بھی ان کا تعین ہوتا ہے۔ اوس آبادی میں سے جو اس سرزمین میں سے عمیق طور پر وابستہ ہیں کچھ اشخاص بہتر اجرت کی خواہش میں باہر چلے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اقتصادی وجوہات سے وقتاً اور جزواً اُس ملک میں مداخلت کی جس میں اخلاق ہنوز ابتدائی حالت میں ہیں۔ اگر ہم شہری ہندوستان کی طرف متوجہ ہوں تو ہم کو ایسی ہی مخالف حالت ملتی ہے۔ ... ان دونوں حالتوں میں نہ تو صحیح اختلاط ہے اور نہ مکمل نفوذ۔ فی الواقع یہ دونوں نظامات ایسے منفصل اور بعید ہیں کہ آسانی سے مجتمع نہیں ہو سکتے۔

لہذا ہندوستان کی ایک عظیم اور پیچیدہ جماعت کے کل طبقات میں اقتصادی انقلاب کی حالت موجود ہے۔ اگر یورپ میں کوئی بھی ایسا وقت تھا جو موجودہ ہندوستان سے ذرا بھی مشابہ ہو تو وہ صنعتی انقلاب کا وقت تھا۔ جس کے صدمہ سے ہم اب بھی مقابلتاً کامل طور پر مطمئن نہیں ہوئے ہیں۔ اس کو یوروپ کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیئے کہ وہ ذہنی تحریک جو انقلاب فرانس پر منتج ہوئی صنعتی انقلاب کے وقت ظاہر نہ ہوئی۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ ممکن تھا کہ یورپی معاشرت بالکل ہی تباہ ہو جاتی۔ لیکن اس حالت میں بھی جبکہ فرانسیسی انقلاب کا زور فتوحات نپولین ہی میں ختم ہو چکا تھا صنعتی انقلاب نے کافی معاشرتی اور سیاسی بے اطمنانیاں پیدا کیں۔ جب اقتصادی انقلاب کی وجہ سے اقوام کے پورے طبقات کو اپنی طرز زندگی بدلنا

پڑتی ہے تو یہ لازمی ہے کہ بہت سے اشخاص مبتلائے مصائب ہوں۔ اس سے بے اطمینانی پھیلتی ہے سیاسی اور تباہ کن تحریکات بالیقین پیدا ہونے لگتی ہیں ۱۸۴۸ء کے انقلاب کے علاوہ اشتراکیئین کا گروہ بھی صنعتی انقلاب سے پیدا ہوا۔

لیکن وہ انقلاب اس قدر عظیم اور ہمہ گیر نہ تھا جیسا کہ آج ہندوستان میں سرگرم عمل ہے۔ یورپ میں مشین اور دخانی قوت کی ایجادات مدت ہائے دراز میں جا کر عظیم الشان واقعہ قرار پائی۔ جن میں کہ تجارت اور صنعت متواتر وسعت پا رہی تھیں، سرمایہ بہت جمع ہو گیا تھا اور اقتصادی اصول بتدریج رائج ہو رہے تھے...... امر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے عظیم صنعتی انقلاب سے بھی عظیم تر اور اہم تر واقعہ ہندوستان کا اقتصادی انقلاب ہی ہے۔ ایسے اضلاع میں ریلیں بن گئی ہیں جہاں گزرنا ممکن تھا۔ آج بھی سڑکیں نہیں ہیں۔ کارخانے قایم ہو گئے اور انہیں ایسے آدمی کام کر رہے ہیں جو صنعتی کاروبار کے عادی نہیں ہیں۔ سرمایہ اس ملک میں پہونچ گیا ہے جو اس قسم کی ترقی کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ اور ان سب باتوں کا نتیجہ کیا ہے؟ ہندوستان کے معاشرتی نظام کا شیرازہ بکھر رہا ہے۔ برہمن اب پوجاری کا کام نہیں کرتے۔ رعیت کے لیے یہ مجبوری نہیں ہے کہ وہ آراضی ہی کے ساتھ بندھا رہے۔ بنیہ صرف بیوہرہ ہی نہیں رہا۔ کپڑا بننے والوں کو فنا ہو جانے کا ڈر ہے۔ اور ٹھٹھیروں کو کام چلانا مشکل ہے۔ یورپ کے ادبی اضطراب کو پیش نظر رکھ کر جو کلتر تبدیلی کی وجہ سے پیدا ہوا تھا اگر تم اُن کثیر التعداد اشخاص کی پریشانی پر غور کرو جو اس فوری انقلاب کی بدولت اپنے موروثی پیشہ کا کام نہیں کر رہے ہیں۔ تو تم کو اس کا اندازہ ہو گا کہ سیاسی نے بے چینی کا خاص منشا رکیا ہے۔ یہ ذرا بھی

ہندوستان ایشیائی ملک نہ ہوتا تو مدتوں پہلے اس سے خوں فشاں انقلاب ہو چکا ہوتا۔"

در اصل مذکورہ بالا سطور بیسویں صدی کے آغاز میں لکھی گئی تھیں۔ جبکہ دنیا ہنگامہ رستخیز سے پارہ پارہ نہ ہوئی تھی اور نہ نیم ایشیائی روش میں جارحانہ معاشرتی انقلاب جاگزیں ہوا تھا۔ لیکن سنین قبل از جنگ میں بھی دیگر واقف کاران مشرق روز افزوں اہمیت کے معاشرتی اضطراب کی پیشینگوئیاں کر رہے تھے۔ ہندو قوم پرست لیڈر بپن چندر پال نے لکھا "یہ نام نہاد بے چینی در اصل سیاسی نہیں ہے یہ فی الحقیقت ذہنی و روحانی عروج اور ایک عظیم معاشرتی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ جس میں جدید منطق اور جدید فلسفہ حیات [۱] ہو گا"۔ اور فرانسیسی ماہر سیاسیات شیلے نے ہندوستان کے بارے میں لکھا "اقتصادی انقلاب کا ایک سلسلہ رونما ہو گا جس سے لازمی طور پر کشمکش اور مصائب پیدا ہوں گے [۲]۔"

معلوم یہ ہوتا ہے کہ قبل از جنگ کے زمانہ میں حالات معیشت کی زیادہ مشکلات اور اسی کے ساتھ مغربی آسایش کے خیال اور اسی نہج کے دیگر رفیع تر معیاروں کے اختیار کرنے سے مشرقی آبادی کے مختلف اجزا میں تصادم پیدا ہو گیا تھا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں ایک برطانوی ماہر حفظان صحت نے ہندوستان کی سیاسی بے چینی کی اصل وجہ "فلاکت" بتائی۔ ہندوستان کے عوام کے قابل افسوس حالات کا

---

[۱] بپن چندر پال کا مضمون "ہندوستان میں بے چینی کے معین قوتیں"، جو فروری سنہ ۱۹۱۰ء کے ہمعصر ریویو میں شایع ہوا (مصنف)

[۲] ج۔ شیلے کی کتاب "برٹش انڈیا کے انتظامی مسایل"، صفحہ ۳۰۹ مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۰ء (انگریزی ترجمہ) مصنف

ذکر کرنے کے بعد اس نے لکھا "بلاشبہ یہ کہا جائے گا کہ یہ حالات تو ہندوستان میں لامتناہی زمانہ سے موجود ہیں، اور آج بھی اُن میں نئے چینی پیدا کرنے کی قوت ہر جس قدر کہ پہلے تھی۔ میری رائے یہ ہو کہ نئے چینی وہاں ہمیشہ سے خفیہ طور پر موجود رہی ہو علاوہ بریں اوس زمانہ کے عوام اپنے حالات کا دیگر خوش قسمت اقوام کی حالت سے موازنہ نہ کر سکتے تھے۔ اب وہ اپنے غلیظ محلوں اور گندے "دیسی مکانات" کا مقابلہ برتر اور باقاعدہ چھاونیوں کے مقامات اور برطانوی حکام اور نیز اپنے متمول بھائیوں کے مکانوں سے کر سکتے ہیں۔ جہاں تک میری عقل میں آتا ہو یہ غربت ہی ہر جو کل عوام کی بے چینیوں کا ہمیشہ اصلی باعث ہوتی ہے........ مغویانہ مجالس، سیاسی گفتگو، بابو صاحبان اور سربرآوردہ حضرات کی توقعات عمیق تر شورش کے سطحی اظہارات ہیں[۵]"

بلاشبہ یہ روزافزوں معاشرتی کشمکش اس وجہ سے اور بھی ترقی کر گئی کہ مشرقیوں کو اُن سب اشخاص کی تکالیف میں کوئی دلچسپی نہ تھی جو اُن سے خاندان، ذات یا رسوانات کے رشتہ سے وابستہ نہ تھے۔ کل مشرق میں مغربی مفہوم کے مطابق "معاشرتی خدمت" کا عملاً علم ہی نہیں ہو۔ اس مسئلہ کو چند مشرقیوں نے خود لکھا ہو۔ ہندوستان کی شہری زندگی کا ذکر کرتے ہوئے ایک ہندوستانی اہل قلم لکھتا ہو "معاشرتی آداب کا کوئی عام معیار نہیں ہو........ اس وقت تک ہندوستان میں معاشرتی اصلاح میں افراد یا خاندان کی زندگی کا لحاظ کیا گیا ہو لیکن اس کا اطلاق جس طور سے عام نوع انسان اور بالخصوص مضطر انسانیت کی اُن شکستہ روح جماعتوں پر ہوتا ہو جن کو شہر کہتے ہیں۔ وہ ایسی مقدس کتاب ہے جس کی تلقین ہنوز باقی ہے[۶]"

---

[۵] ڈاکٹر رونلڈز راکس کا مضمون "سیاسی شورش کا ایک سبب فلاکت ہو" جو رسالہ دی سروے ... [illegible]

چنانچہ ایک امریکی ماہر عمرانیات نے کل صنعتی مشرق میں روز افزوں غریب محلوں کی خرابی کی بابت لکھا ہے "سب سے بڑا خطرہ اس امر سے ہے کہ مشرقیوں کو انسانی جان کی قدر کا یہ وسیع مغربی احساس نہیں ہے۔ اور ہماری روشن خیالی رائے عامہ جیسی کوئی پابندی نہیں جو ہم میں صدیوں کی صنعتی جد و جہد کے بعد پیدا ہوئی ہے جبتک یہ عناصر بھی پیدا نہ ہوں اس وقت تک ایسے مصائب اور خرابیوں کا خطرہ لگا رہے گا جس کا مغرب کو کبھی بھی علم نہ ہوا۔"[۵۱]

یہ سب معاشرتی نئے چینی "نوزائیدہ طبقوں پر منتہی ہوتی ہے۔ یعنی روشن خیال ان صنعتی شہروں کے کارخانے کے مزدور، روشن خیال طبقے بالخصوص اس کے نیم تعلیم یافتہ ناکامیابوں کے انقلابی رجحانات کا ذکر ہو چکا ہے۔ بلاشبہ ان آخر الذکر اشخاص نے موجودہ مشرق کی سب انقلابی شورشوں میں شمالی افریقہ سے لیکر چین تک نمایاں حصہ لیا ہے۔ صنعتی مزدوروں کی روایت، پسندی، جہالت اور عدم توجہی کی وجہ سے اور نیز اس وجہ سے کہ اُن کی دوسری معاشرتی بے چینی کے مرکز یعنی روشن طبقے کے درمیان کوئی حقیقی ربط نہیں ہے۔ بعض مصنفین کی رائے میں یہ اغلب نہیں کہ یہ زمانۂ قریب میں بڑا انقلابی جزو بن جائیں۔

اس نقطۂ خیال کو فرانسیسی ماہر اقتصادیات متین نے خوب بیان کیا ہے۔ اصلاً ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے "قوم پرستی کی

بقیہ نوٹ صفحہ ماقبل :۔ مزدوری" صفحہ ۲۳ و ۲۴ مطبوعہ لندن ۱۹۱۱ء (مصنف)

[۵۱] اے ڈبلیو کاہن کا مضمون "مشرق پر مغربی اثر کا عمرانی اندازہ" جو مئی ۱۹۱۱ء میں امریکی جرنل آف سوشیولاجی میں شایع ہوا۔ (مصنف)

[۵۲] پی۔ گورانٹ کا مضمون "چینی انقلاب کا علم النفس" جو ۱۵ مارچ ۱۹۱۲ء کے ریویو ڈی "موندیں

تحریک کا آغاز اوسط طبقہ سے ہوتا ہے اور اس سے سرمایہ داروں یا بڑے مالکان جائداد کی باقاعدہ مخالفت ظاہر نہیں ہوتی۔ اقتصادی امور میں یہ اون کے معین ہیں[۵]۔ ''مزدوروں کی بابت یہ ہے'' قلیوں کو یہ خیال نہیں ہے کہ اِن کی حالت بہتر ہوسکتی ہے۔ رعیت اور کاشتکاری کے مزدوروں کی طرح یہ بغاوت کی کوئی علامت ظاہر نہیں کرتے یہ کس کے پاس اپنی فریاد لے جائیں؟ سوسائٹی کے دروازہ ان کے لیے بند ہیں۔ کسی ذات سے تعلق نہ رکھنے کی وجہ سے ان لوگوں کو پرانے قسم کے کاریگر بھی ذلیل سمجھتے ہیں۔ جو باوجود اپنی پستی کے اپنی ذات کی حیثیت پر نازاں ہیں۔ ایک ہندو کے لیے قلی ہو جانا سب سے بڑا کو ذات ہو جانا ہے۔ کارخانوں کے مزدوروں کی تعداد ہنوز ایسی بڑی نہیں ہی کہ ایک مستقل اور طاقتور مزدوروں کا گروہ بنالیں جو قدیم معاشرت پر دباؤ ڈال سکیں۔ اگرچہ وہ کبھی کبھی ہڑتال بھی کرڈالتے ہیں تو بھی وہ موجودہ ٹریڈ یونین سے ایسے بعید ہیں۔ جیسے کہ قدیم کام کرنے والے ذات سے۔ نہ ان کو یہ اُمید ہے کہ روشن خیال طبقہ ادنیٰ اون کی رہنمائی کرے گا کیونکہ قوم پرستی کی تحریک اپنی ''شہری'' صورت سے خارج نہیں ہوئی ہے۔ اور ہمیشہ سرمایہ دار کی طرفدار رہی ہے۔

بقیہ صفحہ ما قبل:۔ شایع ہوا۔ ابن ستراؤد کی کتاب ''مشرقی سراب''، صفحہ ۳۴۶ لغایت ۱۶۶ جی ڈی۔ لیس کی کتاب ''دوم صلی ہند''، صفحہ ۱۶۲ و ۱۶۳۔ (مصنف)

[۱] البرٹ متیس کی کتاب ''موجودہ ہندوستان'' ... صفحہ ... مطبوعہ پیرس ۱۹۱۹ء (مصنف)

[۵] کسی خاص تجارت یا صنعت میں کام کرنے والے مزدوروں کی جماعت جو اپنے مشترکہ مفاد کی تحفظ کی کوشش کرے۔ (مترجم)

اس طور پر ہندوستان کی صنعت و حرفت ہنوز عالت جنین میں ہے نفس الامر یہ ہی کہ مادی ارتقار جو اپنے آپ کو تعمیر کارخانہ جات سے ظاہر کرتا ہو اور معاشرتی ارتقار جو مزدوری پیشہ جماعت پیدا کرتا ہے ابھی صرف ظاہر ہی ہوا ہے۔ اور ذہنی ارتقار جس سے معاشرتی مطالبات پیدا ہوتے ہیں ابھی شروع ہی نہیں ہوا۔[1]

ہندوستان کے صنعتی حالات کے دیگر مبصرین موسیو متین کی رائے سے متفق نہیں ہیں۔ چنانچہ جے۔ریمزے میکڈانلڈ برطانوی حزب العمال کا لیڈر کہتا ہے "یہ خیال کرنا کہ پست ہندوستانی مزدور فرقہ وار لڑائی میں ایک خودشناس فوج بن جائیں گے مغربی دماغ کی بلند پروازیوں میں سب سے زیادہ ناقابل حصول خواب و خیال ہے۔ لیکن بعض وقت میں یہ خیال کرکے متحیر ہوجاتا ہوں کہ بالآخر یہ خیال بالکل ہی ناقابل حصول نہیں ہو۔ اول تو یہ کہ کارخانہ جات کے کاروبار کی ترقی سے نئے خانماں مزدوروں کی جماعت پیدا ہوگئی ہے۔ جس کا کسی دوسرے سرمایہ دار جماعت میں اس قسم کی اقتصادی جماعت سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ خیال کرنا کہ اس طبقہ کا ہندوستانی سیاسیات میں داخلہ ممکن نہ ہوگا یا نہ ہونے دیا جائے گا۔ اس خیال سے بھی زیادہ لغو اور نئے ہودہ ہے کہ ان کی سیاسیات کو مغربی دستور پر ترقی دی جائے۔ مزید براں محنت کرنے والوں نے ٹریڈس یونین کے ضوابط کے بموجب عمل پیرا ہونے پر مستعدی ظاہر کی ہے۔ صنعتی جماعتیں بنا رہے ہیں اور ہڑتالیں بھی کرتے ہیں۔ ہندوستانی صاحب فہم اشخاص

---

[1] البرٹ متین کی کتاب "موجودہ ہند اور اس کے معاشرتی مسایل کا مطالعہ" صفحات ۳۰۳ لغایۃ ۳۰۵ (مصنف)

سنے جو بعض معاشرتی اصلاحی تحریکات جاری کی ہیں اُن میں ٹریڈ یونین کے انقیاد کی مخصص کوشش کی ہے اور ایسے خیالات کی تلقین کی ہے جن سے ہم بسلسلۂ تبلیغ ٹریڈ یونین واقف ہیں۔ اگر ہندوستان میں خزانہ عامرہ کی پالیسی سرمایہ دارانہ ہوگئی تو اس تحریک سے صرف اشتعال ہی نہ ہوگا جیسا کہ جاپان میں ہوا تھا بلکہ جاپان میں تو قانون بنا کر اس کو روک لیا گیا تھا لیکن ہندوستان میں یہ تحریک کسی طرح نہ دبے گی۔ اس وقت تک حقیقی مزدوری پیشہ طبقہ جو اپنے جنم بھوم کے گانوں سے دور ہوکر ہندوستانی نظام جماعت سے بالکل بے تعلق ہو گیا ہے بہت ہی ہے۔ مگر یہ طبقہ بڑھ رہا ہے اور میرا یقین ہے کہ دیگر ممالک کے سرمایہ دار مزدوری پیشہ جماعت کے اصول پر بہت جلد مرتب ہو جائے گا۔ جب اس کو اپنی سیاسی اہمیت کا احساس ہوگا تو بالیقین اس کی تنظیم بھی انھیں اصول پر ہوگی"۔

اب ہم مشرق ادنےٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ایک قرن سے زیادہ ہوا کہ ایک فرانسیسی سوشلسٹ مصنف نے عام مصریوں کی مشکلات معیشت کو دیکھ کر معاشرتی بے چینی کے آثار محسوس کیے اور سخت اضطراب کی پیشینگوئی کی۔ اس نے لکھا "کارخانہ جات کی افزونی اور اوس کی بدولت جو نذری اور دفعتاً ترقی ہوئی ہے اوس سے ایک حقیقی مزدوری پیشہ جماعت پیدا ہوگئی ہے۔ صرفہ معیشت گرانی کی اوس حد تک پہونچ گیا ہے کہ اس سے پہلے مصر میں کبھی نہ تھا لیکن شرح مزدوری میں خفیف سی ترقی ہوئی ہے۔ افلاس اور احتیاج کی کثرت ہے۔ اس ملک وادی نیل ڈوبتا ہیں جو پہلا ہر شاداب ہو ایک نہ ایک دن عوام مخالفین سے برانگیختہ ہوکر شکایت بلکہ غصہ کرنے لگیں گے"

---

(۱) سبت۔ ریمزے میکڈانلڈ کی کتاب گورنمنٹ ہند، صفحات ۱۲۳ تا ۱۲۴ مطبوعہ لندن

سچ ہے کہ اجانب اور سرمایہ کی بکثرت درآمد نے اوس وقت میں تعویق پیدا کردی جبکہ مصری قوم کے شہری اور دیہاتی مزدور۔ اُن بھائیوں کو جو اون سے کیجا رہی ہیں۔ بالمشافہ دیکھ سکیں۔ وہ اشتراکیت کے اثر تعلیمی کے فقدان کو محسوس کریں تاہم یہ ممکن ہو کہ یہ بیداری وقت سے بہت پہلے ہی پیدا ہو جائے۔ ذہانت محض مصری کامیاب اور خوشحال اشخاص ہی میں نہیں پائی جاتی ہے۔ جن اشخاص کی مزدوری روز بروز کم ہو رہی ہے وہ اسی قدر ذکی الفہم ہیں۔ اب حقیقتاً یہ سوال رہ گیا ہے کہ وہ وقت کب آئے گا جبکہ اسلامی اشتراکیت کا شعلہ اول مرتبہ بلاد اسلامی میں فروزاں ہوگا؟[1] اسی طرح الجزائر میں بلجیم کے ایک سیاح نے جنگ عظیم سے کچھ ہی پہلے شہر کے مزدوروں میں مزدوری پیشہ جماعیت کی بیداری کے آغاز کو معلوم کیا۔ مغربی خیالات کی سرعت اشاعت کا ذکر کرتے ہوئے اس نے لکھا۔ "الجزائر کے گھاٹوں پر اسلام جامۂ بوسیدہ کی طرح پارہ پارہ ہو رہا ہے۔ بندرگاہوں پر کام کرنے والے۔ کوئلہ لانے والے۔ اور انجن صاف کرنے والے خواہ کسی نسل کے کیوں نہ ہوں اپنا اسلام چھوڑ کر اصلی مزدوری پیشہ جماعت کا اتفاق سیکھ رہے ہیں۔ اور وہ اپنے رفقائے یورپ کے شریک کار ہو رہے ہیں۔ اگر الجزائر میں بہت سے بڑے بڑے کارخانے کھل جائیں تو اسلامی راسخ الاعتقادی وہاں سے بالکل اسی طرح ناپید ہو جائے گی جیسا کہ ہمارے یہاں صنعتی تصادم سے قدیم قسم کے کیتھولک اعتقادات ناپید ہو گئے۔"[2]

مشرق میں مزدوروں کی باقاعدہ تحریکات کی سریع اشاعت کے مدارج جیسے کچھ کہ ہوں لیکن ایک امر یقینی ہے کہ جنگ عظیم

---

[1] چارلس... [illegible] ...از لیڈی ڈراپ [illegible] ۱۹۰۶ء صفحات ۲۲۵-۲۲۶ مصنف

[2] اسلام و اشتراکیت [illegible] مطبوعہ [illegible] ۱۹۱۱ء صفحہ ۱۸۲ مصنف

کے سالہائے ماقبل ہیں جنہے چینی اکثر حصص مشرق میں پھیلی ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ زیادہ تر سیاسی تھی لیکن اس کا معاشرتی پہلو بھی تھا۔ ۱۹۱۳ء کے اختتام پر ایک سربرآوردہ اینگلو انڈین اخبار نے یاس سے یہ لکھا "اس وقت تک ہم اس قدر تباہی کی طرف جانے والی سڑک پر اتر گئے ہیں کہ اب ایسے اضلاع کو بھی جو ہندوستان کے بڑے پُرامن مقامات کہلاتے تھے متمول اشخاص اس لیے ترک کر رہے ہیں کہ ان کا مال واسباب وہاں محفوظ نہیں ہو۔ قانون کی تحقیر اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اس کو بد اندیش اشخاص نے گناہوں کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ سرحدی پٹھان ایسے دلیرانہ جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں جن کا یقین نہیں آتا۔ اُن امور کے بارے جو مہذب اشخاص کا کام نہیں ہیں عام جلسے اور شورش کی جاتی ہے۔ خانگی یا عام امور کی سیاسیات میں کوئی معاملہ ایسا نہیں ہے جس پر غیر ذمہ دار اشخاص اپنے غیظ وغضب کا اظہار نہ کرنا چاہتے ہوں، چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی بڑی بڑی شکایات کا رنگ دیکر پیش کیا جاتا ہے۔ ایک حاکم ضلع کی زندگی جو حقیقتاً باقاعدہ اور بافرصت بسر ہونا چاہیے۔ اُن متضاد اثرات کی مداخلت بیجا سے پریشانی میں بسر ہوتی ہے جو عوام میں مادۂ اطاعت کے کم ہو جانے سے پیدا ہو گئی۔ خود بڑی ملازمتوں کے طبقوں واسطے میں ٹریڈ یونین قایم ہو گئی ہیں۔ فوج اور پولس کے افسران کو یہ شکایت ہے کہ پرانے لوگوں کے مقابلہ میں نئے رنگروٹ کم فرماں بردار کم پابند ضابطہ اور بات بات پر شکایت کرنے والے ہیں"[1]

بلاشبہ جنگ عظیم نے مشرقی بےچینی کو اور زیادہ کر دیا۔ مشرق ادنیٰ کے اکثر حصص میں بالخصوص سخت مصائب دیہاں اور سخت افلاس نے معاشرت کو بدنظمی

---

[1] دی انگلش مین (کلکتہ) ۱۱ فروری ۱۹۱۴ء کے لٹریری ڈائجسٹ میں نقل کیا گیا ہے صفحہ ۲۰۶۔ مصنف

کے کنارہ تک پہونچا دیا۔ اس بدشگون اضطراب میں روسی بالشیوزم کا منحوس اثر پڑا جو اس سب منتشر بے چینی کو باقاعدہ طریقوں سے خاص اغراض کے لیئے مجتمع کر رہا تھا۔ بالشویزم کی غرض اصلی دنیا کا انقلاب اور مغربی تہذیب کی بربادی ہے اس مقصد کے حصول کے لیے بالشیوک لیڈروں نے صرف مغرب ہی پر براہ راست حملے نہ کیے بلکہ ایشیا و افریقہ میں پہلوؤں پر بھی حملہ کرنے کی فکر کی۔ ان کو یقین تھا کہ یہ آگ اگر مشرق میں لگ جائے گی تو روسی بالشیوزم کو طاقت حاصل ہو جانے کے علاوہ مغرب میں جو جنگ سے بالکل متزلزل ہو گیا تھا اقتصادی اشتعال اس زور کا ہوگا کہ صنعتی بربادی شروع ہو جائے گی۔ اور اوس سے یورپ میں انقلاب کا راستہ کھل جائے گا۔

بالشیوزم کے تبلیغی مساعی اپنے احاطہ اور وسعت کے لحاظ سے عالمگیر تھے۔ دنیا کا کوئی حصہ ان کے کارکنوں کی سازش سے خالی نہ تھا اور نہ بےچینی کے کسی امکانی ذریعہ کو نظر انداز کیا گیا تھا۔ بالشویزم کے اسلحہ خانے میں خالص "سرخ" اصول یعنی مزدوری پیشہ جماعت کی رہنمائی کے علاوہ اور بہت سے اسلحہ بھی تھے چونکہ پہلی بات جو مطلوب تھی وہ موجودہ نظام عالم کی بربادی تھی لہذا ہر شئی جو نظام کے مخالف تھی خواہ وہ بالشویزم سے اصولاً کتنی ہی بعید کیوں نہ ہو بالشویکی اغراض کی تکمیل کے لیئے کام میں لائی گئی۔ لہذا یورپ کی طرح ایشیا، افریقہ، امریکہ اور اسٹریلیا میں بالشویک فتنہ انگیزوں نے ہر غیر مطمئن کے کان میں اپنی نفرت اور انتقام کا منتر پھونکا۔ بالشویزم جو جبر اور مقابلہ کی آگ بھڑکا رہا تھا اُس میں ہر قوم پرستی کی تو قف اور ہر سیاسی شکایت اور ہر معاشی ناانصافی اور ہر ملی امتیاز ایندھن کا کام دیتا تھا[۱]۔

---

[۱] بالشیوک تبلیغ کے عالمگیر صورت کے لیے ملاحظہ ہو پال میلیوکوف کی کتاب بالشویکی تحریک ایک تھی۔

بالشویک سرگرمی کے لیے مشرق ادنیٰ و وسطےٰ نہایت ہمت افزا مقامات تھے۔ علاوہ اس کے کہ یہ مقامات ہر قسم کی سخت شورشوں کا شکار ہو رہے تھے قدیم زار کی شہنشاہیت کے موروثی منازل مقصود تھے۔ لہٰذا اُن کے حالات روسی وکلا نے خوب معلوم کیے تھے اور "پرامن مداخلت" کا خاص فن مرتب کر لیا تھا جو ان اغراض کے لیے بآسانی کارآمد ہو سکتا تھا۔ ترکی، ایران، افغانستان اور ہندوستان کی پہلے ہی سے ایسی حالت تھی کہ انھیں انگلستان کے خلاف سیاسی نسلی اور مذہبی ہیجان پیدا کرنے کے لیے ٹراٹزکی[۱] اور لینن[۲] کو کسی نئی تدبیر سوچنے کی

بقیہ نوٹ صفحہ ماقبل:۔ بین الاقوامی خطرہ ہے" مطبوعہ لندن ۱۹۲۰ء نیز مصنف کی کتاب "گوروں کے غلبہ اقتدار کے خلاف رنگ کا اُٹھنے والا طوفان" صفحات ۲۱۸ لغایت ۲۲۱۔ اور نیز مصنف کا مضمون "بالشویکی تحریک یعنی اراذل کی مخالفت" جو جون ۱۹۲۰ء دی سنچری میں شایع ہوا۔ (مصنف)

[۱] ٹراٹسکی ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ یہودی عطار تھا۔ اوڈیسہ میں تعلیم پائی ۱۹۰۵ء میں سائبیریا کو جلاوطن کیا گیا۔ وہاں سے فرار ہو کر جنیوا پہونچا اور اعتدال پسند انقلابی جماعت کا صدر رہا۔ اور انتہا پسندوں سے ربط پیدا کیا۔ پھر گرفتار ہو کر سائبیریا بھیجا گیا۔ لیکن وہاں سے بھاگ کر فرانس جرمنی اور سوئیزرلینڈ میں اخبار نویسی کا کام کرتا رہا۔ ۱۹۱۷ء میں لینن کے ساتھ روس واپس آیا اور سوویٹ کا صدر منتخب ہوا۔ (مترجم)

[۲] لینن ۱۸۷۰ء میں بمقام سمبرسک پیدا ہوا۔ امرا کے خاندان سے ہے۔ سمبرسک میں تعلیم پانے کے بعد کازان کی یونیورسٹی میں داخل ہوا لیکن گورنمنٹ کے خلاف ایک بلوے میں شریک ہونے کی پاداش میں یونیورسٹی سے خارج کیا گیا۔ ۱۸۹۱ء میں پیٹروگراڈ کے دارالعلوم میں قانون اور اقتصادی درجہ میں شریک ہوا۔ ۱۸۹۵ء میں جرمنی چلا گیا۔ اسی سال واپس ہو کر اشتراکیین کی سرگرمیوں میں شرکت کی بنا پر گرفتار ہو کر سائبیریا جلاوطن کیا گیا۔ سنہ ۱۹

ضرورت نہ پڑی۔ حکومت زار نے اِن کاموں کو پشتہا پشت سے کیا تھا اور اس کے متعلق پوری معلومات پٹروگریڈ کے دفاتر اور نیز باقی ماندہ زار کے وکلا کے دماغوں میں موجود تھیں۔ اور یہ وکلا جدید کام میں ہاتھ لگانے کے لیے پہلے کی طرح مستعد تھے۔

بالشویک تحریک کے اس وسیع جال میں جس میں آج کل مشرق پھنسا ہوا ہے ہم کو بالشویک کے دو مقاصد میں امتیاز کرنا چاہیے۔ ایک تو فوری یعنی مغربی سیاسی اور اقتصادی تفوق کی بربادی دوسرا انتہائی یعنی مشرقی عامۃ الناس کو بالشویک بناکر دیسیوں کے طبقات اعلیٰ و اوسط کو اُسی طرح فنا کرنا جیسا کہ روس میں ہوا۔ اور جیسا کہ مغرب کے دیگر ممالک کے لیے تجویز کیا گیا ہے۔ منزل اوّل میں بالشویزم مشرقی عقائد رسوم کے احترام اور مشرقی تحریکات قوم پرستی کی حمایت کو مستعد ہے۔ منزل دوم میں مذاہب مثلاً اسلام اور حامیان قوم مثلاً کمال پاشا کو دو طبقہ اوسط کے شہری ہونے کا، ملزم قرار دے کر بے رحمی سے تباہ کرنا مقصود ہے۔ ہم اس پر تبصرہ کریں گے کہ بالشویکی (ڈپلومیسی) حکمت عملی ان دونوں تجاویز پر ایک ہی وقت میں عمل پیرا ہونے کی کیونکر کوشش کرتی ہے

روسی بالشویزم کی مشرقی پالیسی ۱۹۱۷ء کے ختم پر اپنے برسر اقتدار ہونے پر ہی معیّن ہو گئی تھی۔ ۱۹۱۸ء بہت بڑی تیاریوں کا زمانہ تھا۔ ایک عظیم تبلیغی نظام مختلف ذرائع سے مدون کیا گیا تھا۔ پرانی زار کی حکومت کے وکلا اور ماہران حکمت عملی جو معاملات مشرق سے خوب واقف تھے خوشامد سے یا حکماً

بقیہ نوٹ صفحہ ماقبل :- میں رہا ہونے کے بعد ممالک غیر کو چلا گیا۔ اور سترہ سال سوشلسٹ لیڈر رہا اکتوبر ۱۹۱۷ء میں پٹروگریڈ واپس آکر حکومت کرنیکی کے زوال کا باعث ہوا۔ (مترجم)

اس خدمت پر مامور کیے گئے تھے۔ روسی مسلمانوں کی آبادی مثلاً جنوبی روس کے تاتاریوں اور وسط ایشیا کے ترکمانوں میں سے بہت سے اشخاص اس کام کی غرض سے لیے گئے تھے۔ جنگ عظیم کے ختم پر جو جلا وطن ترکی و ایران و ہندوستان اور دیگر مقامات سے روس میں جمع ہو گئے تھے بہت زیادہ کارآمد ثابت ہوئے دوران جنگ کی ترکی حکومت کے تقریباً کل سربرآوردہ اشخاص مثلاً انور۔ طلعت۔ جمال وغیرہ دول ائتلاف کے فاتحانہ انتظام کے ڈر سے بھاگ کر روس میں پناہ گزیں ہوئے یہی اُس ہندو لیڈر کا حال تھا۔ جو زمانۂ جنگ میں جرمنی ملازم تھا اور اب جسے لینن کی خدمت میں باریابی حاصل تھی۔ سنہ ۱۹۱۸ء کے ختم تک بالشویزم کا محکمۂ تبلیغ مشرق بالکل درست ہو کر تین شعبوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ پہلا اسلامی ممالک کے لیے دوسرا ہندوستان کے لیے اور تیسرا مشرق اقصےٰ کے لیے۔ مشرق اقصےٰ میں جو بالشویکی جدوجہد رہی اُس سے اِس کتاب کو تعلق نہیں ہے۔ اگرچہ قارئین کو یہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ موجودہ روسی تاریخ میں چینیوں نے کیا حصہ لیا۔ اسلامی اور ہندوستان کے شعبہ جات نے بہت سرگرمی دکھائی اور منوں بالشویکی تحریرات کو مختلف مشرقی زبانوں میں ترجمہ کیا۔ اور بہت سے خفیہ وکلاء اور مبلغین کو "میدان عمل" اور کل غیر مطمئن اور انقلابی عناصر سے اتصال کے لیے تیار کیا۔

سنہ ۱۹۱۹ء کے ابتدائی مہینوں میں مشرق ادنےٰ و وسطےٰ میں بالشویکوں کی جدوجہد بہت نمایاں ہو گئی۔ ائتلاف نے مشرق ادنےٰ کے قوم پرستوں کی توقعات کو جو نامنظور کیا اِس سے جس قدر یاس و غصہ کا طوفان اُٹھا وہ بالشویک کے ہاتھوں میں اچھا آلۂ کار بن گیا[۱]۔ اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ مصطفےٰ کمال اور ترکی و ایران و

[۱] ملاحظہ ہو فصل پنجم مصنف

مصر وغیرہ کے دیگر قوم پرستوں کی ماسکو نے کیسی حمایت کی۔ مشرق وسطےٰ میں بھی بالشویکوں کو اہم فتوحات حاصل ہوئیں۔ ۱۹۱۹ء کی بہار میں جو بلووں اور معنویانہ جبر کی لہر شمالی ہند میں پھیل گئی صرف اسی میں بالشویک جدوجہد کا اثر نمایاں نہ تھا بلکہ افغانستان[۵۱] میں بھی برطانیہ کو سخت ضرب پہونچائی گئی۔ جنگجو کوہستانیوں کا ملک جو ہندوستان کی شمالی و مغربی سرحد پر دائمی ابر برقبار کی طرح واقع ہے جنگ عظیم میں محض اس وجہ سے ساکت رہا کہ اس کے حکمران امیر حبیب اللہ خاں کی روش برطانیہ پسند تھی۔ لیکن اوائل ۱۹۱۹ء میں حبیب اللہ خاں قتل کردیئے گئے۔ یہ معلوم نہیں کہ اس معاملہ میں بالشویک ہاتھ تھا یا نہیں۔ لیکن بالیقین انھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا کیونکہ حبیب اللہ خاں کے لڑکے امیر امان اللہ خاں برسر اقتدار ہوئے جو انگلستان کے مسلمہ دشمن تھے اور دوران جنگ میں ان کے تعلقات ترکی و جرمنی دونوں سے رہتے تھے۔ امیر امان اللہ خاں نے فوراً ماسکو سے رسل ورسائل شروع کردیئے۔ اور کچھ دنوں بعد عین اس وقت جبکہ پنجاب میں شورش کا ہیجان انتہا کو پہونچ چکا تھا انھوں نے انگلستان سے جنگ کا اعلان کردیا۔ اور ان کے وحشی قبایل نے سرحد کے پار آکر شمالی مغربی سرحد کو مشتعل کردیا۔ سخت لڑائی کے بعد انگریزی افواج کو افغان حملہ کے روکنے میں کامیابی ہوئی اور امیر امان اللہ کو مجبوراً صلح کرنا پڑی۔ لیکن یہ ظاہر تھا کہ گورنمنٹ برطانیہ امیر امان اللہ خاں کو زیادہ دبانے کی جرات نہ کرسکتی تھی۔ لہذا شرایط صلح میں امیر کو اپنی پہلی پابندی سے کہ سوائے برٹش انڈیا کے کسی دوسری قوم سے سیاسی تعلقات نہ رکھیں، آزادی مل گئی۔ امیر امان اللہ خاں نے اپنی خودمختاری کا فوراً اعلان کیا اور ماسکو سے دھوم دھام کے تعلقات

---

[۵۱] ملاحظہ ہو فصل ششم۔

قایم رکھے بنفس الامر یہ ہے کہ بالشویکیوں نے اب روسی ترکستان میں ایک اہم تبلیغی ماتحت مرکز سرحد افغانستان کے قریب ہی قایم کر دیا تھا۔ اور اس دفتر کی جدوجہد میں نہ صرف افغانستان بلکہ ہندوستان کا وسیع میدان کار بھی شامل تھا۔[1]

---

[1] افغانستان اور ایشیائے وسطیٰ کے واقعات کے لیے ملاحظہ ہو سرٹی۔ ہولڈچ کا مضمون "افغانستان میں بالشویزم کا اثر"، جو ۲۴ دسمبر ۱۹۱۹ء کو نیو یوروپ میں شایع ہوا۔ اقبال علی شاہ کا مضمون "بخارا کا زوال"، جو ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو نیر ایسٹ میں شایع ہوا اور نیز اوس کا مضمون ایشیاء متوسط کی گتھی جو اکتوبر ۱۹۲۰ء ایشیاٹک ریویو میں شایع ہوا۔ مشرق ادنیٰ و وسطیٰ میں بالشویکی سرگرمیوں کے لیے ملاحظہ ہو میلیو کود کی کتاب مذکورہ بالا اور میجر جنرل سر جارج اسٹن کا مضمون "مشرق میں بالشویک تبلیغ"، جو اگست ۱۹۲۰ء کو فورٹ نائٹلی ریویو میں شایع ہوا۔ ڈبلیو۔ ای۔ ڈی۔ ایلن کا مضمون "گزشتہ اور موجودہ ماورائے قفقاز" جو اکتوبر ۱۹۲۰ء کو کواٹرلی ریویو میں شایع ہوا۔ سر ویلنٹائن چرول کا مضمون "مشرق ادنیٰ میں متضاد پالسیاں"، جو یکم جولائی ۱۹۲۰ء کو نیو یورپ میں شایع ہوا۔ ایل دیو مون ولبدان کا مضمون "بیدار ہونے والی ایشیا" جس کا ترجمہ فرانسیسی سے ۱ اگست ۱۹۲۰ء کو لونگ ایج میں شایع ہوا۔ میجر جنرل لارڈ ایڈورڈ گلائشین کا مضمون "مسلمانوں اور مشرق وسطیٰ کی گتھی"، جو دسمبر ۱۹۱۹ء کو نیشنل ریویو میں شایع ہوا۔ بیکسٹن ہیول کا مضمون "روس اور صلح" جو ۲۶ جنوری ۱۹۲۰ء کو نیشن (نیو یارک) میں شایع ہوا۔ ہیر فان ہاف کا مضمون "ترکی میں قوم پرستی کی تحریک"، جو ڈیوٹش ریویو میں دسمبر ۱۹۱۹ء میں شایع ہوا۔ آر۔ جی ہنٹر کا مضمون "اتلاف بلی اور اسلام"، جو ۲۶ اگست ۱۹۲۰ء کو نیو یورپ میں شایع ہوا۔ نیمرا کا مضمون "عرب بغاوت کا قصہ"، جو اگست ۱۹۲۰ء کو بالکن ریویو میں شایع ہوا۔ باج کا مضمون "لینن کی تسخیر اسلام

سنہ ۱۹۲۰ء میں بالشویک جدوجہد کل مشرق ادنیٰ اور وسطیٰ میں اور واضح ہوگئی۔ ہم بیان کرچکے ہیں کہ بالشویک روس نے ترکی اور ایرانی قوم پرستوں کی تحریکات کی کیسی زبردست حمایت کی۔ فی الواقع ائتلاف کی غیر دانشمندانہ تنگ نظر پالیسی قوم پرستوں کو انبوہ در انبوہ لینن کے آغوش میں ڈھکیل رہی تھی۔ باوجودیکہ ان کو خود ماسکو کے بین الاقوامی اصول سے سخت نفرت تھی۔ مثلاً ماسکو کو جو افغان مشن گیا تھا اس کے گروہ نے سوویٹ روس سے دوستی کے وجوہ کو دوران ملاقات میں آزادی سے ظاہر کیا اور اس کو سرکاری سوویٹ اخبار اذوبیسٹا نے طبع کیا۔ "میں نہ کمیونسٹ[1] ہوں نہ سوشلسٹ[2] لیکن میرا سیاسی پروگرام اس وقت تک یہ ہے کہ

بقیہ نوٹ صفحہ ماقبل

کی کوشش" جو ۸ جون سنہ ۱۹۲۰ء کو نیو یورپ میں شایع ہوا۔ ہینیس ویٹڈنٹ کا مضمون "گزشتہ مشرق کی تباہی" جو شمال و جنوب میں مئی سنہ ۱۹۲۰ء میں شایع ہوا۔ خارج بنک کا مضمون "روسی خارجی پالسی" جو یکم جولائی سنہ ۱۹۲۰ء کو نیو یورپ میں شایع ہوا۔ (مصنف)

[1] کمیونسٹ وہ گروہ ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ انفرادی ملکیت کو ختم کرکے ہر شئے ملکیت مشترکہ قرار دی جائے۔ (مترجم)

[2] سوشلسٹ۔ وہ گروہ جو اس امر کا خواہاں ہے کہ ہر شخص مساوی حالت کا رہے۔ حتےٰ کہ ہر شخص کی املاک بھی مساوی ہوں۔ اس اصول کے بقا و قیام کے لیے یہ فرقہ کہتا ہے کہ کاروبار جماعت کے ماتحت بدانصرام پائے اور اس میں تقابل اور مسابقت کو دخل نہ ہو۔

(مترجم)

ایشیا سے انگریزوں کو نکالا جائے۔ ایشیا میں یوروپی سرمایہ داری کا جس کے بڑے نمائندے انگریز ہیں، میں جاپانی دشمن ہوں - اس امر پر میں کمیونسٹ سے متفق ہوں اور اس بارہ میں میں تمہارا قدرتی حلیف ہوں - افغانستان ہندوستان کی طرح سرمایہ داری کی سلطنت نہیں ہے۔ اور یہ غیر اغلب ہے کہ پارلیمنٹی حکومت ان ممالک میں جڑ پکڑ سکے۔ اس وقت یہ کہنا مشکل ہے کہ واقعات مابعد کیا صورت اختیار کرینگے۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ اُس مشہور خطبہ نے جو سوویٹ گورنمنٹ نے کل اقوام عالم کے نام بھیجکر سرمایہ داروں کے خلاف جنگ کرنے کی درخواست کی تھی۔ ہم پر بہت بڑا اثر کیا۔ کیونکہ ہمارے نزدیک تو سرمایہ دار "اجنبی"، یا اگر صاف صاف کہا جائے انگریز کا مرادف ہے۔ اس سے بھی زیادہ ہم پر اس بات کا اثر ہوا کہ روس نے اون خفیہ عہد ناموں کو کالعدم کردیا جو شہنشاہیت پسند حکومتوں نے کیے تھے۔ اور یہ اعلان کردیا کہ ہر قوم خواہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو اس کو یہ حق ہے کہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرے۔ اس فعل سے ایشیا کی وہ قومیں جن کو لوٹ لیا گیا تھا اور تمام فرقے جو ابھی اشتراکیت سے بہت بعید ہیں۔ سوویٹ روس کے پاس آموجود ہوئے"۔ بلاشبہ ہم کو جو علم بالشویک مبلغین کی چالوں کا ہے اُس سے ہم کو یہ یقین نہیں ہوتا کہ افغانی سفیر نے وہ باتیں کہیں جو اژولستیا نے بیان کی ہیں۔ اگر یہ ملاقات فرضی بھی ہو تو جو الفاظ اس کے منہ سے ادا کیے جاتے ہیں کثیر التعداد مشرقیوں کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اور ممالک مشرق میں بالشویک مبلغین کی کامیابی کی خاص وجہ کا اظہار کرتے ہیں۔

فی الحقیقت بالشویک تبلیغ کی ترقی ایسی کامیاب ہوئی کہ سوویٹ کے نبذہ کلم کھلا اپنے مقاصد کے بیان کا کام کرنے لگے۔ پہلے ماسکو نے اپنے آپ کو مغربی "شہنشاہیت" کے خلاف مشرقی اقوام کا حامی ظاہر کیا۔ اس کی مخالفت "اقوام" سے بلا لحاظ طبقات تھی۔ اور اس کے منشے یہ وعدہ کیا تھا کہ دیسیوں کے خیالات اور

نظامات کا احترام کیا جائے گا۔ اور ان کو "خود انفصالی" کا حق ہوگا۔ مثلاً سنہ ۱۹۱۹ء کے ختم پر جو بالشویکوں کا اعلان لینن کے دستخط سے ترکوں کے لیے جاری ہوا حسب ذیل ہے: "دنیا کے مسلمانو! سرمایہ داروں کے مظلومو! بیدار ہو۔ روس نے زار کی اس پالیسی کو ترک کر دیا ہے۔ جو تمہارے لیے مضر تھی اور تم کو انگریزوں کے ظلم کے استیصال میں مدد دینے کو تیار ہے۔ وہ تم کو مذہب اور سیلف گورنمنٹ کی آزادی دے گا۔ قبل از جنگ کی سرحدوں کا احترام کیا جائے گا۔ کوئی ترکی ملک ارمینیا کو نہ دیا جائے گا۔ درہ دانیال تمہارا رہے گا قسطنطنیہ ہی اسلامی دنیا کا دارالسلطنت ہوگا۔ روسی مسلمانوں کو سیلف گورنمنٹ دی جائے گی۔ اس کے بدلے میں ہم تم سے یہ چاہتے ہیں کہ تم بے رحم سرمایہ داروں سے لڑو جو تمہارے ملک کو لوٹ کر نوآبادی بنانا چاہتے ہیں" اپنی رعایا سے مخاطبت میں بھی یہی عام لہجہ قایم رکھا گیا تھا۔ ان روسی افواج کے احکام میں جو ہندوستان کی سرحد پر تعینات تھے یہ بیان کیا گیا تھا "پامیر ڈویژن کے رفقا! تم کو اہم کام دیا گیا۔ سوویٹ کی جمہوریت تم کو پامیر کی چوکیوں کی محافظت کو بھیجتی ہے جو ہندوستان و افغانستان کے دوستانہ ممالک کی سرحد پر ہیں۔ پامیر کا حدب انقلابی روس اور ہندوستان کے درمیان حایل ہے۔ ہندوستان کی تیس کروڑ آبادی کو مٹھی بھر انگریزوں نے غلام بنا رکھا ہے۔ اس حدب پر انقلاب کے علم برداروں کو آزادی دینے والی فوج کا سرخ جھنڈا بلند کرنا چاہیے۔ کاش اہل ہند کو جو ظالم انگریزوں سے لڑ رہے ہیں معلوم ہو جائے کہ دوستانہ امداد دور نہیں ہے۔ شمالی ہند کی حریت پسند اقوام سے بے تکلف ہو جاؤ و ان انقلابی ترقی میں دامے درمے سخنے مدد کرو اور اُن الزامات کی تردید کرو جو برطانوی شہزادوں، امیروں اور ساہوکاروں کے کارپردازوں نے ہمیشہ روس کے خلاف شایع کیے گئے ہیں۔ پایندہ باد مخالف

انقلابیں یورپ و ایشیا"،
بالشویک تبلیغ کی منزل اول اس قسم کی تھی۔ مگر تھوڑے عرصہ بعد بالکل دوسری قسم کی تبلیغ ظاہر ہونے لگی۔ اس میں شک نہیں کہ اس تبلیغ کی منزل دویم میں مغربی سرمایہ داروں کی شہنشاہی پر برابر حملے ہوتے رہے لیکن اب ان مخالف مغرب حملوں کے متوازی یا شمول میں عامۃ الناس سے خاص اپیل ہونے لگی جس میں ان کو سب "سرمایہ داروں" اور "طبقہ اوسط کے شہریوں کے" خلاف خواہ دیسی ہوں یا اجنبی مشتعل کیا گیا تھا اور ان کی سب بیماریوں کا علاج "مزدوروں کی جماعت" بتائی گئی تھی۔ سنہ ۱۹۲۰ء کے موسم گرما میں جو بالشویکی اعلان عام ترکوں کے لیے شایع کیا گیا تھا حسب ذیل ہے۔ یہ ایک سال قبل کے اعلان سے بالکل مختلف ہے۔ اس دلچسپ دستاویز میں لکھا تھا "مزدور ہر جگہ کے ساہوکاروں کے خلاف جد و جہد کر رہے ہیں۔ یہ اشخاص امرا اور ان کے پٹھوؤں کی مدد سے ترکی مزدوروں کو اپنے سلاسل بلا میں گرفتار رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ یورپ کے ساہوکار ہی ہیں جنھوں نے ترکی پر قبضہ کر لیا۔ بالادو آؤ۔ ہم دنیا کے مزدوروں سے متحد ہو جائیں اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو ہم کو کبھی سر نہ اٹھا سکے گا۔ انقلاب ترکی کے بہادروں کو بالشویزم میں شریک ہونا چاہیے۔ زندہ باد سویم مجلس بین الاقوامی الحمد للہ۔"

اشتراکیوں نے ان جد و جہد مساعی میں صرف باتوں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عمل بھی شروع کر دیا۔ مشرقی اقوام میں سب سے پہلے بالشویزم کا نفوذ روسی ترکستان میں ہوا۔ آخر سنہ ۱۹۱۷ء میں جب بالشویکی اولاً بر سر اقتدار ہوئے تو انھوں نے

ترکستان کو کامل "حق خود انفصالی عطا کر دیا تھا۔ اور باشندوں نے اپنے دیسی حکمرانوں کا خیر مقدم کر کے اپنی قدیم سلطنتیں قایم کر لی تھیں۔ جو ایک نوع پر جماعتی رشتہ میں روس کے ماتحت تھیں۔ مگر اوائل سنہ ۱۹۲۰ء میں سوویٹ گورمنٹ نے ترکستان کو "معاشرتی انقلاب" کے لئے تجویز وں تصور کیا۔ لہذا دیسی حکمرانوں کو معزول کر کے کل سیاسی اختیار مقامی سوویٹ کو دیدئے گئے (جو روسیوں کے تحت میں تھے) دیسی طبقات اعلے و اوسط کا مال لوٹ لیا گیا۔ اور جو منتشر مقاومت ہوئی اس کو قتل واذیت اور دیگر بالشویکی تخویفی ذرایع سے فرو کیا گیا[۱]۔ قفقازیہ میں بھی آذر بائیجان کے سوویٹی بنانے کے ساتھ ہی معاشرتی انقلاب شروع ہو گیا۔ آذر بائیجان کی تاتاری جمہوریت قدیم صوبہ ماورائے قفقاز کا ایک حصّہ تھی۔ اور اس نے سنہ ۱۹۱۷ء میں حکومت زار کے زوال پر اپنی آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ مشرقی ماورائے قفقاز بحیرہ خزر کے پاس آذر بائیجان کا دار السلطنت باکو تھا جو اپنی تیل کی کانوں کے لئے مشہور ہے۔ تیل کی تجارت نے باکو کو مغربی طریقہ کا کاروباری مرکز بنا دیا تھا۔ اور اس کی آبادی زیادہ تر مزدوری پیشہ جماعت پر مشتمل تھی جو روسی اور ایشیائی اختلاط نسل سے پیدا ہوئی ہے۔ اس شہری مزدوری پیشہ جماعت کے نوزائیدہ جماعتی احساس کو بھڑکا کر بالشویک وکلا نے سنہ ۱۹۲۰ء کی بہار میں سیاسی ضرب لگا کر قوم پرست حکومت کو مغلوب کیا۔ اور روسی امداد سے آذر بائیجان کو سوویٹ جمہوریہ بنا لیا۔ اس کے بعد معاشرتی انقلاب

---

[۱] اقبال علیشاہ مذکور الصدر (مصنف)

کے معمولی لوازمات یعنی اعلے اور اوسط طبقات کی لوٹ مار قتل عام شروع ہو گیا۔ اور کل جائداد پیر جمانہ جبر و اشنداد کے بعد بحق قصباتی مزدوری پیشہ جماعت و زراعتی مزدوران ضبط ہو گئی۔ اس طور پر ۱۹۲۰ء کے شروع مہینوں میں بالشویزم مشرق ادنے وسطے دونوں جگہ حقیقتاً عمل پیرا ہو گئی۔[۵۲]

مشرق میں پورے طور پر قدم جمانے کے بعد بالشویزم کی اتنی قوت مل گئی کہ وہ نقاب کو دور کر دے۔ ۱۹۲۰ء کے موسم خزاں میں سوویٹ گورنمنٹ نے باکو میں ایک "مشرقی اقوام کی کانگرس" منعقد کی جس کا مقصد مشرق کو مغربی تسلط سے آزادی دلانے کے علاوہ بالشویکی بنانا بھی تھا۔ اس بڑے مقصد کو چھپانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اور اس وقت جو لہجہ اختیار کیا گیا تھا ایسا تعجب خیز تھا کہ ہم کو اس کی طرف پوری توجہ کرنا چاہیئے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کانگرس کے انعقاد کا جو نوٹس تیسری (ماسکو) بین الاقوامی جماعت نے جاری کیا تھا۔ وہ مشرق کے "کاشتکاروں اور مزدوران" کے لئے تھا۔ دعوتی اشتہار حسب ذیل تھا:۔

---

۵۲ قفقاز کے واقعات کے لئے ملاحظہ ہو۔ ڈبلیو ای۔ ڈی ایلن کا مضمون "گزشتہ اور موجودہ ماورائے قفقازیہ" جو اگست ۱۹۲۰ء کو کوارٹرلی ریویو میں شایع ہوا۔ سی ۱۰ ای بیکھوفر کا مضمون۔ "ماورائے قفقازیہ کی حالت" جو ۲ دسمبر ۱۹۲۰ء کو نیو یوروپ میں شایع ہوا۔ "ڈی۔ زیڈ۔ ٹی کا مضمون آذربائیجان پہلی مسلمان جمہوریت" جو ۱۹۱۹ء میں ریویو آف دی مسلمان ورلڈ میں شایع ہوا۔ ہائیسٹن ہیں کا مضمون "گرجستان کا دروازہ" جو ۳۰ مارچ ۱۹۲۱ء کو نیشن ریذو پارک) میں شایع ہوا۔ (مصنف)

ایران کے کاشتکار و اور مزدورو! قاجاری حکومت طہران اور اس کے خدام یعنی خوانین صوبہ جات نے صدیوں سے تم کو لوٹا اور برباد کیا ہے۔ وہ زمین جو قانون شریعت کے بموجب تمہاری مشترکہ ملکیت تھی حکومت طہران کے خوشامدیوں نے اس پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہ اشخاص اس اراضی کو اپنی مرضی کے مطابق خرید و فروخت کرتے ہیں اور تم پر جیسا چاہتے ہیں ٹیکس لگاتے ہیں۔ اور جب اپنی بدانتظامی کی وجہ سے انھوں نے ملک کو اس حالت پر پہونچا دیا کہ خود اُس سے کافی نفع نہ اٹھا سکے تو انھوں نے ایران کو سال گزشتہ انگریز سرمایہ داروں کے ہاتھ بیس لاکھ پونڈ کو فروخت کر ڈالا تاکہ آخر الذکر ایران میں ایک فوج ترتیب دیں جو تم پر بیش از بیش ظلم کرے۔ خوانین اور حکومت طہران کے لئے محاصل جمع کریں۔ انھوں نے جنوبی فارس میں تیل کے چاہات فروخت کر دئے اور اس طور پر ملک کی لوٹ میں مدد کی۔

کاشتکاران جزیرۃ العرب! انگریزوں نے تمہارے ملک کی آزادی کا اعلان کیا۔ لیکن تمہارے ملک میں اسی ہزار انگریزی فوج مقیم ہے جو لوٹ مار، قتل، اور تمہاری عورتوں کو بے حرمت کر رہی ہے۔

کاشتکاران اناطولیہ! انگریزی، فرانسیسی اور اطالوی حکومتیں اپنی توپوں کے زور سے قسطنطنیہ پر قابض ہیں۔ انھوں نے سلطان کو مقید کر رکھا ہے اور اس پر مجبور کیا ہے کہ وہ خالص ترکی ممالک کے تجزیہ پر رضامندی ظاہر کر دیں۔ اور ملک کے مالیات کو ممالک غیر کے سرمایہ داروں کے سپرد کر دیں تاکہ وہ ترکی قوم سے خوب جلب منفعت کر سکیں۔ جو چھ سال کی لڑائی کے بعد خود ہی فلاکت میں مبتلا ہے۔ انھوں نے ہرقلیہ کی کوئلہ کی کانوں

پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور تمہارے بندرگاہوں کو دبا لیا۔ اور تمہارے ملک میں اپنی فوج بھیج رہے ہیں جو تمہاری کاشت کو پامال کر رہی ہے

کاشتکاران و مزدوران آرمینیا! قریبا قرن گزر گئے کہ تم ممالک غیر کے سرمایہ داروں کی سازشوں کا شکار ہو ان سرمایہ داروں نے قتل عام کے خلاف زبانی جمع خرچ کر کے تمہیں ابھارا کہ سلطان کے خلاف جنگ کرو۔ اس سے ان کا منشاء یہ تھا کہ تمہارے خون کے بدلہ میں خونخوار سلطان سے جدید مراعات اور تازہ منافع روزانہ حاصل کریں۔ دوران جنگ میں ان لوگوں نے تم سے صرف آزادی کا ہی وعدہ نہ کیا بلکہ تمہارے تجار تمہارے مدرسین، اور تمہارے پیشوایان مذہبی کو یہ بھی لالچ دیا کہ وہ ترکی کاشتکاروں کی زمین طلب کریں۔ تاکہ ارمینیوں اور ترکیوں میں دائمی جنگ رہے اور اس لڑائی سے وہ خود ہمیشہ نفع اٹھاتے رہیں۔ کیونکہ جب تک تمہارے اور ترکوں کے درمیان جنگ رہے گی اسی وقت تک انگریز فرانسیسی اور امریکی سرمایہ دار ارمنی بغاوت کے خوف سے ترکوں کو روک سکیں گے۔ اور کردوں کے فتنہ کے خوف سے ارمینیوں کو لقمہ توپ بنا سکیں گے۔

اے کاشتکاران شام و عرب! انگریزوں اور فرانسیسیوں نے تم سے آزادی کا وعدہ کیا تھا اور اب انھوں نے تمہارے ملک میں فوجیں ڈال کر قبضہ کر لیا ہے۔ اب انگریز اور فرانسیسی اپنے قوانین تم پر نافذ کرتے ہیں۔ تم نے اپنے آپ کو ترکی سلطان اور حکومت قسطنطنیہ کے پنجہ غضب سے آزاد تو کر لیا۔ لیکن اب تم پیرس اور لندن کی حکومتوں کے غلام ہو۔ فرق صرف اسقدر ہے کہ جدید آقا سلطان کی حکومت کے

مقابلہ میں زیادہ طاقتور رہیں اور تمہیں زیادہ لوٹ سکتے ہیں

تم خود ان سب باتوں کو سمجھتے ہو۔ ایران کے کاشتکار اور مزدوروں نے اپنی حکومت طہران کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جزیرۃ العرب کے کاشتکار انگریزی افواج کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں۔

اے اناطولیہ کے کاشتکارو! تم حملہ غیر کے خلاف لڑنے کے لئے کمال پاشا کے جھنڈے کے تلے جمع ہو رہے ہو لیکن اس کے ساتھ ہم یہ بھی سنتے ہیں کہ تم خود اپنی پارٹی کی تنظیم کے لئے بھی کوشاں ہو۔ اگر ترکی پاشا اتحادی لٹیروں سے صلح بھی کر لیں گے تو یہ اصلی کاشتکاروں کی پارٹی جنگ کو قائم رکھے گی۔ شام میں امن نہیں ہے۔

اے کاشتکاران ارمینیہ! تم کو اتحادی باوجود اپنے مواعید کے فاقوں سے مرنے دیتے ہیں۔ تاکہ تم پر کامل تسلط رکھ سکیں تم روز بروز یہ سمجھتے ہو کہ اتحادی سرمایہ داروں سے نجات کی امید رکھنا حماقت ہے۔ تمہارے طبقہ اوسط کی حکومت جو اتحادیوں کی پٹھو ہے اس کو بھی امن اور امداد کے لئے روس کی حکومت کے لئے مزدوروں اور کاشتکاروں سے درخواست کرنا پڑتی ہے۔

اے مشرق ادنے کے کاشتکارو اور مزدورو! اگر تم اپنا نظام قائم کر لو۔ اگر تم اپنی حکومت کاشتکاران و مزدوران بنا لو۔ اگر تم اپنے آپ کو مسلح کر لو اگر تم سرخ روسی

مزدوروں اور کاشتکاروں کی فوج سے متحد ہو جاؤ تو تم انگریز فرانسیسی و امریکی سرمایہ داروں کا مقابلہ کر سکو گے۔ تب تم اپنے دیسی قزاقوں سے انتقام لے سکو گے۔ تب تمہارے لئے یہ ممکن ہوگا کہ دنیا کی جمہوریت مزدوران سے متحد ہو کر اپنے مفاد کی حافظت کر سکو! ۔ تب تم کو یہ معلوم ہوگا کہ اپنے ملک کے ذرائع کو کیوں کر ترقی دو تاکہ تم کو خود اور کل دنیا کے اُن مزدوری پیشہ اقوام کو فائدہ ہو جو اپنی محنت کے اثمار سے ایماندار ی کے ساتھ تبادلہ کریں گے ۔ اور ایک دوسرے کی مدد کریں گے

ان تمام مسائل پر ہم تم سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ لہذا یکم ستمبر کو باکو میں شریک کانگریس ہونے کے لئے حتی الامکان کوشش کرو۔ اور جتنی بڑی تعداد میں ممکن ہو آؤ۔ تم سال بسال ریگستان میں ہو کر مقامات مقدسہ کو جاتے ہو اور وہاں پہونچکر خدا اور اپنے ماضی کی حرمت کا اظہار کرتے ہو۔ اب تم ریگستانوں کوہستانوں اور دریاؤں کا سفر کرنا تاکہ اس مسئلہ کو طے کر سکو کہ تم غلامی سے کیوں کر آزاد ہو اور کیوں کر بھائیوں کی طرح متحد ہو تاکہ آزاد اور مساواتی زندگی بسر کر سکو"

اس طلبی سے باکو کی کانفرنس کی نوعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ فی الواقع یہ قوم پرستی کی جماعت ہونے کی بجائے معاشرتی انقلابیوں کی جماعت تھی ۔ انیس سو نمایندوں میں سے تیرہ سو مسلمہ کمیونسٹ تھے ۔ سب سے بڑے وفد ترکی، ایران ۔ ارمینیہ اور قفقاز سے آئے ۔ عرب، ہندوستان اور مشرق اقصٰی کے

بھی نمایندے تھے۔ بلاشبہ روسی سوویٹ گورمنٹ کا تسلط تھا۔ اور اس نے کل کارروائیوں کو بالکل اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ ان کارروائیوں کی نوعیت کا خلاصہ مشہور بالشویک لیڈر زینوولو کے ایڈریس میں ہے۔ یہ تیسری (ماسکو) بین الاقوامی جلسے کی کمیٹی کارکن کا صدر تھا۔

زینوولو نے کہا "ہم اس کانگریس کو تاریخ کے سب سے بڑے واقعات میں سے شمار کرتے ہیں۔ کیوں کہ اس سے صرف یہی نہیں ثابت ہوتا کہ یورپ اور امریکہ کے ترقی کن مزدور اور جفاکش کاشتکار بیدار ہوئے ہیں۔ بلکہ ہم نے آخر کار اس دن کا بھی مشاہدہ کرلیا جبکہ مشرقی اقوام کے نہ صرف چند بلکہ لاکھوں اور کروڑوں مزدور بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ یہ اقوام کل دنیا کی آبادی کا سب سے بڑا حصہ ہیں۔ لہذا یہ انہی کا حصہ ہے کہ سرمایہ اور مزدوری کی جنگ کو آخری نتیجہ تک پہونچا دیں"۔

"کمیونسٹ بین الاقوامی جلسہ نے اپنی پیدایش ہی سے یہ کہا کہ یورپ سے جو گنے اشخاص ایشیاء میں بستے ہیں۔ ہم کل اقوام کو جو مزدوری پیشہ ہیں آزاد کریں گے .... ہم جانتے ہیں کہ مشرق کی مزدوری پیشہ جماعت پست حال ہے۔ لیکن یہ ان کی غلطی نہیں ہے وہ نہ پڑھ سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں۔ وہ جہل اور توہمات میں مبتلا ہیں۔ وہ ارواح خبیثہ پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ نہ اخبار پڑھ سکتے ہیں اور نہ ان کو واقعات عالم کی خبر ہے۔ ان کو ابتدائی قواعد قانون حفظان صحت کا بھی علم نہیں ہے۔ دوستو! ہمارے ماسکو کے بین اقوامی

جلسہ میں اس مسئلہ پر بحث ہوئی تھی کہ آیا ممالک مشرق میں اشتراکی انقلاب قبل اس کے کہ یہ ممالک سرمایہ داری کی منزل کو طے کریں، ہو سکتا ہے یا نہیں؟ تم کو علم ہے کہ عرصہ دراز تک یہ خیال رہا کہ ہر ملک کو اولاً سرمایہ داری کے دور سے گزرنا چاہئے ....

...... تب ہی اشتراکیت کے مسئلہ میں جان پڑ سکتی ہے۔ اب ہم کو یقین ہو گیا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ روس نے ایسا کر کے دکھا دیا۔ اور اسوقت سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چین، ایران، ہندوستان، ترکی اور ارمینیہ کے لئے بھی یہ ممکن ہے۔ اور ان ممالک کو نظام سوویٹ کے حصول کے لئے فوراً اُڑنا چاہئے۔ یہ ممالک بھی اپنے آپ کو سوویٹ جمہوریت کے لئے تیار کر سکتے ہیں اور تیار کرنا چاہئے۔

"میری غرض یہ ہے کہ ہم ان اشخاص کی جماعتوں کو بھی مدد دیتے ہیں جو ہمارے خیالات پر یقین نہیں رکھتے ہیں۔ اور بعض امور میں مخالف بھی ہیں چنانچہ سوویٹ گورنمنٹ ترکی میں کمال پاشا کی اسی لحاظ سے مدد کرتی ہے ہم ایک لمحہ کے لئے بھی یہ فراموش نہیں کرتے کہ جس تحریک کے سردار کمال پاشا ہیں وہ کمیونسٹ تحریک نہیں ہے۔ میرے پاس ترکی جمہوری حکومت انگورہ کے پہلے اجلاس کی پوری رپورٹ کے ملخصات ہیں۔ اس میں کمال پاشا نے خود کہا ہے کہ خلیفہ کی ذات مقدس اور واجب الاحترام ہے کمال پاشا کی تحریک کا یہ مقصد ہے کہ خلیفہ کی مقدس ذات کو دشمنوں کی دسترس سے بچایا جائے۔ یہ ترکی قوم پرستوں کا نقطہ خیال ہے کیا یہ کمیونسٹ نقطہ خیال بھی ہے؟ ہرگز نہیں! ہم عوام کے مذہبی اعتقادات کا احترام کرتے ہیں اور عوام کو از سر نو تعلیم دینا بھی جانتے ہیں۔ لیکن یہ سالہا سال

کام ہے۔

مشرق اور دیگر مقامات کی مزدوری پیشہ جماعت کے مذہبی اعتقادات پر ہم بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ لیکن اس کانگریس میں تم کو یہ بتا دینا ہمارا فرض ہے کہ جو کچھ کمال پاشا کی گورنمنٹ ترکی میں کر رہی ہے تم کو نہیں کرنا چاہیئے۔ تم کو سلطان کے اقتدار کی حمایت نہ کرنا چاہیئے۔ خواہ تمہارے مذہبی خیالات تمہیں اس پر مجبور کرتے ہوں۔ تم کو آگے قدم بڑھانا چاہیئے اور پیچھے نہ ہٹنا چاہیئے۔ ہمارا یقین ہے کہ سلطان کا وقت پورا ہو گیا۔ تمہیں چاہیئے کہ کسی قسم کے خود سرانہ اختیار کو باقی نہ رکھو۔ تم کو جو عقیدت سلطان سے ہے اس کو ختم کر دینا چاہیئے۔ حقیقی سوویٹ نظامات کے حصول کے لئے کوشش کرنا چاہیئے۔ روسی کاشتکاران بھی زار کے بڑے معتقدین میں تھے۔ لیکن عوام کا حقیقی انقلاب جب وقوع پذیر ہوا تو زار سے یہ عقیدت بالکل معدوم ہو گئی۔ جب کاشتکاروں کا ایک حقیقی انقلاب ارض سیاہ میں وقوع پذیر ہو گا۔ تو یہی واقعہ ترکی اور کل مشرق میں پیش آئے گا۔ عوام کو اپنے سلطان اور اپنے آقاؤں سے عقیدت جاتی رہے گی۔ ہم پھر کہتے ہیں کہ ترکی میں موجودہ حکومت عوام نے جو طرز عمل اختیار کیا ہے وہ کمیونسٹ کی بین الاقوامی پالیسی نہیں ہے۔ یہ ہماری پالیسی نہیں تاہم ایں ہمہ ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ گورنمنٹ برطانیہ کے خلاف ہر انقلابی جنگ میں ہم امداد دینے کو تیار ہیں۔

ہاں ہم انگریز سرمایہ داروں کے مخالف ہیں۔ ہم انگریزی شہنشاہیت کی گردن پکڑ کر اس کو پامال کرنا چاہتے ہیں۔ یہ انگریزی سرمایہ داری ہی ہر جس کے خلاف بہ ترین و مہلک ترین ضرب لگنی چاہیئے۔ یہ امر واقعہ ہو

لیکن اس کے ساتھ ہی ہم کو مشرق کی مزدوری پیشہ جماعت کو نفرت کی تعلیم دینا چاہیے۔ اور یہ تعلیم دینا چاہیے کہ وہ کل متمول طبقات سے بلا خیال ذاتیات لڑنے کو آمادہ ہو جائیں۔ مشرق میں جو انقلاب رونما ہو رہا ہے اس کی بڑی اہمیت یہ نہیں ہے کہ ہم انگریز حامیان شاہنشاہی سے یہ درخواست کریں کہ وہ اپنا قدم اس لئے ہٹالیں کہ متمول ترک نہایت آسایش سے اپنے قدم جمالیں۔ نہیں! ہم سب متمول اشخاص سے نہایت خلق کے ساتھ یہ کہیں گے کہ آپ اپنا منحوس قدم ہٹا لیجئے تاکہ ہم میں نہ کوئی عیش پرستی رہے نہ فخر و مباہات۔ نہ عوام کی حقارت رہے اور نہ بیکاری۔ بلکہ دنیا پر مزدوروں کا محنت کش ہاتھ حکمراں ہو جائے"

بالشویزم کی مسلمہ مہم یعنی کل مشرق کو بالشویک بنانے کی مقصد میں باکو کی کانگرس جنگ کا پہلا گولا تھی۔ اس کے بعد سوویٹ کارروائیوں میں ترقی ہوئی اور اچھی خاصی کامیابیاں بالخصوص قفقاز میں ہوئیں۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۱ء کی بہار میں گرجستان اور ارمینیہ دونوں ملک بالشویکی ہو گئے

مگر ان کامیابیوں سے ہی سوویٹ روس کے ان قوم پرست وظیفہ خواروں میں روز افزوں بےچینی پیدا ہونے لگی۔ مختلف مشرقی قوم پرستوں کی جماعتوں کو جنہوں نے اتحادی سلطنتوں کے خلاف ماسکو کی امداد کا نہایت سرگرمی سے خیر مقدم کیا تھا یہ احساس ہونے لگا کہ ان کی توقعات حب وطن کے لئے روسی بالشویزم ایسی ہی خطرناک ثابت ہوگی جیسا کہ مغربی شاہنشاہیت۔ بلاشبہ قوم پرست لیڈروں نے ماسکو کے اصل مقصد کو ہمیشہ سے پہچان لیا تھا۔ لیکن انھوں نے یہ محسوس کیا تھا کہ وہ اس نازک موقعہ پر پورے حاوی ہیں اور روسی مدد کو بلا ماسکو کی قیمت

کے ادا کئے حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن اب ان کو یہ یقین نہ رہا۔ اگرچہ مشرق میں مزدوری پیشہ جماعت کی تعداد جو اپنے طبقہ کی اہمیت سے واقف ہو بہت تھوڑی تھی اور کمیونسٹ فلسفہ مشرقی عوام کی سمجھ سے فی الحقیقت باہر تھا۔ باایں ہمہ سوویٹ روس کی ہستی ہی ایسی شے تھی جو نظر انداز نہ کی جا سکتی تھی۔ روس میں کمیونسٹ کی تعداد قلیل جو ان کے کہنے کے بموجب چھ لاکھ سے زیادہ نہ تھی سترہ کروڑ نفوس پر غیر محدود مطلق العنانی قائم کیے ہوئے تھی مغربی ممالک اپنی عام تعلیم اور باضابطہ آزادی کے مستحکم روایات پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ لیکن مشرق میں بالشویزم کے خلاف ایسا کوئی حصن حصین نہ تھا۔ فی الواقع مشرق کی حالت بالکل روس جیسی تھی عوام میں وہی سخت جہالت تھی اور بڑا طاقتور طبقہ وسطے ویسا ہی معدوم تھا۔ مطلق العنانی کی روایات بھی وہی تھیں۔ بیرحم جماعت اقل کی حکومت سے عام طور پر راضی ہو جانے کے میلان بھی موجود تھے۔ اور آخر بات یہ ہے کہ سوویٹ شدہ ترکستان اور آذربائیجان کی منحوس مثالیں موجود تھیں۔ مختصر یہ کہ مشرقی قوم پرستوں کو پرانی ضرب المثل کا خیال آیا "شیطان کے ساتھ کھانا کھانے کے لئے بہت بڑے چمچے کی ضرورت ہے"

ہر جگہ قصہ ایک ہی تھا۔ ایشیاء کوچک میں مصطفےٰ کمال پاشا نے بالشویکی مبلغین کو گرفتار کیا اور روسی و ترکی افواج کئی بار متنازعہ فیہ سرحد قفقازیہ پر دوچار ہو گئیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ لارڈ ملنر اور مصری قوم پرستوں لیڈروں کے درمیان کیسا خاطر خواہ تصفیہ

بعض اسو جہ سے جلد ہو گیا کہ مصری قوم پرستوں کو معاشرتی انقلاب کن فتنہ انگیزوں کا ڈر لگا ہوا تھا جو فلاحین کو مشتعل کر رہے تھے۔ مسٹر ولنٹائن چیرول نے ۱۹۱۸ء کی بہار میں یہ محسوس کیا کہ ہندوستان میں ہندوستانی رائے عامہ پر روس کی سلطنت کی تباہی اور بالشویکی اثر کے فتح نے اچھا اثر ڈالا۔ وہ لکھتے ہیں کہ با فکر ہندوستانیوں نے یہ دیکھ لیا کہ جب کل حکومت کے اجزا تیزی سے منتشر ہو گئے تو روسی روشن خیال طبقہ (جو ہندوستانی روشن خیال طبقہ کے مقابلہ میں کثیر التعداد اور قدیم الایام تھا) جاہل عوام پر قابو رکھنے میں کیسے بے بس ثابت ہوئے[۱] افغانستان میں بھی امیر کو بھی اپنے بالشویکی حلیفوں سے محبت کم ہونے لگی۔ سوویٹ شدہ ترکستان سے جو پناہ گزینوں کا سیلاب ان کی سرحد میں آیا اور ان میں ان کے رشتہ دار امیر بخارا بھی تھے تو امان اللہ خاں کو بہت فکر ہوئی۔ اسی زمانہ میں روسی سرحد پر افغان فوج میں بغاوت ہوئی۔ اور باغیوں نے یہ مطالبہ کیا کہ روسی نمونہ پر ان کو سپاہیوں کی مجلس شوریٰ قایم کرنے کا حق دیا جائے۔ بالشویک کارپردازوں نے ہندوستان کو لوٹ کا لالچ دلایا۔ لیکن امیر کو یہ نظر آتا تھا کہ ہندوستانی لوٹ کس کام آئے گی۔ جبکہ ان کی اپنی باغی رعایا انھیں لوٹ کر مار ڈالے گی۔ اس طرح امتداد زمانہ کے

---

[۱] سر ولنٹائن چیرول کا مضمون "گرفتارِ آلام ہندوستان" جو جولائی ۱۹۱۸ء کو ایڈنبرا ریویو میں شائع ہوا نیز ملاحظہ ہو عزہائی نس آغا خاں کی کتاب "ہندوستان بحالت نقل و حرکت" صفحہ ۱۰ مطبوعہ لندن ۱۹۱۸ء مصنفؒ

[۲] اقبال علی شاہ مذکور الصدر (مصنف)

ہمعنان مشرقی قوم پرست اور قدامت پسندوں کو بالشویزم سے متفقہ خوف ونفرت پیدا ہونے لگی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اگر دیگر امور خارج نہ ہوتے تو ماسکو کی پیش قدمیاں فوراً ہی روک دی جاتیں۔ اور بالشویک کارپردازوں کا جلد استیصال ہو جاتا۔

بدقسمتی سے مشرقی قوم پرست اپنے آپ کو اشوئی اور مغربی شہنشاہیت کے سمندر کے درمیان پاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ ان دونوں سے ایک دوسرے کے خلاف کام لیں یعنی اتحادیوں کی ہر جارحانہ حرکت سے ماسکو کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور سوویٹ لینن کی ضرب سے مغرب کی طرف کھنچ جاتے ہیں۔ مغرب کے مدبرین کو اس کا احساس ہو جانا چاہیئے اور یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ بالشویزم کا سب سے اچھا کارپرداز نیولو نہیں ہے۔ جس نے باکو میں دہاں دہارہ تقریر کی بلکہ جنرل گورد ہے جو شام اور اندرون عرب کے ممالک میں اہل سینیگال کی فوج کے ساتھ تہ پردستیٔ ناہیرون سے کام لے رہا ہے۔

بلاشبہ اگر بالشویزم مشرق میں کسی بڑے پیمانہ پر رائج ہو گیا تو خود مشرق اور کل دنیا کی بڑی بدنصیبی ہو گی۔ اگر مغرب میں بالشویزم کی فتح سے بربریت مراد ہے تو مشرق میں اس سے قطعاً سبعیت قائم ہو جائے گی۔ اگر مشرق کے جاہل اور وحشی عوام اپنے قدیم مذہبی اور رسمی قیود سے دفعتاً آزاد ہو جائنگے اور معاشرتی انقلاب کے سیلاب میں چھوٹے طبقات اعلےٰ و وسطےٰ غرق ہو جائنگے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ کل مشرقی تہذیب و تمدن برباد

ہو گیا۔ اور مشرق طوائف الملوکی کے غار میں ایسا گرا کہ وہ پشتہا پشت تو کیا صدیوں کے بعد نکل سکے گا۔
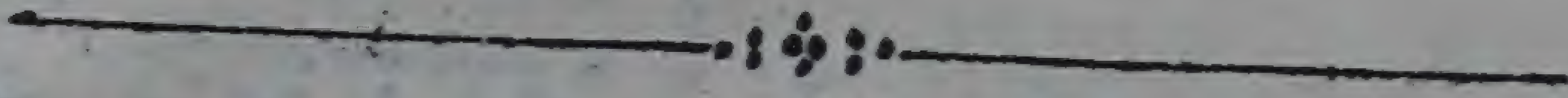
نتیجہ

مشرق ادنےٰ و وسطےٰ پر ہمارا تبصرہ ختم ہوگیا- اس تبصرہ کی نمایاں صورت کیا ہے؟ انقلاب! بالآخر غیر متحرک مشرق متحرک اور کامل طور پر متحرک ہوگیا- آج مشرق کامل انقلاب، سیلان اور ہیجان کی حالت میں ہے اور یہ انقلاب، سیلان، اور ہیجان جسقدر فوری اور عمیق ہر اسقدر پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا- دنیائے اسلام ایکہزار سال تک جمود اور سکون کی حالت میں رہکر اب پھر ایکمرتبہ سرگرم تگا پو نظر آتی ہر

منزل مقصود؟ ہم بالکل نہیں جانتے! کون ہر جو اس عظیم ہیجان، اس سیاسی، اقتصادی معاشرتی، مذہبی اور اس سے بہت زیادہ پہلوؤں کو لئے ہوئے ہیجان کے نتائج کی پیشینگوئی کرنیکی جراَت کرسکے؟ ہم اپنی عقل کی بساط کے موافق جراَت کرکے جو کچھ کرسکتے ہیں وہ صرف اسیقدر ہر کہ اس عظیم تغیر کے مختلف عناصر کی تحقیق اور تحلیل کریں-

لیکن یقیناً یہ بھی بہت زیادہ ہر- اس عظیم تغیر پر جو سرگرم عجلت ایک نظر خواہ سرسری ہی کیوں نہ ہو، ڈالنا اور اس کے بے شمار پہلوؤں کو کسی قسم کے سلسلہ میں مربوط کرنا اور اس الجھی ہوئی گتھی میں صحیح سررشتہ میلان کا پتہ لگانا ہی آیندہ ترقیات کا جو یکے بعد دیگرے پیش آنیوالے ہیں کم از کم عارضی علم اور ان کی اہمیت

کا اندازہ کرنے کی قابلیت حاصل کرنا ہے۔

پرانا مقولہ ہے کہ کسی شے کا علم ہی اس کا ادراک ہے اور میں اس پر یہ مستزاد کرتا ہوں کہ امید قایم کرنا بھی ہے۔ لہذا ان حالات کے علم سے یہ امید ہوتی ہے کہ موجودہ تکلیف جو عظیم ہونے کے ساتھ ہی مبہم بھی ہے اس نوزائیدہ مشرق کی دردزہ ہی ثابت ہوگی جو نئی دنیا میں عنقریب اپنا مقام اور وقار حاصل کرنے والا ہے۔